

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ
سینس ڈائجسٹ
ماہنامہ

دسمبر 2017

معراج رسول



مدیر اعلیٰ
عذر ارستول

مدیرہ
نائب مدیرہ
یعنی احمد
اظہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07
انشائیہ
جون ایلینا

خوشامیدی کا حژوہ سنانے والے
ایک بھلے انسان کا نظریہ

08
آج کے خط
مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت و تارکین کی توجہ
شیریں باتیں، کلمے شکوے اور چٹلوس مشورے

16
نوشت اتحاد
ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار
افسانوں کے سبق آموز اور غیرت آمیز واقعات

70
رنگ آسمان
لے آر راجپوت

مشرق مغرب کے عجیب امتزاج اور تاریخی تخیلی خیالوں
کے عبرت انگیز شاواہد میں لہری لہری پاکستان

63
مات
ناہید سلطانی اختر

رشتوں کی خوشبو سے معمور
ایک ناکام عشق کی زندہ ولی

53
ہوشیاری
محمد یاسر اعوان

مغربی معاشرے میں پینے
والے حبس نام کی پڑھ پڑھ کا نوک انڈاز

116
ناک تے
ملک صفدر حیات

عشق کے نام پر، ایم اے سی
کے لیے، والوں کی لڑو، مسہر روداد

107
تیسری کوشش
تنویر ریاض

قاتل سے مقتول بننے والے ایک
محبور کی کارروائی کا ماحیرا

103
جیون مان
وسیم بن اشرف

جیون مان کرنے والے ایک
مخلص دوست کا قصہ

154
محفل شعر سخن
قارئین

تہائی کا شکار ہونے والے
آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ
چنڈن کے مہمان کا انداز بیان

145
داستان گو
علی اختر

تہائی کا شکار ہونے والے
آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ
چنڈن کے مہمان کا انداز بیان

165
تلاش
بابر نعیم

ایک مضطرب انسان کے
عجیب سفر کی منظر روداد

157
نیاموڑ
شمر عباس

تینی سے گزرتے حالات کی
ذوری تھلے ایک حسین کی فائز

201
خود کردہ
سلیم انور

تفتیشی بوت لاطیسیں ہاتھ ساتھ
بے ڈالے خطا کاری کی چالاک

168
وقت
حسام بٹ

ایک عزم بازی مگر کی بازی مری..... سنسنی
خیز واقعات پر محل ایک دلیر باطلیل داستان

221
سلگتے چنار
افتخار اعوان

سلگتے راگہ... کبھی بھرتے شعلوں
کے لڑکیاں تنور سے والوں کا جھولہ

207
حضرت یوسف علیہ السلام
رضوانہ ساجد

اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی
سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

205
تبادلہ
مظہر سلیم ہاشمی

حسرت پرانی ہیں خوار ہیں
والا ایک دہانسان کا قصہ

000
کترنیں
ارارہ

دنیا بھرے ادھر ادھر سے لطفے، چکے
اقتباسات، مکر، انشائیہ اور تفتیشی کہانیاں

240
شکست کی فتح
طاہر جاوید مغل

فدوت دم پر شکست کھانے
والی دوشیزہ کی حیران کن رخ

231
تحفہ
شاہ زین رضوان

حیرت کو چھپانے کے لیے انوکھا
انڈاز اختیار کرنے والی حسین کی مکاری

مژدہ

ہم جو کھٹکھٹاتی ہوئی مٹی سے بنائے گئے، ہم جو خاک کے خیر سے اٹھائے گئے اور ہم جو خاک میں ہی ملائے جائیں گے۔ ہم فتنہ و فساد کے زمانے میں زندہ ہیں اور بدستوں نے ہمارا گھر و کچھ لیا ہے۔ سو ہم پر لازم آیا کہ ہم اپنے اپنے جھروں سے باہر آئیں اور مرنے والوں اور مارنے والوں کو اس المناک حقیقت سے آگاہ کریں کہ زندگی مارنے والوں اور مارے جانے والوں، دونوں ہی سے سو تیلی ماڈن کا سا سلوک کرتی ہے۔ کسی کو ریشم و کنواری کے بستری پر سلاتی ہے اور کسی کو بچھانے کے لیے گدڑی بھی نصیب نہیں ہوتی لیکن موت سب ہی کو ایک نظر سے دیکھتی ہے، سب کو اپنی چھائی میں سمیٹ لیتی ہے اور سب کو ایک ہی طور خاک میں ملاتی ہے۔

وہ جو زمین پر بہت اینڈ کر چلتے ہیں، ان کے لیے کسی بھی میدان سے، کسی بھی کمیت یا کھلیاں سے ایک مٹی اٹھائی جائے اور پھر دل و دماغ کی آکھوں کے چراغوں کی روشنی میں اسے دیکھا جائے تو اس میں اب سے لاکھوں برس، ہزاروں اور کیکڑوں برس پہلے گزر جانے والے ہمارے اجداد کے بدن کے ریزے نظر آئیں گے۔ کسی عالم کے سر پر غرور کا ایک ذرہ، کسی مظلوم کے چہرے ہوئے جگر کا ایک ریشہ اور کسی مقبول کی کتڑی جانے والی انگلیاں اس مٹی بھر مٹی میں مکمل مٹی ہوں گی۔ اس کے کسی ذرے سے کسی نیک نفس اور بزرگ زیدہ انسان کی خوشبو آ رہی ہوگی اور کسی ذرے سے خبث باطن کی مڑا اندھ رہی ہوگی۔ لیکن جون ایلیا، تم جو ایک مٹی مٹی لیے بیٹھے ہو اور اس میں گڑھتھاں کی جھلکیاں دیکھ رہے ہو تو تم ان جھلکیوں کو دیکھ کر کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا سیکنا اور کیا سکھانا چاہتے ہو؟

میرے بھائی، میرے دوست، میں گویا مٹی سے محروم ہوں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا اور میں نے تو ابھی زندگی کے کتب سے کچھ بھی نہیں سیکھا تو میں تمہیں یا کسی کو بھلا کیا سکھاؤں گا۔ میں یہ مٹی بھر مٹی اپنے حکمرانوں کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں اپنے بارے میں اور اپنے آپ کے کروڑوں کے بارے میں بتاؤں، ان بستیوں کی کلیاں دکھاؤں جن کے نصیب ہمیشہ تیرہ و تار رہے، جن کے مقدر میں کبھی سکھ کی گھڑیاں نہیں لکھی گئیں۔

میرے بھائی، انہیں بتایا جائے کہ یہاں حکمرانوں نے محض تجربے کیے، زیادہ مطلق العنانی کے، زیادہ فرعونیت کے تجربے، ہمارے یہاں عوام کے نام پر آنے والوں نے سب سے پہلے عوام کا ہی ٹیٹو اچایا۔ اس بستی کے معصوم و مظلوم رہنے والوں کے سینے میں امید کے دریا لہراتے ہیں۔ وہ ہر آنے والے کا دامن بہت دردمندی سے، بہت خوش امید سے تھامتے ہیں اور ہر مرتبہ دھکے کھاتے جاتے ہیں۔

ایک بار پھر لوگوں کو مژدہ سنایا جا رہا ہے، ایک ایسے بندوبست کی نوید دی جا رہی ہے جہاں پے ہوئے اور کپلے ہوئے لوگوں کو عزت کی روٹی مل سکے گی، جہاں مظلوموں کو انصاف فراہم ہو سکے گا، جہاں رشوت ستانی اور بدعنوانی کا کوئی گڑہ نہ ہوگا۔

یہ تمام اچھے جملے، یہ سارے خوب صورت خواب، اس سے پہلے بھی یہاں کے لوگوں کو دکھائے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی یہی کہا گیا ہے کہ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی اور یہاں رہنے والوں کی عزت نفس کا احترام کیا جائے گا۔

یہاں کے لوگوں نے پہلے بھی ان وعدوں پر اعتبار کیا تھا، یہاں کے لوگ ایک بار پھر نئے وعدوں پر اعتبار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس مژدے کو اس امید کے ساتھ سنا ہے کہ یہ وعدے، وعدہ فرمائیں ہوں گے۔ وہ اس آس میں ہیں کہ انہیں ایک بار پھر زراں نہیں کیا جائے گا۔

مژدہ سنانے والوں نے بستیوں کو ترانے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ اس دور میں کارفرمادی کا دعویٰ یقیناً ایک بڑا دعویٰ ہے۔ یہ دعویٰ جنہوں نے کیا وہ اس پر پورے اتریں اور کروڑوں کے سامنے سرخرو ہوں کہ یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔





عزیزانِ من!
السلام علیکم!

لیجئے جناب دسمبر 2017ء بھی آن پہنچا..... وہ تو آتا ہی تھا..... وقت کبھی کسی کے روکے سے رکا ہے۔ البتہ کسی کی مقام پر وقت صرف سالوں کے ہندسوں تک تو بدلتا ہے مگر حالات..... واقعات اور دیگر معاملات میں جوں کا توں ہی رہتا ہے کیونکہ..... باختیار طبقہ انہیں بدلتا ہی نہیں جاپتا اور عوام کے حصے میں غفلانہ تسلیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا جیسے کبھی کی لوڈ شیڈنگ کے لیے دعوے تھے کہ 2017ء کے آخر تک اس کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن کہاں جناب..... اب تو خیر سے 12 سے 22 گھنٹے تک اس کا دورانیہ بڑے دھڑلے سے مقرر کر دیا جاتا ہے، دوسری جانب مہنگائی کے جن کو قابو کرنے کا خواب دکھا کر پیڑوں کی قیمتوں میں مختصر مختصر وقفے سے اضافہ کر کے شاید یہ طبقہ طنزیہ ہنسی ہنستا ہوگا کہ ”کھولیں تصویر دیکھیں“ اسی طرح اس و اماں کی صورت حال کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی ناشوش چھوڑ کر بظاہر بکڑ بکڑاوا دیا کر کے خاموشی کی ایک لمبی چادر تان لی جاتی ہے جبکہ سیاسی منظر نامے پر نظر ڈالی جائے تو عجب تماشا یہ بازی گرنگا کر رکھتے ہیں۔ جب قومی دولت پر جی جان سے ہاتھ صاف کیا جا رہا ہوتا ہے تو یہی لوگ آنکھوں پر پینا اور مفاد کی پٹی باندھے جین کے باسری بجا رہے ہوتے ہیں اور جب مفاد ہو چکا ہے تو اپنی اپنی بین کلال کر بچنا شروع کر دیتے ہیں اور سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ کین پر لہرانے والے انسان نہیں ہوتے۔ جب رکھوالے ہی لٹیرے ہوں تو غیروں سے کیا شکوہ..... ایسے میں شاعر مشرق علامہ اقبال کا خواب ہو یا قائد اعظم محمد علی جناح کی آرزو..... ہم ان کے سامنے شرمندہ نہ ہونے تو کیا کریں۔ 25 دسمبر اپنے محبوب قائد کا یوم پیدائش اور پھر لازوال قربانیوں اور انتھک کادوشوں کے نتیجے میں ملنے والی اس دھرتی کی دل و جان سے قدر کرنا کیا ہم سب کا اولین فرض نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں سرخ روئی عطا فرمائے۔ (آمین)۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی اعلوئی صاحبزادی دینا وادیا 2 نومبر 2017ء کو مضافات الہی سے وفات پانگیں۔ اللہ پاک قائد کی اس نشانی کو جو رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)۔ وقت کا یہی کرشمہ ہے کہ دیا کے مانند بہتا رہتا ہے مگر دریا کی سطح سے لگتا ہے جیسے انسان اسی ایک جگہ ٹھہرے پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھا ہے۔ 2017ء اللہ حافظ۔ دسمبر ہمیشہ یادوں کو سمیٹنے اور نئی امیدوں کے چراغ جلانے کا مہینا بن کر آتا ہے اور بچپن سے وقت کی لگام اگلے سال کے ہاتھوں میں تھما کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اپنی امیدوں کے چراغ لیے ہم بھی چلتے ہیں اپنی بزم کی جانب جہاں بدلے موسم اور بدلنے والے خیالات کے رنگ جا بجا بکھرے ہیں۔

حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی کو نورنگہ ضلع میانوالی سے شائع ہونے والی ”سپنس ڈائجسٹ“ کا ماہ نومبر کا شمار ہاتھوں میں ہے۔ جون ایلیا کی ”مخول“ ہوش ربا تحریر ہے۔ آپ کے خطوط میں عبدالباقی رومی کی گزارشات پر صدمے۔ واقعی اس وقت مسلم دنیا کی حالت زار پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شام میں..... جنگ جاری ہے، عراق تباہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا ملک دہشت گردی کی زد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلم دنیا میں سیاسی امن لائے۔ آمین۔ محمد صفر معاویہ، اشفاق شاہین، ریاض بٹ، ادریس احمد خان، صادق معاویہ، ڈاکٹر نائل نصر، رمضان پاشا، محمد قدرت اللہ نیازی، رضا شاہ کے محبت نامے پڑھے، دل کو خوشی ہوئی۔ قدرت اللہ خان نیازی کی خوشگوار آمد جی آیا توں نیازی صاحب۔ نئے لکھاریوں کو بھی خوش آمد یہی اعلیٰ اختر کی دربان پریمی۔ پر تعوی راج ہمارا جا اور سیکھنا کی عشق کی داستان عبرت پریمی۔ ہندی مزاج کی خوب صورت تحریر ہے۔ منظر امام کی اعلیٰ طرف میں ایک حساس نکتے کو مصنف نے اٹھایا ہے۔ ارشد اور جویریہ کی شادی ہو جاتی تو کوئی قحط نہ تھی۔ زندگی ایک بھجوتے نامے جو ہر حال میں مایاں بیوی کو بھینچا ہوتا ہے۔ رنگ آسمان میں اسے آرزو چھوٹے مختلف کرداروں کو یکجا کیا ہے۔ آزادی ہندوستان میں انگریز راج فرنگیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مزاج کو جاگر کیا گیا ہے۔ کہانی آگے ایک نامور لکھنے نظر آتی ہے۔ ٹارگٹ میں مرزا امجد بیگ نے عدالتی تکیوں کی خوب وضاحت کی ہے۔ ان کے دلائل میں وزن ہوتا ہے جب وہ مخصوص انداز میں عدالت میں بحث کرتے ہیں۔ عارف کو یہ گناہ ثابت کرنے میں ہمک صاحب کی محنت کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ظفر اقبال ظفر کی عشق نامہ تمام..... لکھنؤ کے مخصوص ماحول اور طوائف کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ نوابوں کا طوائفوں کی حویلیوں میں جانا اور ان کی اولاد کا ان سے تہذیب و گفتار کا یکساں ایک اہل حقیقت ہے۔ سایہ الہام، ہارون، اور

آموز کہانی ہے۔ محمد الیاس کی عمدہ کاوش بھی۔ جن شادی شدہ مستورات کے شوہر بیرون ملک چلے جاتے ہیں لیے عرصے کے لیے، ان کے ساتھ مزہ جیسا ہوتا نظر آتا ہے اور ان پر حاوی بیروں کے غلط چکر میں پڑ جاتے ہیں جو سادہ لوح عوام کو لوٹنے میں پہلے ہی بدنام ہوتے ہیں جیسی پیراس بیماری کو جنات سے منسوب کرتے ہیں اور عام آدمی ان کے چکر میں آ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ علم طب کی ایک بیماری ہسٹریا ہوتی ہے۔ وقت اب نئے موڑ پر ہے۔ اسد علی اور اس کی ماں ملکی کا ملاپ ہونے کے بعد کہانی ایک نئی ڈگر میں داخل ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسد علی کو نئے دشمنوں سے برسر پیکار ہونا پڑے گا۔ کہانی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی تحریریں جاندار ہوتی ہیں اور وہ طبی دنیا کے مسائل اور انجمنوں پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ شاہ صاحب کی کہانیوں پر مضبوط گرفت ہوتی ہے۔ زندگی اداس ہے اس کا ثبوت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام..... رضوانہ ساجد کی تحریر پورے خشوع و خضوع سے پڑھتا ہوں۔ انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے آزمائشیں بھیجیں اور پھر انہیں سرخرو بھی فرمایا۔ ان کی اعلیٰ قسطوں کا انتظار ہے گا۔ شاطر میں استاد اور شاگرد دونوں ایک ضعیف عورت سے مات کھا گئے شاکر لطیف کی عمدہ تحریر ہے۔ استاد و شاگرد ایک دوسرے سے بھی تھمیں نشتے اور پھر دھوکا کھاتے اور دینے کڑے میں جا کرے۔ طاہر جاوید مغل کی تحریریں اپنی مثال آپ ہیں۔ تحریر میں منظر کشی مغل صاحب کا طرہ امتیاز ہے۔ واقعی کھلاڑی مزدیکھے رہ جاتے ہیں اور اناڑی جیت جاتے ہیں۔ مغل صاحب نے جو لکھا ہے کہ جو جیتا بڑا بے ایمان وہ اتنا بڑا فنکار پاکستان میں آج کل ایسی فضا بنی ہوئی ہے اور ہم پاکستانی سیاست اور عدالتوں کی جنگ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔“

بچھلے شمارے میں ایک کہانی کے چند فقروں کی طرف ایمانے زار شاہ، طلعت مسعود اور مرزا نو روز بیگ نے توجہ مبذول کرانی ہے جو سبھا شائع ہوئے۔ اس کے لیے معصف، مدیرہ اور ادارہ تبدل سے معذرت خواہ ہیں۔

زرین خان آفریدی کا تبصرہ حیدر آباد سندھ سے۔ ”نومبر 2017ء کے سپنس نے اکتوبر کے سپنس کا شکوہ دور کر دیا۔ نائل سے لے کر آخری اسٹوری دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بقول طاہرہ آئی میں ممکن نہیں نگاری حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ کہانیوں کی تعداد اور ڈائجسٹ کے صفحات بھی زیادہ تھے۔ نائل خوب صورت رنگوں سے مزین تھا۔ شکر ہے اسلاف اعلیٰ مقام۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب دہرے معیار والے لوگوں کا نخل بیان کر رہے تھے۔ ایسے لوگ مذاق ہی تو ہوتے ہیں۔ ادارے میں مدیرہ صاحبہ نے پیار معاشرے کا ذکر کیا ہے۔ مدیرہ جی، ہم پاکستانی ماشاء اللہ اتنے حوصلہ مند بر جرات و ہمت والے ہیں کہ اس پیار معاشرے کو تندرست کر کے جیتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں استقلال نصیب کر رہے آئیں اور اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اپنی پناہ میں رکھے۔ آگے اپنی پر بہار محفل پر نظر پڑی تو جناب رومی انصاری صاحب ممدارت پر قابض تھے، مبارک باد تبصرہ بھی کمال تھا۔ محمد صفر، اشفاق شاہین، ادریس احمد اور رمضان پاشا صاحبان کے تبصرے و محال کمال بے مثال تھے۔ ڈاکٹر نائل، ایمانے شاہ اور ادراسی صاحبزادہ دوست تہمدوں کے ساتھ روٹی محفل تھیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب بھی سویر تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ باقی نئے تبصرہ نگار بھی اپنی رائے دینے میں کامیاب رہے۔ دربان، اعلیٰ اختر صاحب کو خراج تحسین کہ تاریخی واقعات کو بہت خوب صورتی سے پیش کرتے ہیں کہ انسان اس دور میں چلا جاتا ہے۔ پر تعوی راج کے حالات زندگی و واقعات پھر سیکھنا کی بے مثال محبت بہت ہی زبردست۔ اپنے دربان پر تعوی راج کے ساتھ ہی ہو جانا عام بات نہیں۔ رنگ آسمان، اے آرزو چھوٹ مسز شوکی اور رینا نیم کے ساتھ باس ہو گئی ہے۔ کہانی کا روحم اور الفاظ کا چناؤ بھی بہترین ہے۔ اب بتائیں یہ داستان کتنے عرصے ہمارے ساتھ رہے گی۔ شمر عباس کی غلط فہمی بھی اچھی رہی۔ بھی کبھی آنکھوں دیکھی بات بھی غلط ثابت ہوتی ہے جیسے ایلین سے ہوئی۔ عشق نامہ تمام، ظفر اقبال ظفر صاحب کی بہت عمدہ رہی۔ دل کشا اور نواب صاحبہ تھیں۔ شاطر شاکر لطیف صاحب کی بہت شاندار رہی۔ نہ استاد نہ ہی شاکر دیکھو پائے۔ بقا وادیا شاطر تھی۔ اپنی چیز کی حفاظت بھی اچھی بات ہے۔ ٹارگٹ اور مرزا صاحب و یلڈن، جسے اللہ رکھے اسے کون چلے میں ممبر پور کو کشمر مرزا امجد بیگ صاحب کی تھی۔ شاکر اور ایلیا نے عارف سے جو چکارا پائے گا کیا طریقہ ڈھونڈا لیکن خود ہی کڑھے میں گرے۔ جگت کی فتح، طاہر جاوید مغل صاحب، نام بھی اچھا کام بھی اچھا۔ اس بار تفصیل چھالنے کے گاؤں موران والی کی عین النور کے کارنامے لے کر حاضر ہوئے۔ عموماً بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ گاؤں گوٹھ کی لڑکیاں شہری لڑکیوں سے زیادہ اونچی اڑان بھرتی ہیں۔ اکثر نقصان بھی اٹھاتی ہیں۔ نور کا جوڑی دار واقعتاً تھا۔ اسٹوری بہت جاندار ہے آگے کیا کیا ہوتا ہے اس کا انتظار ہے۔ آج ایک اور بات کی طرف توجہ دلا نا جاہوں کی کہ ڈائجسٹ کی تمام اسٹوریز اور داستانوں میں ٹپک یا نام کے ساتھ جو قصے پر یں بنی ہوئی ہیں، بیٹ ایڈ بیٹ ہوئی ہیں۔ رنگ آسمان کی رینا اور وقت کی شاکر کی تصاویر بے حد خوب صورت ہیں۔ اس طرح ہر اسٹوری کے متعلق مصوری بہت اچھی ہوتی ہے۔ سوائے مرزا امجد بیگ صاحب کے۔ (آپ کی نشاندہی کا شکریہ)۔ اس بار سلسلہ وار داستان وقت کو ناٹھن تم دے پائی کہ بشاور سے ہمارے گھر گیٹ آئے ہوئے ہیں تو ان میں مصروف ہیں۔ باقی کتریں کافی اچھی ہیں۔ محفل شعر و سخن تو ہمیشہ کی طرح اذہم رہی۔ (اتنی مصروفیات میں بھی



❖ اشفاق شاہین کی لاہور سے آمد۔ ”سپنس حسب معمول بروقت مل گیا۔ سرور قی بھی روایتی سارہ، مطلب روٹیں ساپنڈ نہیں آیا۔ جون ایلیا انٹرنیشنل میں وقت کی سنگینیاں بیان کرتے نظر آئے۔ اپنی محفل میں پہنچے، عبدالجبار روٹی مسکن تبدیل کرنے کے بعد کرسی صدارت پر موجود تھے۔ شاندار تبرکے کے ساتھ بہت اچھے۔ مفرد محاذیہ، ریاضیٹ، زرین آفریدی، اوشارا علی، زاہد، قدرت اللہ نیازی، فضا شاہ اور امتیاز احمد کے تبرکے بہت اچھے اور خوبصورت رہے، پسند آئے۔ ایمانے شاہ بختر آ کے ساتھ مکمل بار آئیں۔ چوڑے جی آئیوں۔ باقی احباب کے خطوط بھی اچھے رہے۔ سب سے پہلے وقت کا مطالعہ کیا اس بار منظر نگاری خوب رہی۔ اس کی بالآخر اپنی امی سے ملاقات ہوئی مئی اور کچھ غیر متوقع حالات بھی سامنے آئے جن کا سامنا کرنے کے لیے وہ ٹانگ کر رہا ہے اور سب سے دلچسپ بات مقبول بحثی نے جس دوسری عورت کی پاکستان میں موجودگی ظاہر کی ہے، وہ کون ہے۔ میرا تو خیال ہے وہ ڈیلفینا ہے اور آفس سٹاک بات اینڈ پریسل سلطان انگل کی وفات، اس بار قسط بہر حال بہت اچھی رہی۔ نئی سلسلے اور کاپی رائٹنگ آسان آئے اور انجمن، آغاز تو بہت اچھا ہے، خصوصاً حالات سے کہانی نے اسٹارٹ لیا ہے۔ آگے کیا رخ اختیار کرتی ہے تین چار قسطوں میں واضح ہو جائے گا۔ آخری صفحات کی کہانی شکست کی فتح واہ طاہر جاوید محفل صاحب، شاندار نور کی ہمت و حوصلے کی داستان بہت زبردست رہی۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ مرزا امجد بیگ مارٹن کے ساتھ موجود تھے بہترین۔ تاہم تو ایک طرف اس کی بیٹی اپنی ماں سے بڑھ کر محفل ایسے کردار اب بھی جا بجا موجود ہیں۔ مختصر کہانیاں بھی خوب رہیں۔ خصوصاً اعلیٰ طرف اور عشق تا تمام نے خوب مزہ دیا بہترین رہیں۔ سایہ محمد ایلاس نے خوب لمبی قابل غور اور پراثر تحریر حضرت یوسف کے واقعات پڑھ کر بہت ہی اچھا لگا اور محفل شعر و سخن میں انتخاب لا جواب رہا۔ خصوصاً حاصر سعید، اسامہ جمیل اور تاہم یوسف کے انتخاب کیا کہنے۔“

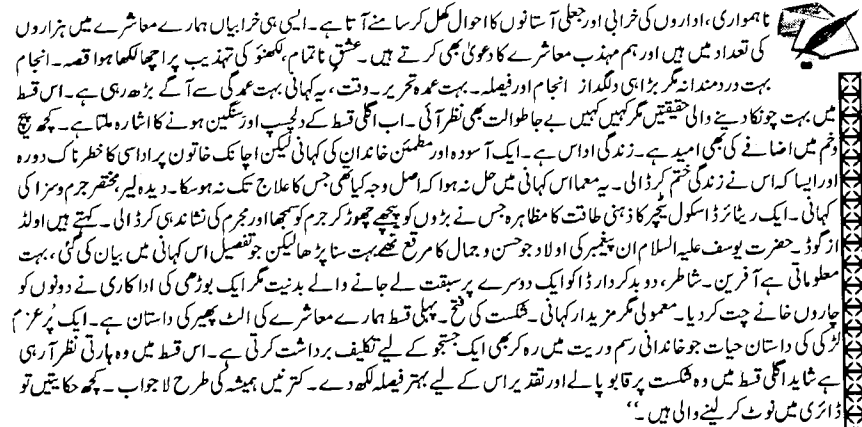
❖ عبدالجبار روٹی انصاری قصور ٹی سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”میڈم سپنس تو محبت کی دیوی لگتی ہیں جس کی ادھ کھلی آکھیں سونے والوں کی طرح گانے والوں جیسی کی بھر پور عکاسی کر رہی ہیں۔ سیاہ گیسو، ہونٹوں پر لالہ خوب صورت چہرہ بس مسروں کے پھولوں کے کندھے پر کھدکھائیے ہاں جی موسم بدل رہا ہے رت پہلے پھولوں کی آ رہی ہے تو پیار و محبت کے رنگ تو ہر منظر آئیں گے نا! حقیقت ہے کہ موسموں کے خوب صورت رنگ تو لیں نہیں کرتے۔ یہ انسان کو احساس دلاتے ہیں اپنی خوشبو سے، اپنے رنگوں سے، اپنی ہواؤں سے بھی حساس دل انسان میں خوب صورت جذبے موجزن ہوتے ہیں کیونکہ یہ سب سچائی پر مبنی ہوتا ہے لیکن اگر انسان کو دیکھا جائے تو یہ موقع پرست ہے اور توکل سے باز نہیں آتا اور جون ایلیا کے مطابق جب وقت اس کے ساتھ ٹول کرتا ہے تو پھر ہر اگل پن کی ہنسی سے رونے پر ہی اختتام ہوتا ہے، پس سبق کیسے کی ضرورت ہے۔ پُر بہار محفل میں خود کو پہلے نمبر پر دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ شکر یہ سپنس ہمارا شامل حال رہتا ہی تیری محبتوں سے ہے۔ حضرت یوسف بھائی بنیامین کو بچانے کے لیے اللہ کے حکم سے خوب راہ نکالتے ہیں اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ ان کی بھرا بھی سبق آموز ہوتی ہے اور پھر حضرت یوسف کا قصہ تو قصص الاحسنین میں سے ہے پھر پیارا کیوں نہ لگے۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اگلے حصے کا شہت سے انتظار ہے۔ محبت و شفقت سے لبریز خوب صورت کہانی سایہ اعلیٰ کی ہے۔ مزہ کا شوہر واپس آیا تو اس پر آ یا ہوا جن بھی کوہ قاف اڑن چھو ہوا جو صرف عامل کا لایا ہوا تھا۔ پھول کا منزہ کی اوک سے پانی پیتا بہت اچھا لگا۔ یہ ہوتی ہیں گاؤں کی محصوم بھینس اور بھر پور شفقتیں جو کبھی نہیں بھولتیں۔ دربان پر قہوی راج نے اپنے وعدے کی لاج بھی خوب نبھائی، بہادر کرناگی نے اس محبت کی راہ ہموار کی جس کی شکستہ دیوی بھی اور پھر یہ دیوی اپنے پتی پر قہوی راج کے ساتھ ہی جل مری۔ پر قہوی راج کی جنگی بہادری اور محبت دونوں ہی زبردست تھیں۔ ایڈیٹر سے بھر پور اور سرگرم جذبات سے معمور رنگ آساں کا پہلا حصہ زبردست رہا۔ سادہ مزاج شوکت کے لیے گھوڑوں کو سنبھالنا تو مشکل نہیں مگر ٹپل آنکھوں والی فرنگی لڑکیوں نے ضرور اسے تحفے میں ڈال دیا ہے۔ اب دیکھو وہ کس کو سنبھالتے ہیں، رینا کو یا کارشا کو رجب آساں کیا کیا رنگ دکھائے گا اگلے حصے میں دیکھیں گے۔ نورالین نے تو متوسلہ قسم کی لڑکی پر لحاظ سے ہی مگر لڑکی ہونے کے ناتے نہیں نہ کہیں جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہے اور پھر اپنے باپ کی وجہ سے اور بھی سہم جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے شاندار کیریئر میں اپنی بیکری کی طرح سست روی آ جاتی ہے اور دوسری سہی کسر فہانے اس کا دل تو ذکر پوری کر دی۔ وہ تو اس کے تا یا با اس کی بھر پور حوصلہ افزائی کر رہے ہیں بھی شکستہ در شکستہ کھانے کے باوجود ثابت قدم ہے۔ شکست کی فتح عمدہ کہانی ہے۔ زندگی قدم قدم پر انسان کا امتحان لیتے ہے۔ علی کو ایک طرف اس کی ماں ملی تو دوسری طرف اس کے شیخ انکلی علی سلطان وفات پا گئے۔ وقت انسان کو آزمائشوں سے گزارتا ہے اور علی جیسا مستقل مزاج اور ثابت قدم شخص ان آزمائشوں سے بھی گزر جائے گا۔ وقت اپنی رفتار سے اچھی جا رہی ہے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون جھکے۔ شاکر اور انیلا عارف پر چوری کا الزام لگا کر بھول گئے کہ عدالت میں جا کر درودھ کا درودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔ سوہ خود ہی مارٹن بن گئے۔ وکیل صاحب کی کہانی بھی عمدہ رہی۔ محفل شعر و سخن سے وزیر محمد خان، شیزا کا شان اور سہیر بیچان ٹاپ پر رہے۔“



❖ رابعہ آفرین، بلوکر نیا زیگ لاہور سے شریک محفل ہیں۔ ”بہت دیر سے دل ہاتھ بائدے ہمارے سامنے کھڑا تھا کہ خدا ار اپنے جذبات شیر کردو۔ سامنے کہتے ہیں کہ دل کی بات دل میں رکھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ آج ہم بھی قفل لب کھول دیتے ہیں۔ (مہربانی جناب کی..... محفل میں خوش آمدید)۔ جون ایلیا کا انشائیہ ہمیشہ میری نظروں کے سامنے اک نئے سبق کے ساتھ آیا اور ہمیشہ مجھے دعوت دیتا آؤ مجھے پڑھ کر بھوار جیتی جو ہر تلاش کر لو۔ ذکر انکل! میں آپ کو کیوٹ کیوٹ سرورق تخلیق کرنے پر مبارکباد بالکل بھی نہیں دوں گی کیونکہ مبارک باد تو غیروں کو دی جاتی ہے اور آپ تو ہمارے اپنے ہیں نا؟ کیوں عذرا آئی، سچ کہنا؟ (جی ہاں بالکل سچ کہا)۔ لوگوں کی زندگی میں سپنس نے بہت اچھا کردار ادا کیا، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کو میں نے زندگی کی سچ حقیقتوں سے نظر فرما ملاتے دیکھا ہے ان ڈائجسٹ کی وجہ سے۔ اس کی زعمہ مثال میری دوست کے دادا ابویں، جن کو پیار اور عزت سے میں خود دادا ابویں کہتی ہوں۔ وہ بہت باہمت ہیں، ان کا جگر بھی پھٹے اور بہت سی اندرونی چیزیں انکلیڈ ہو کر ختم ہونے کے قریب ہو چکی ہیں مگر میری وہ ہمہ وقت سکراتے رہتے ہیں اور کام پر بھی جاتے ہیں وہ صرف اور صرف آپ کے میگزین پڑھتے ہیں اس کے علاوہ کوئی بھی رسالہ نہیں پڑھتے۔ سپنس اور پاکیزہ نے بہت سے لوگوں کی صلاحیتوں کو نہ صرف ابھارا بلکہ انہیں ایک نام، ایک مقام بھی دیا۔ جی الدین نواب کی جتنی بھی تحاریر پڑھیں، وہ لا جواب تھیں کیا ہم دوبارہ ان کے علم و ذوق سے مستفید ہو سکیں گے؟ (جی جناب بالکل محفوظ ہو سکیں گے..... ”سپنس کلاک“ کے عنوان تلے ہم گاہے گاہے خوب صورت کہانیاں دوبارہ شائع کرتے رہیں گے۔ آپ کے خیالات کی ہم قدر کرتے ہیں لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ سپنس کی کہانیوں پر بھی کچھ تبصرہ فرمائیں۔ آپ کو اگر لکھنے کا شوق ہے تو ضرور ہمیں تحریر بھیجیے اگر کہانی میں دم ہوا اور انداز بھی دلچسپ ہو تو ہر سالے میں ضرور جگہ ملے گی ورنہ دوسری صورت میں ہم معذرت کریں گے لیکن..... آپ سے تا ہرگز نہیں توڑیں گے)۔“

❖ عبدالغفور خان ساغری تنک کی ضلع ایک سے آمد۔ ”کچھ مصروفیات کی وجہ سے خط ارسال نہیں کر سکا لیکن جاسوسی سپنس کے ساتھ رابطہ بحال تھا۔ اب بھی کچھ تاثر کمال کر خط ارسال کر رہا ہوں۔ اس ماہ کی کہانی شکست کی فتح بہت زیادہ پسند آئی۔ لکھاری بھی تو جاوید محفل صاحب تھے، ویلڈن۔ اب کچھ ذکر خطوط کی محفل کا۔ عبدالجبار روٹی کو صدارت کی کرسی پر دیکھا مبارک ہو۔ خطوط میں نوک جھوک اچھی رہی۔ اشعار کی محفل اچھی تھی۔ ائمہ نصیر سکھر، ملائکہ حریم کے اشعار اچھے تھے۔ باقی بھی بہتر تھے۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ اس ماہ کا سپنس میڈیو پتھل کے نزدیک انہیسی سے لیا۔ ٹائٹل میں محبت کے رنگ بھر دیے تھے، بہت ہی عمدہ۔ باقی میں اپنی شادی میں میں معروف تھا۔ (ارے واہ بھی مبارک باں جی..... منہ تو ٹھیک کرادیں ہمارا)۔“

❖ محمد خواجہ کورگی، کراچی سے شامل محفل ہیں۔ ”نمبر کا شمارہ آب و تہا۔ کے ساتھ ہاتھ میں ہے۔ سرورق لڑکی کی آکھیں خوب صورت لیکن یاں اور امید کا بر ملا اظہار، ارد گرد دونوں کا کس، یقیناً یہ محبت کی ہی فنون کاری کا اداس پن۔ جون ایلیا کا ایک صفحہ بہت سے رموز و اسرار لیے ہوئے ہے ذرا غور سے پڑھتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں دل میں اضطراب ہے، ہر شخص ملک کے اندرونی خلفشار میں مبتلا ہے۔ کوئی اپنا جرم قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ملک بد سے بدتر حالات، مہنگائی، آمدنی میں کمی کا ہر حربہ استعمال۔ قومی بچت جو لوگوں کی دال روٹی چلا رہا ہے اس پر حملہ، بے پناہ قرض کہاں جا رہا ہے۔ محفل آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کچھ کرئیں سکے۔ لیڈر اتنا بچھا اچھا لگ رہے ہیں کہ صورت تک صاف نظر نہیں آ رہی ہے۔ بیرونی دشمن دیکھ رہے ہیں کہ ہم اپنی موت کا خود ہی سامان کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے ملک خدا داد کے خود ہی دشمن بن بیٹھے ہیں۔ کورگی میں لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ 12 گھنٹے سے 18 تک پہنچ گیا ہے۔ بجلی کے بلوں میں ہزاروں روپے کا غیر ضروری اضافہ لگا رہے ہیں میرے محل میں خرچ کے علاوہ 32 ہزار روپے علیحدہ ہے لگا کر 260 پونٹ کا کل 36 ہزار سے زیادہ کا بیجھا گیا۔ کے الیکٹرک کوئی وجہ بتانے سے قاصر۔ اتنی زبردست لوڈ شیڈنگ کے بعد کیا میٹر خود بخود چلتا رہے گا؟ آخر مجھے وفاقی تنصیب کی مدد لینی پڑی اتنے پاؤں پیلے کے بعد کے الیکٹرک کے خلاف فیصلہ آیا۔ اتنا ظلم اتنی نا انصافی۔ پچھلے دو ماہ سے دوستوں کی محفل سے دور رہا لکھنے کا وقت نہیں اور ڈپریشن کی انتہا رہی۔ دوستوں میں عبدالجبار روٹی انصاری کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ باقی خطوط بھی کم نہ تھے۔ دربان، تاریخی کی دلرہ انگیز داستان سے بہت سی معلومات ملیں۔ اعلیٰ طرف، واقعی یہ کہانی ایک اعلیٰ ظرف و جوان کی ہے جس کی سچ بیانی نے ہوتا ہوا شریک ختم کرداد یا ورنہ آج کل رشتوں کے لیے ایک جھوٹ کا طوفان نظر آتا ہے جو آخردو خاندانوں کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔ اس کہانی میں لڑکی کے والد کا فیصلہ مجھے غیر موزوں لگا۔ باقی ان کی سوچ۔ رنگہ آساں، بڑی محسوس آمیز اور سنسنی خیز سیریل، آگے اور بھی دلچسپی کا قہقہہ ہے۔ محبت رنگ نسل غلامی آزادی نہیں دیتی۔ محبت کا انجام اچھا نکلے۔ غلط فہمی، بڑی منفرد کہانی۔ وہ علیحدہ ہونے والے لوگ ایک عجیب حادثے سے دوچار ہو کر پھر ایک ہونے پر راضی، کہانی کا تسلسل بہت اچھا لگا۔ مارٹن۔ وکیل صاحب کا ایک اور عظیم کارنامہ۔ ایک بددیانتی پر شروع ہونے والا لہجہ صرف بیک صاحب نے ہی اس کو اس طریقے سے نبھادیا۔ معاشرے کی



۱۴ اور لیس احمد خان ناظم آباد کرنا بھی سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”سپنسز ڈائجسٹ موصول ہوئے ہی اب انتظار نہیں ہوتا ہے۔ تاہم بے دل بڑھ جاتی ہے۔ سارے ضروری غیر ضروری کام پر طرف صرف اور صرف ڈائجسٹ کا ہی مطالعہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا کچھ کچھ نہیں ہے منہ سے۔ کافر لگی ہوئی۔ لوہر کا ڈائجسٹ خوش رنگ سرورق کے ساتھ ذکر صاحب کے ہنر کو واضح کے ہوئے تھا۔ انشا پر بھی بے مثال تھا پھر ناموں پر نظر پڑی تو سر فہرست عبد الجبار رومی انصاری نظر آ رہے تھے۔ مبارک باد۔ دیگر نئے پرانے دوست بھی میر پور حاضری لگا رہے تھے۔ تبصرے کی پینڈ پینڈ کی پردہ ستوں کا شکر ہے۔ اس کے بعد تاریخی کہانی دربان پریمی تاریخ سے آگاہی حاصل کی پھر منظر امام کی اعلیٰ طرف پریمی۔ منظر امام صاحب کی ہر کہانی دل پر اثر کرتی ہے اور دیر تک اثرات رہتے ہیں۔ اس کے بعد سلسلہ اور کہانی رنگ۔ سماں پریمی۔ کہانی بعد وجد آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی خوب صورت کہانی ہے۔ امید ہے اپنے اختتام تک دلچسپی برقرار رہے گی۔ بدلائیے ایضاً انداز میں لکھی گئی کہانی تھی۔ عشق کا تمام پرانی قدروں اور وضع داری کو نبھانے کی روایات پر بڑی اچھی کہانی تھی۔ شعر و سخن کی تحف میں بھی ایچھے اور منتخب اشعار نے بہت محفوظ کیا۔ محمد الیاس کی سہا بھی اچھی لگی۔ اس کے بعد حسام بیٹ صاحب کی دقت سلسلے دار کہانی بڑی کامیابی سے جاری ہے اور دلچسپی کا عنصر ہے۔ ذکر شیر شہر سید کی کہانی زندگی اداس ہے ہمیشہ کی طرح پیچھا سڑتی کہانی تھی۔ دو دیدہ دلیر بہتر تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان حیات بھی جاری ہے جس نے دل کو روشنی سے منور کر دیا ہے۔ بہت تفصیل سے حالات لکھے گئے ہیں۔ شاطر بھی دلچسپ کہانی تھی جس میں ہمارے چوروں کو بھی مات دے دی اور استادوں کے استاد کو بھی چاروں خانے چت کر دیا۔ راجہ بھی مند دیکھتا رہ گیا۔ آخری صفحات کی کہانی ہلکتی کی فتح طاہر جاوید منیل صاحب کی کہانی حاصل مطالعہ دہی، بہت خوب صورت کہانی ہے۔ امید ہے آگے بھی دلچسپی جاری رہے گی۔ کتر نہیں بھی اچھی لکھیں۔ (سپنسز سے پیار بھر انا بتا برقرار رکھنے کا شکر۔)۔“



✽ انجم فاروق ساحلی کی لاہور سے شرکت۔ ”سینس آج بھی کنگ ڈائجسٹ ہے۔ ٹائل خوش رنگ اور دروانی تاثر پر مشتمل ہے لیکن اس بار ڈاکر صاحب نے نزاکت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سینس نے اپنے اجراء سے لے کر آج تک بہترین معاشرتی کہانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اسی کے آئینے سے جھانکنا دربان کا عکس خوب ہے۔ فہرست میں باغی بھر دار رسول کے نام کے نیچے آپ کا نام شائع کر کے آپ کے اور پرچے کے وقار میں اضافہ کیا گیا۔ (شکریہ)۔ اعلیٰ ظرف اچھی کاوش ہے۔ اختتام خوب تھا۔ غلطی کا محفل بھر پور اور دلچسپ تھی۔ ریاض بٹ صاحب کا خط خوب ہے۔ صادق معاذ یہ جانچہ بے قائل قدر ہے۔ رنگب آسان اچھی تحریر ہے۔ شاطر، دیوقامت، گھیراؤ اچھی تحریریں ہیں۔ ٹارگٹ اپنے مخصوص انداز میں خوب تھی۔ عداوتی کارروائی دیکھی ہے بھر پور تھی۔ فکسٹ کی فتح خوب صورت تحریر ہے۔ سازش اور غلطی متاثر نہ کر سکیں۔ سایہ، عشق ناقام، بدلہ اور زندگی اداس ہے انہی زیر مطالعہ ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام ایمان افروز کاوش ہے۔ محفل شعر و سخن میں بھی قارئین نے دلچسپی اور اشتیاق سے اپنی ذوق مندی کا ثبوت دیا۔ وقت تیزی سے اپنے نقوش ثبت کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ (پندرہ کی کا شگریہ۔ آپ کی تحریر انہی زیر غور ہے)۔“

✽ ریاض بٹ حسن ابدال سے شامل محفل ہیں۔ ”سرورق کی حین کی مسکراہٹ ماننے کی خشک چمک بھی لگی۔ (یہ کیا بات ہوئی جناب)۔ خیر آگے بڑھے۔ جون ایلما کے انٹرایٹے خول پر نظر پڑی ہمیشہ کی طرح سید عادل میں اثر گیا۔ جیسے لفظ بہت کچھ سمجھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے اپنے غفلوں کی محفل میں۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی کا احساس ہوا۔ کرسی صدارت پر عبد الجبار رومی انصاری بیٹھے ہیں۔ مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ میر حاصل اور خوب صورت لفظوں کا مرقع ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتے تھے خوب کہا ہے۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ ہے۔ محمد صفر معاذ کا تبصرہ بھی ان کے کہنے شوق قلم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ رمضان کا شاکا کافی پرانے تبصرہ وقار ہیں۔ ان کے تبصرے بھی محفل کی جان ہوتے ہیں۔ سبکی بات زیر آفریدی، بہن کے لیے بھی ہے۔ اوشا راگھی میرے شورے پر ٹل کر نے کا شکریہ۔ باقی لوگوں کے تبصرے بھی قابل غور اور قابل تحریف ہیں۔ علی اختر کی تاریخ کے اور اقر سے شک کر دہ کہانی دربان ایک خوب صورت کہانی ہے۔ محبت، محبت ہوئی ہے جو اپنا آپ منوائے ہے۔ جھکتا ہے محبت کی۔ اس کو نہا رکھ دیا اور آخر میں ان کی راگھی ایک ہوئی اور ان کی کہانی تاریخ کے اور اقر میں امر ہوگئی۔ منظر اہام کی چھوٹی سی کہانی اعلیٰ ظرف بہت کچھ کہہ گئی۔ محبت کی جس عمارت میں اعتماد کا سینٹ نہ ہو وہ حالات کے ایک ہی جھٹکے سے کسی وقت بھی دھڑا سے زمین بوس ہو سکتی ہے۔ تویر ریاض کی سازش اس بار ڈاکر سے لائق تھی جیسا کہ کسی سائے کا قول ہے کہ آپ اپنے بچوں کی خاطر دنیا کو کلوے کلوے کر سکتے ہیں۔ اسی طرح والدین کے درمیان غلطی کو دور کر کے بچہ اپنے والدین کو غلامی میں لے سکتا ہے۔ شرمعاس کی کہانی غلطی میں سبکی ہوا۔ پرچے میں حقیقت کے رنگ اچھے لگتے ہیں۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی ٹارگٹ بھی ہمارے معاشرے کی عکاس کہانی ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے روایتی داؤ پیچ سے جعلی اور ڈباہر کو چاروں خانے چت کر دیا۔ جو بندہ جرم بھی کرتا ہے وہ بے شک نیک نیت ہے یہ کام کرے لیکن جس بندے کو قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے اس کا ٹوکو کی تصویر نہیں ہوتا پھر قانون جب حرکت میں آتا ہے تو مرزا امجد بیگ صاحب جیسے وکیل دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتے ہیں۔ شاکر لطیف کی کہانی شاطر بھی ایک چوکا دینے والے انجام کی کہانی ہے۔ کچھ کا حفظ ناقص طور پر کیے جاتے ہیں پھر میر کو سوا سوا ریل کو بدلنا ضرور ملتا ہے۔ ہمارے انسانی کومات بلکہ شہادت دے دی جو اپنے آپ کو بہت کایاں اور عقلمند سمجھتا تھا، ویلڈن..... رضوانہ ساجد کی حضرت یوسف علیہ السلام کی چھوٹی قطع بھی ایمان کو تازہ کر رہی ہے۔ یہ قصہ جتنی بار پڑھیں اپنا تاثر ضرور چھوڑتا ہے۔ محفل شعر و سخن کی محفل خوب سبکی ہوئی ہے۔“

✽ پرویز احمد لاٹکا حیدر آباد، جامشورو سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”آج کل چھٹیوں پر پاکستان آیا ہوا ہوں تو بس ہر طرف دیس کی خوشبو بھی محسوس ہو رہی ہے۔ گھر والوں اور دوستوں سے ملاقاتیں تو ہو رہی ہیں لیکن میری اصل خوشی کا سبب بنی ہے کراچی یا تڑا۔ پچھلے دنوں میں نے بڑے ڈی پی کے معروف رانز حضرات سے ملاقات کی۔ یقین کریں آپ کے توسط سے پیدا ہونے والی یہ محبتیں اور ملاقاتیں اتنی خوشی سے سرشار کر چکی ہیں کہ یادوں کا جیسے خزانہ اٹھا ہو گیا ہو۔ سینس کے تازہ شمارے کا خصوصی انتظار تھا کیونکہ محفل صاحب کی آمد کی اطلاع پاکیزہ میں آئے اشتہار سے مل چکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ آئے، انہوں نے دیکھا اور ہمارے دلوں کو فتح کر گئے۔ جاری ہے دیکھ کر بڑا غصہ آیا لیکن بی گنے کی فکسٹ کی فتح کا اگلا حصہ بھی توڑ جاتا ہے۔ وقت واقعی ایک یادگار ترین سلسلہ ہے۔ حسام بٹ صاحب اپنی صلاحیتیں وکیل یا باور پولیس یا پورے مضامین کر رہے تھے۔ (صلاحیتیں بھی ضائع نہیں جاتیں وہ بھی اپنی ایک انگ کاوش ہے)۔ یہ قطعہ غموزی سولگی لیکن امید ہے کہ اعلیٰ بار بٹ صاحب ایکشن اور ہنگاموں کو کراچی کی سڑکوں پر لے آئیں گے۔ قبول جملی کا کردار حیرت کا باعث ہے اور دیکھتے ہیں کہ اس کی پیش گوئی پر اب ویلڈن یا شادو میں سے کون سا نئے آتا ہے؟ نا صرف ملک بھی طویل عرصے سے غائب ہیں۔ ان کو بھی تلاش کر کے لے آئیں۔ چھوٹی کہانیوں میں منظر اہام چھانگے۔ سازش، دیوقامت اور دیدہ دلیر بھی بہترین تراجم تھے۔ انیم الیاس کی سایہ دل پر گہرا اثر چھوڑ دینی اور مزہ ہی آگیا۔“

✽ محمد زریان سلطان اردو بازار کراچی سے چلے آ رہے ہیں۔ ”عرصہ ہوا سینس سے نانا جوڑے مگر اب کبھی شریک محفل

سوشل میڈیا قارئین کے لیے اہم اطلاع

سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ادارے کی کوئی OFFICIAL WEBSITE نہیں ہے۔ جو ایڈمن اپنی WEBSITES پر آڈیشل کالفاظ استعمال کر رہے ہیں، اسے فوری ترک کر دیں تاکہ قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ بصورت دیگر ادارہ سائبر کرائمز ایکٹ کے تحت کارروائی کرے گا۔

بھی ہو جاتے ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے اپنا خط دیکھ کر۔ نوبر کا شمار بھی ہمیشہ کی طرح لا جواب رہا۔ دربان تاریخی کہانی نے دل جیت لیا۔ بہت اچھی رہی۔ وقت کی رفتار اگرچہ رسی مکر وقت جیسا بھی ہو کر رہی جاتا ہے۔ لہذا اسے بھی پڑھ لیتے ہیں دیے حسام بٹ صاحب برائے مہربانی وقت کی رفتار غموزی تیز کر دیں تو کہانی کا مزہ دو بالا ہو جائے۔ نیا سلسلہ رنگب آسان پڑھاؤ مختلف انداز میں شروع ہونے والی یہ نئی داستان دیکھنے کے چل کر کراچی اختیار کرتی ہے۔ لہذا اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے ہم مرزا امجد بیگ کی جانب بڑھ گئے جنہوں نے اپنے مطلوبہ ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لیے دلائل اور ثبوتوں کا انبار لگا دیا اور عدالت کے کٹھنرے میں دشمن کے جیسر اکھاڑ دیے۔ ویلڈن، ڈاکٹر شہزاد سید کے تو کیا ہی کہنے..... ہمیشہ کہانی ختم کرنے کے بعد بھی کافی دیر تک ایک سرسلاطاری رہتا ہے اور دل و دماغ کہانی کے پیچ و خم میں ہی الجھتا رہتا ہے۔ زندگی اداس ہے اس بار بھی ایسی کہانی ثابت ہوئی۔ ظفر اقبال ظفر کی کہانی عشق ناقام نے تو اس بار چوکا دیا۔ بہت خوب صورت تحریر۔ احساسات و جذبات کی دلنشین عکاسی۔ محمد الیاس کی سایہ نے بھی ایک اچھا تاثر چھوڑا۔ انسان جب بھی قدرت اور فطرت سے دور جھانکتا ہے کسی نہ کسی مصیبت میں ضرور گرفتار ہو جاتا ہے۔ سبکی حال منزہ کا بھی ہوا مگر بے جاری جعلی پیر فقیری کے ظلم و ستم کا شکار ہوئی جبکہ اصل خطا دار اس کا شوہر تھا جس کی وجہ سے منزہ کو کوئی اذیت سہی پڑی۔ تویر ریاض کی سازش اور شاہ زین رضوان کی بدلہ نے بھی بہت متاثر کیا۔ ویلڈن۔ آخری صفحات کی کہانی فکسٹ کی فتح کے تو کیا ہی کہنے۔ طاہر جاوید محفل کا انداز ہی اتنا سحر انگیز ہوتا ہے کہ موضوع کوئی بھی ہو۔ دل پر ضرور اثر کرتا ہے۔ اس بار بھی خواتین کی اہمیت عزت اور صلاحیتوں پر بہت شاعرانہ اثر ہے۔ اب دیکھیے اگلے حصے میں کیا ہوتا ہے کیونکہ آخر میں جاری ہے نے ہمیں منہ چاڑھا تھا۔ بہر حال۔ شاکر لطیف کی شاطر کہانی بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہوگئی۔ اب پرانے معصفت کے ساتھ ساتھ نئے رانز کو بھی مل جاتی ہے یہ بھی ایک اچھا قدم ہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ضروری ہے کیونکہ آنے والے کل میں جانے کون بڑے فکسٹ کے حلیت سے اپنا لوہا منوالے۔ ویلڈن۔ (بہت شکریہ جناب آپ کے زیر خیالات کی ہم قدر کرتے ہیں۔ سینس کی تحریروں سے آپ محفوظ ہوئے یہ جان کر ہمیں بھی اچھا لگتا ہے اور سبکی بات ہمیں حیرا چھا کام کرنے پر کاشانی ہے)۔“

✽ اوشا راگھی مٹھی سندھ سے۔ ”18 اکتوبر کو سینس ڈائجسٹ کے درشن ہو گئے تھے مگر تہوار کی تیاری اور گہما گہمی کی وجہ سے پڑھ نہ پائے۔ 19 اور 20 اکتوبر کو ہمارا دیوالی کا تہوار بہت زبردست اور خوشگوار گزرا (مبارک ہو)۔ ہماری اس خوشی میں ہماری کافی مسلم فرینڈز بھی شامل ہوئیں اور خوشیوں کو دو بالا کیا۔ اس طرح سینس ڈائجسٹ کی ٹائل گرل بھی بہت خوش رنگ پکڑوں میں ہمارے تہوار میں شرکت کرنے آئی تھی۔ تبصرے سب کے بہترین تھے سرسری طور پر پڑھ پائی ہوں تمام تبصرہ وقار جنہوں کی پرواز پر تھے۔ ویلڈن۔ طاہر جاوید محفل کی فکسٹ کی فتح، دل کو بہت بھائی۔ عین انور اور ذوالقرنین کی داستان محبت آگے پتانیں کیل میٹھ لے گی۔ انتظار رہے گا۔ رنگب آسان اسے آرا رانچت کی داستان کافی اچھی لگ رہی ہے۔ داستان کا محول اور ٹیپو بھی متاثر کن ہے۔ رینا اور شوکت سے شروع یہ کہانی اب کس پر ختم ہوگی۔ دوسری طرف ریحان اور شاہ زمان کا ٹولہ بھی اپنے مشن پر پہنچ کر پتانیں کیا کا نامہ انجام دے گا۔ رات کا گھر بڑوں کے خیمے کے باہر گر بیلی (Grizzly) کی موجودگی..... سب خیر ہو۔ دوسری قطع کا شہادت سے انتظار ہے۔ علی اختر کی کہانی دربان تو اسے دن رہی بہت ہی دلچسپ اور لا جواب داستان رہی۔ پرتھوی رانج میرانیوٹ کردار ہے کہ کم تو جھگڑتا بھی نہیں کئی اپنے دربان جتنی کے ساتھ تھی تو بھی ان کی لازوال محبت۔ خالد عباس کی مصوری بھی بیٹ ہے۔ مراسلے چہرہ بٹ رہے اور محفل شعر و سخن کا تو جواب نہیں ویلڈن اشعار کے سلیکشن کے لیے۔ تینوں اعزازی اشعار کے علاوہ، وزیر محمد خان، ریاض بٹ، محمد قدرت نیازی، ناہید یوسف، سعدیہ ریحان اور اسد خان کے انتخاب بہت اعلیٰ آفریں تھے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے

صباحہ کراچی۔ وسیم احمد، ملتان۔ عامر خان، کوئٹہ۔ اقبال احمد، کراچی۔ نازنین بشیر، سکھر۔ فرحانہ عامر، سرگودھا۔ شاہین کلہیل، فیروز آباد۔ ریحانہ کریم، لالہ موٹی۔

نوشتاتحاد

ڈاکٹر ساجد امجد

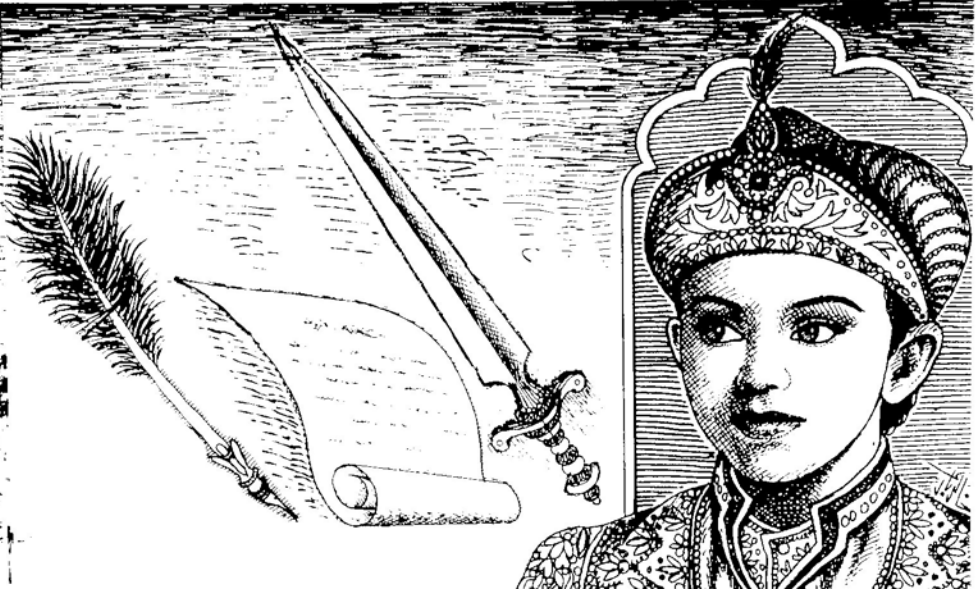
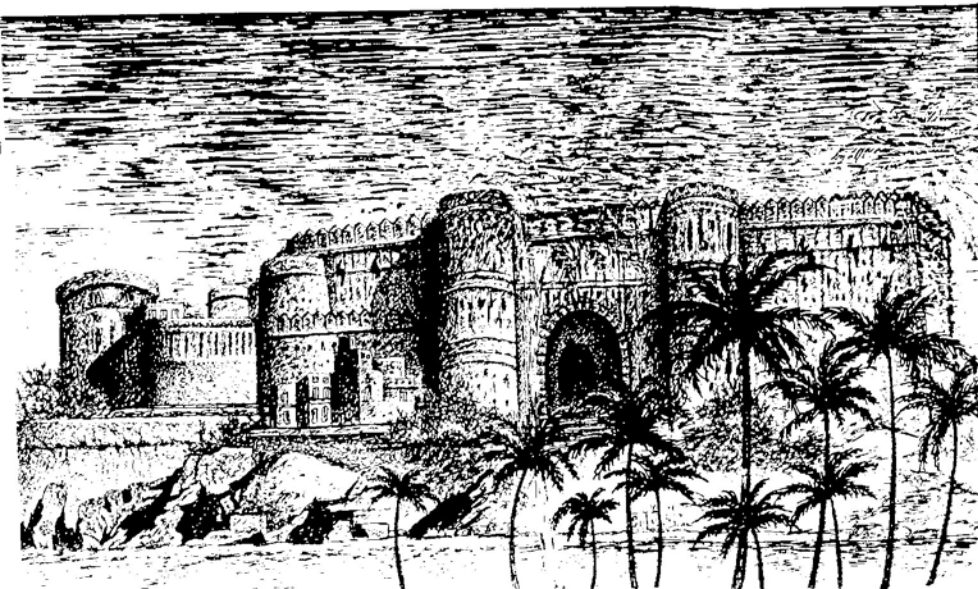
انفرادی طور پر پرگزر المحہ اپنے دامن میں کوئی نہ کوئی یاد سمیٹ لیتا ہے مگر جب یہ لمحات کچھ خاص ادوار میں ڈھل جاتے ہیں تو اس پورے عہد کے بے شمار واقعات کسی داستان کی صورت آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ برہان نظام شاہ اور دیگر اہم کرداروں پر مشتمل زیر نظر تحریر اپنی مکمل جزیات کے ساتھ کئی رازوں اور گمشدہ گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جنگی حالات ہوں یا محلاتی سازشیں صاحب اقتدار کی تدبیروں اور کاوشوں کا حال اور جستجو کا رنگ ایک جیسا ہے۔ اسے بھی کم عمری میں جب تخت شاہی ملتا تو اس کے مصاحبین کی ہوس اور طمع نے اپنے پنجے کچھ طرح پھیلائے کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔۔۔ کہ یہی انجام بالآخر پر بادشاہ اور صاحب اقتدار کا ہوتا ہے۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

حرم سرا کے کدوؤں میں لگے قد آدم آئینے سنسان پڑے تھے۔ نکلی، چوٹی، مٹی کچھ بھی تو نہیں تھا۔ بیک، جھومر، لنگن کچھ بھی تو نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیوں۔ تخت ابھی نابالغ تھا۔ سات سال کا بچہ برہان نظام شاہ احمد نگر کے تخت پر جلوہ گر ہوا تھا۔ وہ گود میں بیٹنے کے لائق تھا، بھانے کے لائق نہ تھا۔ حرم سرا عورتوں سے بھرا ہوا تھا مگر عورتوں کی تعداد برہان نظام شاہ کے باپ کے زمانے میں مع ہوئی تھی۔ برہان نظام شاہ کی عمر کا تقاضا تھا کہ وہ اس تعداد سے بے خبر رہے۔ حرم سرا میں موجود عورتوں کے لیے یہ صورت حال مایوس کن بھی تھی اور تکلیف دہ بھی۔ مسلسل سکوت تھا جو حرم سرا کی دیواروں پر طاری تھا۔ دل بہلانے کے لیے کچھ نوجوان شوخ عورتوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ تھی جس میں دن گزر رہے تھے۔

اس افسردہ ماحول میں عاتق تھی جس کے قدم پچھلے دو دنوں سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کے کپڑوں کا صندوق مسلسل کھلا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک جوڑا بدل کر دیکھ رہی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر زاویے بدل بدل کر مٹی کا یور ہوٹوں پر سجا رہی تھی۔ یہ احتیاط بھی کر رہی تھی کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ انداز اپنا آئینے میں دیکھتے ہیں وہ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو کوئی دیکھے نہ دیکھے۔ اس کی عزیز ترین سہیلی کلنار اس کی اس تبدیلی کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ آخر کلنار سے

رہا نہیں گیا۔ عاتق فوراً بے کے نزدیک اپنے خیالوں میں گم رہی تھی کہ کلنار بھی وہاں پہنچ گئی۔
”عاتق..... یہاں ایکلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“
”اب کہاں آگئی ہوں۔ تم جو یہاں بیٹھی ہو۔“
”میں تو اب یہاں آئی ہوں۔ تم تو کئی دن سے مجھ سے کترا رہی ہو۔“
”میں تم سے کیوں کتراؤں گی۔ ایک تم ہی تو میری سہیلی ہو۔ وہ وہاں تو یہاں کے سازشی ماحول سے بچ رہی ہوں۔“
”تم کئی دن سے بیٹے سنورنے میں مشغول ہو۔ خیریت تو ہے..... کہیں ایسا تو نہیں کہ برہان نظام شاہ وقت سے پہلے بالوغ ہو گئے ہوں؟“ کلنار نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔
”کلنار! تو بڑی حرافہ ہے۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔“
”لو، اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ مجھے تو یہ دکھ ہے کہ ہم بے چارے برہان نظام شاہ کے کام نہیں آ سکتے۔ کیا تجھے افسوس نہیں ہوتا کہ ہم بچرے میں بند قیدی کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ کہیں آتا نہ جاتا۔ برہان نظام شاہ آتا بھی ہے تو اپنی ماں سے لگا بیٹھا رہتا ہے۔“
”کیا کیا جائے نظام شاہ۔ بحری کی کوئی جوان اولاد تھی ہی نہیں۔ وصیت کرتا تو کس کے لیے۔ اس نے برہان نظام شاہ کو ولی عہد مقرر کر کے تمام امراء سے اطاعت و وفاداری کے وعدے لیے۔“



”تیرے خیال میں یہ امراء اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ ملکی معاملات صحیح طور پر چلا رہے ہیں۔“

”ہمیں ان معاملات سے کیا سروکار۔ امراء جانیں اور ان کا کام۔“

”اب اتنی بھولی بھی مت بنو۔ میں نے تو سنا ہے رومی خاں، کرم خاں وغیرہ اس بندوبست سے خوش نہیں ہیں اور مکمل خاں دکنی سے حسد رکھتے ہیں جو برہان نظام شاہ کے نام سے سلطنت چلا رہا ہے اور ملکی و مالی معاملات پر قبضہ کیے بیٹھا ہے۔“

رومی خاں کا نام آتے ہی عائشہ کا دل حلق میں آ کر انک گیا۔ وہ بھی راز کھل گیا۔ گنار کو کہیں سے سن گئی تھی لیکن اس نے اپنی کسی کمزوری سے اسے تقویت نہیں دینے دی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”تو یہ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ مجھے تو جڑ ہوتی ہے ایسی باتوں سے۔“

”اچھا بیٹھ تو سہی۔ کچھ اور باتیں کر لیتے ہیں۔“

”نہیں، اب میں چلوں گی۔ شہزادہ راجا جیوسور ہاتھا تو مجھے اتنی فرصت مل گئی۔ اب وہ اٹھ گیا ہوگا ذرا راجا کر اسے دیکھوں۔“

عائشہ نے زیادہ بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اٹھ گئی۔

وہ فوارے کے نزدیک سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی تو سرے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ شہزادہ راجا جیو کی والدہ کمرے میں موجود تھیں اور کافی پریشان نظر آ رہی تھیں۔

”عائشہ! کہاں چلی گئی تھیں۔ شہزادہ سو کر اٹھ گیا ہے۔ اگر اپنے آپ کو کوئی نقصان پہنچا لیتا تو جانتی ہے کیا ہو جاتا۔“

”میں ابھی گئی تھی، ابھی آگئی۔“

”بچی تو پوچھ رہی ہوں کیوں تھی۔ اگر گئی تھی تو شہزادے کو ساتھ لے کر جاتی۔“

عائشہ کی یہ حیثیت نہیں تھی کہ وہ ہر بات کا جواز پیش کرتی۔ اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی اور آگے بڑھ کر راجا جیو کو گود میں اٹھا لیا۔

راجا جیو، برہان نظام شاہ کا چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر ابھی صرف چار سال تھی۔ عائشہ شہزادے کی دایہ می یعنی شہزادے کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری تھی۔

”آئندہ مجھے شکایت نہ ملے۔“ راجا جیو کی والدہ

نے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد عائشہ نے شہزادے کو گود سے بچنے اتار دیا اور آنے والی رات کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ یہاں سے کیسے نکل سکتی؟ راجا جیو کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جائے گی؟ بات ایسی بھی نہیں کہ کسی کو ہمارا بنا سکے کسی سے مدد لے سکے پھر ایک حل اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اپنی جگہ اگر گنار کو سلا جائے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خوش ہو گئی لیکن فوراً ہی اپنے خیال کی تردید بھی کر دی۔ گنار یہ ضرور پوچھے گی کہ میں کس سے ملنے اور کہاں جا رہی ہوں۔ اگر میں اس وقت چھپا بھی لوں تو کسی وقت یہ راز کھل ہی جائے گا۔ میری کمزوری اس کے ہاتھ آ جائے گی۔ وہ اس کمزوری کو کسی وقت بھی استعمال کر سکتی ہے۔ پھر میں کیا کروں؟ اسے اب ایسی انجمن تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے۔ تبھی ایک لمحے کو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ جانا ہی ملتی تو کروں لیکن اس پر لاچار غالب آ گیا۔ پھر میں کیا کروں؟ ایک خیال نے اس کے بدن میں تازہ روح پھونک دی۔ میں بیمار بھی تو ہو سکتی ہوں۔ اس نے اپنا دھننا اپنے سر پر باندھ لیا اور لیٹ گئی۔ راجا جیو اس کی اس ہیئت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے؟“

”ہاں۔ شاید آپ کو آج رات اپنی والدہ کے ساتھ سونا پڑے۔“

”نہیں۔ میں وہاں نہیں سو سکتا۔“

”آپ کو اپنی بوا کی تکلیف کا خیال نہیں؟“

”آپ حکیم فتح اللہ خاں کو بلا کر ان سے دوا کیوں نہیں لیتیں؟“

”تھوڑی سی تکلیف کے لیے انہیں کیا زحمت دوں۔“

”جب تھوڑی سی تکلیف ہے تو امی حضور کو کیوں زحمت دے رہی ہیں؟“

”ایک تو آپ باتیں بہت کرتے ہیں۔ جو ہوگا تھوڑی دیر میں فیصلہ کروں گی۔“

”جی بہتر۔“

محصور راجا جیو کی بات عائشہ کی سمجھ میں آ گئی۔ اسے حکیم فتح اللہ خاں کو بھی گواہ بنالیتا چاہیے۔ اس نے اپنی ملازمہ چپا کلی کو بلا دیا۔

”ذرا دوڑ کر حکیم صاحب کو تو بلا کر لے آ۔“

”ان سے کیا کہوں؟“

”کہنا سر میں درد ہے۔ وہ اگر دوا دیں تو مت لیتا۔“

اصل دلیری

ایک بادشاہ نے میدان جنگ میں سپاہی کی دلیری پر خوش ہو کر انعام و اکرام دیا اور پوچھا۔ ”حمر میں سب سے دلیری کی بات تم نے کون سی کی ہے؟“

”عالی جاہ۔“ سپاہی نے دست بستہ عرض کیا۔ ”میں نے بارہ سال اپنی بیوی کے ساتھ گزراہ کیا ہے۔“

کوئی بات نہیں تھی۔ زرباز خاں اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی اس کے چہرے پر اطمینان آ گیا۔

”میں نے رومی خاں تک آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اس کے آدی اب تک اس مقام پر پہنچ گئے ہوں گے جہاں تک آپ کو پہنچا کر میرا کام ختم ہو چکا ہوگا۔ واپسی میں آپ کو خود ہی حرم سرا تک پہنچنا ہوگا۔“

”میں خود کیسے آؤں گی؟“

”جس خفیہ راستے سے میں آپ کو لے جاؤں گا، آپ اسی خفیہ راستے سے واپس آ جائیے گا۔“

”میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک چکر اپنے کمرے کا لگا لوں۔ پھر واپس آتی ہوں۔“

عائشہ اپنے کمرے میں آئی۔ کچھ دیر بناؤ سنگھار میں مصروف رہی پھر بستر کو اس حالت میں تبدیل کر دیا جیسے کوئی سو رہا ہے۔ چند کپڑے رکھ کر اوپر سے ایک موٹی چادر ڈال دی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا کر دیا اور باہر نکل آئی۔

زرباز خاں تیار کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دیں اور عائشہ کو لے کر حرم سرا سے باہر جانے کے لیے آگے بڑھا۔ آخری دروازے کے قریب ایک بوڑھی عورت سامنے آ گئی۔ وہ بڑی بے ہودگی سے ہنس رہی تھی۔ عائشہ نے اپنے کپڑوں میں چھپائی ہوئی چاندی کی چندا شرفیاں اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ عورت کی ہنسی ہونٹوں میں رہ گئی اور اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

اس حرکت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس قسم کے واقعات یہاں اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ حرم سرا کی عورتیں امراء کے پاس اکثر جاتی رہتی ہیں۔

زرباز خاں عائشہ کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ یہاں اندھیرا ضرور تھا لیکن ایسا راستہ بھی تھا کہ تیزی سے چلا جاسکتا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک گھنے درخت کے نیچے

انہیں بلا کر لانا اور اگر ہو سکے تو راجا جیو کی والدہ کو بتاتی ہوئی حکیم صاحب کی طرف جاتا۔“

چپا کلی دوڑتی ہوئی گئی اور تھوڑی دیر میں حکیم فتح اللہ خاں تشریف لے آئے۔ عائشہ سر پر پٹی باندھے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب نے بغض دیکھی۔

”کیا آپ کے سر میں واقعی درد ہے؟“

”میں آپ سے غلط بیانی کیوں کروں گی۔“

”ہاں، یہ بھی ہے۔ بہر حال میں دوا دے رہا ہوں۔ اسے کھالیں، صبح تک درد چلا جائے گا۔“ حکیم فتح اللہ خاں رخصت ہوئے تھے کہ چپا کلی آ گئی۔

”اماں حضور فرما رہی ہیں کہ شہزادہ حضور کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ ان کا آج آپ کے پاس سونا ٹھیک نہیں۔ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔“

تیرنشا نے پرگنا تھا۔ شہزادے کو خود اس کی والدہ نے طلب کر لیا تھا۔ یہی وہ جاہتی بھی تھی۔ اس نے اسی وقت شہزادے کو اس کی ماں کے پاس بھیج دیا۔ اب اسے رات کے وقت یہاں سے نکلنے کا بندوبست کرنا تھا جس کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ اسے اسی وقت زرباز خاں سے ملاقات کرنی تھی جو حرم سرا کا انچارج تھا۔ اس سے ملنا مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ بات ہو چکی تھی۔

بات یہی اٹھی تھی کہ وہ زرباز خاں کے سوا کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔ زرباز خاں اس کا رشتہ وار تھا۔ اس کے باوجود اس نے زرباز خاں کو پوری بات نہیں بتائی تھی۔

اسے چند روز پہلے رومی خاں کا پیغام ملا تھا کہ وہ کسی روز موقع دیکھ کر اس سے ملاقات کرے۔ عائشہ نے اس پیغام کا نہ جانے کیا مطلب لیا۔ اس نے اپنی دانست میں یہ سمجھا کہ رومی خاں جیسے دولت مند امیر کی نگاہ التفات اس کی طرف ہو گئی ہے اور اب اس کے دن پھرنے والے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے میں حق ہے۔ جانب تھی کہ جب تجت پر سات سالہ بچہ جلوہ افروز ہو تو حرم سرا کا امراء کی گرفت میں آ جاتا انا زمی ہے۔ اس کی مثال گنار کی شکل میں اس کے سامنے تھی جسے ایک امیر میاں جمال الدین نے اپنی خلوت میں طلب کیا تھا۔ رومی خاں نے اسے طلب کیا تھا اس کے لیے یہی بہت تھا۔ اس نے سر کی پٹی اتاری، حکیم صاحب کی دی ہوئی دوا ایک کونے میں چھپائی اور زرباز خاں سے ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔

حرم سرا کی خواتین زرباز خاں سے اپنے مسائل کے سلسلے میں اکثر ملاقاتیں کیا کرتی تھیں اس لیے خطرے کی

دو فائدے

مقدمہ نگاری کی پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی پڑھا لکھا ہو۔ اسی لیے بڑے بڑے مصنف بھاری رئیس دے کر اپنی کتابوں پر پروفیسروں اور پولیس سے مقدمے لکھواتے اور چلاوتے ہیں اور حسب فضا دہائی کے ساتھ بری ہوتے ہیں۔ فاضل مقدمہ نگار کا ایک پیغمبر اندر فرض یہ بھی ہے کہ وہ دلائل و نظائر سے ثابت کر دے کہ اس کتاب منطاب کے طلوع ہونے سے قبل، ادب کا نقشہ مسدس حالی کے عرب جیسا تھا:

”ادب“ جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
اس میں شک نہیں کہ کوئی کتاب بغیر مقدمہ کے
شہرت عام اور بقائے دوام حاصل نہیں کر سکتی بلکہ بعض
معجزات الہیہ تو اسرا مقدمہ سے ہی کی جاٹ میں لکھی
گئی ہیں۔ برنارڈ شا کے ڈرائے (جو درحقیقت اس کے
مقدموں کے عجیبے ہیں) اسی ذیل میں آتے ہیں اور دور
کیوں جائیں، خود ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں
جو کھس آخر میں دعائے لالچ میں نہ صرف یہ کہ پوری
نماز بڑھ لیتے ہیں بلکہ عبادت میں خشوع و خضوع اور گلے
میں رندمی رندگی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اپنی مالی
مشکلات کو حاضر و ناظر جانتے ہیں لیکن چند کتابیں ایسی
بھی ہیں جو مقدمہ کو جنم دے کر خود دم توڑ دیتی ہیں۔
مثلاً ڈاکٹر جاسن کی ڈکشنری، جس کا صرف مقدمہ باقی
رہ گیا ہے اور کچھ ایسے مصنف بھی گزرے ہیں جو مقدمہ
لکھ کر قلم توڑ دیتے ہیں اور اصل کتاب کی ہوا تک نہیں
دیتے..... جسے شعر و شاعری پر مولانا حالی کا بھرپور مقدمہ
جس کے بعد کسی کو شعر و شاعری کی تاب و تماشائی نہ رہی۔
بقول مرزا عبدالودود بیگ، اس کتاب میں سے مقدمہ
نکال دیا جائے تو صرف سرورق باقی رہ جاتا ہے۔

تاہم اپنا مقدمہ تقلم خود لکھنا کاروبار ہے کہ اس
طرح دوسرے بھوت بولنے سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرا
فائدہ یہ کہ آدمی کتاب پڑھ کر قلم اٹھاتا ہے۔ ورنہ ہمارے
نقاد عام طور سے کسی تحریر کو اس وقت تک غور سے نہیں
پڑھتے جب تک انہیں اس پر سرتہ کا شبہ نہ ہو۔

مشاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس

کوئی مشورہ ہی نہیں لیا جا رہا ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹے
غرور و تکبر کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ غرور ان کے
ساتھ ساتھ احمد نگر کو بھی ڈبو دے گا۔ پڑوس میں اسماعیل
عادل شاہ بیٹھا ہوا ہے۔ ہماری ذرا سی غفلت ہوئی تو وہ احمد
نگر کی اینٹ سے اینٹ بجاوے گا۔ احمد نگر کو بچانے کے
لیے ضروری ہے کہ برہان نظام شاہ کو تخت سے اتار کر
راجا جیو کو بٹھا یا جائے۔“

”میں پھر بھی نہیں سمجھی کہ اس میں، میں کیا کر سکتی ہوں؟“
”ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“
”میری کیا حقیقت کہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔“
”تم ہماری مدد اس طرح کر سکتی ہو کہ راجا جیو کو کسی
طرح ہم تک پہنچا دو۔“

”یہ کام میرے بس کا نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔“
”احمد نگر کو بچانے کے لیے بھی نہیں؟“
”احمد نگر سے مجھے محبت ہے۔ اسے بچانا بھی چاہتی
ہوں لیکن یہ کام میرے بس کا نہیں۔“
”سوچ لو۔ اس چھوٹے سے کام کے لیے ہم تمہیں
اتنی دولت دیں گے کہ تمہاری نسلیں کھائیں گی۔“
”کھائیں گی تو جب، جب میں زندہ رہوں گی۔ اس
جرم کی پاداش میں مجھے زندہ کون چھوڑے گا۔“
”تمہاری جان کی ضمانت ہم لیتے ہیں۔“
”آپ حرم سرا میں آکر مجھے نہیں بچا سکتے اور مجھے تو
وہیں رہنا ہے۔“

”تم راجا جیو کو لے کر یہاں آ جاؤ پھر تم یہیں رہو گی یا
جہاں جانا چاہو چلی جانا۔“
”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

اتنی دیر میں دو ملازمین دو چھوٹے قہال اٹھائے
کمرے میں داخل ہو گئے اور قہال رکھ کر چلی گئیں۔ کرم
خاں آگے بڑھے اور دونوں قہالوں کے خوان پوش
ہٹا دیے۔ ایک قہال میں زیورات تھے، دوسرے میں
سونے چاندی کے سکے۔

”اس کے علاوہ بھی تمہارے لیے بہت کچھ ہے۔“
رومی خاں نے کہا۔

دونوں قہالوں کو دیکھ کر عائشہ کا ایمان ڈمگ گیا۔ اس
کے لہجے میں نری آگئی۔

”راجا جیو کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا؟“
”نہ صرف یہ کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ وہ تخت
پر بیٹھے گا اور تم راج کر گئی۔ اس کے پردے میں تم حکومت

چند درختوں سے گزرنے کے بعد پالکی کچی سڑک پر
آگئی۔ یہ پالکی ایک محل کے صدر دروازے سے گزرنے
کے بعد رک گئی۔

پالکی سے اتار کر اسے ایک وسیع کمرے میں بٹھادیا
گیا۔ اسے جس عزت کے ساتھ یہاں تک پہنچایا گیا تھا،
اس پر اسے اپنی ذات پر فخر ہو رہا تھا، اپنے حسن پر ناز
ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رومی خاں جیسے امیر کی
نظروں میں میری کتنی وقعت ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ
رومی خاں ابھی اسے غلوٹ میں طلب کرے گا اور وہ صبح
ہونے سے پہلے پہلے امیر ترین عائشہ بن کر قلعے میں لوٹے
گی۔ اس کے بعد شاید نوکری کی ضرورت بھی نہ رہے۔ وہ

نوکری چھوڑ کر اپنی بہن کے گھر چلی جائے گی اور آرام
سے زندگی گزارے گی۔ اس کی سوجھیں اس وقت ٹوٹ
گئیں جب ایک ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ نہایت
ادب سے سلام کیا اور اسے ایک دوسرے کمرے تک
پہنچا دیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ تصور
لے کر آئی تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا
رومی خاں سے ہوگا لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے
دھچکا سا لگا تھا۔ اس نے کمرے میں رومی خاں، کرم خاں
اور امیر خاں کو بیٹھے دیکھا۔ یہ کیسی خلوت ہے؟ یہ تینوں

یہاں کیوں موجود ہیں؟
”عائشہ! تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ہم نے تمہیں یہاں
کیوں بلا یا ہے۔“
”میں تو کچھ نہیں جانتی۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں
کہ آپ نے مجھے بلا یا اور میں چلی آئی۔“
”بات یہ ہے کہ ہمیں تم سے ایک اہم کام لینا ہے اور
وہ کام تم ہی کر سکتی ہو۔“

”میں کب سے اتنی اہم ہو گئی؟“
”تم اہم اس لیے ہو کہ شہزادہ راجا جیو تمہاری نگرانی
میں ہے۔“
”میرے آنے سے راجا جیو کا کیا تعلق؟“
”تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ احمد نگر کی بھلائی کے لیے
راجا جیو کی کیا اہمیت ہے۔“
”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھی۔“

”بات صاف ہے۔ تخت پر برہان نظام شاہ بیٹھا
ہے۔ مکمل خاں دکنی اور اس کا بیٹا شہزادے کی کم سن سے
فائدہ اٹھا کر خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ایسے کام کر رہا ہے
جو احمد نگر کے مستقبل کے لیے قطعی فائدہ مند نہیں، ہم سے

پالکی واقعی موجود تھی۔ عائشہ پالکی میں بیٹھ گئی۔ پالکی
کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمی آگے بڑھے اور پالکی کو
اٹھایا۔ گھڑسوار آگے بڑھ گیا اور دو آدمی پالکی اٹھا کر چل
دے۔

پہنچ گئے۔ یہ درخت یہاں اکیلا کھڑا تھا۔ شاید یہی پہچان
تھی کہ منزل آگئی۔ اس درخت سے ایک زنجیر بندھی
ہوئی تھی۔ زرباز خاں نے اندھیرے میں زنجیر ٹوٹی اور
اسے کھینچا۔ خود کا نظام حرکت میں آیا اور زمین کا کچھ حصہ
اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ زرباز خاں نے کچھ دیر آنکھوں کو
اندھیرے کا عادی کیا اور پھر اس سرنگ میں بنی یہ سڑھی پر
قدم رکھ دیا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر مشعل تلاش کی۔ وہ
چٹھان اپنے ساتھ لایا تھا۔ مشعل روشن کی اور عائشہ کو اندر
بلا لیا۔ یہاں بھی ایک زنجیر لگی ہوئی تھی جسے کھینچنے پر زمین
اپنی جگہ آگئی۔

”جب تم واپس آؤ تو اس مشعل کو بٹھادینا اور باہر نکل
آنا۔ درخت سے بندھی زنجیر کو کھینچنا تو زمین اپنی جگہ
آجائے گی۔“

”زرباز خاں! ایک بات پوچھوں؟“
”پوچھو۔“

”حرم سرا سے جتنی عورتیں باہر جاتی ہیں، وہ اسی وقت
اور پریشانی اٹھانے کے بعد جاتی ہوں گی۔“

”ضروری تو نہیں لیکن تمہارا معاملہ دوسرا ہے۔ تم
شہزادے کی دایہ ہو اور پھر تمہیں رات کے وقت لٹکانا تھا اس
لیے میں نے یہ احتیاط برتی۔“

”اگر میں دن کے وقت کہیں جانا چاہوں؟“
”دن کے وقت اتنی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ اکثر عورتیں
اپنے رشتہ داروں سے ملنے قلعے سے باہر چلی جاتی ہیں۔“
اندھیری سرنگ میں قدرتی روشنی ہوئی تو دونوں نے
آگے چلنا شروع کیا۔ سرنگ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ تھوڑی دور
چلنے کے بعد سرنگ کا دوسرا کنارہ آگیا۔ یہاں بھی زنجیر
بھائی ٹوڑست نہ گیا۔ دونوں باہر آ گئے۔

اندھیرے میں کسی کے وجود کا احساس تک نہیں
ہو رہا تھا۔ اچانک ایک گھڑسوار ایک درخت کی اوٹ
سے باہر آیا۔

”مجھے رومی خاں نے بھیجا ہے۔“
”کیا سواری لائے ہو؟“

”اس درخت کے پیچھے پالکی تیار کھڑی ہے۔ تشریف
رکھیے۔“

پالکی واقعی موجود تھی۔ عائشہ پالکی میں بیٹھ گئی۔ پالکی
کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمی آگے بڑھے اور پالکی کو
اٹھایا۔ گھڑسوار آگے بڑھ گیا اور دو آدمی پالکی اٹھا کر چل
دے۔

کردی اور تمام امرا تمہارے حکم کے باندھوں گے۔“
”راجا جیو کو کہاں پہنچانا ہوگا؟“
”اس وقت تم جہاں بیٹھی ہو..... اس کے بعد تمہارا کام ختم۔“

رات بچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ کسی دن بھی موقع دیکھ کر راجا جیو کو رومی خاں کے گھر پہنچا دے گی۔

اسے جس پالکی میں لایا گیا تھا اسی پالکی میں سوار کر کے خفیہ سربگ تک پہنچا دیا گیا۔ اس نے زرباز خاں کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سربگ میں قدم رکھ دیا اور پھر سربگ سے باہر نکل آئی اور بد آسانی حرم سرا تک پہنچ گئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر گہری سانس لی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ وہ رات بھر جاگتی رہی تھی لیکن نیند اب بھی اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے جن حالات سے گزری تھی، اس کا ذہن ان واقعات کو دہرا رہا تھا۔ خطرات اس کے سامنے ٹھہرے تھے لیکن زبورات سے بھرے تھے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

میری خواب دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں نیند بھر گئی۔ صبح سو کر اٹھی تو اس کا بدن بخار سے جل رہا تھا۔ حکیم صاحب پھر آگئے۔ دوا پھر دے دی گئی۔ دن نکلنے میں حرم سرا کی رونق پھر لوٹ آئی تھی۔ کہیں کہیں سے فہمبوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عائشہ رات کو کہاں تھی اور کیا وعدے کر کے لوٹی ہے۔

اس کا بخار اترتے اترتے شام ہو گئی۔ وہ راجا جیو کی والدہ کے پاس گئی اور راجا جیو کو اپنے ساتھ لے آئی۔ اب اسے زیادہ سے زیادہ راجا جیو کے ساتھ رہنا تھا تا کہ جلد از جلد اپنے وعدے کی تکمیل کر سکے۔ وہ راجا جیو کی دیکھ بھال میں مشغول تھی۔ اس کے ساتھ ہی موقع کی تاک میں بھی گئی کہ ایک موقع ملے اور وہ راجا جیو کو لے کر یہاں سے نکل جائے۔ ایک دن اسے موقع مل گیا۔ اس نے راجا جیو کو لڑکیوں کے کپڑے پہنا دیے تاکہ کسی کی نظر پڑ بھی جائے تو یہی سمجھ کر کوئی لڑکی ہے جسے وہ اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔ ایک دن پہلے اس نے یہ بھی مشہور کر دیا تھا کہ وہ اپنی بہن سے ملنے اس کے گھر جائے گی۔ حرم سرا کے دروازے پر پالکی آ کر رک گئی۔ کسی نے دیکھا بھی تو یہ دیکھا کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ پالکی میں بیٹھی ہے۔

یہ محفل اتفاق تھا کہ اسی وقت برہان نظام شاہ کی والدہ

نے اپنے چھوٹے بیٹے راجا جیو کو یاد کیا۔ حرم سرا میں شہزادے کو ڈھونڈا کیا لیکن وہ ہوتا تو ملتا۔ چاروں طرف ہنگامہ مچا گیا۔ محل کے تمام اندرونی اور بیرونی ملازم ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا ہو سکتا ہے شہزادہ محل کے کسی حوض میں گر پڑا ہو۔ کچھ ملازم حوضوں میں اترنے کی تیاری کر رہے تھے کہ کسی نے عائشہ کو فرار ہونے کی خبری کر دی۔ اسے تلاش کیا گیا۔ وہ حرم سرا میں موجود نہیں تھی۔ برہان نظام شاہ کی والدہ نے ملازموں کو عائشہ کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔ کچھ لوگ احتیاط کے طور پر حوضوں میں بھی اتر گئے۔ وہ ابھی رومی خاں کے گھر تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ ملازموں نے پالکی کو گھیر لیا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میری پالکی کو کیوں روکا گیا ہے؟“
”آپ اپنے ساتھ کسے لے جا رہی ہیں؟“
”میری بھانجی ہے۔ میرے پاس آئی ہوئی تھی۔ میں اسے لے کر کر اپنی بہن کے گھر جا رہی ہوں۔ لیکن نہیں تو اسے دیکھ لو۔“

اس نے راجا جیو کی ایک جھلک ملازموں کو دکھادی۔ ملازموں نے واقعی ایک لڑکی کو دیکھا۔ وہ راجا جیو کو پہچان ہی نہ سکے لیکن پھر بھی انہوں نے ضروری سمجھا کہ پالکی کو حرم سرا کی طرف لوٹا دیں۔

عائشہ پہنچتی رہ گئی اور پالکی کو حرم سرا پہنچا دیا گیا۔ اس نے راجا جیو کی والدہ سے بھی یہی کہی کہ وہ اپنی بہن کے گھر جا رہی تھی لیکن اس کے پاس اس کے اس سوال کا جواب نہیں تھا کہ راجا جیو کو زنا نہ لباس کیوں پہنایا۔
”میں اگر یہ مان بھی لوں کہ تو اسے اپنی بہن کے گھر لے جا رہی تھی تو میں تجھ سے یہ پوچھوں گی کہ زنا نہ کپڑے پہنانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔ بس مجھے شوق ہو رہا تھا۔“
یہ بہانہ قابل قبول نہیں تھا۔ وہ اپنی مغالطی پیش نہ کر سکی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس معاملے میں مزید تفتیش کی ضرورت تھی کہ دراصل وہ کہاں جا رہی تھی اور اس کے عزائم کیا تھے۔

یہ کوئی معمولی معاملہ نہیں تھا۔ حرم سرا میں پالکی پہنچنے کی دیر تھی کہ بات اس حلقے تک پہنچ گئی جو برہان نظام شاہ کے پردے میں احمدگر کی حکومت چلا رہے تھے۔ مخالفین تک بھی یہ خبر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ خاص طور پر رومی خاں یہ خبر سن کر دھل کر رہ گیا۔ اب اسے وہ کرنا تھا

جس کا ارادہ قطعی نہیں تھا۔
مکمل خاں دکنی نے فوراً برہان نظام شاہ سے ملاقات کی۔ فیصلے تو اسی کے چلنے تھے لیکن دوسرے امراء کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ جو فیصلہ کیا جا رہا ہے، اس میں برہان نظام شاہ کی مرضی شامل ہے۔ وہ ایک تحریر پہلے ہی لکھ کر لایا تھا جس پر برہان نظام شاہ کے دستخط کرانے تھے۔
اس تحریر کے جواب میں عائشہ کو ایک قریبی قلعے کے قید خانے میں قید کر دیا گیا۔

جس وقت عائشہ کو قید خانے میں منتقل کیا جا رہا تھا، اسی وقت رومی خاں کے محل میں کرم خاں اور امیر خاں نہایت فکر مند سی جمع تھے۔

”رومی خاں! اس گرفتاری کے بعد مزید گرفتاریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ اندازہ یہ آسانی لگا یا جا سکتا ہے کہ تفتیش کس مرحلے پر پہنچے گی۔ ہمیں مکمل خاں دکنی اور اس کے بیٹے کی طرف سے کسی رعایت کی توقع نہیں رہنی چاہیے۔ اگر کسی نے ہمارا نام نہیں بھی لیا تو مکمل خاں دکنی اسے بہانہ بنا کر ہماری طرف بڑھے گا۔“ کرم خاں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔ میرا فکر مقابلے کے لیے تیار ہے۔ ہم مکمل خاں دکنی کو یہ اجازت ہرگز نہیں دیں گے کہ وہ برہان نظام شاہ کو یہ غال بنا کر اپنی مان مانی کرتا پھرے۔“

”کیا ہم اس کا مقابلہ کر سکیں گے؟“
”فرار کا دوسرا راستہ بھی تو موجود نہیں۔“
”ایک راستہ ہے۔ اگر ہم کسی طرح عائشہ کا منہ بند کر دیں تا کہ وہ راز نہ کھول سکے۔“
”کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟“

”میرے ایسے آدمی قلعے میں موجود ہیں جو یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔“
”کیا اس طرح مکمل خاں کو ہم پر شک نہیں ہوگا؟“
”شک ہو سکتا ہے، ثبوت تو نہیں ہوگا۔ عائشہ زندہ رہی تو ہم کو اہم ہوا بن جائے گی۔“

یہ باتیں ہوتی رہیں اور یہ مجلس اس فیصلے پر ختم ہوئی کہ عائشہ کو موت سے ہٹا کر دینا چاہیے۔ اس فیصلے پر عملدرآمد کے لیے رومی خاں بھرپور حصہ لے سکتا تھا کیونکہ شاید اسی دن کے لیے اس نے اپنے بہت سے آدمی قلعے میں اہم عہدوں پر متعین کیے تھے۔ برہان نظام شاہ کا اتالیق مکمل خاں دکنی اس سے ناواقف نہیں تھا لیکن وہ

برگرد کے مخصوص حالات اور رومی خاں کی طاقت سے خوف زدہ بھی تھا البتہ اس کا بیٹا جمال الدین عزیز الملک جو سربوختی کے عہدے پر فائز تھا، نوجوان ہونے کی وجہ سے زیادہ جذباتی تھا۔ رومی خاں کے کئی لوگوں کو ان کے عہدے سے ہٹا چکا تھا۔ وہ رومی خاں کی طرف سے چونکا ضرور تھا لیکن یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ عائشہ سے اس کا کوئی تعلق ہوگا۔ اس کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب عائشہ قید خانے میں مردہ پائی گئی۔

مکمل خاں دکنی کو پورا یقین تھا کہ عائشہ کی موت میں رومی خاں کا ہاتھ ہے لیکن ایک اہم گواہ اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اب وہ ٹرس بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ عائشہ سے اس کا تعلق تھا اور راجا جیو کو اغوا کرنے میں اسی کا ہاتھ تھا اور اس کی موت کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔

ممکن ہے یہ معاملہ دبا دیا جاتا کہ جلد ہی زرباز خاں نے مکمل خاں دکنی سے ملاقات کی درخواست کر دی۔ یہ درخواست فوراً قبول بھی کر لی گئی۔

عائشہ اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اب اس پر گزرنے والی داستان کو کسی بھی انداز میں سنایا جاسکتا تھا۔ زرباز خاں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اپنا دامن بچا کر عائشہ کے اس فرار کی کہانی سنائی جب وہ رومی خاں سے ملنے جا رہی تھی۔

”مجھے یہ شک ہوا تھا کہ وہ رات کے وقت کسی سے ملنے جا رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ اس نے مجھے ہمارا بنانے کے لیے بھاری رشوت دینے کا وعدہ کر کے بتایا کہ وہ رومی خاں سے ملنے جا رہی ہے۔ میں ڈر گیا اور رشوت لینے سے انکار کر دیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی نہ کسی طرح رومی خاں تک پہنچ گئی تھی۔“

وہ... بیان دیتے ہوئے یہ بھول گیا تھا کہ عائشہ کے فرار کا گواہ ایک اور بھی ہے۔ یہ تھی وہ بوڑھی عورت جس کو رشوت دے کر عائشہ حرم سرا سے باہر نکلی تھی۔ وہ بوڑھی عورت راجا جیو کی والدہ کے پاس گئی اور اپنا جرم قبول کر لیا۔

”میں تو اس وقت کو در رہی ہوں جب عائشہ میرے پاس آئی تھی۔ میں نے لالچ میں آ کر اس کے لیے رات کے وقت دروازہ کھول دیا۔ زرباز خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے بھی سفارش کی۔ میں باتوں میں آ گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ رومی کے گھر جا رہی ہے۔“
”تو نے کیا کہا، ذرا پھر سے تو کہہ۔ زرباز خاں

جاسوسی ڈائجسٹ



موسم سرما کا دھندلا جیسا

آغاز دسمبر کے شمارہ

کا خوب صورت انداز

دوسری موت

باطن کی اچھائی اور ظہار کی برائی میں
لتھڑے کرداروں کے مصائب کی سنسنی خیز
داستان... پروین زبیر کے قلم سے

انکابے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نصیب میں آگے بڑھتا
ظاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسر پیکار نوجوان کی سرگزشت۔

عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

دسمبر کی شاموں میں بھیگے
سرورق کہانی کی رعنائی و دلکشی

ان کے علاوہ

منظر امام، تنویر، باض، سلیم، انور،
امرشد بیگ، جمال دست، تمکین مرزا
اور عکسین فاطمہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

جین کتہ جین

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کتنا ہیں

لنگر جمع کیا اور ”کاویل“ سے روانہ ہو کر نظام شاہی سرحد
میں داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے
پرگنوں پر قبضہ کر لیا۔

عماد الملک کی یہ حرکت ایسی نہیں تھی جسے نظر انداز کیا
جاسکتا۔ مکمل خاں نے پہلے تو عماد الملک کی جانب ایک خط
روانہ کیا جس میں اس نے عماد الملک کو اس کے ارادوں
سے باز رہنے کی تلقین کی تھی اور جب اس کا جواب نفی میں
آ گیا اور اس کے آگے بڑھنے کی اطلاعات برآتی رہیں
تو مکمل خاں نے بھی لنگر جمع کیا اور حاکم پرندہ خواجہ جہاں
کے ہمراہ بڑی شان و شوکت سے عماد الملک کی سرزنش کے
لیے روانہ ہوا۔ دوسری طرف سے عماد الملک نے اپنی
فوجوں کو آگے بڑھایا۔ ایک مقام قصہ رانوری کے قریب
دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ فریقین نے اپنی اپنی
صفیں درست کیں۔ مکمل خاں نے برہان نظام شاہ کو کم سی
ٹی وجہ سے قلب لشکر میں رکھا اور ایک ترکی غلام آذر خاں
کو اس کی حفاظت کے لیے اس کا ردیف مقرر کر کے اس
کے ساتھ رکھا۔

دونوں فوجیں پہل کرنے میں ایک دوسرے کا انتظار
کر رہی تھیں۔ اسی میں پورا دن گزر گیا۔ رات ہوئی تو
دونوں فوجیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئیں۔ دونوں کو
دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی فریق شب خون نہ مار دے لہذا
دونوں طرف مسلسل رت جگا ہوتا رہا۔

سحر نزدیک بھی کہ مکمل خاں نے اپنے لشکر سے
خطاب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ جب صبح کے وقت صفیں
درست کر چکے تو پہل کرنے میں دیر نہ کرنا۔ عماد الملک نے
بھی غالباً یہی ہدایت کر دی تھی چنانچہ جب صبح ہوئی اور
فوجوں نے صفیں درست کر لیں تو دونوں فوجیں ایک ساتھ
ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئیں۔ طرفین کے سپاہیوں نے
فتح کے لیے جی توڑ کوششیں کیں۔ نہایت محسوس کارن
پڑا۔ ابتدا میں عماد الملک کی فوجوں کا پلڑا بھاری تھا۔ عماد
الملک برابر اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ جس طرح بھی ہو
برہان نظام شاہ تک پہنچ کر اسے گرفتار کر لیا جائے یا اسے
نقصان پہنچایا جائے لیکن مکمل خاں نے اسے قلب لشکر میں
رکھا تھا اور اس کی حفاظت کا خاطر خواہ بندوبست کیا تھا لہذا
عماد الملک اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ الٹا
نقصان اٹھا بیٹھا۔ برہان نظام شاہ کے تعاقب میں وہ اپنی
فوج کی طرف سے غافل ہو گیا۔ اچھی خاصی فتح، شکست
میں بدل گئی۔ برہان نظام شاہ کی فوج غالب آنے لگی۔

باہمی اختلاف پہلے سے کہیں زیادہ بڑھتے چلے گئے۔ رومی
خاں کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح یہ دوری ختم ہو جائے۔
اس قربت ہی کی وجہ سے وہ اس قابل ہو سکا تھا کہ کوئی
سازش تیار کر کے لیکن مکمل خاں اب اتنا چوکنا ہو گیا تھا کہ
کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا بلکہ رومی خاں کے آدی تو
اسے یہ بتا رہے تھے کہ مکمل خاں اسے راستے سے ہٹانے کی
تدبیریں کر رہا ہے۔

رومی خاں نے جب یہ دیکھا کہ موافقت کی کوئی
صورت نہیں اور وہ اکیلا اس قابل نہیں کہ مکمل خاں کا زور
توڑ سکے تو اس نے اپنی مدد کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔
اس کی نظر علاؤ الدین عماد الملک پر گئی جو دینی علاقے
”کاویل“ پر حکمرانی کر رہا تھا۔ برہان نظام شاہ کے باپ
نظام شاہ سے اس کی پرانی دشمنی تھی۔ کئی معرکے ہوئے تھے
جن میں عماد الملک کو شکست ہوئی تھی۔ وہ اب بھی احمد نگر کی
طرف لالچی نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن مکمل خاں دکن کی
طاقت کے سامنے ہلے نہیں تھا۔ اب جو رومی خاں نے اس
سے خط کتابت کی اور اسے یقین دلایا کہ احمد نگر کو فتح کرنے
میں وہ اس کی مدد کرے گا تو اس کے خواب تعبیر کی طرف
گامزن ہو گئے۔ یہ خط کتابت کئی ماہ تک جاری رہی اور
بالآخر اس نے رومی خاں کو خط لکھ دیا کہ وہ فرار ہو کر اس
کے پاس ”کاویل“ پہنچ جائے۔

رومی خاں نے اپنے دو بقیہ ساتھیوں کرم خاں اور
امیر خاں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی اس مشورے کو پسند
کیا۔ ان کی کوششوں سے پانچ اور امیر بھی اس مشورے میں
شامل ہو گئے۔ آٹھ ہزار کا لشکر بھی مرتب ہو گیا اور یہ سب
ایک رات احمد نگر سے فرار ہو کر ”کاویل“ پہنچ گئے۔

رومی خاں نے عماد الملک سے بالمشافہ گفتگو کی اور اسے
باور کرایا کہ احمد نگر کو فتح کرنا اس وقت نہایت آسان ہے۔
”احمد نگر پر اس وقت دس سالہ برہان نظام شاہ
حکمرانی کر رہا ہے۔ مکمل خاں دکن اور اس کا بیٹا اسے دونوں
ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ نظام مملکت افراتفری کا شکار
ہے۔ احمد نگر کے لوگ حکومت کے خلاف ہو گئے ہیں۔
سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اب ہمیں ہی دیکھ لو۔ اگر ہم
اس صورت حال سے بدظن نہ ہوتے تو اپنا وطن کیوں
چھوڑتے۔ اس وقت اگر احمد نگر پر حملہ کر دیا جائے اور ہم بھی
تمہارے ساتھ ہوں تو قلعہ بہ آسانی فتح کیا جاسکتا ہے۔ یہ
اچھا موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھا لیجیے۔“
عماد الملک، رومی خاں کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے

عائشہ کو تیرے پاس لے کر آیا تھا؟ وہ اس کے ساتھ تھا؟“
”ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہی اسے خفیہ راستے
سے حرم سرا سے باہر لے کر گیا تھا۔ آپ مجھے جس قسم لے لو۔“
”تو یہ بات مکمل خاں کے سامنے کہہ سکتی ہے؟“
”میں سب کے سامنے کہنے کو تیار ہوں۔ بس مجھے
رشتہ لینے کے الزام میں سزا نہ دی جائے۔“

”میں ضمانت لیتی ہوں کہ تجھے سزا نہیں ملے گی۔“
برہان شاہ کی والدہ اس بوڑھی عورت کو لے کر مکمل
خاں کے پاس چلی گئیں۔ اس نے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ
بتا چکی تھی۔ ایک مرتبہ پھر زباز خاں کو طلب کیا گیا۔ اس
مرتبہ وہ باتیں چھپانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ اس نے قبول
کیا کہ اس نے عائشہ کو فرار ہونے میں مدد دی تھی البتہ اس
نے یہ ضرور بتایا کہ فرار ہونے کے بعد وہ کس سے مل گئی تھی،
اس سے وہ ناواقف ہے۔ مکمل خاں نے بوڑھی عورت کو
سرزنش کے بعد چھوڑ دیا لیکن زباز خاں کو باقی عمر قید خانے
میں گزارنی پڑی۔

اب ہر بات کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ سازش پکڑی
گئی تھی۔ رومی خاں اور اس کے ساتھی قصور وار پائے گئے
تھے۔ الزام یہ تھا کہ انہوں نے عائشہ سے روابط بڑھائے
اور راجا جیو کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ برہان نظام شاہ
کی جگہ اسے تخت پر بٹھادیا جائے البتہ عائشہ کی موت کا
ذمے دار زباز خاں کو قرار دیا گیا تاکہ یہ راز نہ کھل جائے
کہ فرار اس نے کرایا تھا۔ اس لیے اسے ہمیشہ کے لیے قید
خانے کے سپرد کر دیا گیا۔

مکمل خاں دکن نے اپنے ہم خیال امراء کو جمع کیا اور
آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا۔ طے یہ ہوا کہ راجا جیو کو شاہی
نگرانی میں لے کر اس کی حفاظت کی جائے اور مخالف امراء
کو شاہی فیصلوں سے دور رکھا جائے۔

یہ فیصلے رومی خاں کے کانوں تک بھی پہنچے۔ اسے یہ
اطمینان تھا کہ دکنی الحال یہ معاملہ دب گیا ہے۔ موقع دیکھ کر
کوئی سازش پھر تیار کی جائے گی۔

اس واقعے کے بعد مکمل خاں نے برہان نظام شاہ اور
راجا جیو کی طرف بہت توجہ کی اور ان کی نگرانی بڑی کڑی نظر
سے کرنے لگا۔

برہان نظام شاہ کی تعلیم کا ایسا عمدہ انتظام کیا کہ وہ
صرف دس سال کی عمر میں عہد کی سے خط نسخ لکھنے کے قابل
ہو گیا اور فارسی کتب نہایت روانی سے پڑھنے لگا۔

وقت کے ساتھ ساتھ رومی خاں اور مکمل خاں کے

حالات ایسے بگڑے کہ پھر سنبھل نہ سکے۔ عماد الملک کی فوج میدان سے بھاگ کھڑی ہوئی اور کاویل تک راستے میں کہیں نہ ٹھہری۔

مکمل خاں نے برہان نظام شاہ کو ساتھ لے کر مفرور رہا۔ کا تعاقب کیا۔ عماد الملک گھبرا کر براہ میں داخل ہو گیا۔ مکمل خاں نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ عماد الملک نے نہایت ہوشیاری سے اپنی فوج کو پیچھے کیا اور براہ کے علما و مشائخ کو مکمل خاں کے پاس بھیجا۔ ان لوگوں نے فریقین میں اس شرط پر صلح کرادی کہ ہر فریق اپنے اپنے ملک کو واپس چلا جائے۔

مکمل خاں نے بادل ناخواستہ علما کی بات مان لی۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ اسٹیلیل عادل شاہ کہیں احمد نگر کو اکیلا دیکھ کر چھ نہ دوڑے۔ وہ تیزی سے سفر کرتا ہوا احمد نگر واپس آ گیا۔

☆☆☆

بے جا پورے حاکم یوسف عادل کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا اسٹیلیل عادل شاہ کم سن تھا اس لیے عنان حکومت اس کے ایک امیر کمال خاں نے سنبھال لی تھی۔ احمد نگر میں بھی یہی ہوا تھا کہ برہان نظام شاہ بوجہ کسی تخت پر بیٹھا ضرور تھا لیکن حکومتی نظام مکمل خاں وکئی اور اس کے بیٹے کے ہاتھ میں تھا۔ وہی سیاہ سفید کے مالک تھے۔ فرق صرف اتنا ہوا تھا کہ اسٹیلیل عادل شاہ کی والدہ پونجی خاتون کی تدبیروں سے کمال خاں کو قتل کر دیا گیا تھا اور نظام حکومت اسٹیلیل عادل شاہ کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

اسٹیلیل عادل شاہ کے کئی سال کمال خاں کے طرف داروں سے لڑائیاں کرتے ہوئے گزر گئے تھے اور اب اس کی نظریں احمد نگر پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ برہان نظام شاہ جوانی کی عمر کو پہنچنے کے باوجود مکمل خاں وکئی کا محتاج تھا یا مکمل خاں نے اسے اپنا محتاج بنایا ہوا تھا۔

مکمل خاں بھی اس کے ان ارادوں سے غافل نہیں تھا اور اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ اسٹیلیل عادل شاہ کی طاقت بڑھنے سے پہلے ہی اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر لے۔ اسی دوران اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اسٹیلیل عادل شاہ، عماد الملک کی طرف وکئی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے اور اس کے ساتھ مل کر احمد نگر کی طرف بڑھے گا۔ اس نے اس سواری کی ٹانگیں تراشنے کا ارادہ کر لیا جس پر اسٹیلیل عادل شاہ سواری کرنے کا خواہاں تھا۔ عماد الملک سے کشیدگی برقرار تھی۔ چھوٹی چھوٹی جہازیں بھی چلتی رہتی تھیں۔ اسے یہ پُر خاش بھی

تھی کہ اس کے مخالف امیروں کو عماد الملک نے پناہ دے رکھی ہے۔ اس نے عماد الملک کو معروف رکھنے کے لیے اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کوئی ایسی وجہ بھی تلاش کرنی شروع کر دی جو کسی بڑے معرکے کا سبب بن سکے۔ جلد ہی ایک سبب اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے برہان نظام شاہ سے ملاقات کی اور اسے حقائق سے آگاہ کیا۔

”کیا آپ جانتے ہیں کہ قصبہ پاتری جو اس وقت عماد الملک کے قبضے میں ہے، آپ کے اجداد کا علاقہ ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”ہم نے سنا ہے کہ نظام شاہیوں کے اسلاف میں کلکرنی نام کا ایک شخص تھا جو پرگنہ پاتری کا رہنے والا تھا۔ وہ کسی سبب سے غریب الوطن ہو کر پانچاگر چلا گیا تھا۔ جب نظام شاہی خاندان کے ہاتھ میں حکومت آئی اور ان کی علیحدہ سلطنت (احمد نگر) قائم ہوئی تو وہ تمام برہمن جو بادشاہ احمد نظام شاہ سے قربت رکھتے تھے، قصبہ پاتری چھوڑ کر احمد نگر آ گئے۔ وہ پاتری سے بہت محبت رکھتے ہیں اور پاتری پر عماد الملک کا قبضہ ہے۔ ہم اس سے تقاضا کر سکتے ہیں کہ وہ پاتری واپس کر دے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میرے والد سے برہمنوں کی قربت داری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ حقیقت آپ پر آشکار ہو لیکن اب بتانا پڑے گا۔ احمد نظام شاہ کے اجداد برہمن تھے۔ ان میں سے ایک احمد شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اس نے مشرف یہ اسلام ہو کر اپنا نام ملک حسن رکھ لیا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے شاہی غلاموں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ احمد شاہ بہمنی نے یہ غلام اپنے بیٹے محمد شاہ کو عطا کر دیا۔ سلطان محمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے مطابق ملک حسن کو وکیل سلطنت کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ اس نے کئی علاقے فتح کر کے اپنے بیٹے ملک احمد کو عطا کیے۔“

”اس نے مرہٹوں کے کئی قلعے فتح کر لیے اور اپنے لیے احمد نظام الملک بگری کا لقب اختیار کیا۔ وکن میں اس کا نام احمد نظام شاہ مشہور ہو گیا۔ اسی احمد نظام نے احمد نگر کی بنیاد رکھی۔ اس نے اس شہر کی تعمیر میں بہت دلچسپی لی۔ دو تین سال کی مدت میں یہ شہر مصر اور بغداد کی طرح آباد ہو گیا۔ آج اسی احمد نگر کے آپ حکمران ہیں۔“

برہان نظام شاہ نے یہ داستان پوری دلچسپی سے سنی

اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب کچھ آپ نے مجھے تو بتا دیا ہے، عماد الملک کو اس کی ہوانہ لگے۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں، عماد الملک کو یہ سب کچھ معلوم نہیں ہوگا؟“

”اسے معلوم ہو لیکن آپ اپنی تحریر میں اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیں۔“

”میں اسے کچھ نہیں لکھوں گا۔ صرف یہ لکھوں گا کہ قصبہ پاتری آپ کے اجداد کا ہے اسے آپ کے حوالے کر دے۔“ برہان نظام شاہ نے منظوری دے دی اور مکمل خاں وکئی نے عماد الملک کے نام خط لکھ دیا۔

”ہمارا قصبہ پاتری سے جو تمہارے ملک میں داخل ہے اور سرحد پر واقع ہے، بہت پرانا تعلق ہے۔ ہمارے تمہارے درمیان جو صلح ہوئی تھی، اس کا تقاضا ہے کہ تم اس قصبے کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس کے عوض تم ہمارے ملک کا جو قصبہ چاہو ہم سے لے لو۔“

برہان نظام شاہ نے اس خط پر اپنی مہر ثبت کی اور یہ خط عماد الملک کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ عماد الملک نے یہ پیشکش اور مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔

عماد الملک اب جو کتنا ہو گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ برہان نظام شاہ مچلا بیٹھنے والا نہیں۔ اس مسئلے پر وہ کبھی نہ کبھی ایک بڑی جنگ ضرور لڑے گا۔ اس کی تیاری ابھی سے کر رہی ہے۔ اس نے اس مقام پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کروانا شروع کر دیا۔

یہ تعمیرات تو پوشیدہ رہ سکتی تھیں اور نہ عماد الملک نے اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ برہان نظام شاہ نے اس وقت مکمل خاں کو اپنے حضور طلب کیا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دربار کو آراستہ دیکھا۔ اس کا بیٹا جمال الدین بھی وہاں موجود تھا۔ مکمل خاں نے اسے برہان نظام شاہ کی... خود مری سے تعبیر کیا لیکن جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہوئی۔ برہان نظام شاہ کو اطلاع پہنچی تھی اور اس کے ازالے کے لیے اس نے درباریوں کو جمع کیا تھا۔

”میں نے آپ سب لوگوں کو اس لیے زحمت دی کہ عماد الملک نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا ہے۔“

”کیا وہ پچھلی جنگ کا انجام بھول گیا؟“ ایک امیر نے توار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”پچھلی جنگ کے انجام ہی نے اسے یہ راہ دکھائی ہے۔“

”کیسی راہ؟“

”وہ صوبہ پاتری کے مقام پر قلعے کی تعمیر میں

فرق

ایک شخص سمندر کے کنارے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس سے کچھ فاصلے پر ایک آدمی بیچے جھکتا ہے، کوئی چیز اٹھا رہا ہے اور سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ وہ اس شخص کے قریب جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ سمندر کے کنارے ریت پر بے شمار پھلیاں تڑپ رہی ہیں۔ شاید یہ بڑی موج نے ان کو ساحل سمندر پر پھینک دیا تھا اور وہ شخص ان کو واپس سمندر میں پھینک رہا تھا کہ ان کی جان بچ جائے اسے اس شخص کی بے وقوفی پر ہنسی آگئی اور وہ کہنے لگا۔ ”ارے بھائی صاحب! اس سے کیا فرق پڑے گا۔ تم کتنی پھلیوں کو بچا لو گے؟“ یہ سن کر وہ شخص مسکرایا۔ اس نے ایک پھلی کو اٹھا لیا اور سمندر میں پھینک دیا۔ وہ پھلی تیزی سے پانی پر بہتی ہوئی دور نکل گئی۔ اس پر اس شخص نے دوسرے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے دیکھا ہے فرق پڑا ہے۔“ اور پھر پھلیاں اٹھا کر سمندر میں پھینکنے لگا۔

موازنہ

لقمان حکیم کو ان کے آقا نے حکم دیا کہ ایک بکری ذبح کر دو اور اس کے گوشت کے دو بہترین ٹکڑے میرے پاس لاؤ۔ انہوں نے بکری ذبح کی اور اس کا دل اور زبان لے جا کر آقا کے سامنے رکھ دی۔ پھر آقا نے حکم دیا کہ ایک اور بکری ذبح کر دو اور اس کے گوشت کے دو بدترین ٹکڑے میرے پاس لاؤ۔ انہوں نے دوسری بکری ذبح کی اور اس کا بھی دل اور زبان آقا کی خدمت میں پیش کر دی۔ مالک بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا۔ ”اے لقمان! یہ کیا... تم دو بہترین ٹکڑے دل اور زبان لے کر آئے اور دو بدترین ٹکڑے بھی دل اور زبان ہی لے کر آئے؟“

لقمان حکیم نے فرمایا۔ ”اگر دل اور زبان اچھے رہیں تو ان سے بہتر جسم کا کوئی دوسرا حصہ نہیں ہو سکتا اور اگر یہ دونوں بگڑ جائیں تو ان سے بدتر جسم کا کوئی عضو نہیں ہو سکتا۔ یہ بہتر ہیں تو بہتر ہیں اور بگڑ جائیں تو بدترین ہیں۔“

مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف

معروف ہے۔ اس قلعے کی تعمیر سے اس کے دو مقاصد پورے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ سرحدی مقام ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ممالک کی حفاظت کر سکے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ بہ وقت ضرورت اسٹیل عادل شاہ کی فوجوں کو وہاں بٹھرا سکتا ہے جو ہمارے لیے ہمیشہ خطرہ بنی رہیں گی۔

”وہ یہ قلعہ اپنی سرحد میں بنوا رہا ہے۔ ہم اسے کس طرح روک سکتے ہیں؟“ امراء نے یہ ایک آواز کہا۔ مکمل خاں اب تک خاموش بیٹھا تھا لیکن اب وہ خاموش نہ رہا۔ ”ہم اسے ٹوک بھی سکتے ہیں اور روک بھی سکتے ہیں۔ ایسا کرنا ہمارے لیے اس لیے ضروری ہے کہ اگر قلعہ تعمیر ہو گیا تو ہم ہمیشہ خوف میں مبتلا رہیں گے۔ کسی سرحدی مقام پر قلعہ تعمیر کرنا یوں بھی جتنی قوانین کے خلاف ہے۔“

”پھر جو کرنا ہے آپ ہی کریں۔ ہم تو آپ کا ساتھ دے سکتے ہیں۔“ مکمل خاں نے اجازت ملتے ہی عماد الملک کو کھٹا۔ ”سرحدی مقام پر ہمیں قلعہ تعمیر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح تمہارے سپاہی ہمیشہ ہم سے جنگ کرتے رہیں گے اور اس طرح ہمیں تکلیف پہنچتی رہے گی۔ بہتر ہے کہ تم قلعے کی تعمیر کا کام فوراً روک دو۔“

عماد الملک تک یہ خط پہنچا ضرور لیکن اس نے اس خط کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ اس کی یہ بے توجہی دیکھ کر مکمل خاں کے سامنے جنگ کے سوا دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس نے یہ مشہور کیا کہ وہ بالا گھاٹ اور دولت آباد کی سیر کے لیے نکلنا چاہتا ہے۔ اس بہانے اس نے فوج جمع کرنا شروع کر دی۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ دولت آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ برہان نظام شاہ اس کے ہمراہ بھی تھا اور حقیقت حال سے واقف بھی۔

عماد الملک اس کارروائی سے بے خبر تھا۔ قلعہ تعمیر ہو چکا تھا اور عماد الملک اس کی حفاظت کا انتظام کر کے اپنے ممالک کی طرف لوٹ گیا تھا کہ مکمل خاں بلائے ناگہانی کی طرح قلعے کے سامنے پہنچ گیا اور باتری پر حملہ کر دیا۔ قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ جو اندر تھا وہ اندر رہ گیا۔ قلعہ نو تعمیر شدہ تھا۔ ابھی یہاں اتنا لشکر اور اناج نہیں تھا کہ محصورین زیادہ دن تک محاصرے میں رہ سکتے جبکہ رسد پہنچنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا۔ مکمل خاں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا یہ اندیشہ تھا کہ عماد الملک اپنے لوگوں کی مدد کو ضرور پہنچے گا اور ممکن ہے اسٹیل عادل شاہ کو بھی مدد کے لیے بلا لے۔

مکمل خاں کے بہادر سپاہیوں نے مکندوں اور زینوں کے ذریعے قلعے کے میناروں پر چڑھ کر حصار کو خیر کر لیا۔ قصبہ پاتری نظام شاہیوں کے قبضے میں آ گیا۔ برہان نظام شاہ نے اپنے ایک امیر میاں محمد غوری کو مکمل خاں کے خطاب سے نوازا اور قلعے کا حاکم مقرر کر کے واپسی کا بلکل بجا دیا۔

لشکر اور بھاری ساز و سامان پیچھے آتا رہا اور برہان نظام شاہ برہان کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا۔ دولت آباد کے مقام پر ایک گاؤں کے قریب موسیقی کی مدھرتانوں نے اس کے قدم روک لیے۔ جوانی کے قدم بے خوفی کے سائے میں پلتے ہیں۔ اس نے اپنے مختصر سے لشکر کو باہر چھوڑا اور خود گاؤں میں داخل ہو گیا۔ بڑے بڑے گیس کے ہنڈے جل رہے تھے۔ بہت سے لوگ دائرہ بنائے بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان ایک قاتلہ عالم رقاصہ جو نقص بھی کسی نے توجہ بھی نہیں دی اور وہ ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس کے حسن کا نظارہ کرنے لگا۔

برہان نظام شاہ حکمران تھا۔ دربار میں رقاصاؤں اور موسیقی دانوں کی کمی نہیں تھی لیکن اس رقاصہ میں کوئی ایسی بات بھی کہ وہ دل ہار بیٹھا۔

”بھائی یہ رقاصہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔“ ”تم کیا اس گاؤں کے نہیں ہو یا جان بوجھ کر انجان بن رہے ہو؟“ اس آدمی نے اس کی طرف دیکھ کر بغیر کہا اور پھر غیر ارادی طور پر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا شامی لباس دیکھ کر جیسے سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

”اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھارہی ہیں تو آپ برہان نظام شاہ ہیں یا کوئی اور حکومتی عہدیدار۔“ ”میں کوئی بھی ہوں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“

”اس کا نام بھان متی ہے۔ قصبہ پاتری سے آئی ہے۔ گاؤں کے کھیا کے بیٹے کی شادی ہے۔“ اس آدمی نے کہا اور بھاگ کر کھیا کو بلا لیا۔ مجھے میں کھلی سچ سمجی۔ کھیا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا۔

بھونزے نے چاہا پھول کا سارا رس پی جائے لیکن فی الوقت تو صرف اتنا کر سکا کہ گلے میں پڑا ہوا مردار بید کا ہار اس کی طرف اچھال دیا۔ پھول اپنی شاخ سمیت جھک گیا۔ مسجد سے اذان بلند ہوئی اور محفل برخواست ہوئی۔ بھان متی نے اس کے قدموں میں سجدہ کیا۔

”آج رات گاؤں سے باہر ہمارے خیمے میں آ کر ہم سے ملو۔“ ”جو حکم سرکار کا۔“

برہان نظام شاہ اس گفتگو کے بعد اٹھ گیا۔ اس کے پلے جانے کے بعد کھیا آگے بڑھا اور بھان متی سے تحسانہ لہجہ میں مخاطب ہوا۔

”تم میرے بیٹے کی فکر چھوڑو اور فوراً برہان نظام شاہ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ہم پر کوئی مصیبت ٹوٹے۔“

”آپ سے زیادہ مجھے فکر ہے۔ میرے وطن قصبہ پاتری پر برہان نظام کا قصبہ ہو چکا ہے۔ اسے خوش کر کے ہی میں اپنے وطن میں خوش رہ سکتی ہوں۔“

مکمل خاں دکنی رات بھر اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ وہ اپنے خیمے میں پہنچ گیا، اس نے باریابی کی اجازت مانگی اور حضور میں پہنچ گیا۔

”ہو سکتا ہے عماد الملک ہمارے تعاقب میں نکل چکا ہو۔ ہمیں تو فوراً احمد نگر پہنچنا چاہیے تھا۔ آپ نے ایک رات ضائع کر دی۔ اب بھی وقت ہے، آپ فوراً روانگی کا حکم جاری فرمائیے۔“

”ہم آج کی رات بھی یہیں گزاریں گے۔“ ”یہاں..... اس ویرانے میں؟ دشمن سے بے خوف ہو کر؟“

”ہمیں کسی کی پروا نہیں۔ ہم نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔“ ”لیکن معلوم تو ہو، آپ آج کی رات رکنے پر کیوں بعد ہیں؟“

”ہم آپ کو کچھ بتانے کے پابند نہیں۔“ اس قطعی جواب کے بعد مکمل خاں کا وہاں بیٹھنا فضول تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ آیا لیکن حیران ضرور تھا کہ برہان شاہ کو ایسا کیا ضروری کام ہے جس کے لیے وہ ہم سب کو خطرے میں ڈال رہا ہے۔ اب ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے فوراً سپہ سالار کو طلب کیا اور اسے مکمل تیار رہنے کا حکم دیا۔

رات ہوتے ہی برہان شاہ نے اپنے آدمی بھیج کر بھان متی کو بلوایا۔ اب مکمل خاں پر عقدہ کھلا کہ وہ رات کو یہاں کیوں رکھا تھا۔ برہان شاہ کو کھجنا تھے کار تھا۔ اس کی

نئی جوانی نے یہ گل کھلائے تھے۔ اب اس کا علاج کوئی نہیں تھا۔

رات بھر پورا لشکر شب خون کے خوف سے جاگتا رہا اور برہان شاہ آدیش دیتا رہا۔

صبح ہوئی اور برہان شاہ کے حکم سے لشکر نے کوچ کیا تو مکمل خاں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بھان متی نامی رقاصہ برہان شاہ کے ساتھ تھی۔

احمد نگر پہنچتے ہی برہان شاہ نے تو جیسے مکمل خاں کی طرف سے آنکھیں ہی پھیر لیں۔ اس نے کسی بھی امیر کو اپنے پاس طلب کرنا چھوڑ دیا۔ وہ سلطنت کے کاموں سے غافل ہو کر بھان متی کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔

مکمل خاں یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ چند دنوں کا نشہ ہے اتر جائے گا لیکن جب اس نے یہ سنا کہ برہان شاہ نے اس بازاری عورت سے شادی کر لی اور حرم کی دوسری عورتوں پر اسے فوقیت دینے لگا ہے تو اسے انجام صاف نظر آنے لگا۔ اس نے اپنا پہلو بچا پانی مناسب سمجھا۔ ایک روز موقع دیکھ کر برہان شاہ کے حضور پہنچ گیا اور وزارت کی انگوٹھی اتار کر اس کے آگے رکھ دی۔

”حضور! وکالت و وزارت کی انگوٹھی حاضر ہے۔ جب تک آپ کم عمر تھے، میں نے اپنی ضعف العری کے باوجود آپ کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اب جبکہ حضور خود مہمات سلطنت انجام دینے کے قابل ہو گئے ہیں، مجھے معاف فرمائیے۔“

برہان شاہ تو خود یہی چاہتا تھا کہ اسے کوئی سمجھانے والا نہ رہے۔ اس نے تھوڑی سی بناوٹی حیل و حجت کے بعد درخواست قبول کر لی۔

مکمل خاں نے تمام سیاسی و ملکی معاملات سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے مکان میں غلوت نشیں ہو گیا۔ اس کے بعد اپنے انتقال تک غلوت نشیں ہی رہا۔ بھی عید بقر عید حاضر دربار ہو جاتا تھا اور بس۔

☆☆☆

اسٹیل عادل شاہ دشمنوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ عماد الملک نے کئی مرتبہ اسے احمد نگر پر حملے کے لیے اکسایا تھا لیکن اسے اپنے علاقے سے نکلنے کی فرمت نہیں مل رہی تھی بلکہ اب تو اسے یہ خوف ہونے لگا تھا کہ برہان شاہ صورت حال سے تنگ آ کر اس کے علاقے کی طرف نہ چڑھ دوڑے۔ اس کے وزیر اسد خاں لاری نے اسے مشورہ دیا کہ برہان نظام شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔

دووں سوار اس کا پیغام پہنچانے کے لیے عماد الملک کی طرف روانہ ہو گئے۔

دووں قاصدوں کے روانہ ہوتے ہی سلطان بہادر نے تیار شروع کر دی اور اپنے لشکر اور خزانے کو لے کر دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔

برہان نظام شاہ کو جب اس تیاری کا علم ہوا تو اس نے اسماعیل عادل شاہ اور قلی قطب شاہ کے نام خطوط روانہ کیے۔ قلی قطب شاہ اس وقت کسی اور مہم میں مصروف تھا اس لیے اس نے صاف انکار کر دیا البتہ اسماعیل عادل شاہ نے برہان کی مدد کی اور اپنے لشکر سے چند ہزار سوار منتخب کر کے ان کو امیر برید کے ساتھ مع خزانہ و سامان جنگ امیر برید کے ہمراہ روانہ کر دیے۔

سلطان بہادر ماہور اور پاتری کو نظام شاہیوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے برابر میں داخل ہوا۔ یہاں پہنچتے ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ یہاں مقیم ہو گیا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر عماد الملک کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا۔ اس نے سلطان بہادر کی خدمت میں عرض کیا۔ ”یہ میرا ملک ہے۔ آپ کو چاہیے کہ پیش قدمی کریں۔ برہان نظام شاہ کو تباہ و برباد کر کے اگر آپ اس کے ملک کا کچھ حصہ مجھے بھی عیادت فرمائیں تو میں اپنے بیوی بچوں کو بھیج کر مذکورہ علاقہ سارے کا سارا آپ کی نذر کر دوں گا اور ملازموں کی طرح آپ کے ساتھ ہوں گا۔“

سلطان بہادر نے یہ درخواست قبول کر لی اور نظام شاہی فوج کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جو پہاڑی علاقے میں مقیم تھی۔

پہلے حملے میں اسے شکست ہو گئی لیکن سلطان بہادر نے عماد الملک کی گھرائی میں بیٹے ہزار سواروں کا ایک دوسرا لشکر روانہ کیا۔ برہان نظام شاہ اور امیر برید میں اس لشکر سے مقابلہ کرنے کی تاب نہ تھی۔ برہان نظام شاہ خواجہ جہاں کے علاقے ”پرنده“ کی طرف فرار ہو گیا۔

گجراتیوں نے تعاقب ضرور کیا لیکن برہان نظام شاہ ”پرنده“ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

برہان نظام شاہ ”پرنده“ میں تھے۔ واپسی کے دروازے اس پر بند ہو چکے تھے۔ سلطان بہادر بے خوف و خطر احمد نگر پہنچ گیا اور باغ نظام میں قیام پزیر ہوا۔ یہاں ایک وسیع چبوترہ بنا ہوا تھا اور در و درمک وسیع میدان تھا۔ وہ اس وسیع چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اہل شہر کو حکم ہوا کہ اس کے

”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن گجرات میں بھی جنگ چھڑ گئی؟“

”گجرات کی جنگ سے ہمارا کیا تعلق۔“

”احمد نگر کا بادشاہ مارا ماری پر تلا ہوا ہے۔ عماد الملک کمزور پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے حاکم گجرات سلطان بہادر گجراتی کو مدد کے لیے پکار رہا ہو۔“

”مشکل ہے مگر کیا خبر۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مدد ہی مانگتی تھی تو اسماعیل عادل شاہ کو بھی پکارا تھا۔“

”اب وہ زمانے گئے۔ اسماعیل عادل شاہ کی بہن برہان نظام شاہ کے گھر میں ہے۔ اب وہ اس کے خلاف نہیں لڑ سکتا۔“

یہ سوار دیہاتیوں کی باتوں کو چھوڑ کر کرب کے آگے بڑھ چکے تھے۔ اب وہ کئی سڑک پر رواں دواں تھے۔ دن کی وجہ سے ان کے سروں سے گزری اور شام کے اندھیرے چھلنے لگے۔ وہ شہر میں داخل ہوئے تو دوکان بیند ہونے لگی تھیں۔ سلطان بہادر سے ملاقات کا یہ کوئی وقت نہیں تھا۔ رات کسی سرائے میں ہی گزاری جاسکتی تھی۔ مسئلہ زبان کا بھی تھا۔ وہ یہاں کی زبان سے ناواقف تھے۔ کسی نہ کسی طرح مقامی افراد سے سرائے کا پتا پوچھ لیا۔

”یاد رکھو، ہمارے پاس بہت سی تحائف ہیں۔ نیا ملک ہے نئے لوگ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ سرائے میں ہم اس مال سے ہی محروم ہو جائیں۔“

”ہاں، ہمیں بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔“

وہ ایک سرائے میں پہنچ گئے۔ مال کی گھر میں نیند کہاں آتی۔ رات باتوں میں کاٹ دی۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے سرائے چھوڑی اور قلعے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ پہرے داروں کو عماد الملک کی طرف سے دیا ہوا خط دکھایا اور اپنی شناخت کرائی۔

ان پہرے داروں نے انہیں دروازے کے قریب ایک وسیع کمرے میں بٹھا دیا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی۔ پہرے دار تو انہیں بٹھا کر بھول گئے تھے۔ دوپہر کے قریب انہیں سلطان بہادر کے حضور پیش کر دیا گیا۔ انہوں نے وہ تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے جو عماد الملک نے اس کے لیے بھیجے تھے اور خط اس کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا۔

”عماد الملک سے کہنا وہ تیاری کرے، ہم اس کی مدد کے لیے تیار ہیں۔ حاکم احمد نگر سے ہمیں بھی بہت سے حساب چکانے ہیں۔“

اسماعیل عادل شاہ بھی تجربہ کار تیر اندازوں کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلا۔ برہان نظام شاہ کے ساتھ ایک بڑا لشکر تھا لیکن ایک زبردست لڑائی کے بعد نظام شاہیوں کو شکست ہو گئی۔ عماد الملک ”کاویل“ کی طرف بھاگ گیا اور برہان نظام شاہ احمد نگر واپس آ گیا۔

یہ شکست ایسی تھی کہ برہان نظام شاہ کے ہوش جاتے رہے۔ وہ ایسا مایوس ہوا کہ بھان متی کے تازخے میں بھی اسے نہیں بھلا سکتے تھے۔ اس وقت اس کی مایوسی میں مزید اضافہ ہو گیا جب اس نے سنا کہ اسماعیل عادل شاہ نے قصبہ پاتری پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کا غصہ مایوسی پر غالب آ گیا۔ وہ ایک زبردست لشکر لے کر پاتری کی طرف روانہ ہوا اور دو ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد اسے دوبارہ اپنے قبضے میں لے آیا۔

برہان نظام شاہ اس مقام سے قلعہ ماہور کی طرف روانہ ہوا۔ اس قلعے کو بھی اس نے فتح کر لیا۔ عماد الملک مقابلے کی تاب نہ لاکر پہلے کی طرح برہان پور کی طرف بھاگ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے پہلے کی طرح صلح کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے بلکہ ارد گرد کے کئی حکمرانوں سے مدد لے کر برہان نظام شاہ اور اس کے اتحادی احمد آباد بیدر کے حکمران قاسم برید سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

بدقسمتی سے اس لڑائی میں بھی عماد الملک اور اس کے اتحادیوں کو شکست ہو گئی۔ عماد الملک گھبرا کر برہان پور کی طرف بھاگا۔

اس جنگ میں برہان نظام شاہ کے ہاتھ دشمن کا بہت سامان واسباب لگا۔

اب عماد الملک کے لیے دکن میں کوئی سہارا نہیں رہ گیا تھا۔ اسماعیل عادل شاہ سے اسے امید نہیں رہی تھی کیونکہ اس کی بہن برہان نظام شاہ کے گھر میں تھی۔

☆☆☆

دوسرا کاویل اچلی پور سے گجرات جانے والی سڑک پر دوڑے چلے جا رہے تھے۔ اوپر اوپر کھیتوں میں کام کرنے والے ان سواروں کی برق رفتاری دیکھ کر کسی سوچ میں کم ہو گئے تھے۔

”یہ کوئی عام سوار نہیں ہیں۔ شاہی سوار معلوم ہوتے ہیں۔ عماد الملک کی طرف سے آ رہے ہیں۔“

”وہ تو فیک ہے لیکن یہ اتنی جلدی میں کہاں جا رہے ہیں؟“

”دیکھتے نہیں، یہ سڑک گجرات کی طرف جاتی ہے۔“

”اس کی صورت کیا ہوگی اور ضرورت کیوں ہے؟“

اسماعیل عادل شاہ نے کہا۔

”صورت تو یہ ہوگی کہ شادی وغیرہ کا سلسلہ استوار کیا جائے۔ ضرورت اس لیے ہے کہ اس مشترک طاقت کے ساتھ اپنے ازلی دشمن قاسم برید سے باز پرس کی جائے اور اس کو خوب مزہ چکھایا جائے۔ اسی طرح دوسرے تریفوں سے بھی شٹا جاسکتا ہے۔“

اسماعیل عادل شاہ نے اسد لاری کا مشورہ مان لیا اور اس کوشش میں لگ گیا کہ عماد الملک کے علم میں لائے بغیر برہان نظام شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ بہر حال دونوں طرف کے امراء کی کوششوں سے برہان شاہ اور اسماعیل عادل شاہ نے قلعہ شولا پور کے نواح میں ملاقات کی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں اسماعیل عادل شاہ نے اپنی بہن مریم سلطانہ کی شادی برہان نظام شاہ سے کر دی۔

اسماعیل عادل شاہ کے کسی امیر نے برہان نظام شاہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ قلعہ شولا پور بی بی مریم کے جہیز میں دے دیا جائے گا لہذا شادی ہو جانے کے بعد برہان نظام شاہ نے اس قلعہ کا مطالبہ کیا۔ اب خدا جانے اسماعیل عادل شاہ کے علم میں تھا یا بعد میں اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”میں نے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا تھا۔ اگر ملازموں میں سے کسی نے ایسی کوئی بات کی تھی تو انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ مجھ پر یہ لازم نہیں کہ ان کے کہے ہوئے وعدے کا پابند ہوں۔“

برہان نظام شاہ اس وقت تو خاموش رہا اور احمد نگر واپس آ گیا لیکن واپس آتے ہی قلعہ شولا پور فتح کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس کڑے وقت میں اسے علاء الدین عماد الملک کی یاد آئی۔ اسے معلوم تھا کہ اسماعیل عادل شاہ اور عماد الملک کے تعلقات کشیدہ ہو گئے ہیں۔ اس نے اس کشیدگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک سفارت عماد الملک کی طرف روانہ کی اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ نتیجہ اس کی مرضی کے مطابق نکلا۔ عماد الملک، اسماعیل عادل شاہ سے جلا بیٹھا تھا، فوراً اس درخواست کو قبول کر لیا۔

برہان نظام شاہ تیس ہزار سواروں اور ایک بڑے توپ خانے کے ساتھ قلعہ شولا پور کی فتح کے لیے روانہ ہوا۔ عماد الملک کی فوجیں بھی اس کے ساتھ چلی گئیں۔

سلام کو حاضر ہوں۔ وہ چالیس روز تک متواتر اس چوڑے پر بیٹھا رہا۔ ہر خاص و عام کا سلام لیتا۔ ہاتھی، اونٹ اور ہرن میدان میں چھوڑے جاتے اور بادشاہ ان کی لڑائی کا تماشا دیکھتا۔

وہ ان کھیل تماشوں میں مگن تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے لشکر پر کیا بیت رہی ہے۔ نظام شاہی امراء بڑی چالاک اسے سبھرائیوں کے لشکر کی بے چینی بڑھا رہے تھے۔ یہ لوگ غلہ اور ضرورت کی دوسری چیزوں کو بے آسانی سبھرائیوں تک نہ پہنچتے دیتے تھے۔ حالت یہ ہوئی کہ سبھرائیوں کے لشکر میں سخت قحط پڑ گیا۔ بے شمار ہاتھی اور گھوڑے ہلاک ہو گئے۔

یہ صورت حال دیکھ کر سبھرائی امیروں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ سب کے سب سلطان بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مشکل سے آگاہ کیا۔

طویل ترین اجلاسوں کے بعد ان امراء نے مشورہ دیا کہ اگر اس ملک کو فتح کرنا ہے تو سب سے پہلے قلعہ دولت آباد کو تسخیر کرنا چاہیے جو کہ سرحد پر واقع ہے۔ سلطان بہادر کو یہ جو یزید پسند آئی لیکن احمد نگر کی رونق دیکھ کر اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس چوڑے سے اتر کر کہیں اور جائے۔ وہ یہاں سے کوچ کرنے میں حیلے بہانے کرنے لگا۔ صاف جواب بھی نہیں دیتا تھا اور کوچ بھی نہیں کرتا تھا۔

ایک روز وہ اپنے پانگ پر لینا نیند کے مزے لے رہا تھا کہ غریبوں کا ایک گروہ اس کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ یہ غریب نہایت بھیانک شکلوں کے تھے۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں آگ تھی اور کسی نے اپنے ہاتھوں میں پہاڑ اٹھایا ہوا تھا۔ قریب تھا کہ وہ یہ سب چیزیں سلطان بہادر پر ڈال دیں کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور اس کا پورا بدن پسینے میں شرابور تھا لیکن شکر بھیج رہا تھا کہ یہ شخص خواب تھا۔ ذرا ہوش ٹکانے آئے تو خوف اس پر ایک مرتبہ بھر غالب آ گیا۔ یہ خوف بلاوجہ نہیں تھا۔ کوئی طاقت ہے جو اسے یہاں سے ہٹانا چاہتی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے خواب کی تعبیر بتانے والوں کو بلایا۔ کسی نے کچھ تعبیر بتائی کسی نے کچھ۔ ایک بوڑھا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اس نے بتایا۔

”نظام شاہ (برہان نظام شاہ کا باپ) کے زمانے میں اس مقام پر بہت بڑی لڑائی ہوئی تھی۔ ہندو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد قتل کر دی گئی تھی۔ ان مقتولوں کی روضیں

اسی مقام پر رہنے لگی ہیں اور شیطانوں کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خواب انہی روجوں کے زیر اثر آپ کو نظر آیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے یہ روضیں نہیں چاہتیں کہ میں یہاں رہوں؟“

”مطلب آپ خود اخذ کر سکتے ہیں۔ آپ اگر یہاں قیام کیے رہے تو آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔“ سلطان بہادر پر پہنچی طاری ہو گئی۔ اس نے اسی دن اس مقام سے کوچ کر کے ایک اور مقام پر پڑاؤ ڈالا اور پھر دو تین روز کے بعد وہاں سے بھی روانہ ہو گیا۔ عماد الملک کو بھی طلب کر لیا اور دولت آباد کے مقام پر قیام پذیر ہو گیا تاکہ قلعہ دولت آباد کی تسخیر کے لیے کوشاں ہو۔

برہان شاہ نے گھر ہو کر ابھی تک ”پرنده“ میں مقیم تھا۔ اسے دولت آباد کی تسخیر کا اندیشہ ہوا تو اس نے گھبرا کر اسماعیل عادل شاہ کو خط لکھا۔

”آپ نے جس برادرانہ محبت سے میری مدد کی میں اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں لیکن جب تک آپ بذات خود اس طرف توجہ نہیں کریں گے مجھے مصیبت سے چھکارا نہیں ملے گا۔ سلطان بہادر دولت آباد تک آ گیا ہے۔ مجھے اس سے چھکارا دلایئے۔“

ایک قاصد بھلی کی سی تیزی سے روانہ ہوا اور اسی برق رفتاری سے واپس پلٹا۔ اسماعیل عادل شاہ نے پیغام بھیجا تھا۔

”بیچارے کے ہندو اس وقت موقع کی تلاش میں ہیں۔ اگر میں بیچارے سے نکلوں گا تو یہ لوگ دریائے کرشنا عبور کر کے سارے شہر کو باد کر دیں گے۔“

برہان نظام شاہ اس جواب سے سخت مایوس ہوا۔ اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ کوئی امیر ساتھ نہ تھا، صرف سپاہی تھے۔ حرم کی کچھ خواتین تھیں۔ ان میں بھان متی بھی تھی۔ یہ بھان متی بھی جس کی وجہ سے اس کا دل لگا ہوا تھا۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ بھان متی صرف رقاصہ نہیں بلکہ نہایت عقل مند عورت ہے۔ اس کے مشورے اکثر اوقات اس کے کام آتے رہے تھے۔ اس نے بھان متی کو طلب کیا۔

”خیر تو ہے، کیا آج دن کے وقت مجھے سناٹی گری کرنی ہوگی؟ میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ دن کے وقت شراب نہ پیا کریں۔“

”میں نے اس وقت تمہیں کسی اور کام سے بلایا ہے۔“

”بندی حاضر ہے۔“

برہان شاہ نے اسے تمام حالات سے آگاہ کیا اور اس کا مشورہ چاہا۔

”آپ احمد نگر واپس جائیں، وہاں لشکر جمع کریں اور مردانہ وار دولت آباد روانہ ہوں۔ سلطان بہادر سے مقابلہ کریں۔“

کسی کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن بھان متی کی بات اس کے دل کو لگی۔ وہ احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے حسب استطاعت لشکر جمع کیا اور پوری تیاری کے ساتھ دولت آباد کی راہ لی جہاں سلطان بہادر کا لشکر تھا۔ انھیں مار رہا تھا اس سے چارکوں کے فاصلے پر برہان شاہ نے قیام کیا۔ اس جگہ وہ بڑی احتیاط اور چوکی کے ساتھ پورے تین مہینے مقیم رہا۔ اس عرصے میں اس کا لشکر سبھرائیوں سے برابر چھڑ چھاڑ کرتا رہا۔ سبھرائیوں کو اتنا تنگ کیا کہ وہ جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے۔

امیر برید نے برہان نظام شاہ کی اجازت کے بغیر ہی صف آرا کی شروع کر دی۔ برہان نظام شاہ امیر بریدی کی جرأت سے واقف تھا۔ اسی وقت میدان میں آیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ طرفین نے خوب خوب داد شجاعت دی۔ آخر کار اسماعیل عادل شاہی لشکر کا پلہ بھاری رہا۔ سبھرائیوں کو شکست فاش ہوئی۔

برہان نظام شاہ نے اس فتح کو اتفاق قرار دیا۔ وہ اپنے آپ میں اتنی سکت نہیں سمجھتا تھا کہ بہادر شاہ سے مقابلہ کر سکے۔ اب ایک ہی ترکیب تھی کہ کسی طرح سلطان بہادر اور عماد الملک میں دوری پیدا کر دی جائے۔ اس نے عماد الملک کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور اسے سلطان بہادر کی نیت سے آگاہ کیا۔ قاصد بھی ایسا چرب زبان تھا کہ عماد الملک کو شیشے میں اتار لیا۔

”آپ نے سلطان بہادر کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بیش بہا تحائف اس کی نذر کیے۔ وہ تمہاری مدد کے بہانے دکن میں داخل ہوا۔ اس سے مل کر پاتری اور ماہور کے قلعہ نظام شاہی قبضے سے نکالے۔ برابر اور احمد نگر میں اس کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ ہر سال اسے ہفتی اور کم یا ب تحفے بھیجے لیکن اب وہ یہاں جم کر بیٹھ گیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے سلطان بہادر ہم سے ہمارا ملک جھینٹا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے غلے نہیں۔ اس سے دوستی رکھ کر آپ اپنا ملک بھی گنوائیں گے۔ یہی وقت ہے کہ دشمنی چھوڑ کر برہان شاہ سے دوستی کا ہاتھ بڑھائیے۔“

سلطان بہادر نے ہوا کا رخ بدلتے دیکھا تو اسے

واپس کی فکر ہوئی لیکن ان دنوں دریاؤں میں پانی بہت چڑھا ہوا تھا۔ برہان نظام شاہ نے ایک مرتبہ پھر ایک چال چلی۔ اس نے سلطان بہادر کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اپنے آدمیوں کو تحفوں اور نذرانوں کے ساتھ اس کی خدمت میں بھیجا۔ جب اس نے دیکھا کہ دکنی اس کے مطیع ہو گئے ہیں تو اس نے دکنیوں کی مخالفت ترک کر دی اور گجرات واپس چلا گیا۔

☆☆☆

بھان متی کی کثرت شراب نوشی نے اسے موت کے دہانے پر لاکھڑا کیا تھا۔ شاہی محکموں کی کوششیں راہگاہ چلی گئی تھیں۔ اس کا آخری وقت تھا۔ برہان نظام شاہ اپنے جھیلوں میں پڑ کر بھان متی کی طرف سے بالکل ہی غافل ہو چکا تھا۔ بھان متی نے طبیبوں کی منت سماجت کر کے برہان نظام شاہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ کسی طرح اس کا پیغام برہان تک پہنچا گیا۔ اسی وقت عماد الملک کی طرف سے آئی ہوئی سفارت رخصت ہوئی تھی۔ برہان کا مزاج خوشگوار تھا۔ وہ ملاقات کے لیے تیار ہو گیا۔ پچھلی یادیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ وہ بھان متی کو دیکھنے اس کے محل میں چلا آیا۔

بھان متی بڑیوں کا ڈھانچا بنی بستر پر لیٹی تھی۔ برہان شاہ کو دیکھتے ہی آنکھ کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکی۔ بڑی حسرت سے برہان شاہ کی طرف دیکھا۔

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ بھان متی نے کزور آواز میں کہا۔ ”ایک اعتراف ہے جو اس وقت کرنا چاہتی ہوں۔ اس امید پر کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔“

”کہو بھان متی۔ میں سن رہا ہوں۔“

”میں عماد الملک کے حرم کی ایک معمولی سی کنیز تھی۔ اسی نے مجھے دولت آباد کے قریب آپ کا گؤں میں بھیجا تھا جہاں میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ گؤں کا چودھری بھی اس سے ملا ہوا تھا۔ مجھے بھیجے کا مقصد یہ تھا کہ میں آپ کو اپنے دام میں پھانس لوں اور آپ کے خلاف ان سازشوں میں شریک ہو جاؤں جو وہ آپ کے خلاف کر رہا تھا۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ آپ خود ہی وہاں چلے آئے۔ مجھے اس لیے بھیجا گیا تھا کہ میں آپ کو شراب نوشی کی راہ پر لے آؤں اور پھر شراب میں زہر ملا کر آپ کی ہلاکت کا سامان کروں۔ میں نے آپ کو شراب نوشی کی راہ بڑھائی تو دیا لیکن مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں آپ کو قتل نہ کر سکی۔ ایک مرنے والی کی یہ نصیحت یاد رکھیے گا

کہ عہد الملک آپ کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اسے دوست نہ سمجھئے گا جیسا کہ آپ ان دنوں کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس سلطان بہادر کی فرمان برداری سے اپنی سلطنت بچا لیتے ورنہ عہد الملک سلطان بہادر سے مل کر احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بچا دے گا۔“

وہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ اس کی آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی زندگی اس سے روکھئی۔ برہان شاہ نے اس کی طرف تاسف سے دیکھا اور اس کے قریب سے اٹھ گیا۔

وہ بھان مٹی کی باتوں سے ایسا متاثر ہوا تھا کہ اس کے پاس سے اٹھ کر سیدھا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا اور حکم دے دیا کہ جب تک وہ باہر نہ آئے، کوئی اس سے ملاقات کی درخواست نہ کرے۔ یہ جہارت صرف اس کی زوجہ مریم بی بی کر سکتی تھی جو اسماعیل عادل شاہ کی بہن ہونے کی وجہ سے خاص مرتبہ رکھتی تھی۔ برہان شاہ نے اس سے بھی کہلوادیا کہ وہ بھی ملاقات کی جسارت نہ کرے۔

خواب گاہ کی تنہائی میں وہ چند سال پہلے کے واقعات دہراتا رہا۔ ان شکستوں کے بارے میں سوچتا رہا جو عہد الملک کے ساتھ مل کر لڑائیوں میں اسے ہوئی تھیں۔ اسے ایک جنگ ایسی بھی یاد آئی جب عہد الملک اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ عہد الملک نے اسے سلطان بہادر کے نام کا خطبہ پڑھوانے سے روک دیا تھا۔ اسے بھان مٹی کی باتوں میں صداقت نظر آنے لگی۔ وہ خلاف توقع خلوت گاہ سے باہر آیا اور فوری اجلاس طلب کیا۔ اس کے وفادار امراء حکم ملتے ہی حاضر ہو گئے۔ اس نے بھان مٹی کا نام لیے بغیر عہد الملک کی سازشیں ان کے سامنے رکھیں اور عہد الملک کے بجائے سلطان بہادر کی طرف دوتی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے مشورہ طلب کیا۔

”اس طرح تو اسے دکن میں داخل ہونے کا موقع مل جائے گا۔“

”ہم اسے یہ موقع نہیں دیں گے۔ اس کے مطیع ہونے کا دم بھرتے رہیں گے۔ ضروری ہو تو اسے خراج بھی دیتے رہیں گے۔ وہ ہمارا اتحادی بن گیا تو عہد الملک کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہو سکے گی۔“

ایک طویل بحث کے بعد برہان شاہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ کسی کو سلطان بہادر کے پاس بھیجے اور دوتی کے لیے راہ ہموار کرے۔

برہان شاہ نے اپنے ایک امیر میران شاہ کو اعلیٰ تحفوں اور چند شہور ہاتھیوں کے ساتھ سلطان بہادر کی خدمت میں سگجرات روانہ کیا۔

میران شاہ وہاں پہنچا ضرور لیکن سلطان بہادر نے اس سے ملنے سے انکار تو نہیں کیا لیکن قدر سے تخریر کرتا رہا۔ کئی دن بعد وہ ملاضرور لیکن نہایت خفا تھا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ برہان شاہ نے میرے نام کا خطبہ صرف ایک بار پڑھوایا۔ یہ ہے اس کی وفاداری۔“

”برہان شاہ آپ کا مطیع و فرمانبردار ہے۔ اگر اس سے کوئی امر آپ کی مرضی کے خلاف سرزد ہوا ہو تو آپ معاف فرمائیں۔“

میران شاہ نے نہایت خوش اسلوبی سے برہان شاہ کے خلوص و محبت کا یقین دلایا اور کہا۔ ”یہ میری تحقیر رائے ہے کہ آپ برہان نظام شاہ پر لطف و کرم کر کے اپنا بھی خواہ بنالیں۔“

سلطان بہادر شاہ نے اس کی بات مان لی اور اسے احمد نگر کی طرف روانہ کروا دیا تاکہ برہان شاہ کو یہاں لایا جائے اور اس کی ملاقات سلطان بہادر سے کرائی جائے۔

برہان نظام شاہ سات ہزار پیادوں اور سواروں کے ساتھ برہان پور روانہ ہو گیا۔

برہان نظام شاہ نے خواجہ ابراہیم کو اپنا قاصد بنا کر اپنی روانگی سے پہلے ہی میران شاہ کے پاس روانہ کروا دیا تھا تاکہ ملاقات کے لیے ضروری امور پہلے ہی طے کر لیے جائیں۔

برہان نظام شاہ دریائے تپتی کے کنارے ایک موضع میں جا کر اترا اور خواجہ ابراہیم سے ملاقات کی جسے وہ اپنی روانگی سے قبل روانہ کر چکا تھا۔

خواجہ ابراہیم نے اسے بتایا۔ ”یہ قرار پایا ہے کہ سلطان بہادر تخت پر بیٹھا رہے گا اور برہان شاہ اس سے کھڑے کھڑے ملاقات کرے گا۔“

برہان شاہ یہ سنتے ہی بھوک اٹھا۔ ”یہ مجھے سے کبھی نہ ہو سکے گا کہ سلطان بہادر تخت پر بیٹھا رہے اور میں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہوں۔ اس سے تو بہتر ہے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا جائے اور میں یہیں سے واپس لوٹ جاؤں۔“

”حضور، مصلحت کا تقاضا ہے کہ اس وقت سر نہ بٹا کر لیا جائے اور اپنا مطلب نکالا جائے۔“ خواجہ ابراہیم نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

”میں مصلحت کے لیے بھی یہ ذلت گوارا نہیں لے سکتا۔“

”اب ایک ہی ترکیب ہے۔ اگر حضور فرمائیں تو عرض کروں۔“

”مجھے ملاقات پر مزید مجبور نہ کیجیے گا۔“

”میرے پاس قرآن مجید کا ایک نادر نسخہ ہے جو حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے مبارک ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ملاقات کے روز اسے اپنے ساتھ لیتے چلیں تاکہ سلطان بہادر اس مصحف مقدس کے استقبال کے لیے تخت کے نیچے قدم رکھے۔ اسے تخت سے نیچے اتارنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔“

برہان شاہ یہ تدبیر سن کر بہت خوش ہوا اور ملاقات کے لیے تیار ہو گیا۔ دوسرے دن سورج نکلنے کے بعد برہان شاہ، خواجہ ابراہیم کے ساتھ اس مقام کی طرف روانہ ہوا جو ملاقات کے لیے مقرر ہوا تھا۔ مقام پر پہنچ کر خواجہ ابراہیم نے مصحف مقدس کو اپنے سر پر رکھ لیا۔ جب شاہی پردہ سرا کے اندر داخل ہوئے تو سلطان بہادر نے انہیں دیکھ کر اپنے ایک مصاحب سے پوچھا۔ ”خواجہ ابراہیم کے سر پر کیا ہے؟“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، خواجہ ابراہیم نے قریب پہنچ کر کہا۔

”یہ قرآن مجید کا ایک نسخہ ہے جو حضرت علیؑ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔“ یہ سنتا تھا کہ سلطان بہادر بے اختیار اپنے تخت سے نیچے اترا اور استقبال کے لیے آگے بڑھا اور مصحف شریف کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگا دیا اور اسی طرح کھڑے کھڑے برہان نظام شاہ سے سلام لیا۔ سلطان بہادر نے خیریت پوچھی۔ برہان نظام شاہ نے اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نے خواجہ ابراہیم سے بیٹھنے کے لیے کہا کیونکہ وہ مصحف مقدس اس کے لیے لے کر آیا تھا اور برہان نظام شاہ کو نظر انداز کیا۔ خواجہ ابراہیم نے حکم سنا ضرور لیکن وہ بیٹھا نہیں۔ سلطان بہادر نے پھر بیٹھنے کو کہا اس نے پھر نظر انداز کر دیا۔ جب تیسری بار حکم جاری ہوا تو خواجہ ابراہیم نے محذرت خواہانہ جواب دیا۔

”حضور کا حکم میرے سر آنکھوں پر لیکن میں تعمیل سے مجبور ہوں۔ برہان نظام میرا آقا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کھڑا رہے اور میں بیٹھ جاؤں۔“

”وہ بھی بیٹھیں۔ میں نے منع توہی کیا ہے۔“

سلطان بہادر نے کہا اور برہان شاہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک

مناسب جگہ پر بٹھا دیا اور خود راقا صلے پر بیٹھ گیا۔ منگلو شروع ہوئی۔ آغاز سلطان بہادر نے کیا۔ ”موجودہ زمانہ بڑا ہنگامہ خیز ہے۔ چاروں طرف شورشیں برپا ہیں۔ بتاؤ تو سہی ایسے عالم میں تم نے کیسے زندگی بسر کی؟“

برہان شاہ نے نہایت عالمانہ انداز میں جواب دیا۔ ”جس بستی کا انجام بلندی ہو اور جس بجز کی انتہا وصل ہو، اس کے آخری لطف ہی کو یاد رکھنا چاہیے۔ خداوند تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ میں نے جس قدر پریشانی اٹھائی، آج توہی سی ویریں آپ سے مل کر اس کی تلائی ہوئی۔“

اس جواب میں سلطان بہادر کی تعریف بھی پوشیدہ تھی، اس لیے نہایت خوش ہوا اور خواجہ ابراہیم کے سامنے اس جواب کو تحریفی انداز میں دہرایا۔

”آپ نے سنا..... کیا فاضلانہ جواب دیا ہے۔“

”یہ سب کچھ حضور کی نوازشات کا نتیجہ ہے۔“

سلطان بہادر اس جواب سے بھی بے حد خوش ہوا، اسی وقت اٹھا۔ کمر بند، خنجر اور مرصع کھوار جو خود زیب تن کیے ہوئے تھا، اپنے جسم سے علیحدہ کیے اور برہان نظام شاہ کی کمر میں باندھ دیے۔

کچھ دیر بعد سلطان بہادر نے اپنا خاص گھوڑا منگو کر برہان شاہ کے سپرد کیا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم فن شہ سواری میں بڑی مہارت رکھتے ہو۔ یہ عربی گھوڑا حاضر ہے۔ ذرا سرا پر دہ کے گرد چکر تو لگاؤ۔“

برہان شاہ سوار ہوا اور دکن کے دستور کے مطابق گھوڑے پر سوار ہو کر اسے پھرایا۔ اس نے اس خوبصورتی سے گھوڑا پھرایا کہ سلطان بہادر تعریف کے بغیر نہ رہ سکا۔ خوش ہو کر فرمایا۔ ”یہ سواری چتر کے بغیر کچھ اچھی معلوم نہیں ہوئی۔ ایک چتر برہان کے سر پر سنا لیکن کی جائے۔“

برہان نظام شاہ نے فن شہ سواری کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ سلطان بہادر کا دل جیت لیا۔ اس کی پزیرائی میں اس نے دوسرے روز ایک بہت بڑا جشن منعقد کیا۔ اپنے تخت کے اطراف میں چار طلائی کرسیاں بچھوائیں۔ برہان شاہ اور اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ ان پر بٹھائے گئے۔

سلطان بہادر نے دل کھول کر تواضع کی۔ برہان نظام شاہ کو پانچ گھوڑے، دو ہاتھی اور بارہ سوہون عنایت کیے۔ سلطان بہادر کو معلوم تھا کہ چوگان بازی میں برہان

ملو خاں کی دادی اس صورت حال سے سخت تالاں تھی۔ آخر چھ ماہ بعد ہی چند امیروں کی مدد سے اسے گرفتار کر لیا گیا اور شہزادہ ابراہیم کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔

ابراہیم عادل شاہ تخت نشین ہوا تو برہان نظام شاہ ایک مرتبہ پھر پُر امید ہو گیا کہ اسماعیل عادل شاہ سے جو شرائط طے ہوئی تھیں، وہ ضرور پوری ہوں گی۔ اس نے اس سلسلے میں کئی سفارتیں ابراہیم کی طرف روانہ کیں لیکن وہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ اس کے خوشامدی امیروں نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ دکن کے علاقوں کی مساوی تقسیم فضول سی بات ہے بلکہ دانش مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ خود برہان نظام کے علاقے بھی فتح کر لیے جائیں۔ لطف تو یہ ہوا کہ اسماعیل عادل شاہ کا اتحادی اسد خاں لاری بھی اپنے وعدے سے پھر گیا اور ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ مل کر برہان نظام شاہ اور اس کے ہمدرد امیر قاسم برید پر چڑھائی کر دی۔ ان دونوں نے عادل شاہی لشکر سے جان بچا کر ایک قصبے میں پناہ لی۔ ابراہیم عادل شاہ کو اس سے نہیں اس کے علاقوں سے غرض تھی لہذا بالاکھاٹ دولت آباد کا رخ کیا اور اس علاقے کو ہر طرح سے تباہ و برباد کیا۔

یہ وقت برہان نظام کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ قصبہ میٹیر میں تھا اور امیر برید سخت پرتھو تھا۔ یہ مشکل اس وقت اور کڑی ہو گئی جب اسی بیماری کے عالم میں امیر برید کا انتقال ہو گیا۔ برہان نظام کا ایک بازو کوٹ گیا۔

اب برہان نظام کے لیے صلح کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے دکن کی معزز ہستیوں کو درمیان میں ڈالا۔ ان معزز لوگوں نے دونوں خاندانوں کے درمیان شرط ططور پر صلح کروادی۔ شرط یہ تھی کہ ابراہیم عادل شاہ کو شولا پور کے پانچ پرگنوں پر گئے واپس ملیں گے اور اسماعیل میں آہل میں کوئی جنگ نہ ہوگی۔

اس فتح کے بعد دونوں فریقوں نے اپنے اپنے ملکوں کی راہ لی۔

اس صلح کو ایک سال گزر گیا۔ یہ تمام عرصہ برہان نظام نے کانٹوں کی تاج پر گزارا۔ اسے شولا پور کے پانچ پرگنوں کے نکل جانے کا بے حد کھتا تھا۔ وہ برہان میں ان پرگنوں کو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی کمزوری سے خوفزدہ بھی تھا۔ اپنی کمزوری کو طاقت میں بدلنے کا موقع جلد ہی مل گیا۔ ابراہیم عادل شاہ اور علاؤ الدین عا الملک کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ یہی موقع تھا جب برہان نظام شاہ کو

شاہ کی حراست میں آیا۔ ادھر سلطان قلی قطب شاہ نے نزاکت وقت کے پیش نظر کوکنڈہ کو نہیں چھوڑا۔ وہ اگرچہ جنگ کے میدان میں نہیں آیا لیکن قلعہ کے لوگوں کی حفاظت اور ان کی مدد کے لیے سواروں اور پیادوں کی ایک اچھی تعداد روانہ کر دی۔

اسماعیل عادل شاہ قلعے کے محافظوں سے جنگ کرتا رہا۔ ممکن تھا کہ یہ جنگ نتیجہ خیز ثابت ہوتی مگر حکم الہی سے اسماعیل عادل شاہ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اس نے اپنے امیر اسد خاں لاری کو طلب کیا اور حکم دیا۔

”مجھے یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آ رہی ہے۔ تم تلنگانہ کی جنگ جاری رکھو اور مجھے حسن آباد گلبرگہ روانہ کر دو۔ طبیعت ٹھیک ہوتے ہی میں تم سے آلوں گا۔“

ابھی اسے گلبرگہ پہنچنے کی تیاری کی جا رہی تھی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی لڑائی کا سلسلہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

اسماعیل عادل شاہ کے انتقال کی خبر اسد خاں لاری نے کسی کو نہ ہونے دی۔ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کی موت کو صیغہ راز میں رکھا جائے۔ بادشاہ کے مردہ جسم کو پانگی میں رکھ کر اس پر نقاب ڈال دی۔ جب دن کا اجالہ ختم ہوا اور چاروں طرف تاریکی چھا گئی تو اسد خاں لاری نے اس کی لاش کو قصبہ کوکنڈہ دیا جہاں وہ اپنے والد مرحوم کی قبر کے برابر جگہ پاسکا۔

اس کی موت کے ساتھ ہی وہ تمام شرائط دم توڑ گئیں جو دونوں بادشاہوں کے درمیان طے پائی تھیں۔ اسماعیل عادل شاہ کو تلنگانہ کی طرف جانا تھا اور برہان نظام کو براری کی جانب۔

اسماعیل عادل شاہ کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے ملو خاں کو تخت نشین کر دیا گیا۔

برہان نظام شاہ اب اس خاندان کا ایک فرد بن چکا تھا۔ ملو خاں سے اسے بڑی امیدیں تھیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسماعیل عادل شاہ کے عزائم کو پورا کرے گا۔ تلنگانہ فتح ہوگا اور پھر برادر اور پھر دکن کو آپس میں مساوی تقسیم کر لیا جائے گا۔

اس کی ان امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب ملو خاں نے تخت نشین ہوتے ہی عیش پرستی کا راستہ اختیار کیا اور خود کو نوشی اور رقص کی محفوں میں کم کر لیا۔ رنگ رلیوں میں ایسا بھوکا ہو گیا کہ پھر بھی نہ ابھرا۔

یہ خط پڑھتے ہی برہان نظام شاہ کی غیرت نے جوش مارا۔ فوراً حکم دیا کہ سرپردہ شاهی باہر نکالا جائے۔ دوسرے روز وہ سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے بسائے ہوئے موش آمدن پونچھ کر چند روز قیام کیا اور لشکر فرام کرنا رہا۔ جب تمام سامان مکمل ہو گیا تو برہان نظام بڑی شان و شوکت سے عادل شاہی سرحد کی طرف روانہ ہوا۔

ادھر اسماعیل عادل شاہ بارہ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ برہان نظام کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مٹھیں مقرر ہو گئیں۔ اس کے بعد میدان جنگ فریقین کی آزمائش گاہ بن گیا۔

جب تک سپاہیوں کے پاس سامان جنگ اور دلوں میں عزم رہا، لڑائی برابر جاری رہی اور کثرت و خون کا بازار گرم رہا۔ آخر ایک حکمران جیسا اور ایک ہار۔

اس جنگ کا انجام نظام شاہیوں کے حق میں رہا ہوا۔ انہیں شکست ہوئی۔ برہان شاہ کے وفاداروں نے برہان نظام کو صحیح سلامت میدان جنگ سے نکال لیا۔

احمد نگر کے دو تین ہزار باشندے اس صرع کے میں کام آئے۔ برہان نظام شاہ کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔

وہ کسی ہارے ہوئے جواہر کی طرح احمد نگر واپس آیا۔ اس روز وہ بھان مٹی کی بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس نے تو اب یہ تک سوچ لیا تھا کہ اگر وہ زندہ ہوتی تو اسے عماد الملک کے پاس بھیجتا اور اس کے ساتھ مل کر اسماعیل عادل شاہ سے بدلہ لینے کے لیے اس پر حملہ کرتا لیکن اب وہ دھوپ میں اکیلا کھڑا تھا۔ اسماعیل عادل شاہ اس کا دشمن بن چکا تھا۔ عماد الملک کا ساتھ اس نے خود چھوڑ دیا تھا اور سلطان بہادر اس کی مدد کو نہیں بھیج سکا تھا۔

یہ صورت حال صرف اس کے لیے تکلیف دہ نہیں تھی بلکہ دونوں جانب کے امراء اسے تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور اس کو شش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح یہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے۔ دونوں طرف کے امیروں نے بے درپے کئی ملاقاتیں کیں اور دونوں بادشاہوں کو ملاقات پر آمادہ کر لیا۔ دونوں بادشاہ سرحد پر آپس میں بغل گیر ہوئے۔ بات چیت کے دوران یہ طے کیا کہ برہان نظام شاہ برار کو فتح کرے اور اسماعیل عادل تلنگانہ کو اور پھر ملک دکن کو آپس میں مساوی تقسیم کر لیں۔

اس بات چیت کے ایک سال بعد اسماعیل عادل شاہ اور امیر قاسم برید نے باہم مل کر تلنگانہ کا رخ کیا۔ تلنگانہ کا مشہور قلعہ جس کا نام تلکنڈہ تھا، سب سے پہلے اسماعیل عادل

نظام اپنی مثال آپ ہے۔ اس نے برہان کے ساتھ سراپردہ کے اندر ہی یہ کھیل کھلایا۔

جب سلطان بہادر سراپردہ سے باہر آیا تو خواجہ ابراہیم اور برہان کے دیگر امراء باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے بہت سا سامان سلطان بہادر کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا۔

دو مہینے سے زیادہ مہمان داری کا لطف اٹھانے کے بعد برہان نظام شاہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔۔۔۔۔ واپسی کے دوران کچھ دیر بالاکھاٹ دولت آباد میں قیام کیا۔

برہان شاہ احمد نگر واپس آیا تو نہایت طاقتور تھا۔ سلطان بہادر سے اس کے تعلقات بہتر کیا دوستانہ ہو گئے تھے۔ اب وہ اس حالت میں تھا کہ اپنے علاقوں میں اضافہ کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اس علاقے کے راجاؤں کی طرف توجہ کی۔ مرہٹواری کے بہت سے راجا جو اب تک خود مختار چلے آ رہے تھے، برہان نظام کے مطیع ہو گئے۔ برہان نے بغیر کسی قسم کی معرکہ آرائی کے تیس قلعے اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔

کہتے ہیں طاقت بہت سے غلط راستے دکھا دیتی ہے۔ مصلحت تو کمزور دیکھتے ہیں طاقتور نہیں۔ برہان شاہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سلطان بہادر سے دوستی کے بعد برہان شاہ کے لیے اسماعیل عادل کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی لہذا جب اسماعیل عادل شاہ نے قلعہ کلیان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو برہان نظام شاہ سے مدد کی درخواست کی۔ برہان شاہ نے نہ صرف مدد کرنے سے معذرت کی بلکہ اسماعیل عادل شاہ کو منع کیا کہ وہ اس قلعہ کو فتح نہ کرے۔

اس حرکت پر اسماعیل عادل شاہ کا چراغ پا ہونا فطری تھا۔ اس نے ایک نہایت سخت خط برہان شاہ کے نام لکھا۔ ”آج تک تم نے کبھی ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔ کیا تم نے احمد نگر کے گزشتہ واقعات کو فراموش کر دیا ہے جو ایسی نازیبا اور ناشائستہ تحریر مجھے بھیجی ہے۔ اگر سلطان بہادر کی طرف سے دیا جانے والا چتر سر پر رکھ کر تم مغرور ہو گئے ہو تو مجھ کو یہ نشہ بالکل بے کیف ہے۔ یہ سب کچھ وہم و گمان ہے۔“

”تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ، بہتری اسی میں ہے ورنہ نتائج کی تمام ذمہ داری تم پر ہوگی۔ میں نگلی تلواریں کر میدان جنگ میں موجود ہوں۔ ذرا باغ نظام سے باہر نکلو، میرے مقابلے پر آؤ پھر تمہیں عادل شاہ ہی بہادروں کی جرأت و جواں مردی سے باخبر کیا جائے۔“

ابراہیم عادل شاہ کے حریفوں کو اس نے کاموقع مل گیا۔ اس نے جشیہ قلعہ قطب شاہ اور بیجا نگر کے حکمران رام راج کو اپنا رازدار بنایا۔ حاکم پر بندہ خواجہ جہاں دکنی کی حمایت بھی حاصل کر لی اور سب سے مل کر ابراہیم عادل شاہ کے علاقے پر چڑھائی کرنے کے خیال سے روانہ ہوا۔

برہان نظام شاہ قلعہ شولا پور کی طرف بڑھا اور اسے حراست میں لے لیا۔ اس نے وہ پانچ پر گئے قبضے میں لے لیے جو اس کے ہاتھ سے چلے گئے تھے۔ سرحدی علاقوں کو جی بھر کے لوٹا۔ ابراہیم عادل شاہ کی فوج نے مقابلہ کیا لیکن شکست پر شکست کھائی۔ ادھر قلعہ قطب شاہ بیجا پور پر چڑھ آیا اور گلبرگہ پر قابض ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ برہان نظام شاہ کے اشارے پر رام راج بھی آگے بڑھا اور قلعہ بنگر کو گھیر لیا۔

برہان نظام شاہ کی ترکیب کامیاب ہوئی تھی۔ اس کے اس کے اس نے پر ابراہیم عادل شاہ کے حریفوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ اس خطرناک صورت حال سے سخت متشکر تھا۔ اس نے گھبرا کر اسد خاں لاری کو طلب کیا۔ اسد خاں لاری بھی مطمئن کم اور متشکر زیادہ تھا۔ ابراہیم عادل شاہ کے تمام حالات اس کے سامنے رکھ کر اس سے مشورے کا طالب ہوا۔

”تمام حالات جہارے سامنے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تمام حکمران ہمارے خلاف ہو گئے ہیں۔ ہم بے یک وقت تمام لوگوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اب تمہارے زیادہ تدبیر کی ضرورت ہے۔ میں نے تمہیں اسی مشورے کے لیے طلب کیا ہے۔“

”تدبیر کا تقاضا تو یہی ہے کہ جس طرح برہان نظام نے ہمیں اکیلا کیا ہے، اسی طرح ہم اسے اکیلا کر دیں۔“

”یہ کس طرح ہوگا؟“

”بادشاہ مبارک! کوئی ہمارے خلاف نہیں ہے۔ یہ سب کچھ برہان نظام کے اشارے پر ہو رہا ہے۔ دراصل عادل شاہی خاندان کا سب سے بڑا حریف رہی ہے۔ بقیہ امراء تو اس کے اشارے پر چلتے ہیں۔ ان کی علیحدہ کوئی حیثیت نہیں۔ اگر برہان نظام کا خاتمہ کر دیا جائے تو تمام ذیلی امراء سے چمکا کر مل جائے گا۔“

”کیا ہم برہان نظام شاہ کا کام تمام کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟“

”اس کے لیے جنگ کی ضرورت نہیں۔“

”پھر کیا ہو سکتا ہے؟“

”اس کے لیے ضروری ہے کہ شولا پور کے ان پانچ پرگنوں کو نظام شاہ کے حوالے کر دیا جائے جن کی وجہ سے لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ بعد ازاں رام راج کو ایک ہمدردی بھرا خط تحریر کیا جائے۔ اس کے علاوہ قرب و جوار کے راجاؤں کو شاہانہ تحائف پیش کیے جائیں۔ رام راج نہایت بااثر ہے۔ وہ اگر مٹھی میں آگیا تو دوسرے راجا تھوڑی سی پیشکش پر عادل شاہی حکومت کے طرف دار ہو جائیں گے۔ ان لوگوں سے اطمینان ہو جائے پر جشیہ قلعہ قطب شاہ سے نمٹنا آسان ہے۔“

ابراہیم عادل شاہ نے اس کی باتوں سے اتفاق کیا اور رام راج کی خدمت میں خط روانہ کرنے کے بعد قریبی راجاؤں کو قیمتی تحائف بھیجنے شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی اسد خاں لاری کے سپرد ایک جانبا ز لشکر کیا اور حکم دیا کہ قلعہ قطب شاہ پر حملہ کر دے۔ اسد خاں لاری نے قلعہ کا کافی گھیر لیا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کی مدد کو کوئی نہیں آیا۔ قلعہ کے محافظین نے رولتختی بھادری کا مظاہرہ کیا اور کئی ماہ کی کوشش کے بعد قلعہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہ ایک اور مقام انکر کی طرف بڑھا۔ قلعہ قطب شاہ شکست کے خوف سے تنگنا گدہ کی طرف بھاگ گیا۔ اسد خاں نے اس کے پیچھے گھوڑے دوڑائے۔ قلعہ قطب شاہ نے قلعہ کو لکڑی کے قریب و جوار میں پہنچ کر اپنی فوج کی ترتیب و تنظیم کی۔ اسد خاں بھی پہنچ گیا۔ دونوں فوجوں میں مذہبیٹر ہوئی۔ بد قسمتی سے قطب شاہیوں کو شکست ہو گئی۔

یہ اتنی بڑی فتح تھی کہ ابراہیم عادل شاہ مطمئن ہو گیا اور خود کو محفوظ پادشاہ کو ان کی جاندا دی دیکھ بھال کے لیے واپس کر دیا۔

برہان نظام شاہ تمام حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ابراہیم عادل شاہ کو اکیلا دیکھ کر حسن آباد گلبرگہ پر حملہ کر دیا۔ شہر کے حصار کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ابراہیم بھی اپنی فوج کے ہمراہ جوابی کارروائی کے لیے بیورہ منہر کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ دریا کے دوسرے کنارے کا علاقہ برہان نظام کے قبضے میں تھا۔ نہر پار کرنا ابراہیم عادل شاہ کے لیے ناممکن ہو رہا تھا۔ اس کے سپاہی جب آگے بڑھتے تیروں کی بو پھانڈ ان کا راستہ روک لیتی اور وہ واپس لوٹ آتے۔ اس کوشش میں دو تین ماہ لگ گئے۔ بالآخر سیکڑوں سپاہیوں کی قربانی کے بعد ابراہیم عادل شاہ نے دریا پار کر لیا۔

طر کی منزلیں طے کرتا ہوا قلعہ کلیان کے قریب آ گیا اور برہان نظام شاہ کے لشکر کے پاس ہی قیام پذیر ہوا۔ وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ رمضان کا مہینا آ گیا۔ غلہ اور دیگر سامان ضرورت نہ پہنچنے کی وجہ سے نظام شاہی امراء کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ دو دو تین تین دن کا قاذو کر کے روزے رکھنے لگے۔ ان تمام واقعات نے برہان نظام کو حواس باختہ کر دیا۔ اس نے تمام امراء کا اجلاس طلب کیا اور ان سے مشورہ چاہا۔ جتنے منائے تھے۔

”اب اسی میں عافیت ہے کہ ہم واپس چلے جائیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ دیوار کے اندر سے داخل ہو کر دشمن سے لڑا جائے۔“

”اگر ہمیں فتح حاصل ہو تو ہم دوبارہ قلعے کا محاصرہ کر لیں اور اگر شکست ہو تو واپس احمد نگر چلے جائیں۔“

برہان نظام شاہ نے یہ سب باتیں سن کر اپنی رائے دی۔ ”ہمارے گھوڑوں کی حالت اس وقت خراب ہو گئی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہے کہ جنگ میں حصہ لے سکیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم جنگ کے ارادے کو ملتوی کر کے احمد نگر کا راستہ لیں۔ آئندہ پھر کبھی موقع ملے تو خوب اچھی طرح تیاری کر کے اس طرف آنا چاہیے۔“

برہان نظام شاہ سب باتیں سن کر خاموش ہو گیا۔ اٹھا اور اکیلا ہی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے سب سے بڑے امیر عین الملک کے پاس پہنچا۔

”عین الملک! تمام حالات سے تم بخوبی آگاہ ہو۔ اگر ہم نے دشمن سے لڑائی کیے بغیر محاصرہ اٹھالیا اور اپنے ملک کو واپس چلے گئے تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ جنگ کی جاتی ہے تو اس کا انجام بھی بہت برا ہوگا کیونکہ ہماری فوج کی حالت بری ہے۔“

”عین الملک نے کہا۔“ آگے آپ کی مرضی۔“

”جنگ کے حق میں تو میں بھی ہوں لیکن فوج کی حالت بہت بری ہے۔ اسی مشورے کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ جنگ کی جائے تو کس طرح؟“

”اس کی ایک ہی صورت ہے۔“ عین الملک نے کہا۔ ”عید کی مہم دشمن پر حملہ کر دیں۔ اس وقت حریف کے لشکر کا ہر سپاہی عید کی تیاریوں میں مشغول ہوگا۔ اس وقت کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ ہم حملہ کریں گے۔ ہمیں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

”تدبیر تو اچھی ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ شاید یہ خبر چھپی نہ رہے اور حریف تک پہنچ جائے۔“

”ہم اس خبر کو خفیہ رکھیں گے۔“

”کیا لشکر والوں کو نہیں بتایا جائے گا کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں؟“

”یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اس بابت بھی میں نے سوچ رکھا ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے خزانچی کو یہ حکم فرمادیں کہ میں اس سے جتنی رقم طلب کروں، وہ بغیر کسی حیل و حجت کے میرے حوالے کر دے اور بالکل پس و پیش نہ کرے۔“

”میں ابھی تمہارے سامنے حکم نامہ تحریر کر کے دیتا ہوں۔“

برہان نظام شاہ نے اسی وقت یہ حکم نامہ تحریر کر دیا۔

”عین الملک تم سے جس وقت جو کچھ مانگے، فوراً اس کو دے دو اور اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرو۔“ عین الملک نے اس حکم نامے کے مطابق شاہی خزانے سے ایک لاکھ ہون لکھوائے۔ خزانچی سے یہ بھی کہہ دیا کہ مزید رقم درکار ہوگی تو وہ بھی طلب کی جائے گی۔

عید میں ابھی چند روز باقی تھے اس لیے اس کی ترکیب آسانی سے کامیابی سے ممکن ہو سکتی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے تمام عسکری سرداروں کے پاس گیا اور انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے اس رقم کو لشکریوں میں تقسیم کرنے کے لیے کہا۔

”یہ رقم سپاہیوں میں تقسیم کر دو اور یہ ظاہر کر دو کہ یہ رقم عید کے اخراجات کے لیے ہے۔“

عسکری سرداروں نے یہ رقم سپاہیوں میں تقسیم کر دی۔

جب عید میں ایک دن باقی رہ گیا تو عین الملک نے ان سرداروں سے کہا کہ وہ عید کی صبح سپاہیوں کو سبھانے کا حکم دیں اور خود بادشاہ کی خدمت میں سلام و مبارک کے لیے حاضر ہوں۔

عید کی صبح تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ سپاہیوں کی سبھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ انہیں سبھ ہونے کا حکم کیوں دیا گیا ہے لیکن وہ حکم کی تعمیل کے لیے مجبور تھے۔ خاصی رعیتیں مل چکی تھیں اس لیے خوش بھی تھے۔

عین الملک نے لشکر گاہ کے گرد بھینٹی ہوئی دیوار کو ایک جگہ سے توڑنے کا حکم دیا اور سپاہیوں کو لے کر دشمن کی طرف بڑھا۔

نظام شاہی ہاتھیوں کے ذریعے عادل شاہی لشکر

اپنے قاصدوں کو ننگو ان روانہ کیا تاکہ وہ اسد خاں لاری کو اس کے ارادے سے آگاہ کریں۔

جب یہ قاصد ننگو ان پہنچے تو اسد خاں نے اس خیال سے ان کا پرہیزگارانہ استقبال کیا کہ وہ صلح کا پیغام لے کر آئے ہوں گے لیکن جب انہوں نے آنے کا مقصد بیان کیا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ قاصد بیان کر رہے تھے۔

”شہزادہ عبداللہ اپنے بھائی کے عتاب سے خوفزدہ ہو کر ”بندر کوہ“ پہنچ گیا ہے وہاں کے عیسائی اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اس نے برہان نظام اور قلی قلعہ شاہ سے مدد چاہی ہے۔ آپ کو بھی ابراہیم عادل شاہ کی معزولی اور شہزاد عبداللہ کی تخت نشینی سے اتفاق کرنا چاہیے۔ اس صورت میں آپ کو نئے بادشاہ کا اتالیق مقرر کر دیا جائے گا۔“

اسد خاں قاصدوں کی زبانی حالات سے آگاہ ہوا تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے ان قاصدوں کی خلاف توقع سخت توہین کی۔

”اگر بادشاہوں کی شریعت میں قاصدوں کا قتل جائز ہوتا تو میں آپ لوگوں کی گردن اڑا دیتا۔ خیریت اسی میں ہے کہ آپ لوگ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں اور اپنے آقا سے جا کر کہو کہ اسد خاں ابھی تک اپنے آقا کا نمک خوار ہے۔“

یہ دھوکہ جواب سن کر برہان نظام نے اپنے دشمنوں میں ایک اور دشمن کا اضافہ کر لیا۔ اس کا نام تھا اسد خاں لاری۔ دشمن سے کیا امید۔ اس نے یہ امید چھوڑی اور قطب شاہ کو اپنے ساتھ مل کر عادل شاہی سلطنت کی طرف روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

کئی ماہ کی تیاری کے بعد اسے خبر ملی کہ اسد خاں شدید علیل ہے۔ یہ اور بھی اچھا تھا۔ اب وہ ابراہیم عادل شاہ کی مدد کو نہیں آ سکتا تھا۔ وہ موقع غنیمت دیکھ کر عادل شاہی سلطنت کی طرف روانہ ہوا۔ اسد خاں کی بیماری نے شدت اختیار کر لی تھی۔ اسی دوران یہ اطلاع آ گئی کہ اسد خاں کا انتقال ہو گیا۔ برہان نظام نے یہ اطلاع ملنے ہی اصل مقصد کو پس پشت ڈالا اور پہلے قلعہ ننگو ان کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ننگو ان پر ابراہیم عادل نے قبضہ کر لیا۔

برہان شاہ احمد نگر واپس آ گیا۔ غصہ کبھی نہ کبھی تو اترتا تھا۔ اس نے سفر کی منزلیں طے کیں اور قلعہ کلیان پر حملہ کر دیا۔ ابراہیم عادل شاہ بھی

دونوں طرف کے سپاہیوں کی ترتیب و تنظیم ہونے لگی۔ چھپے دریا تھا، سامنے نظام شاہی فوج۔ لڑنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے پہل کی۔ قطب شاہی بھی آگے بڑھے۔ نہایت گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ چند گھنٹوں کی لڑائی نے فیصلہ ابراہیم عادل شاہ کے حق میں کر دیا۔

اس فتح نے ابراہیم عادل شاہ کو غرور میں مبتلا کر دیا۔ اس کا سر آسمان کو چھو رہا تھا، قدم زمین پر نہیں تھے۔ اس نے لوگوں سے بدسلوکی شروع کر دی۔ خلق خدا اس کے مظالم سے تنگ آ گئی۔ لوگوں نے تنگ آ کر اس کے برادر شہزادہ عبداللہ کو بادشاہ بنانے کا ارادہ کیا۔ یہ سازش بڑی رازداری سے تیار کی گئی لیکن کسی طرح یہ راز ابراہیم عادل شاہ پر فاش ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے مظالم کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ شہزادہ عبداللہ جان بچا کر بیجا پور سے فرار ہو گیا۔

ابراہیم عادل شاہ کے خوشامد یوں نے اسے باور کرایا کہ اس سازش میں اسد خاں لاری کا ہاتھ ہے۔ بادشاہ اس کی طرف سے مفلک ہو گیا۔ اس نے اسد خاں سے خط لکھا کہ بدکردی اور جو موسیٰ بھل اور تحائف وغیرہ بھیجا کرتا تھا، وہ بھی بند کر دیے۔ اسد خاں جو اپنی جاگیر ”ننگو ان“ میں تھا بڑی کوشش کی کسی طرح وہ اپنی نیک نیتی اور نمک خواری ثابت کر سکے۔ پھر اس نے ایک وضاحتی خط بڑی تفصیل سے لکھا۔

”چند مکار، عیار اور فریب خوردہ اور خود غرض لوگوں نے میری جانب سے جو حضور کو بدگمان کیا ہے، اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اگر ان کی خطائیں شمار میں لائی جائیں تو کئی گنا ہوں گی مگر جو قصور مجھ سے وابستہ کئے گئے ہیں، وہ قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ان سے میرا دور کا بھی تعلق نہیں۔ ننگو ان میں کافی عرصہ قیام کرنے اور حضور کی ریاست میں قدم نہ رکھنے کا مقصد حریفوں، مکاروں اور خود غرض انسانوں کی پورش سے بچنا تھا۔ میرا یہ اقدام عیاروں کو پسند نہیں آیا۔ انہوں نے اس کو طرح طرح کے مٹھی پہناتے اور میری دور اندیشی کو نمک حرامی کے مترادف ٹھہرایا۔ اگر حضور کی رضا ہو تو ابھی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاؤں۔“

ابراہیم عادل شاہ کے دل کا ٹائٹل نکل سکا۔

برہان نظام شاہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ موقع اچھا ہے اگر اسد خاں لاری ساتھ دے تو ابراہیم عادل شاہ کو ہٹا کر شہزادہ عبداللہ کو تخت نشین کرایا جاسکتا ہے۔ اس نے

کے حصار کو توڑ دیا گیا۔ عین الملک اسی راستے لشکر سیت اندر داخل ہو گیا۔ عادل شاہی لشکر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ہوجائے گا۔ سب کے سب غیر مسلح تھے۔ اس حملے نے ان کے حوصلے پست کر دیے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ بادشاہ عمید کا غسل کر رہا تھا۔ اسے حملے کی اطلاع ملی تو وہ سراپردہ سے باہر آیا اور ایک گوشے میں چھپ گیا۔

اسی روز برہان نظام نے سپاہیوں کی ترتیب و تنظیم کی اور کلیان کے حصار کی جانب بڑھا۔ اس مرتبہ اس نے مہم ارادہ کیا کہ اگر حصار والوں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے نہ کیا تو وہ تمام لوگوں کو قتل کر دے گا۔ قلعے کے لوگ پہلے ہی سے ابراہیم عادل شاہ کی شکست سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے قلعے کو نظام شاہ کے حوالے کر دیا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اس وقت مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ قلعہ کلیان کو جانے دیا اور خود برہان نظام کو یہاں مصروف دیکھ کر باقی ماندہ فوج کے ہمراہ نظام شاہی ممالک کی طرف چل پڑا۔ برہان نظام کے کئی پرگنوں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد قلعہ پرندہ پر حملہ کر دیا۔ اہل قلعہ بالکل غافل تھے۔ قلعے کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ عادل شاہ کے لشکر بلا روک ٹوک تلواریں ہاتھ میں لیے قلعے میں داخل ہو گئے۔ چند سپاہی ہمت کر کے سامنے آئے اور قتل ہو گئے، باقی فرار ہو گئے۔ قلعے پر عادل شاہ کا قبضہ ہو گیا۔ قلعہ کلیان کے ہاتھ سے جانے کا دکھ کسی قدر کم ہوا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اس قلعے کو ایک وکئی امیر کے حوالے کیا اور خود بیجا پور آ گیا۔

حاکم پرندہ خواجہ جہاں وکئی کو جس وقت اس واقعے کا علم ہوا وہ برہان نظام شاہ کے ساتھ قلعہ کلیان میں تھا۔ اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی پھر قلعہ پرندہ کے مفروضہ سپاہی بھی اپنی شکست کی داستان لے کر اس کے پاس حاضر ہو گئے۔ اس نے برہان نظام سے اس کا ذکر کیا۔ خواجہ جہاں نے چونکہ برہان نظام کی مدد کی تھی، لہذا اب برہان نظام کا بھی فرض تھا کہ وہ اس کی مدد کرے۔

برہان نظام اور خواجہ جہاں وکئی ایک بھاری لشکر لے کر قلعہ پرندہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی یہ قلعہ میں کوس دور تھا کہ عادل شاہ کا مقرر کردہ وکئی امیر اتنا خوفزدہ ہوا کہ قلعہ چھوڑ کر فرار ہو گیا اور سیدھا بیجا پور پہنچا۔

میں کوس کا فاصلہ دونوں میں طے کرنے کے بعد جب

برہان نظام شاہ قلعہ پرندہ پہنچا تو قلعے کو بالکل خالی پایا۔ اس نے قلعہ خواجہ جہاں وکئی کے حوالے کیا اور خود احمد نگر چلا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ ابھی قلعہ کلیان کی فتح کا جشن پوری طرح منانے بھی نہ پایا تھا کہ قلعہ کلیان کا وکئی محافظ حاضر دربار ہو گیا اور یہ بدخبر سنا کہ قلعہ دوبارہ نظام شاہی دسترس میں چلا گیا۔

”وہ کون ابھی میں کوس کے فاصلے پر تھا اور تو نے قلعہ خالی کر دیا؟“ ابراہیم عادل شاہ نے استفسار کیا۔

”حضور! میں سو یا ہوا تھا کہ پھروں کی آواز کو نفیری کی آواز سمجھا۔ میں سمجھا دشمن سر پر آ گیا ہے۔ اس وقت مقابلہ بے سود ہے۔ میں نے فرار میں عافیت جانی۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ دشمن فاصلے پر ہے۔ یہ بھی اس وقت معلوم ہوا جب بیجا پور کی طرف آتے ہوئے نظام شاہی لشکر کو راستے میں دیکھا۔ اس وقت میرے ساتھ ایک سپاہی بھی نہیں تھا۔ سب حواس باختہ ہو کر بھاگ چکے تھے۔ میرے پاس اب ایک ہی راستہ تھا کہ میں حضور کو اطلاع دوں۔“

”بد بخت! میں نے تیری بہادری کو مد نظر رکھتے ہوئے تجھے محافظ قلعہ بنا دیا تھا اور تو پھروں کی آواز کو نفیری کی آواز سمجھ کر قلعہ دشمن کے حوالے کر آیا۔ کیا اب بھی تجھے جینے کا حق ہے؟“

”حضور! مجھ پر رحم فرمائیں۔“

وہ چپٹا رہ گیا اور بادشاہ نے اسے موت کے گھاٹ اتروا دیا۔

عادل شاہ کے سامنے اب ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح قلعہ پرندہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا جائے۔

برہان نظام شاہ کا تجربہ کار ذہن اچھی طرح سوچ سکتا تھا کہ ابراہیم عادل شاہ کی سوچ رہا ہوگا۔ بعض ذرائع سے یہ بات اسے معلوم بھی ہوئی تھی کہ ابراہیم عادل شاہ قلعہ پرندہ پر دوبارہ تسلط کے لیے تدبیریں کر رہا ہے۔ اس نے ضروری سمجھا کہ رام راج حکمران بیجا نگر کو اس راز سے آگاہ کر دے۔ اس نے اپنے ایک وفادار امیر کا انتخاب کیا اور اسے رام راج کے پاس بھیج دیا۔

دونوں میں بات چیت کے بعد طے ہوا کہ برہان نظام شاہ ضلع راج پور میں آ کر اس سے ملے تاکہ آئندہ فتوحات کی منصوبہ سازی کی جائے۔

نظام شاہ اپنے سپاہیوں، بھئی خواہوں اور مال و اسباب کے ساتھ راج پور پہنچ گیا۔ رام راج بھی بہادری

سپاہیوں کا ایک گروہ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ مدگل اور راج پور کو فتح کر کے شولا پور کو حراست میں لے لیا جائے۔

رام راج اور نظام شاہ دونوں نے قلعہ راج پور کے اطراف گھیرا ڈال دیا اور بڑی آسانی سے قبضہ کر لیا۔ مدگل کے لوگوں نے خوفزدہ ہو کر چابی رام راج کے حوالے کر دی۔ بعد ازاں اس قلعے کو رام راج نے چند ممتاز اشخاص کے حوالے کیا اور اپنے بھائی کو سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد دے کر حکم دیا کہ وہ برہان نظام شاہ کا ہاتھ قلعہ شولا پور کی فتح میں بنائے اور خود اپنے علاقے کی سمت روانہ ہو گیا۔

برہان نظام شاہ نے رام راج کے سپاہیوں کی معاونت سے قلعہ کو گھیرے میں لے لیا۔ چند روز کے محاصرے کے بعد اس کی بے مبری نے کام دکھایا۔ اس نے جنگی توپوں کے وہاں کھول دیے اور قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ دوبارہ قلعے کی چار دیواری ٹھٹھائی اور ضروری مرمت کرا کے اسے مستعد امیر کے تصرف میں دے کر خود احمد نگر چلا گیا۔

برہان نظام اس کے بعد گھبر گرجانے کا ارادہ کر رہا تھا تاکہ وہاں کا قلعہ بھی فتح کر لے لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ رام راج راج پور اور مدگل کے قلعوں کو فتح کر کے بیجا نگر واپس آ گیا ہے تو اس سال گھبر گرجانے کے قلعے کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ مزید ایک سال تک بیچ و تاب کھاتا رہا اور بالآخر دوبارہ عادل شاہی ممالک کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر رام راج سے ملاقات کی اور یہ معاہدہ کیا کہ رام راج قلعہ ساغر اور آہننگر کو فتح کرے اور بیجا پور اور گھبر گرجانہ پر نظام کا قبضہ ہو۔

برہان نظام نے اپنے اتحادی رام راج کو ساتھ لیا اور بیجا پور کی طرف روانہ ہوا۔ عادل شاہ برہان نظام کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور ایک مقام ”پنالہ“ چلا گیا۔ برہان نظام نے بیجا پور کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ وہ اس قلعے کو فتح کر لیتا مگر قسمت کوئی دوسری ہی چال چلنے کے انتظار میں تھی۔ نظام شاہ پر بیماری کا حملہ ہوا اور اسے محاصرہ اٹھا کر احمد نگر واپس آنا پڑا۔ اس کی یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ بہت علاج معالجہ کرایا لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اس نے سفر آخرت اختیار کیا۔

اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا حسین نظام تخت نشین ہوا۔ اس کے بھائی شہزادہ عبدالقادر نے حسین نظام کی بادشاہت کو تسلیم نہیں کیا اور تخت نشینی کے روز اپنے

بھائیوں کو ساتھ لے کر قلعے سے باہر نکل آیا۔ امراء بھی دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ خون خرابا ہوتا، حسین نظام شاہ نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ ان سب امیروں کو خرید لیا جو شہزادہ عبدالقادر کے ساتھ تھے۔ عبدالقادر ماپوس ہو کر ملک برار چلا گیا۔ اس کے دیگر بھائی بھی ادھر ادھر فرار ہو گئے۔ حسین نظام شاہ کے وہ تمام رقیب جو سلطنت کے دعویدار ہو سکتے تھے ایک ایک کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔ یہاں تک کہ عین الملک جو برہان نظام کا اہم ترین امیر تھا، حسین نظام سے خوفزدہ ہو کر برار کی طرف بھاگا اور پھر بیجا پور پہنچ کر ابراہیم عادل شاہ کے دائرہ ملازمت میں چلا گیا۔ حسین نظام شاہ کے دیگر بھائی بھی اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر بیجا پور چلے گئے تھے۔ یہ سب دیکھ کر ابراہیم عادل شاہ کے منہ میں پانی آ گیا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ حسین نظام شاہ کو تخت سے اتار کر اپنے کسی بھائی کی تختیجہ کو تخت پر بٹھا دے۔ اس نے اپنے پھوپھی زاد بھائی میراں شاہ علی کو چتر و آفتاب گیر سے سرفراز کیا اور یہ طے کیا کہ ان تمام لوگوں کو جو حسین نظام کے ظلم و ستم سے پریشان ہیں، میراں شاہ علی کے گرد جمع کرے اور پھر شاہ علی کو احمد نگر کے تخت پر بٹھائے۔

حسین نظام بھی ان کا دروازیوں سے بے خبر نہیں تھا لیکن اکیلے مقابلہ کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ اس نے عماد الملک کو اپنا ہماز بنانے کی کوشش کی اور ایک قاصد عماد الملک کے پاس بھیجا تاکہ دونوں فرماں روا ابھی اتحاد سے ابراہیم عادل شاہ پر حملہ کریں۔ عماد الملک نے اس کی درخواست قبول کی اور سات ہزار سوار روانہ کیے۔

عماد الملک کے سواروں کو ہمراہ لے کر حسین نظام شاہ قلعہ شولا پور کی طرف روانہ ہوا جس کا محاصرہ ابراہیم عادل شاہ نے کیا ہوا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ بھی اس کا منتظر تھا تاکہ اس کا مقابلہ کر کے گزشتہ شکست کا بدلہ لے سکے۔

دونوں طرف سے لشکر آراستہ ہوئے اور ایک دوسرے کے مقابلے پر آ گئے۔ فریقین میں زبردست خون ریزی ہوئی۔ اس معرکے میں عین الملک نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور نظام شاہی لشکر کے چنگے چھڑا دیے۔ نظام شاہی لشکر نے بھی زبردست دفاع کا مظاہرہ کیا۔ عین الملک نے جب دیکھا کہ نظام شاہی لشکر کسی صورت پسا ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے تو عین الملک ٹھوڑے سے اتر پڑا اور اپنے سپاہیوں کا دل بڑھانے لگا۔ اس کی مستعدی سے اس کے لشکر میں بھی نئی جان پڑ گئی۔ اس زور کا حملہ کیا کہ

ہاتھیوں کی قطاریں ہیں۔ ان قطاروں کی وجہ سے وہ مقام جہاں حسین نظام ٹھہرا تھا ایک تنگی کی مانند نظر پیش کر رہا تھا۔ جب حسین نظام کے مصاحبوں نے عین الملک کو آتے ہوئے دیکھا تو وہ آگے بڑھے اور اس کے گھوڑے کو اس تنگی یعنی ہاتھیوں کی قطاروں کی طرف لے آئے اور اسے گھوڑے سے اترنے کے لیے کہا۔ عین الملک چاہتا تو یہی تھا کہ جس طرح حسین نظام گھوڑے پر سوار ہے وہ بھی سواری کے ساتھ ملاقات کرے لیکن مصاحبوں کے اصرار پر مجبوراً اسے گھوڑے سے اترنا پڑا۔ ابھی اس کے قدم زمین پر پڑے تھے ہی نہیں تھے کہ حسین نظام نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور اسے گرفتار کر کے ہاتھی پر بٹھا دیا گیا۔

عین الملک کی بہادری ضرب المثل تھی لیکن اس وقت وہ غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ حسین نظام اسے گرفتار کرنے کے بعد اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں اس فیل بان کو جس کے ہاتھی پر عین الملک سوار تھا نہ جانے کیا سوچا کہ اس نے کسی حکم کے بغیر اپنا فیصلہ کیا اور عین الملک کا گلہ گھونٹ دیا اور اس کے مردہ جسم کو زمین پر پھینک دیا۔ حسین نظام کو اطلاع دی گئی کہ عین الملک خوف کی وجہ سے مر گیا۔

قبول خاں کو وہاں پہنچتے ہی عین الملک کی گرفتاری کا علم ہو گیا تھا۔ اس کا اندیشہ درست نکلا تھا۔ وہ ابھی گونگو کے عالم میں تھا کہ حسین نظام کا حکم نامہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ ”عین الملک کی عورتیں اور اس کا سامان شاہی بارگاہ میں ملا حظے کے لیے پیش کیا جائے۔“

قبول خاں نے اسی وقت ان عورتوں کو سوار کرایا اور تقریباً پانچ سو افراد کے ساتھ ابراہیم قطب شاہ کے علاقے کی طرف روانہ کر دیا۔

حسین نظام شاہ کے آدمیوں نے قبول خاں کا تعاقب کیا۔ راستے میں کئی جگہ معرکہ آرائی بھی ہوئی۔ قبول خاں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا قصبہ اندور کے قریب پہنچا۔ یہاں نظام شاہی اہرام موجود تھے جنہیں قبول خاں کی آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لیکن اس کی بہادری سے خائف بھی تھے۔ سامنے آ کر لڑنے کی ہمت نہیں تھی حالانکہ قبول خاں کے ساتھ پانچ سو سے زیادہ آدمی نہیں تھے۔ یہ ان کا خوف ہی تھا جس نے دن کے وقت انہیں سامنے نہیں آنے دیا۔ وہ ان پانچ سو آدمیوں

ان شرائط کو ان کے سامنے رکھوں اور واپس آ کر اس وقت تک تمہارے لشکر میں رہوں جب تک تم بادشاہ سے مل کر واپس نہ آ جاؤ۔“

عین الملک نے اجازت دے دی اور وہ وہاں سے رخصت ہو کر بادشاہ کے پاس چلا آیا۔ حکیم قاسم بیگ وہاں سے تو چلا آیا لیکن پیغام دینے کے بعد اپنے گھر گیا اور بیماری کا بہانہ کر کے صاحب فرار ش ہو گیا۔

حسین نظام نے اپنے مصاحبین کی ایک جماعت کو اعلیٰ درجے کے کھانے اور شربت دے کر عین الملک کے پاس بھیجا اور اسے کہلوا یا کہ تم فلاں وقت فلاں مقام پر مجھ سے ملاقات کرو۔ مجھے افسوس ہے کہ قاسم بیگ بیمار ہو گیا ہے اس لیے وہ تمہارے پاس آنے سے قاصر ہے۔ تم اپنی جگہ سے چل پڑو۔ میں تمہارے استقبال کو روانہ ہو رہا ہوں۔ عین الملک کو پیغام مل چکا تھا کہ بادشاہ اس کے استقبال کے لیے روانہ ہو چکا ہے اس لیے وہ مجبوراً ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ بادشاہ سے ملاقات کے لیے چل پڑا۔ عین الملک کے غلام قبول خاں نے روانگی کی مخالفت کی اور کہا کہ قاسم بیگ کی بیماری خود ساختہ اور مکاری ہے۔ اس میں ضرور کوئی چال ہے لیکن عین الملک نے اس کی بات نہ مانی اور اپنے ارادے پر قائم رہا۔

قبول خاں نے عین الملک کو چھوڑا اور بھگم بھاگ لشکر میں پہنچا۔ اس نے لشکریوں سے کہا سب لوگ شہر میں چلے جائیں اور جس جگہ بادشاہ نے ملاقات کا کہا ہے، وہاں جا کر قیام کریں۔

”کیوں؟ یہ حکم نامہ کس کا ہے؟“ ایک سردار نے پوچھا۔ ”آقا کی جان خطرے میں ہے۔ قاسم بیگ جان بوجھ کر بیمار پڑ گیا ہے اور بادشاہ نے میرے اور تمہارے آقا کو دھوکے سے بلایا ہے۔ یہ میرا دم بھی ہو سکتا ہے اور حقیقت بھی۔ میں نے آقا کے سامنے اس کا اظہار کیا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔ اب ہم سب کا فرض ہے کہ اپنے آقا کی جان کی حفاظت کے لیے یہاں سے کوچ کریں۔“

عین الملک بہت جلدی میں تھا۔ دوسرے لشکر میں تکرار ہو رہی تھی۔ جب تک لشکر آمادہ ہوتا عین الملک ”نبہ پور“ پہنچا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں حسین نظام شاہ نے ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔

عین الملک نے دیکھا کہ حسین نظام ایک میدان میں گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے سامنے دونوں اطراف

تھا تو صرف یہ کہ اس نے میدان جنگ میں عادل شاہی فوج کی کمان سنبھالی اور آخر دم تک وفادار رہا۔ اس کی بہادری نے جنگ کی کاپیالٹ کر رکھ دی اور فوج کے قریب لے آیا مگر بادشاہ کی بزدلی نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ مجرم وہ نہیں بادشاہ تھا اور اب اسی کو بے عزت کیا جا رہا تھا۔

اس نے قاصد کو دوبارہ بھیجا اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگر بادشاہ نے ملاقات کا موقع نہیں دیا تو وہ کسی اور کے دامن دولت سے وابستہ ہو جائے گا۔

ابراہیم عادل شاہ نے اسے بھی عین الملک کی کوئی چال قرار دیا اور قاصد کو بے عزت کر کے نکال دیا۔ اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ عین الملک عادل شاہی حدود سے باہر نکل گیا۔ ایک ہی منزل اس کے سامنے تھی۔ وہ نظام شاہی حدود میں آ پہنچا۔

حسین نظام شاہ اس سے خوش نہیں تھا لیکن اس وقت مصلحت کا تقاضا تھا کہ اسے خوش آمدید کہا جائے کیونکہ اس طرح ابراہیم عادل شاہ کا کمزور ہوجانا لازمی تھا۔ اس نے خوشی کا اظہار کیا اور کہلوا بھیجا۔

”یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ عین الملک دوبارہ ہمارے پاس آ گیا۔“

حسین نظام شاہ نے امیر قاسم بیگ کو اس کے استقبال کے لیے روانہ کیا اور اس مضمون کا ایک خط اس کے نام تحریر کیا۔

”ایک مدت سے میں اس امر کا خواہاں تھا کہ تم یہاں آؤ۔ خدا کا شکر ہے میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ تم کچھ عرصے کے لیے ہماری ملازمت سے محروم رہے ہو، یہ شخص ایک اتفاقی امر ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں کسی قسم کا غم یا خوف نہ ہونا چاہیے۔ میری توجہ تم پر پہلے سے دس گنا زیادہ رہے گی۔ تم بالکل بے فکر ہو کر میرے حضور آ جاؤ۔“

حکیم قاسم بیگ اس خط کو لے کر عین الملک سے ملا اور اسے بادشاہ کا خط دیا۔

”میری دوشیزاں مان لی جائیں تو مجھے انکار نہیں ہے۔“ عین الملک نے کہا۔ ”اول یہ کہ حسین نظام خود میرے استقبال کے لیے آئے اور دوسرے یہ کہ جب میں بادشاہ سے ملنے جاؤں تو میری واپسی تک قاسم بیگ میرے لشکر میں رہے۔“

”اب تم مجھے جانے دو۔“ قاسم بیگ نے کہا۔ ”اور تم مجھے اجازت دو تا کہ میں بادشاہ کے پاس جاؤں اور

نظام شاہی لشکر کو اس باختر ہو کر میدان سے بھاگ نکلا۔ نظام شاہی سپاہیوں کے فرار کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے ”علم“ کے پاس صرف ایک ہزار سوار اور ایک سو بھگت رہ گئے۔ قریب تھا کہ شکست مکمل ہوجاتی۔ نظام شاہیوں کا پوری طرح صفایا ہوجاتا کہ ایک جموںی خبر نے ابراہیم عادل شاہ کو بدگمان کر دیا۔ کسی بدخواہ نے یہ خبر اڑادی کہ عین الملک یونہی اپنے گھوڑے سے نہیں اترتا بلکہ اس میں ایک چال ہے۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر دشمن کے ہاتھ سے پاں کھایا اور دشمن سے وعدہ کیا کہ ابراہیم عادل شاہ کو قید کر کے اس کے حوالے کر دے گا۔

عین الملک چونکہ نظام شاہیوں کا پرانا نمک خوار تھا اس لیے اسے یقین آ گیا کہ خبر سچی ہے۔ اس نے کسی تصدیق کی ضرورت محسوس نہیں کی اور میدان جنگ چھوڑ کر بیجا پوری طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

عین الملک تنہا دشمن کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ قریب تھا کہ فتح حاصل کر لیتا کہ اسے ابراہیم عادل شاہ کے فرار کی اطلاع ملی۔ وہ کیا کرتا اس نے بھی میدان جنگ کو یونہی چھوڑ دیا اور ابراہیم عادل شاہ کو روکنے کے لیے اس کا تعاقب کرنے لگا۔ ابراہیم عادل شاہ کا گھوڑا سر پٹ دوڑ رہا تھا، اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ عین الملک اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے یہی سوچا کہ عین الملک اسے قید کرنے کے لیے تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار مزید بڑھادی اور بیجا پور پہنچ کر دم لیا۔ اس کے پیچھے پیچھے عین الملک بھی شہر میں داخل ہو گیا۔

اب عین الملک کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ بادشاہ اس کی طرف سے بدگمان ہے مگر کیوں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے بادشاہ سے ملاقات کی کوشش کی لیکن اسے ملنے نہیں دیا گیا۔ اس ناکامی کے بعد اس نے ایک مستحق شخص کو اپنا قاصد بنا کر ابراہیم عادل شاہ کے پاس بھیجا اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے ہوئے بادشاہ کی برہمی کا سبب پوچھا۔

قاصد لوٹ کر آیا اور جس جواب کے ساتھ آیا، اس نے عین الملک کو حیرت زدہ کر دیا۔

بادشاہ نے جواب دیا تھا کہ مجھے عین الملک جیسے ناکارہ ملازم کی ضرورت نہیں۔ وہ کہیں اور چلا جائے۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتا۔

عین الملک اس جواب پر حیران تھا۔ اس کا جرم اگر

غلطی

مالک نوکر سے۔ ”اس قدر مہنگائی میں پرائے میں اس قدر سہمی..... کیا ہو گیا ہے جہیں فضل۔“
نوکر۔ ”جنتاب معاف کر دیں۔ دراصل میرا والا پراٹھا آپ کی طرف چلا گیا ہے۔“

جواب حاضر ہے

ایک شاعری شادی ہوئی، دوسرے دن ہی نے اپنے شوہر سے کہا۔ ”باد رکھے گا مجھے کھانا پکانا نہیں آتا۔“
شاعر بولا۔ ”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں جہیں بتا دیتا ہوں کہ یہاں پکانے کے لیے کچھ ہے بھی نہیں۔“

سورویے کانوٹ

ایک آدمی مشہور شاعر احمد فراز کے مجموعہ کلام کی کتاب خرید رہا تھا۔ دکاندار نے پوچھا۔ ”فراز آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں۔“
وہ شخص بولا۔ ”میں تو ان کی کتابیں اس لیے خریدتا ہوں کہ ایک دفعہ ان کی کتاب سے مجھے سوکا ٹوٹ ملا تھا۔“

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

یقین

یقین جانو تمام انسان آزاد اور با اختیار پیدا ہوتے ہیں۔

مگر..... ان میں سے کچھ شادی کر لیتے ہیں اور پھر بے چارے بے اختیار ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

جادوگرنی

ہیوی۔ ”آپ کو چکن بنا دوں؟“
شوہر۔ ”نہیں..... میں انسان ہی ٹھیک ہوں..... وڈی آئی جادوگرنی۔“

☆☆☆

ایک سکھ کا سر پھٹ گیا۔
ڈاکٹر۔ ”سر دار جی کیا ہوا؟“

سر دار۔ ”میں چپل سے دیوار میں کیل ٹوک رہا تھا کہ ایک آدمی بولا..... سر دار جی کو پڑی استہال کرو۔“

مرسلہ: محمد جاوید خان۔ تحصیل علی پور

جس کے سامنے خندق بھی نہ تھی، سامان جنگ غلہ اور دیگر اشیاء جمع کیں اور قلعے کو چند قابل اعتماد امیروں کے سپرد کر کے اپنے بال بچوں اور خزانوں کے ساتھ احمد نگر سے نکل کر اپنے علاقے ”جیر“ کی طرف چلا گیا۔ یہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ امیر برید اور عماد الملک کو اپنے ساتھ ملائے اور پھر دشمن کے ساتھ جنگ کرے لیکن امیر برید کے بھائی خان جہاں نے یہ منصوبہ پورا نہیں ہونے دیا۔ خان جہاں عماد الملک کا مدار المہام تھا۔ اس نے جب سنا کہ احمد نگر خالی ہو گیا ہے اور حسین نظام عماد الملک سے ساز باز کرنے کے لیے جیر میں ہے تو اس نے عماد الملک کو درغلا یا کہ اس وقت احمد نگر پر حملہ کر دیا جائے۔ اس سے پہلے کہ حسین نظام، عماد الملک کی طرف قاصدوں کو دوڑاتا، خان جہاں لشکر لے کر احمد نگر پہنچ گیا۔ حسین نظام شاہ نے ایک سردار کی سربراہی میں خان جہاں کی کوشاکی کے لیے تین ہزار سوار بھیج دیے۔ اس لشکر نے پہلے ہی حملے میں خان جہاں کو شکست دے دی۔ اس قصبے سے نجات ملی لیکن ایک اور مصیبت سامنے کھڑی تھی۔ علی عادل شاہ اپنے دو اتحادیوں رام راج اور قطب شاہ کے ہمراہ احمد نگر میں داخل ہو گیا۔ رام راج کے ساتھ آئے ہوئے ہندوؤں نے ظلم کی انتہا کر دی۔ آبادی کو قتل کیا، عمارتوں کو آگ لگا دی۔ مسجدوں کی بے حرمتی کی اور انہیں اصطبلوں میں تبدیل کر دیا اور پھر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کی وجہ سے اہل قلعہ کو بے حد تکلیف ہوئی۔

..... قطب شاہ علی عادل کے ساتھ آیا تھا۔ اس کا حلیف تھا لیکن اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ کسی طرح بھی عادل شاہ کو حسین نظام پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ اس نے قلعے کے ایک طرف کا راستہ جدھر وہ خود مقیم تھا، اہل قلعہ کے لیے کھول دیا۔ قلعہ والے بے خوف و خطر آنے جانے لگے اور ضرورت کی تمام اشیاء ان تک پہنچنے لگیں۔

یہ راز زیادہ دنوں تک راز نہ رہ سکا۔ عادل شاہ اور رام راج کو جب قطب شاہ کے اقدام کی خبر ہوئی تو وہ اس سے ناراض ہو گئے اور اسے دبانے کی کوشش کرنے لگے۔ قطب شاہ اس صورت حال کو زیادہ زیر برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک رات تمام سامان وہیں چھوڑا اور گوکٹنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

عماد الملک نے اس عرصے میں حسین نظام کی مدد کا فیصلہ کر لیا اور چنانچہ خاں دکنی کو پیشوا مقرر کر کے اسے ایک معقول لشکر کے ساتھ نظام شاہ کی مدد کے لیے روانہ کیا۔

دینے کا عہد کیا اور پھر اسے گرفتار کر کے ہلاک کر دیا۔ وہ آپ کے ساتھ بھی چال چل سکتا ہے۔“
ابراہیم قطب شاہ کو قبول خاں یاد آ گیا جو حسین نظام کے خوف سے اس کی پناہ میں آ گیا تھا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ کسی دھوکے میں نہ آئے۔ اس نے اپنا تمام سامان وہیں چھوڑا اور خود آدمی رات کے وقت اپنے ملک کی طرف چلا گیا اور اہل قلعہ کو یہ کہہ گیا کہ وہ نظام شاہیوں کی بھرپور مداخلت کریں اور کسی صورت قلعہ حوالے نہ کریں۔

ابراہیم قطب شاہ نے حسین نظام کا ساتھ چھوڑا اور علی عادل جانشین ابراہیم عادل شاہ سے آ ملا۔
جب صبح ہوئی تو حسین نظام کو اپنے لشکر میں نہ پا کر پریشان ہوا۔ اب اس نے اس مقام پر زیادہ دیر نہیں رہنا مناسب نہ سمجھا اور جلد از جلد اپنے وطن احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی عادل شاہ کے لیے یہ موقع غنیمت تھا جبکہ قطب شاہ بھی اس سے آ ملا تھا۔ اس نے بیجا نگر کے راجا رام راج سے تعلقات استوار کیے اور اسے اپنے ساتھ ملا کر احمد نگر کی طرف روانہ ہوا۔

حسین نظام نے یہ اطلاع ملتے ہی اپنے امیروں سے مشورہ کیا۔ ان سب نے ایک ہی مشورہ دیا کہ ہم میں اتنی قوت نہیں کہ ان تین بادشاہوں سے مقابلہ کریں۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم کلیان کا قلعہ علی عادل شاہ کے حوالے کر کے اس سے صلح کر لیں۔

حسین نظام اس مشورے پر بھڑک اٹھا۔
”جس قلعہ کو میرے باپ نے اتنی محنت سے فتح کیا ہے، اسے کسی مداخلت کے بغیر دشمن کے حوالے کر دوں۔ یہ میری غیرت کے منافی ہے۔“

”ہرزمانے کے تقاضے جدا جدا ہوتے ہیں۔“ امراء نے کہا۔ ”آپ کے والد کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ قلعہ کلیان پر قبضہ کرتے اور آپ کے لیے یہی مناسب ہے کہ دست بردار ہو جائیں۔ یہ قلعہ کسی مناسب وقت پر دوبارہ فتح کیا جاسکتا ہے۔“

”جو کچھ تم لوگ کہتے ہو، مجھ سے یہ کبھی نہیں ہوگا۔“ حسین نظام نے امیروں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اپنی بات پر اڑا رہا۔ اسی اثنا میں علی عادل ایک لاکھ سواروں اور دو لاکھ پیادوں کا لشکر لے کر احمد نگر کے نواح میں پہنچ گیا۔

حسین نظام شاہ نے فوراً احمد نگر کے کچے قلعے میں

کے ساتھ ساتھ ریختے رہے اور جب ایک جگہ رات کے اندھیرے نے راستوں کو چھایا، ان امیروں کے آدمی شب خون کے انداز میں ان پر ٹوٹ پڑے۔ اندھیرے کی چادر میں کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ دشمن کون ہے دوست کون۔ ایسے میں کوئی اور ہوتا تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا لیکن یہ قبول خاں تھا۔ اس کے آقا کی عزتیں اس کے ساتھ تھیں۔ وہ ڈنار باہر اور ان امراء کو بھاگنے پر مجبور کر دیا لیکن اس کوشش میں اس کی آدمی نفری کٹ چکی تھی۔ اس نے وفاداروں کی لاشیں میدان میں چھوڑیں اور عورتوں کو لے کر ابراہیم قطب شاہ کے علاقے کی طرف چلا گیا۔

ابراہیم قطب شاہ نے قبول خاں کو خوش آمدید کہا۔ اس نے جس طرح اپنے مالک عین الملک سے وفاداری کی تھی اور اس کے وارثوں کی حفاظت کی تھی، قطب شاہ اس سے بہت متاثر ہوا اور قبول خاں کو انعام میں جاگیر عطا کی۔

☆☆☆

ابھی ابراہیم عادل شاہ کوئی نیا گلہ کھلانے نہیں پایا تھا کہ اسے مختلف بیماریوں نے گھیر لیا۔ حسین نظام نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حسن آباد گلبرگہ کو فتح کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے امیر قاسم بیگ کو گوکٹنڈہ بھیج کر ابراہیم قطب شاہ کو پیغام بھیجا۔

”اب حالات ہمارے موافق ہیں۔ ہمیں اس وقت سے فائدہ اٹھا کر قلعہ گلبرگہ پر قبضہ کر لیتا چاہیے۔“ ابراہیم قطب شاہ نے موقع غنیمت جان کر اپنا مطالبہ بھی درمیان میں ڈال دیا۔

”میں گلبرگہ کی فتح میں آپ کی مدد کروں گا لیکن اس شرط پر کہ قلعہ آجنگر پر آپ میرے ساتھ مل کر حملہ کریں گے اور اس قلعہ کو میرے حوالے کر دیں گے۔“ حسین نظام نے اس کی یہ شرط منظور کر لی اور دونوں گلبرگہ پہنچ گئے۔

دونوں لشکروں نے مل کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ توپوں کے دہانے کھلے تو برجوں کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں۔ اس سے پہلے کہ قلعہ فتح ہوتا..... قطب شاہ کے امر نے کبار میں سے کسی نے اپنے بادشاہ کے کان بھرے۔

”حسین نظام شاہ وعدے کا کچا ہے۔ وہ قلعہ گلبرگہ پر قابض ہو جائے گا لیکن آپ کو قلعہ آجنگر پر قبضہ نہ کرنے دے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ اس کی مدد نہ کریں۔“

”بادشاہ بھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔“

”یہی وہ بادشاہ ہے جس نے امیر عین الملک کو پناہ

حسین نظام اکیلا اتنے حکمرانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے لشکر کو غلے اور آتش بازی کے آلات سے مضبوط کیا اور خود ”جیر“ کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی عادل اور رام رام راج احمد نگر پہنچے۔ رام راج کے ساتھ آئے ہوئے ہندوؤں نے مسجدوں اور مکانوں کو مہارکنا شروع کر دیا۔ علی عادل کے لیے مسجدوں کی بے حرمتی تکلیف دہ تھی لیکن وہ منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بس یہی کر سکتا تھا کہ رام راج کو یہاں سے نکال لے جائے۔ اس نے رام راج کو مشورہ دیا۔

”یہاں کے قلعے کا محاصرہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ حسین نظام شاہ کا تعاقب کریں۔“
رام راج کو یہ مشورہ پسند آیا اور وہ علی عادل کو لے کر حسین نظام شاہ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

حسین نظام کو جب خبر ہوئی کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے تو اس نے ”جیر“ سے کوچ کیا اور قریبی کوہستانی علاقے میں چلا گیا۔

علی عادل کے ہاتھ سے شکار نکل گیا تھا۔ حسین نظام اب جیر میں نہیں کوہستانی علاقے میں تھا۔ رام راج اور علی عادل دونوں واپس ہوئے اور احمد نگر پہنچ گئے۔ رام راج نے مہرین کے کنارے اپنے خیمے لگائے اور علی عادل اس سے کچھ فاصلے پر قیام پذیر ہوا۔

اسی دوران شدید بارشیں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک روز رات کے وقت مہرین میں زبردست سیلاب آ گیا۔ اس سیلاب کی وجہ سے رام راج کے لشکر میں بڑی تباہی آئی۔ اس کے عین امیر، بارہ ہزار سوار اور سیکڑوں ہاتھی اس سیلاب کی نذر ہو گئے۔

یہ نقصان اپنی جگہ لیکن رام راج نے اسے اپنے حق میں بدشگونی سمجھا اور اس کو کچھ بتائے بغیر اپنے ملک کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ قطب شاہی سرحد کے قریب واقع قصبہ برکی تک پہنچا تھا کہ اس کی ہوس نے پاؤں پھیلانے۔ اس نے قطب شاہی اور عادل شاہی علاقوں پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ دونوں حکمران اپنے اپنے پایہ تخت سے دور ہیں۔

برسات کا بہانہ کر کے برکی میں قیام کیا اور چند پرگنوں پر قبضہ کر کے پچانگر روانہ ہو گیا۔

علی عادل نے جب رام راج کو روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نے بھی واپسی کے لیے کمر باندھی اور جاتے جاتے ملدرک کا علاقہ اپنے ایک امیر مرتضیٰ خاں انجو کے

لہری موقع دیکھ کر علی عادل شاہ سے اتحاد کر لیا۔ حسین نظام اتنی طاقتوں کا ایک ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تھک ہار کر قلعہ کلیان کے محاصرے سے دستبردار ہو گیا۔ اپنے بال بچوں کو قلعہ اوسا کی طرف روانہ کر دیا اور خود قطب شاہ کے ہمراہ دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہوا اور دشمن سے چھ کوس کے فاصلے پر مقیم ہوا۔ دوسرے روز دونوں نے لشکر مرتب کیے اور دشمن سے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔

یہ دونوں دشمن کے بہت قریب پہنچ چکے تھے کہ اچانک بارش شروع ہو گئی حالانکہ یہ بارش کا موسم نہیں تھا۔ بارش اتنی خوفناک تھی کہ میدان میں سمجھو اور دلدل کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس کا توپ خانہ نہ صرف بے کار ہو کر رہ گیا بلکہ دشمن کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں اور اس سے کہا جائے تلوار چلاؤ۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جنگ سے ہاتھ اٹھالیا جائے۔

”میں ان توپ خانوں کی وجہ سے رام راج سے جنگ کرنا چاہتا تھا، اب صورت حال بدل گئی ہے۔ توپ خانے دشمن کے ہاتھ میں آ گئے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں دشمن سے جنگ کرنا مناسب ہے؟“

مشیروں نے بھی یہی مشورہ دیا۔

”موجودہ حالت میں دشمن سے معرکہ آرا ہونا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اگر اس وقت لڑائی کی گئی تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ فی الحال آپ لڑائی کا ارادہ ترک فرمائیں اور اپنے ملک کو واپس چلیں۔ آئندہ پھر کبھی موقع ملے تو دشمن سے سمجھ لیا جائے گا۔“

حسین نظام اس مشورے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دشمن نے ان دونوں کا تعاقب کیا۔ روانہ ہوتے ہوئے نظام شاہی لشکر میں سخت انتشار پھیل گیا۔ جس کا جس طرف مذاہنا بھاگ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حسین نظام کے ساتھ ایک ہزار سے زیادہ سوارانہ رہے۔ اس کے باوجود حسین نظام سفر کی منزلیں طے کرتا رہا۔ دشمن کے پانچ چھ ہزار سواروں نے اسے گھیر رکھا تھا لیکن کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہ حسین نظام شاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا بالآخر تعاقب کرنے والے واپس ہو گئے۔

حسین نظام احمد نگر پہنچا ہی تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ رام راج، علی عادل، علی برید اور برہان عماد الملک احمد نگر پہنچنے والے ہیں۔ اس وقت قطب شاہ بھی واپس چا چکا تھا۔

کو واسطہ بنا کر معاملے کو رفع دفع کر آیا اور صلح کی کوشش کرنے لگے۔

اس گفت و شنید کے نتیجے میں رام راج اپنی جگہ سے اٹھا اور حسین نظام کے استقبال کی تجدیدی۔ پھر اپنی نشست کے برابر بیٹھا۔

حسین نظام نے قلعہ کلیان کی چابی رام راج کے سپرد کی۔ رام راج نے یہ چابی اسی وقت علی عادل کے پاس بھجوا دی۔

حسین نظام نے یہ سمجھا تھا کہ رام راج کے غرور کا سبب علی عادل ہے۔ اسی کے کہنے پر اس نے یہ ناشائستہ حرکت کی تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا تھا لہذا اس نے علی عادل سے ملاقات نہیں کی اور اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ بعد ازاں وہ احمد نگر روانہ ہو گیا۔

وہ رام راج سے توضیح کر چکا تھا لیکن علی عادل کی طرف سے اب بھی کھٹکا تھا۔ اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے لیے خفائی بندوبست کر لے۔ اس نے احمد نگر کے قلعے کی ازسرنو تعمیر شروع کروائی اور اس کی وسعت میں اضافہ کیا۔ قلعے کے گرد اس نے ایک چوڑی اور گہری خندق کھدوائی۔

انہی دنوں عماد الملک کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا برہان عماد الملک تخت نشین ہوا۔

حسین نظام شاہ قطب شاہ سے دوستانہ مراسم پیدا کرنا چاہتا تھا کیونکہ قلعہ احمد نگر کے محاصرے کے ایام میں قطب شاہ نے اس سے بہت اچھا برتاؤ کیا تھا۔

حسین نظام کے مقرب خاص ملاعنایت نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ایک قاصد قطب شاہ کے پاس بھیجے۔

ملاعنایت کی کوششوں سے حسین نظام اور قطب شاہ میں اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ ان دونوں نے یہ بھی طے کیا کہ قلعہ کلیان کو فتح کیا جائے۔ مزید طے ہوا کہ اگر رام راج اور علی عادل مزاحمت کریں تو حسین نظام رام راج سے لڑائی کرے اور قطب شاہ علی عادل کو سمجھے۔

اس معاہدے کے بعد حسین نظام اور قطب شاہ نے قلعہ کلیان کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ اہل قلعہ پہلے کی طرح عاجز آ کر حسین نظام سے امان کے طالب ہوتے کہ اچانک یہ اطلاع ملی کہ رام راج اور علی عادل ایک زبردست لشکر لے کر اس طرف آ رہے ہیں۔

برہان عماد الملک ابھی جہانگیر خاں دکنی کے قتل کا واقعہ بھولا نہیں تھا۔ اس نے بھی حسین نظام سے بدلہ لینے کا

جہانگیر خاں دکنی نے عادل شاہی سرحد پر قیام کیا اور دشمن کی نقل و حرکت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کا روانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رام راج اور عادل شاہی لشکر میں غلے کی رسد بند ہو گئی اور جلد ہی قلعے کے آثار پیدا ہونے لگے۔

جب صورت حال دیگر کون ہو گئی تو رام راج اور عادل شاہ نے پڑاؤ ختم کیا اور آشتی نامی قصبے میں آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک فوج قلعہ پرندہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجی جائے اور واپس آ کر احمد نگر کو حسین نظام کے قبضے سے نکالا جائے۔

جب اس منصوبے کی اطلاع حسین نظام کو ہوئی تو اس کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ اس نے قاسم بیگ کو رام راج کے پاس بھیجا کہ وہ اسے صلح اور دوستانہ مراسم کے لیے آمادہ کرے۔ قاسم بیگ کی کوششوں سے صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔

رام راج نے صلح کے لیے تین شرطیں پیش کیں۔ کلیان کا قلعہ علی عادل کے سپرد کر دیا جائے۔ جہانگیر خاں دکنی کو قتل کر دیا جائے کیونکہ اس نے ہماری رسد بن کر دی تھی۔ حسین نظام ہمارے پاس آئے۔

یہ تینوں شرائط نہایت کڑی تھیں، خاص طور پر جہانگیر خاں دکنی کے قتل کی شرط لیکن اس نے اپنی اور اپنے ملک کی خیر اسی میں دیکھی کہ انہیں مان لیا جائے۔ اس نے اپنے چند خاص آدمیوں کو جہانگیر خاں دکنی کے گھر روانہ کیا۔ یہ بھی خیال نہ کیا کہ وہ مہمان ہے اور مدد کو آیا ہے۔ ایک کافر کے کہنے پر اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہ رام راج سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔

ملاقات کے وقت رام راج کا غرور دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا اور بیٹھے بیٹھے حسین نظام کی دست بوسی کی۔ حسین نظام سمجھ رہا تھا کہ وہ شرط پوری کرنے پر مہارک بادوسے گالین یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ رام راج استقبال کے لیے کھڑا تک نہیں ہوا۔ حسین نظام کو یہ ناشائستہ حرکت نہایت ناگوار گزری۔ اس نے اسی وقت بھری محفل میں پانی منگوایا اور اپنے ہاتھ دھوئے۔ رام راج سمجھ گیا کہ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کے ہاتھ نندے ہو گئے ہیں۔ جو اب میں اس نے بھی پانی منگوایا اور اپنے ہاتھ دھوئے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ ”اگر یہ شخص میرا مہمان نہ ہوتا تو ابھی تلوار سے اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔“

بد مزگی ایسی ہو گئی تھی کہ حسین نظام کو واپسی کا راستہ دیکھنا چاہیے تھا لیکن رام راج کے بھائیوں نے قاسم بیگ

کے تعلقات بہتر ہو جائیں گے، اس کے بعد یہ تینوں حکمران آپس میں مل کر رام راج پر حملہ کریں۔ اسی طرح شولا پور کا قبضہ بھی منٹ جائے گا جو ہر مرتبہ بھڑے کی بنیاد بنتا ہے۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ایک ہی دن دونوں طرف شادی کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔ چاند بی بی بیجا پور آگئی اور بدیہ سلطان بیاہ کراچہ تقرر ہو گئی۔

یہ شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔ طرفین نے جی کھول کر جشنِ مسرت منفقہ کیے۔ اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ اب اس مقولے پر عمل کرنے کا وقت تھا۔

شادی کے امور سے فراغت کے بعد علی عادل شاہ نے حسین نظام شاہ، ابراہیم قطب شاہ اور علی برید کے ہمراہ رام راج کو تباہ و برباد کرنے کا مہم ارادہ کر لیا۔ یہ چاروں فرماں روا بیجا پور کے قریب ایک جگہ جمع ہوئے اور پوری تیاری سے لشکرِ عظیم کو لے کر بیجا پور کی طرف روانہ ہوئے۔ سفر کی منزلیں طے ہوتی رہیں یہاں تک کہ دریائے کرشنا کا کنارہ آ گیا۔ یہ علاقہ علی عادل شاہ کے قبضے میں تھا۔

”دریا کے تمام گھاٹ بند کر دو۔“ رام راج اس زور سے چیخا کہ دربار کے دروید پوار ابل گئے۔

اس نے اپنے بھائی تراج کو تین ہزار سواروں، پانچ سو ہاتھیوں اور ایک لاکھ پیادوں کے لشکرِ جبار کے ساتھ دریا کے تمام گھاٹوں کو بند کرنے کے لیے روانہ کیا۔

اس لشکر کی روانگی کے بعد رام راج نے اپنے مٹھلے بھائی تنکنادری کو مال و اسباب کے ساتھ روانہ کیا۔ ان لوگوں نے گھاٹ بند کر دیے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا دریائے پارا ترنا مشکل ہو گیا۔

یہ انتظامات ہو گئے تو رام راج خود بھی آس پاس کے راجاؤں اور ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

مسلمان بادشاہوں نے ایک جماعت کو دریا کی گہرائی کا اندازہ کرنے کے لیے پانی میں اتارا۔ ان لوگوں نے تیس چالیس کوس تک دریا میں چلنے کے بعد دو تین راستے ایسے دریافت کیے جہاں دریا کم گہرا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ جہاں پانی کم ہے اس کے بالکل سامنے دوسرے کنارے پر ہندوؤں کی فوج کھڑی ہوئی ہے۔

آخر ایک طویل مشورے کے بعد یہ فیراڈادی کہ ہم نے ایک اور نوکھا اور نیا گھاٹ دریافت کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لشکر کے سپاہی گروہ درگروہ اس طرف جانے

کوشور خاں نے اختیار ملتے ہی ایک قاصد ابراہیم قطب شاہ کے پاس بھیجا۔ ابراہیم قطب شاہ پہلے ہی رام راج سے تالاں تھا۔ رام راج نے اس کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے مدعا سنتے ہی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ کوشور خاں نے یہ ذمہ داری ابراہیم قطب شاہ کے سپرد کی کہ وہ حسین نظام کو اس معاملے میں قائل کرے۔

ابراہیم قطب شاہ نے مصطفیٰ خاں اردستانی جو صحیح النسب سید اور ایک عظیم المرتبت فرد تھا، احمد نگر بھیجا۔ اس نے حسین نظام سے ملاقات کی اور تاریخی حوالوں سے وقت کی ضرورت کو بیان کیا۔

”سلاطین، بہمنیہ کے عہد حکومت میں جبکہ تمام ملک وکن پران کی حکومت تھی، کبھی مسلمان فتح حاصل کرتے تھے، کبھی بیجا نگر کے ہندو مسلمانوں پر غالب آتے تھے۔ بہمنی سلاطین عام طور پر بغیر کسی نتیجے کے ہی جنگ موقوف کر دیتے تھے اور بیجا نگر کے ہندوؤں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ اب کی بات دوسری ہے۔ اب ملک وکن کسی ایک حکمران کے تابع نہیں۔ کئی حکمرانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اب دانش مندی اسی میں ہے کہ تمام مسلمان فرماں روا ایک دوسرے کے دوست بن کر رہیں، باہمی اتحاد و اتفاق سے کام لیں تاکہ زبردست دشمن سے نجات پاسکیں۔ ہمارا الیہ یہ ہے کہ ہندو متحد ہیں اور مسلمان حکمران ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ رام راج کی روز افزوں قوت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ نیز آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کرناٹک کے تمام فرماں روا اس کے تابعدار ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمان فرماں رواؤں کا ایک دوسرے سے کشیدہ رہنا بالکل بے جا ہے۔“

حسین نظام شاہ نے مصطفیٰ خاں کی تعریف کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ امرائے نظام شاہی سے ملاقات کر کے صلے کے معاملات طے کرے۔

مصطفیٰ خاں نے حسین نظام کے چند اہم امراء سے تنہائی میں ملاقات کی اور قربت کے لیے نئے نئے راستے تلاش کیے گئے۔ ان ملاقاتوں میں عادل شاہی امراء بھی شریک ہوئے۔ فریقین نے طے کیا کہ حسین نظام شاہ اپنی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے کروے اور اپنی بیٹی کو جہیز میں شولا پور کا قلعہ دے دے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اپنی بہن بدیہ سلطان کو حسین نظام شاہ کے بڑے بیٹے شہزادہ مرتضیٰ سے بیاہ دے اس طرح دونوں فرماں رواؤں

اور عزت و آبرو پر ہندو دوست درازی نہیں کریں گے لیکن رام راج نے اس وعدے کو فراموش کر کے احمد نگر میں مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ نہ قتل سے اپنے ہاتھ روکے نہ مسجدوں کی بے حرمتی سے۔ علی عادل یہ سب دیکھ بھی رہا تھا اور نہ ہی رہا تھا لیکن وہ اس وقت کچھ نہ بولا کہ مصلحت یہی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا افسوس اور دکھ بڑھتا گیا۔ انہی دنوں اس نے خواب دیکھا۔ کوئی اس سے کہہ رہا تھا، تم کیسے مسلمان ہو۔ اپنے سامنے مسجدوں کو چلتے ہوئے دیکھتے رہے اور خاموش رہے۔ مسلمانوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھتے رہے اور کسی کا ہاتھ نہ پکڑ سکے۔ روزِ محشر خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے اسی وقت ارادہ کر لیا کہ وہ ہندوؤں سے جنگ کرے گا اور مسلمانوں کے قتل کا بدلہ لے گا۔ شاید اس طرح اس کی بخشش ہو جائے۔ اس نے امراء اور اراکینِ سلطنت کو مشورے کے لیے بلا یا اور اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ ان امراء نے تمام باتیں غور سے سنیں۔ ان میں محمد کوشور خاں بھی تھا جو نہایت صاحبِ فہم اور بادشاہ کا رازدار تھا۔ اس نے نہایت ادب سے عرض کیا۔

”حضور کی رائے نہایت ٹھوس اور جامع ہے۔ اس پر مزید غور و فکر کی محتاج نہیں تاہم چونکہ آپ نے ہمیں اظہارِ خیال کا حکم صادر کیا ہے اس لیے بعد ادب گزارش ہے کہ اس قدم کے اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ تمام مسلمان فرماں روا باہمی اتحاد و اتفاق سے کام لیں کیونکہ یہ معاملہ کشور کشائی کا نہیں تمام مسلمانوں کی غیرت کا ہے۔ رام راج کے لشکر کی کثرت اور اس کی روز افزوں قوت روز روشن کی طرح واضح ہے۔ اس کا ملک چھ بندرگاہوں، ان گنت قلعوں اور شہروں پر مشتمل ہے۔ اس کا محصول بارہ کروڑ ہون ہے۔ اس کے جاہ و جلال کا سکھ ہر دل پر لکھا ہوا ہے۔ اس سے تنہا جنگ کرنا مناسب نہیں۔ اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ ہماری رائے میں اس وقت حضور کو حسین نظام سے دوستانہ مراسم پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔“

علی عادل نے کوشور خاں کے اس مشورے کو پسند کیا اور اسے اس معاملے میں مختار کل بنا دیا۔ ”آپ اس معاملے میں مختار کل ہیں جو قدم اٹھانا چاہیں اٹھائیں، آپ کو میری منظوری کی ضرورت نہیں۔ فیصلہ بھی آپ کریں گے، عمل بھی آپ کریں گے۔“

حوالے کر گیا۔ یہ علاقہ شولا پور کے نزدیک تھا۔

مرتضیٰ خاں نچلا بیٹھے والا نہیں تھا۔ گا بے بگا ہے شولا پور کی طرف جاتا اور تباہی و بربادی پھیلا کر لوٹ آتا۔ یہ قلعہ چونکہ حسین نظام کے قبضے میں تھا، اس کی حفاظت اس کی ذمہ داری تھی۔ اس نے غلے کی بارہ ہزار پوریاں قلعہ شولا پور میں بھیجیں کہ اگر کسی وقت مرتضیٰ خاں قلعے کا محاصرہ کر لے تو وہاں قلعہ کو غذائی قلت کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ مرتضیٰ خاں کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے حملہ کر دیا۔ نظام شاہی امراء اس حملے کی تاب نہ لائے اور میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ مرتضیٰ خاں نے غلے کی بہت سی پوریوں کو آگ لگا دی اور سیکڑوں پوریاں ہاتھیوں پر لاد کر بیجا پور بھیج دیں۔ یہ بھی بھی وہ تھے جو نظام شاہی امراء میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔

جس وقت نظام شاہی امراء میدان سے بھاگے تھے، امیر شاہ محمد کا ایک غلام مرتضیٰ خاں کے ہاتھ لگ گیا تھا جسے کچھ دور بعد مرتضیٰ خاں نے بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ وہ اپنے مالک کے پاس پہنچا اور اسے خبر دی۔

”عادل شاہی امراء اس وقت لوٹ مار میں مصروف ہیں اور مرتضیٰ خاں کچھ فاصلے پر ایک مقام پر ٹھہرا ہوا ہے جو مجھے معلوم ہے۔ اس وقت اسے بے آسانی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔“

ان امراء نے اسی وقت دو تین ہزار سپاہیوں کو ساتھ لیا اور اس مقام پر پہنچ گئے جہاں مرتضیٰ خاں ٹھہرا ہوا تھا۔ مرتضیٰ خاں کو سمجھنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔

یہ امراء اسے لے کر احمد نگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ عادل شاہ کا امیر مرتضیٰ خاں گرفتار ہو چکا تھا۔ دوسری جانب سے نظام شاہی امیر شاہی عادل شاہ کے ہاتھ لگ گیا تھا لہذا دونوں جانب سے کوشش کی گئی کہ قیدیوں کا تبادلہ ہو۔ فریقین بیچ میں پڑے۔ شاہ فی احمد نگر آ گیا اور مرتضیٰ خاں کو بیجا پور بھیج دیا گیا۔

☆☆☆

پہلی مرتبہ جب علی عادل شاہ، حسین نظام شاہ کی ہنگامہ آرائیوں سے پریشان ہوا تھا تو اس نے رام راج سے مدد طلب کی تھی اور یہ معاہدہ طے ہوا تھا کہ بیجا نگر کے ہندو، مسلمانوں کو کھس اس لیے نقصان نہیں پہنچائیں گے کہ ایک فریق ہندو دے دوسرا مسلمان۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو بھی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ مسلمانوں کے جان و مال

مغربی معاشرے میں پہننے والے جرائم کی پردہ پوشی کا انوکھا انداز

بعض اوقات جذبات کی انتہا انسان کو جانے انجانے میں کسی نہ کسی جرم سے ہمکنار کر دیتی ہے کیونکہ... جب رستہ سیدھا نہ ملے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خواہش اور مقصد بھی غلط ہے... اسی لیے تو انہیں بھی مقصد براری کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے پڑے یہ اور بات کہ ناحق کیے جانے والا خون اپنے قاتلوں کو کسی طور معاف کرنے کے حق میں نہ تھا۔

ہوشیار سی

محمد یاسر اعوان



کے مایوس سپاہیوں نے اس کے علم کو باندھ دیکھا تو فوراً نظام شاہ کے پاس پہنچ گئے۔ رام راج کے لشکر میں سخت ابتری پھیل گئی۔ اسی برس کا بوڑھا رام راج حواس باختہ ہو کر دوبارہ سنگھاسن پر بیٹھ گیا۔ حسین نظام بڑی دور سے اسے سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھی کو آگے بڑھایا اور لوگوں کو باہل کرتا ہوا سنگھاسن کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مزدور جو سنگھاسن اٹھائے ہوئے تھے، ایسے خوفزدہ ہوئے کہ رام راج سمیت سنگھاسن کو زمین پر پھینک کر بھاگ گئے۔ رام راج میدان جنگ میں بے یار و مددگار پڑا رہا۔ کچھ لمحوں بعد ٹیل بان کی نظر سنگھاسن پر پڑی۔ ایسا خوب صورت سنگھاسن دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھرا آیا اور سنگھاسن حاصل کرنے کے لیے ہاتھی کو اسی طرف بڑھایا۔ قریب ہی ایک برہمن کھڑا تھا۔ اس نے ٹیل بان سے درخواست کی۔

”اس سنگھاسن میں رام راج ہے۔ تم اس کے لیے گھوڑا لادو تو راجا تمہیں بہت انعام داکرام دے گا۔“ ٹیل بان تو خالی سنگھاسن سمجھ رہا تھا، یہاں تو معاملہ ہی دوسرا نکلا۔ اس نے فوراً راجا کو اپنے ہاتھی کی سونڈ میں لپیٹ لیا اور حسین نظام شاہ کے توپ خانے کے افسر کے پاس پہنچ گیا۔ اس افسر نے رام راج کو گرفتار کر لیا اور حسین نظام شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ حسین نظام نے اسی وقت راجا کو قتل کر دیا اور اس کا سر جسم سے الگ کر کے میدان جنگ میں پھینک دیا۔

ہندو لشکریوں نے جب راجا کے سر کو دیکھا تو ان کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ میدان جنگ سے ایسے فرار ہوئے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ مسلمان بادشاہوں نے مغرور ہندوؤں کا دس کوس تک تعاقب کیا۔ اس جنگ میں ایک لاکھ سے زیادہ ہندو قتل ہوئے۔ مسلمان فرماں رواؤں نے بعد میں بیجا نگر میں قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا۔

اس جنگ کے بعد پھر کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ سب نتیجہ تھا اتحاد و اتفاق کا کیونکہ..... اتحاد میں بڑی برکت ہے۔

لگے۔ دوسری طرف کھڑا دشمن ان حرکات و سکنات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ صحیح نتیجے پر پہنچا۔ اس نے اصل گھاٹ کو خالی کر دیا اور اس طرف کوچ کر گیا جس طرف عادل شاہی سپاہی گئے تھے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مسلمانوں کے مقابل چلنے لگے۔ ہندوؤں سے غلطی یہ ہوئی کہ اپنی فوج کا کوئی حصہ اصل گھاٹ پر مسلمانوں کو روکنے کے لیے نہیں چھوڑا۔ مسلمانوں نے اپنی تجویز کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھا تو اصل گزرگاہ کا رخ کیا اور دو تین روز کے راستے کو صرف بارہ گھنٹے میں طے کر کے اصل گھاٹ پر پہنچ گئے۔ دشمن کی فوج ابھی تک نہ پہنچی تھی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت بڑے سکون کے ساتھ گھاٹ سے اتری۔ اس کے بعد مسلمانوں کا سارا لشکر گھاٹ عبور کر کے میدان میں آ گیا۔ صبح ہوئے ہی یہ لشکر رام راج کی فوج کی طرف روانہ ہوا۔ رام راج کی فوج یہاں سے پانچ کوس کے فاصلے پر مقیم تھی۔

مسلمان فرماں رواؤں نے اپنے لشکر کو منظم و مرتب کیا۔ تمام توپیں بارود اور گولوں سے بھری گئیں۔ حسین نظام کے تیر اندازوں نے رام راج کی فوج کو توپ خانے کے سامنے دھکیل دیا اور پھر توپوں کے دہانے مل گئے۔ رام راج کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔

رام راج اب تک کسی غلطی میں تھا۔ اس تباہی کے بعد اس کی آنکھیں نکلیں۔ وہ فوراً اپنے سنگھاسن سے نیچے اتر پڑا۔ زربفت کا شامیانہ نصب کیا گیا۔ وہ اسی شامیانے میں ایک جڑاؤ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے حکم کے مطابق اس کے چاروں طرف روپے، اشرافیوں اور مونیوں کے انبار لگا دیے گئے۔ دولت کے یہ ذخیر اس نے بغیر کسی حساب کے اپنے لشکریوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ انعام کے لالچ میں اس کے سپاہی پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش سے لڑنے لگے۔ اس زور کے حملے ہوئے کہ مسلمانوں میں پریشانی پھیل گئی۔

یہ کیفیت دیکھ کر مسلمان بادشاہوں پر مایوسی نے غلبہ کر لیا مگر حسین نظام شاہ اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ اس کے چاروں طرف ہزاروں بان اور تفتک چھوٹ رہے تھے لیکن وہ آگے بڑھتا تاکہ دشمن پر حملہ کرے۔ مسلمانوں

ماخذات:

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، طبقات ناصری، منهاج سراج الدین، تاج الماثر، حسن بن احمد نظامی، منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی۔

ماحول پر سردی طاری تھی۔ اپنے گھر میں بوڑھی کلیر آتش دان کے سامنے بیٹھی اپنی پالتو بلی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھی کہ چائیک ٹیلی فون کی ٹھنکی بجی۔ ”ہیلو“ کلیر نے ریسورٹ اٹھا کر کہا..... جواب میں دوسری طرف سے ایک نرم اور خوبصورت نسوانی آواز سنائی دی۔ ”میں نے اخبار میں آپ کا نمبر ذاتی کالم میں دیکھا تھا۔“ کلیر کو اس قسم کے ٹیلی فون آنے کی امید تھی۔ کیونکہ رات کے گیارہ بجے کوئی بھی اسے ٹیلی فون

دسمبر 2017ء

سینس ڈائجسٹ 4

55 سسپس ڈائجسٹ

دسمبر 2017ء

پھر اداس ہو؟“

”بہت زیادہ۔“ دوسری جانب سے سسکیوں کی آواز آئی۔ ”میں نے..... میں نے مشکل کو تم سے جھوٹ بولا تھا کلیئر۔“

”اوہ! لیکن کس سلسلے میں؟“

”میں نے تم سے کہا تھا تاکہ میں خودکشی کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا، میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔“

”تمہارا شوہر کہاں ہے، کیرویلین؟“

”وہ شہر سے باہر نیشنل ڈین.....“ جملہ ادھورا رہ گیا..... کلیئر اکو ایسا لگے جیسے کیرویلین بے خیالی میں کوئی بات کہنے والی تھی لیکن اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی خاموش ہو گئی۔ چند لمحے بعد ریسور پر اس کی آواز ابھری۔ ”میں گھر پر تنہا ہوں کلیئر۔“

”کیا تمہارے گھر کے قریب کوئی تمہاری سہیلی ہے جو تھوڑی دیر تمہارے ساتھ رہ سکے؟“ کلیئر نے نیشنل ڈین کا لفظ ذہن نشین کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں! میں اپنی کسی سہیلی کو نہیں بلا سکتی۔ میں کسی کو بھی اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کر سکتی۔“

”تمہیں کیا پریشانی ہے کیرویلین؟“ کلیئر نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا..... دوسری جانب کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر کیرویلین کی سرکشی نما آواز آئی۔

”میں نے کسی کو نہیں بتایا کلیئر، صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔ میری پریشانی یہ ہے کہ میں پاگل ہونے والی ہوں۔“

”تمہیں یہ خیال کیوں آیا کیرویلین؟“

”یہ خیال ہی نہیں حقیقت ہے اور ایک ایسی حقیقت ہے جس کا علم صرف مجھے ہے۔ میں اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتی ہوں لیکن کبھی بھی میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھرتی ہے کہ میں اسے قتل کر دوں..... ابھی پچھلے اتوار کو اس خواہش نے مجھ پر اتنا غلبہ پایا کہ میں بستر سے نکل کر بچکن..... میں گئی اور وہاں سے چھری اٹھا لائی۔ جب میں چھری اتھارتھ میں لیے اپنے شوہر کو قتل کرنے خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی تو یکایک مجھے ہوش آ گیا۔ اس سے پہلے میری حالت ایسی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے میں نے مشکل کی شب تمہیں ٹیلی فون کیا تھا۔“

یہ سن کر کلیئر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کیرویلین کوئی عام قسم کی جذباتی عورت نہیں جو جذبات کی رو میں بہہ کر خودکشی کر لیتی ہیں بلکہ خطرناک قسم کی نفسیاتی مرید بھی تھی..... ایسے لوگوں سے گفتگو بہت احتیاط سے کرنی چاہیے..... کلیئر ان نفسیات کی تھوڑی بہت شد بدھی، اگرچہ اس طرح وہ..... اس عورت کا علاج تو نہیں کر سکتی تھی لیکن اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ ایسے لوگوں کو کھس دلائل کے ذریعے خودکشی سے روکا بھی نہیں جاسکتا۔ ایسے لوگوں سے سننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں فوراً نفسیاتی علاج کرانے پر آمادہ کیا جائے۔

”تم نے کسی اور کو اس بارے میں نہیں بتایا.....؟“ کلیئر نے پوچھا۔

”نہیں، تمہارے علاوہ کسی کو نہیں۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”تمہارے شوہر کو تمہارے ان خیالات کا علم ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ کیرویلین نے بے بسی سے کہا.....

”انہیں یقین ہے کہ میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ اسی لیے بعض اوقات مجھے اپنے خیالات سے نفرت ہونے لگتی ہے..... میں سوچتی ہوں کہ اس سے قتل کے میں اپنے شوہر کو کسی روز قتل کر دوں، کیونکہ ناخود ہی مر جاؤں۔“

”نہیں، تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔“ کلیئر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”تم نے مجھ سے مشورہ لینے کے لیے فون کیا ہے۔ کیا تم میرا مشورہ قبول کرنے کو تیار ہو.....؟“

”کون سا مشورہ؟“ عورت نے سرکشی میں پوچھا۔

”تمہیں اس بات کا بخونی احساس ہے کہ تم ذہنی طور پر بیمار ہو۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونا ہی بیماری سے چھٹکارا پانے کی جانب پہلا قدم ہے۔ اس کے برعکس ایسے لوگ جو ذہنی طور پر بیمار ہونے کے باوجود خود کو بیمار نہیں سمجھتے، ماہرین نفسیات کے لیے بہت سی دشواریاں پیدا کر دیتے ہیں۔“

”مجھے یہ مت کہنا کہ میں اپنے خاندانی ڈاکٹر سے مشورہ کروں اور اپنا معائنہ کر اؤں کیونکہ خاندانی ڈاکٹر میرا دیور ہے جسے میں اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کر سکتی۔“

”نہیں، یہ ضروری نہیں کہ تمہاری پریشانی سے تمہارا شوہر یا تمہارا خاندانی ڈاکٹر آگاہ ہو۔ شہر میں بے شمار ماہر

نفسیات موجود ہیں تم ان کے پتے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دیکھ سکتی ہو۔ اگر چاہو تو میں دو چار نام بتا سکتی ہوں۔“ دوسری جانب سے طویل خاموشی کے بعد اس عورت نے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”وہ ڈاکٹر میرے شوہر کو تو کچھ نہیں بتائے گا؟“

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کیرویلین کہ ڈاکٹروں کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں جو کچھ انہیں اپنے مریدوں سے معلوم ہو، وہ سختی سے اپنے تک ہی محدود رکھتے ہیں اور کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔“

”آپ جس ڈاکٹر کا نام مجھے بتانا چاہتی ہیں آپ کے خیال میں وہ قابل اعتماد ہے؟“ اب اس عورت کی آواز پُر امید تھی۔

”ہاں، تم بے فکر رہو۔ اس کا نام ڈاکٹر رابرٹ ہے۔ اس کا دفتر میڈیکل ایسوسی ایٹس بلڈنگ میں ہے..... بہتر ہوگا اگر تم یہ نام کسی کاغذ پر لکھ لو.....“

”نہیں، مجھے یاد رہے گا۔“ وہ بولی.....

”پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ صبح سب سے پہلے تم ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں۔ بہت بہت شکریہ، کلیئر۔“

”تمہارا شوہر کب گھر واپس آئے گا؟“ کلیئر نے پوچھا لیکن سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا..... تیسری بار کلیئر کو کیرویلین کا فون منگل کے روز ملا..... نو بجنے سے چند منٹ پہلے..... کلیئر اپنے تو کیرویلین کی آواز نہیں پہچان سکی کیونکہ آواز بہت مدہم تھی لیکن پھر مخصوص انداز گفتگو سے اس نے فوراً پہچان لیا۔

”بہت دیر ہو گئی، بہت دیر، کل کا انتظار.....“ وہ کہہ رہی تھی۔

”کیرویلین!“ کلیئر اتنے لہجے میں بولی۔

”ہوں۔“ آواز نے ہنسنے کے انداز میں کہا۔

”ہیلو کلیئر۔“

”کیا تم نے کچھ کھا لیا ہے کیرویلین؟“

”دیر ہو گئی، بہت دیر ہو گئی، میں کل کا انتظار نہیں کر سکتی۔“

”کل کا انتظار کس لیے کیرویلین؟“ کلیئر استعجب تھی۔

”ڈاکٹر سے ملاقات، ڈاکٹر رابرٹ، شاید میں آج اسے قتل کر دوں..... جب وہ گھر آئے، کھانے پر، یہ بہتر ہے۔“ کیرویلین نے کہا۔

بحث

ہماری تجویز ہے کہ آئندہ بحث بابوں کی بجائے ایسے لوگوں سے تیار کروایا جائے جو بابوں ہوں۔ مثلاً چند معمار حضرت کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ وہ اس کی تعمیر صحیح طور پر کر سکیں۔ کہیں کئی ندر بننے پائے۔ کیونکہ

نخست اول چوں نہد معمار کج
تأثراً می رود دیوار کج
چند لوہار حضرات کو بھی بحث کی تیاری میں شریک کیا جائے۔ وہ بحث کو مضبوط سے مضبوط بنیادوں پر تیار کرنے میں مدد کریں گے اور اپنی بحث میں خامیوں کے لیے لپک نہیں رہے گی۔

کچھ بڑھی کا کام کرنے والے بھی شامل کیے جائیں جو بحث کی چوبیس درست طور پر بتا سکیں۔ چوبیس درست ہوں گی تو بحث کا ڈھانچا بھی درست ہوگا۔

کچھ ایسے لوگ بھی بلائے جائیں جن کا تعلق طباعت کے فن سے ہو۔ وہ یہ بتا سکیں گے کہ بحث کے کون سے حصے سہری حروف میں چھاپے جائیں اور کون سے عام سیاری سے طبع ہوں؟

چند ایک جلد سازوں کی بھی ضرورت پڑے گی جو بحث کی مضبوط اور دلچسپ جلد بندی کا اہتمام کریں اور اس طرح بحث ہر شخص کو خوبصورت دکھائی دے گا۔

ان میں دیگر پیشوں کے بھر مند بھی شامل کیے جاسکتے ہیں مگر یہ بات ہم وزیر خزانہ پر چھوڑ دیتے ہیں وہ جس کو چاہیں شامل کر لیں۔ صرف ہمارا نام چھوڑ دیں کیونکہ ہم پہلے ہی بہ ماہر اپنے گھر کا بحث تیار کرنے میں مصروف رہتے ہیں اس لیے ہمیں ان کی مدد کرنے کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ اگر ہماری ان تجاویز پر توجہ دی گئی تو کسی کو یہ اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملے گا کہ بحث بابوں کا تیار کردہ ہے۔ دوسرا یہ کہ ہنرمندوں کی شرکت سے واقعی بحث خالص عوامی ہوگا۔ اس طرح متوازن اور غیر متوازن کا بیکر بھی ختم ہو جائے گا کیونکہ اس میں سر سے متوازن ہی نہیں رہے گا۔

شیخ عقیل کی کتاب ”سرخ سفید ساہ“ سے اقتباس

”کیرویلین!“ کلیرانے زور سے کہا۔ ”تم نے کیا کھایا ہے؟“

”کریسٹ سے کہہ دینا، یہ میں نے اس کے لیے کیا ہے۔“ آواز بھاری اور مدہم ہوتی جا رہی تھی۔ ”کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔“

”لیگل لیف بتا دینا اسے..... محبت! آواز مدہم ہوتی ہوئی خاموش ہو گئی..... اچانک کلیرانے کو کوئی آواز سنی اور پھر گھڑی نے نو بجنے کا اعلان کیا..... اس کے بعد دو مرتبہ کو کوئی آواز آئی۔

”کیرویلین!“ کلیرانے آواز دی مگر دوسری طرف خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ کلیرانے نئی مرتبہ آوازیں دیں مگر دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ کلیرا کے پاس کئی معلومات تھیں۔ سب سے اہم یہ کہ کیرویلین کا شوہر لیگل لیف نامی کلب میں کھانا کھا رہا ہوگا۔ اس کے شوہر کا نام مکمل نام کریسٹ ہے اور شوہر کا بھائی ڈاکٹر ہے۔ کلیرا نے ڈائریکٹری میں لیگل لیف کلب کا نمبر دیکھا اور ٹیلی فون کرنے کے لیے ڈائل گھمایا۔

دوسری جانب سے کسی مرد نے ریسپورڈ اٹھالیا۔

”میں کسی ایسے آدمی سے بات کرنا چاہتی ہوں جو کلب لیگل لیف کے تمام ارکان کے ناموں سے واقف ہو.....“ کلیرانے۔

”بہت بہتر، ذرا توقف کیجیے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی اور خاموشی طاری ہو گئی پھر کچھ دیر بعد اس نے ایک مرد کی آواز سنی۔ ”میں خود کسی کی روک تھام کے ادارے کی رضا کار بول رہی ہوں، آپ کے ایک رکن سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ مجھے اس کا مکمل نام معلوم نہیں، مختصر طور پر اسے کریسٹ کہتے ہیں۔“

”کریسٹ!“ دوسری جانب سے آواز آئی۔

”نہریے اس وقت میرے ذہن میں تین کریسٹ آرہے ہیں۔“

”ان کی بیوی کا نام کیرویلین ہے اور ان کا ایک بھائی ڈاکٹر ہے۔ کیا آپ نے پہچان لیا؟“

”بے شک، آپ ڈاکٹر کریسٹ مارشل کی بات کر رہی ہیں وہ دونوں کے ڈاکٹر ہیں۔“

”آپ ڈرافٹروا انہیں لیٹینوں پر بلا دیں۔“ کلیرا نے درخواست کی۔

”بہتر، آپ انتظار کریں۔“

ٹھیک ہے، کیرویلین کا شوہر دندان ساز ہی ہوگا۔ تبھی ایک روز کیرویلین نے نیشنل ڈین کا نام لیا تھا۔ وہ غالباً نیشنل ڈین سرجن ایسوی ایشن کہنا چاہتی تھی لیکن درمیان ہی میں رک گئی۔ کلیرانے سوچا۔

”ہیلو کیرویلین! کیا بات ہے؟“ اچانک ریسپورڈ میں مردانہ آواز ابھری۔

”ڈاکٹر کریسٹ! میں کلیرا بول رہی ہوں۔ خود کسی کی روک تھام کے ادارے سے۔“

”ابھی دس پندرہ منٹ پہلے مجھے آپ کی بیوی کیرویلین کا ٹیلی فون ملا ہے۔ اس نے شاید کسی قسم کی گولیاں کھالی ہیں۔ وہ فون پر گفتگو کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی تھی۔“

”کیا!“ ڈاکٹر کریسٹ کی آواز میں خوف اور استعجاب نمایاں تھا۔ ”میری بیوی نے گولیاں کھالی ہیں! کس قسم کی گولیاں؟“

”مجھے نہیں معلوم ڈاکٹر، آپ فوراً گھر پہنچیں۔ اگر آپ کا گھر کلب سے کافی فاصلے پر ہے تو بہتر ہے کہ آپ پہلے ایسویٹنس کے لیے فون کر دیں اور پھر یہاں سے روانہ ہوں۔“

”بہت اچھا میڈم۔“ ڈاکٹر کی گھبراہٹ ہوئی آواز آئی۔

”آپ نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟“

”کلیرا ڈیول، آپ میرا فون نمبر نوٹ کر لیں اور بعد میں مجھے اپنی بیوی کی حالت سے آگاہ کرنا نہ بھولیں۔“

کلیرانے اپنا نمبر نوٹ کرانے کے بعد فون بند کر دیا..... دو گھنٹے اس نے بے چینی کے عالم میں گزارے تب ہی اس کے فون کی گھنٹی بجی۔

”ہیلو میں کلیرا بول..... رہی ہوں۔“

”میں لیٹینٹ جیکسن بول رہا ہوں۔ محکمہ پولیس کے دفتر سے۔“ دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز نے کہا۔

”ڈاکٹر کریسٹ مارشل نے مجھے آپ کا نمبر دیا ہے کیونکہ ان کی حالت ایسی نہیں کہ وہ کسی سے بات کر سکیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا تعلق خود کسی کی روک تھام کے ادارے سے ہے اور آپ ہی نے ڈاکٹر کریسٹ کو ان کے کلب فون کر کے بتایا تھا کہ ان کی بیوی نے زہریلی

گولیاں کھالی ہیں؟“

”جی ہاں، درست ہے، اب کیرویلین کسی ہے؟“

”وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔“ لیٹینٹ نے بتایا۔

”اوہ! مجھے بے حد افسوس ہوا لیٹینٹ!“

”صبح رپورٹ تو پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوگی لیکن کریسٹ کے مطابق خواب آور گولیوں کی وہ شیشی بالکل خالی ہے جس میں پوری دو درجن گولیاں موجود تھیں۔“

”میرے خدا! ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی..... بتیں سال۔“

”کیا آپ مرحومہ سے ذاتی طور پر واقف تھیں؟“

میرا خیال تھا کہ آپ لوگ کسی کو بھی اپنا نام نہیں بتاتے۔“

”درست لیکن ہم دونوں کافی بے تکلف ہو گئے تھے اور اس سے مجھے کافی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ آج رات سے قبل بھی ہمارے درمیان دو مرتبہ گفتگو ہو چکی ہے۔“

”اوہ! اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے بھی دوسریہ خود کسی کی کوشش کر چکی ہے۔“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اس کا ارادہ ضرور تھا۔ میں اس کے شوہر سے پہلے ہی رابطہ کر لیتی لیکن کیرویلین نے مجھے بھی اپنا مکمل نام نہیں بتایا، آج رات بھی نہیں، بہر حال تین مرتبہ گفتگو کے بعد چند ایسی باتیں ضرور معلوم ہوئیں، جن کی وجہ سے میں آج ڈاکٹر کریسٹ مارشل سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔“

”تمہیں آپ کے بیان کی ضرورت پڑے گی۔ آپ کس وقت پولیس صدر دفتر تشریف لاسکتی ہیں؟“

”جب آپ کہیں۔“ کلیرانے وقت مقرر کر کے فون بند کر دیا۔ دوسرے روز اخباروں میں خود کسی کی ایک مختصر خبر شائع ہوئی..... جب کلیرا پولیس صدر دفتر پہنچی تو وہاں کیرویلین کا شوہر کریسٹ بھی موجود تھا۔ کریسٹ لائے قد اور دبیلے جسم کا خوبصورت آدمی تھا۔ اس کے بال ٹھنڈے اور دانت بے حد چمکدار تھے..... ڈاکٹر کریسٹ سے چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد کلیرا کو احساس ہوا کہ ڈاکٹر نہ صرف خوب صورت بلکہ خوش مزاج اور مہذب بھی ہے۔ اسے یہ سن کر شدید ذہنی مدد پہنچا کہ اس کی بیوی کافی عرصے سے خودکشی کرنے کے بارے

میں غور کر رہی تھی اور شاید اس نے پہلے بھی کوشش کی تھی، یا کی ہو۔

کلیرانے ایک ٹیپ پر اپنا بیان ریکارڈ کرایا اور اپنے اور کیرویلین کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ لیٹینٹ نے اس کا بیان ٹائپ کروا کر اس کے دستخط لیے۔ صرف آدھ گھنٹے میں کلیرا کو چھٹی مل گئی۔ لیٹینٹ نے نفسیات کے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر کے اس بات کی تصدیق کی کہ واقعی کیرویلین نے اس سے نفسیاتی علاج کے لیے رابطہ قائم کیا تھا۔ یہ تمام معلومات ڈاکٹر کی استقبالیہ کمرک سے ملیں۔

واپسی کا سفر کلیرا نے ڈاکٹر کریسٹ کے ساتھ کیا۔ سفر کے دوران ان کے درمیان بہت کم گفتگو ہوئی۔ کلیرا نے سوچا چونکہ اس کا اپنا دانتوں کا ڈاکٹر باہر گیا ہوا ہے اس لیے وہ آئندہ کچھ عرصہ اپنے دانتوں کا معائنہ ڈاکٹر کریسٹ سے کرائے گی.....

تین ماہ بعد اس نے ڈاکٹر کریسٹ کو اس کے دفتر میں فون کیا تاکہ اپنا دانت نگھوانے کے لیے وقت لے سکے۔ استقبالیہ لڑکی نے اسے اتوار کی شام چار بجے کا وقت دیا.....

ڈاکٹر کریسٹ کا دفتر منجانب آبادی والے علاقے میں ایک عمارت کی پہلی منزل پر واقع تھا۔ اسے وہاں پہنچنے میں پانچ منٹ تاخیر ہو گئی۔ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے معذرتی مسکراہٹ کے ساتھ کلیرا کو اطلاع دی.....

”ڈاکٹر صاحب ایک مریض کے ساتھ مصروف ہونے کی وجہ سے اسے پانچ بجے سے پہلے نہیں دیکھ سکتے۔ جب پانچ بجے آپ ان سے ملاقات کریں گی تو ممکن ہے میں یہاں سے چلی جاؤں کیونکہ میں چھٹیوں میں شہر سے باہر جا رہی ہوں اور مجھے چھ بجے کی بس پکڑنی ہے۔ اگر میں چلی گئی تو میں آپ کا چارٹ دے جاؤں گی، آپ ڈاکٹر صاحب کو دے دیجیے گا۔“ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے معذرتی انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ کلیرانے جواب دیا۔

کلیرا انتظار گاہ میں بیٹھ کر رسالے وغیرہ پڑھنے لگی۔ دس منٹ بعد کلیرا نے کو کوئی آواز سنی پھر شرن کی ایک آواز نے پونے پانچ بجنے کا اعلان کیا۔

اس کے بعد پھر کو کوئی آواز سنائی دی۔ کلیرا نے نظر

اٹھا کر دیوار پر لگے قدیم طرز کے لکڑی سے بنے ہوئے گھڑیاں کو دیکھا..... دیکھتے ہی دیکھتے گھڑیاں کی گھڑکی بند ہوئی اور چھوٹی سی چڑیا اندر چلی گئی۔

یہ غالباً وہی گھڑی ہے جس کی آواز میں نے مرحومہ کیرولین سے گفتگو کرتے ہوئے فون پر سنی تھی۔ اس وقت کو کوئی آواز دوسری آواز تھی، شاید اس لیے کہ ان اوقات میں ہر مرتبہ وقت مکمل ہوتا ہے یعنی ایک مرتبہ گیارہ بجے تھے دوسری مرتبہ بارہ اور تیسری مرتبہ نو۔ غالباً یہ گھڑیاں ہر پندرہ منٹ بعد وقت کا اعلان ایک مرتبہ کو کوئی آواز نکال کر کرتا ہے۔ کلیئر اسے سنا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ گھڑیاں پہلے ڈاکٹر کے گھر پر تھا اور کیرولین کی خودکشی کے بعد ڈاکٹر نے اسے اپنے دفتر منتقل کر دیا۔“

کلیئر نے کھٹکھٹا کر گھاسا صاف کیا اور بولی۔ ”سخت مد! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر پر بھی ایک ایسی ہی گھڑی ہے فیکسی یہاں موجود ہے؟“ کلیئر نے استقبال پر پیشگی لڑکی سے دریافت کیا۔

”مجھے معلوم نہیں خاتون، مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے دو تین ہفتے ہی ہوئے ہیں۔“

”اوہ!“ کلیئر خاموش ہو گئی..... چند منٹ بعد لڑکی نے کام ختم کر کے رجسٹر ایک طرف رکھتے ہوئے کلیئر کو مخاطب کیا۔

”ہوسکتا ہے کہ ایک ایسی ہی گھڑی ڈاکٹر صاحب کے مکان پر بھی ہو بھی ان لوگوں نے اس گھڑی کو یہاں لگا دیا ہے۔ اس گھڑی نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ہر پندرہ منٹ بعد مجھے اس منہ کی آواز سننی پڑتی ہے۔“

”ان لوگوں نے..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ کلیئر نے الجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میرا مطلب ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی سے ہے۔ ان کی شادی کے بعد ہی یہ گھڑیاں یہاں لگا دیا گیا ہے۔“

”لیکن ان کی شادی ہوئے تو دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔“ کلیئر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”اوہ! میں پہلی شادی کی بات نہیں کر رہی، خاتون۔“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں ڈاکٹر صاحب کی دوسری شادی کی بات کر رہی ہوں۔ وہ ابھی چند ہفتے قبل ہوئی ہے اور اسی

وجہ سے مجھے یہ ملازمت ملی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی موجودہ بیوی میری جگہ کام کرتی تھی، شادی کے بعد یہ جگہ خالی ہو گئی اور ڈاکٹر کریسٹ نے ملازمت کے لیے میرا انتخاب کر لیا۔“

کلیئر کو بڑا امداد پہنچا۔ وہ شکل سے تو ایسا نظر نہیں آتا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگی۔ ”ابھی اس کی بیوی کو مرے ہوئے تین ماہ ہو چکے ہیں اور اس نے چند ہفتے قبل دوسری شادی کر لی حالانکہ اس روز پولیس صدر دفتر میں وہ کس قدر غمگین اور رنجیدہ نظر آ رہا تھا جیسے اب کبھی شادی ہی نہیں کرے گا۔“

”یہ گھڑیاں سیسل کے مکان پر تھا میرا مطلب ہے ڈاکٹر صاحب کی موجودہ بیوی سیسل کے گھر میں..... شادی کے بعد سیسل ڈاکٹر صاحب کے ہاں منتقل ہو گئی۔“

اس نے اپنا بیشتر فریج فروخت کر دیا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے مکان میں اسے رکھنے کی جگہ نہیں تھی لیکن وہ اپنی چند اشیاء یہاں لے آئی۔ ان ہی میں سے ایک یہ گھڑیاں بھی ہے جسے آپ یہاں دیکھ رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر استقبال پر پیشگی ہوئی لڑکی دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی اور حیرت زدہ کلیئر امداد کھولے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب سوالات جنم لے رہے تھے۔

”اگر یہ گھڑیاں ڈاکٹر کریسٹ کے مکان پر نہیں تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے ٹیلی فون کرنے والی ڈاکٹر کی پہلی بیوی کیرولین نہیں۔ موجودہ بیوی سیسل تھی..... اور وہ تمام ٹیلی فون اس نے اپنے گھر سے کیے تھے۔ اگر اس بات کو مد نظر رکھا جائے کہ پہلی بیوی کی وفات کے بعد ڈاکٹر نے اتنی جلد اس لڑکی سے شادی کر لی جو اس کے دفتر میں استقبال پر لڑکی تو تصویر کا بالکل مختلف رخ سامنے آتا ہے۔“

وہ اپنے خیالوں سے اس وقت چونکی جب گھڑیاں نے پانچ بجتے کا اعلان کیا۔ گھڑیاں کی گھڑکی مکمل اور چڑیا نے باہر نکل کر دوسری گھڑی کو کوئی آواز نکالی اور واپس اندر چلی گئی، اس کے ساتھ ہی کلیئر کے ذہن سے تمام شکوک دور ہو گئے۔ یقیناً یہی گھڑیاں تھا جس کی آواز اس نے ٹیلی فون پر سنی تھی.....

اسی وقت دفتر کا اندرونی دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کریسٹ ایک مریض کے ساتھ باہر نکلا۔ اس نے استقبال پر پیشگی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر کریک

اکھدہ ہفتے پھر آئیں گے، ان کا وقت نوٹ کر لو۔ اس کے بعد تم جا سکتی ہو کیونکہ مجھے معلوم ہے تمہیں چھٹی منانے کے لیے چھ بجے والی بس سے جانا ہے۔“ اس کے بعد ڈاکٹر کی نظر کلیئر پر پڑی اور ایک لمحے کے لیے وہ حیران رہ گیا۔

”ارے آپ! مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری آج کی 1 ٹری مریض آپ ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنا اظہار کرنا پڑا.....“ استقبال پر پیشگی ہوئی لڑکی نے حیرت بھری نظروں سے کلیئر کو دیکھا اور کہا۔

”یہ ان کا چارٹ ہے ڈاکٹر۔“ اس نے ڈاکٹر کو ایک لہسا سا کاغذ دیتے ہوئے کہا۔

”آئیے، اندر تشریف لائیے۔“ ڈاکٹر کریسٹ نے کہا اور کلیئر اس کے پیچھے دفتر میں داخل ہو کر دندان سازی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے گلے میں ایک کپڑا باندھا اور پھر اس سے منہ کھولنے کو کہا۔ کلیئر نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر خاموشی سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ کلیئر کو وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا اگر گھڑیاں نے اپنی مخصوص آواز میں پندرہ منٹ گزرنے کا اعلان نہ کیا ہوتا۔ اس کی آواز اندر بھی آ رہی تھی۔

”اوہ! معاف کرنا ڈاکٹر! میرا خیال تھا کہ تم اپنے مریضوں سے فارغ ہو چکے ہو۔“

لڑکی نے نرم اور چمکدار آواز میں کہا اور دروازہ بند کر کے داہیں جانے لگی۔

اسی وقت کلیئر نے بلند آواز میں کہا۔ ”آپ یقیناً سیسل ہیں؟“

اس عورت نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کریسٹ کو دیکھا۔ ڈاکٹر کے چہرے سے اندرونی کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا جیسے یہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ دونوں عورتوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا جائے یا نہیں.....

”مجھے کلیئر کہتے ہیں سیسل، تم مجھے بھولی نہیں ہو گی؟“ کلیئر نے دھڑک دھڑک اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ سیسل کی آواز پہچان گئی تھی۔ ٹیلی فون پر کیرولین کے نام سے بات کرنے والی عورت یہی تھی.....

ڈاکٹر کریسٹ اور سیسل دونوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ سیسل خاموشی سے اندر داخل ہوئی اور اس نے دروازہ مغربوں سے بند کر دیا۔ اس کی نظریں کلیئر پر جمی ہوئی تھیں..... ”خاتون! آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے جیسے

آج کی بات

جتنا تم کسی کو پرکھو گے اتنا ہی ٹوٹنے جاؤ گے اس لیے لوگوں سے صرف پیار کرو، انہیں آزمانے اور پرکھنے کی کوشش نہ کرو۔ اپنی اچھائی اور دوسروں کی برائی بھولتے چلے جاؤ۔

☆☆☆

خالق سے اچھا تعلق اور مخلوق سے اچھا برتاؤ مومن کی نشانی ہے۔ کھانا پینا، سونا، سانس لینا کام کرنا ہی زندگی نہیں..... دوسروں کے دلوں میں..... اور ان کی دعاؤں میں زندہ رہنا اصل زندگی ہے۔

☆☆☆

صبح کی حقیقی خوشی اس شخص کو نصیب ہوتی ہے..... جو صبح کا استقبال نماز، تلاوت اور ذکر سے کرتا ہے..... اللہ پاک ہم سب کو نماز، تلاوت اور ذکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مرسلہ: شفیق حسین۔ نیوکر ایچی، سندھی ہوٹل

ہماری ملاقات اس سے پہلے بھی کہیں ہو چکی ہے!“ سیسل نے کہا۔

اس کے انداز سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا لیکن وہ اپنی اداکاری سے کلیئر کو بے وقوف نہ بنا سکی۔ وہ سیسل کا چہرہ دیکھ کر بتا سکتی تھی کہ وہ اسے پہچان گئی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کلیئر نے اس کی آواز پہچان لی تھی.....

”بے شک۔“ کلیئر نے سر ہلچے میں کہا۔ ”لیکن ٹیلی فون پر ایک غیر متعلق آدمی کی مدد سے تم دونوں نے واقعی قتل کا عمدہ منصوبہ بنایا اور کیرولین کو بالکل اور نفیاتی مریض ثابت کر دیا۔ ایسی مریض جس سے خودکشی کر لی جبکہ وہ عورت کیرولین بالکل عام ی اور سادہ عورت تھی اور اسے اس تمام ڈرامے کا قطعی علم نہیں تھا۔“ کلیئر نے ڈاکٹر کریسٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”لیکن ڈاکٹر! تم نے اسے خواب آور گولیاں کھانے پر کس طرح مجبور کیا؟ شاید بلب جانے سے پہلے چاہے یا کائی میں جل کر کے دے دیں؟“

..... اچانک کلیئر کو احساس ہوا کہ اس سے بہت بڑی



مات

ناہید سلطانہ اختر

رشتوں کی خوشبو سے محروم ایک ناکام عاشق کی زندہ دلی

کہتے ہیں کہ جیت اور ہار تو زندگی کا حصہ ہے مگر اسے مکمل زندگی سمجھنے والے... اپنی زندگی مکمل ہونے سے پہلے ہی شاید مر جاتے ہیں کیونکہ حوصلہ اور امنگ ہی تو زندہ دلی کا نام ہے... البتہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ زندگی کے اس کمزور موڑ پر اس کا سہارا اور پیارا دوست کوئی اور نہیں بلکہ اس کا باپ تھا پس اسی ایک احساس نے اس کے حوصلوں کو مات نہیں ہونے دیا۔

”مبارک ہو۔“ میں نے بیوی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔
 ”عید نہ بقرمید... کس بات کی مبارک؟“ بیوی نے
 ”کس سے؟“ بیوی جس کا نام تو نور جہاں تھا مگر میں نے ان کی ترتیب پیدائش کے لحاظ سے نبرون، نوٹھری، نور اور فانیہ کے یک نیم دے رکھے تھے۔
 ”نبرون کو عشق ہو گیا ہے۔“ اپنے بانج بیٹوں کو ہم جیران ہو کر مجھے دیکھا۔

پکڑا اور دوسرے سے گیس ماسک چہرے پر چڑھائی دیا۔
 جو نبی کلیرا نے ماس کے اندر گیس کی موجودگی محسوس کی اور گیس کی وجہ سے اس کے رخسار سرد ہونے لگے اس نے اپنا سانس روک لیا لیکن کب تک...؟ کلیرا نے بہت ضبط کیا لیکن سانس روکنے کی وجہ سے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پیچھے پڑے پھٹنے والے ہیں۔ بے بسی کے عالم میں اس نے جدوجہد ختم کرنے اور خود کو موت کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچا۔ بس ایک گہرا سانس اور... اس کے بعد موت آہستہ آہستہ اپنا عمل شروع کر دے گی۔ مگر ٹھیک اسی وقت کسی نے ڈاکٹر کریسٹ کے اندرونی دفتر کا دروازہ کھولا اور کلیرا کو استقبال پر منتہی ہوئی لڑکی کی آواز سنائی دی۔
 ”میں بس کائنات دراز ہی میں بھول گئی تھی ڈاکٹر! بڑی مشکل...“

لڑکی کی آواز رک گئی۔ ”یہ کیا!...“
 لڑکی کے اچانک اندر داخل ہونے سے ڈاکٹر کریسٹ پر شاید رد عمل ہوا۔ اس کی گرفت کلیرا پر ڈھیلی پڑ گئی اور وہ استقبال پر کلرک لڑکی کو دیکھنے لگا جو آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ کلیرا نے اس سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری قوت سے دونوں گھٹنے ڈاکٹر کے پیٹ میں مارے اور دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہی سیسل کا منہ نوچ لیا۔ ڈاکٹر پیٹ دباتے ہوئے دہرا ہو گیا اور سیسل تکلیف سے کراہتے ہوئے اپنا چہرہ رکڑنے لگی۔ کلیرا نے پھرتی سے گیس ماسک اپنے چہرے سے اتار پھینکا اور اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر تیزی سے اسے پکڑنے کے لیے لپکا لیکن... کلیرا استقبال پر لڑکی کو دھکا دے کر باہر نکل چکی تھی۔

باہر نکل کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ سڑک پر نکل کر وہ پوری قوت سے اپنی کار کی طرف دوڑ پڑی۔ راہ گیر رک کر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا، ڈاکٹر بے بسی کے عالم میں عمارت کے دروازے پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ راہ گیروں کی موجودگی میں وہ کربھی کیا کیا سکتا تھا؟ کلیرا نے بیٹھتے ہی گاڑی چلا دی اور اس کا رخ پولیس صدر دفتر کی جانب تھا۔

غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ اسے تپائی میں دو قاتلوں کے سامنے اپنی زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی گردن سے بندھا کپڑا کھولا اور جوتے پہن کر کھڑی ہو گئی۔
 ”میرا خیال ہے، مجھے اب چلنا چاہیے۔“ وہ اس وقت کچھ خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ سیسل بند دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، دروازے سے بٹنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس نے سر دیکھے میں اپنے شوہر سے کہا۔
 ”ڈاکٹر کریسٹ! ڈاکٹر بھی کبھی غلطی سے اپنے مریضوں کو کسی خطرناک دوا کی زیادہ مقدار بھی کھلا دیتے ہیں۔ ایسے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہی حادثہ آج بھی ہو جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس طرح تم کم از کم نکل کے مقدمے میں پھانسی چڑھنے سے بچ جاؤ گے۔“
 کلیرا نے دہشت زدہ نظروں سے سیسل کو دیکھا جو دروازے پر جچی کھڑی تھی۔ ”بہت جاؤ میرے راستے سے، مجھے جانے دو۔“ اس نے پھنی پھنی آواز میں کہا۔
 ڈاکٹر کریسٹ اپنی بیوی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ چہرے سے ایسا ظاہر ہوا پھر ہاتھ جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو، سیسل نے پھر کہا۔ ”تمہارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کریسٹ۔ ایسے حادثات اکثر ہوتے رہتے ہیں اور میں نے آج تک نہیں سنا کہ ایسے حادثے کے نتیجے میں کسی ڈاکٹر کو سزا دی گئی ہو۔“
 کلیرا کی توجہ اس وقت سیسل کی جانب تھی۔
 اچانک... اسے اپنے کندھوں پر فرولا دی بیٹوں کی مضبوط گرفت کا احساس ہوا۔ دوسرے لمحے ڈاکٹر اسے دھکا دے کر ڈینٹل چیئر پر گرچکا تھا۔ کلیرا کی عرا کر چ پچاس سال سے اوپر تھی لیکن وہ صحت مند تھی۔ اس نے بے تحاشا لاتیں اور گھونٹے چلانا شروع کر دیے لیکن بہر حال وہ ایک کمزور عورت تھی اور اس کا مقابلہ دو جوان اور تندرست دشمنوں سے تھا۔ بہت جلد ڈاکٹر نے اسے بے بس کر دیا۔
 ”سیسل! تمہیں معلوم ہے کہ گیس کس طرح استعمال کی جاتی ہے؟“ ڈاکٹر نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”تم گیس ماسک اس بڑھیا کے چہرے پر لگا دو، میں اسے مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہوں۔“
 سیسل اس کے چہرے پر گیس ماسک باندھنے لگی۔
 کلیرا نے سخت جدوجہد کی، وہ بار بار اپنا سر جھک رہی تھی تاکہ گیس ماسک کی نلکیاں اس کے ناک اور منہ میں نہ لگیں۔ سیسل نے پوری قوت سے ایک ہاتھ سے اس کا منہ

اسے پیار سے ملکہ کہا کرتا تھا چونکی۔
 ”ظاہر ہے لڑکی سے۔“ میں نے چائے کی پیالی
 ہونٹوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔
 ”ظاہر ہے لڑکی ہی ہوگی۔۔۔۔۔ شکر ہے خبیث
 معاشروں کی طرح ہمارے ہاں لڑکوں کی لڑکوں سے شادی
 کا رواج نہیں ہے۔“
 ”جو حالات جارہے ہیں اللہ ہی بجائے۔“
 ”ہاں اللہ ہی بجائے والا ہے۔“ ملکہ نے کہا پھر اسی
 تجسس کے ساتھ گویا ہوئی۔ ”بتائیں نا کون ہے؟ کیا کرتی
 ہے؟ کہاں رہتی ہے؟“
 ”نمبرون کی کلاس فیلو ہے۔۔۔۔۔ کلاس فیلو ہے تو ظاہر ہے
 پڑھتی ہی ہوگی، یہیں ہمارے علاقے میں ہی رہتی ہے۔“
 ”باپ کیا کرتا ہے؟“
 ”ابھی یہاں تک نہیں پہنچا ہوں میں۔“
 ”تو جہاں تک پہنچے ہیں، وہاں تک کیسے پہنچے؟“
 بیوی نے مجھے ترجمی نگاہوں سے دیکھا۔ ”ڈائریکٹ؟“
 بیوی کا لہجہ بیک وقت سوالیہ بھی تھا جوابیہ بھی۔
 ”ظاہر ہے۔“

اپنے پانچوں بیٹوں کو ہم میاں بیوی نے ایسا اعتماد
 دے رکھا تھا کہ وہ اپنی ہر اچھی بری بات ہم سے بلا جھجک
 شیئر کرتے تھے نمبر فور اور نمبر فائیو تو ابھی چھوٹے تھے۔ تین
 بڑے بچوں کی ملکیت میں ہر شے تک ہم میاں بیوی کی
 بھرپور رسائی تھی۔ اپنے زیر استعمال سیل فونز پر ان میں
 سے کسی نے سیکورٹی لاک نہیں لگا رکھا تھا۔ ان کی ای میلز مکمل
 رہتیں۔ ان کی الماریاں غیر مقفل ہوتیں۔ اپنے دل کی ہر
 بات وہ بے دھڑک ہم میاں بیوی کو بتا دیتے۔ ان کی کوئی
 بات ہم سے راز نہ تھی۔ تین بڑوں کی دیکھا دیکھی دونوں
 چھوٹے بھی ہم میاں بیوی کو اپنا دوست اور ہمراز سمجھتے
 تھے۔ دونوں ہی اسکول سے گھر واپسی پر دروازے سے
 اندر بعد میں داخل ہوتے، اسکول میں گزارے دن کی
 روداد پہلے سنا شروع کر دیتے۔

پانچوں بچے اور ہم میاں بیوی قطعاً دوستانہ ماحول
 میں رہتے۔ ایک دوسرے کو ”یار“ کہہ کر مخاطب کرتے۔
 بچے مجھے ”یار ابا“ کہہ کر بات کرتے، اپنی ماں کو ”یار امی“
 پکارتے۔ ہم ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بات
 کرتے۔ ایک دوسرے کے گلے میں بانٹیں حائل کر کے
 چلتے۔ غلط یا صحیح، روائیاں ناروا بہر حال تھا ایسا ہی جس پر ہم
 دونوں میاں بیوی کو اپنے اپنے خاندانوں اور احباب میں

اکثر تنقید کا سامنا بھی کرتا پڑتا تھا۔
 ”نور جہاں تم نے اپنے بچوں کو بہت ہی سرچڑھا رکھا
 ہے۔“ میری خوش دامن بیٹی سے کہتیں۔
 ”وسم تم تو کہیں سے اپنے بچوں کے باپ نہیں دکھائی
 دیتے، بلکہ ٹیٹا یا بے رہنے ہوان کے۔“ میرے والد محترم
 خاصی ناگواری سے کہتے۔
 ”ابا جی یہ دور ایسا جا رہا ہے کہ اس میں والدین کو
 بچوں کا دوست بن کر رہنے کی ضرورت ہے۔“ میں اپنی
 دانش بکھارتا۔
 ”بکواس!“ والد محترم میری دانش کو بیک جنبش
 بکواس قرار دیتے اور فرماتے۔ ”والدین اور اولاد کے
 درمیان ایک حدف فصل رہنی چاہیے۔“
 میں بحث میں نہ پڑتا، اپنے حال میں مست ہو جاتا۔
 بچوں کے ساتھ فکری مذاق کرتا، دوڑیں لگاتا، کرکٹ، ہاکی
 اور بیڈمنٹن کھیلتا، فون پر ان کی اور ان کے دوستوں کی گپ
 شپ میں شریک ہوتا۔۔۔۔۔ ان کے دوستوں میں لڑکے بھی
 تھے، لڑکیاں بھی۔ میں نے ان سے بے تکلفی سے کہہ رکھا تھا
 کہ جب بھی ان میں سے کسی کو کوئی لڑکی پسند آ جائے سب
 سے پہلے مجھے بتائیں، نمبرون نے گزشتہ رات مجھ سے کہا
 تھا۔ ”ابا ایک لڑکی پسند آگئی ہے مجھے۔“
 ”اچھا!“ میں ہر تین تجسس ہو کر اس کی طرف متوجہ
 ہوا۔ ”گڈ نیوز!“

میں نے کہا۔ ”کون ہے؟“
 ”میری کلاس فیلو۔“
 نمبرون ان دنوں انجینئرنگ یونیورسٹی میں چھٹے سمسٹر
 کا طالب علم تھا اور چونکہ میری اس کے اکثر کلاس فیلوز سے
 گپ شپ رہتی تھی سو میں نے اس سے پوچھا۔ ”میں جانتا
 ہوں اسے؟“

”نہیں۔“ نمبرون نے جواب دیا۔
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے یار! میں تو تمہارے ہر اس کلاس
 فیلو سے واقف ہوں جس سے تمہاری دوستی ہے۔“
 ”یار ابا اس سے دوستی نہیں مگی۔“
 ”دوستی نہیں تھی تو پھر کیسے پسند آگئی!“ میں نے تعجب
 کا اظہار کیا۔
 ”بالکل الگ تھلک رہتی تھی۔ نہ کبھی اس نے مجھ
 سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی، نہ میں نے اسے لفٹ
 کرائی مگر آج اچانک ہی وہ مجھے اچھی لگنے لگی۔“
 ”وہ کیسے بھلا!“

”سردی تھی۔۔۔۔۔ میں چائے پینے یونیورسٹی کیسے میری
 ابا گیا تو وہ وہاں بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ ہیز کے بالکل نزدیک۔۔۔۔۔
 ان نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے۔۔۔۔۔ میں اسے دیکھتا ہی
 رہ گیا ابا۔۔۔۔۔ اس کا چہرہ ایک دم گلابی ہو رہا تھا۔ اور پہلی
 بار مجھے پتا چلا کہ وہ تو میری کالج کیا یونیورسٹی کی حسین ترین
 لڑکی تھی انا کیوٹ ابا۔۔۔۔۔ آپ اسے دیکھیں گے تو کہیں
 گے واقعی خوب صورت ہے۔“
 ”خوب صورتی کسی کے چہرے میں نہیں دیکھنے
 والے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔“ میں نے فراست بھاری۔
 ”اور لڑکی یونیورسٹی اچانک اچھی لگتی ہے۔۔۔۔۔ تمہاری ماں بھی
 مجھے اسی طرح اچانک اچھی لگی تھی۔“
 ”اچانک کیوں! اماں تو آپ کی کزن تھیں اور آپ
 لوگ جو اسٹڈنٹ فیلو سسٹم کے تحت ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔
 آپ تو انہیں دن میں دن میں مرتبہ دیکھتے ہی ہوں گے۔“
 ”گھما مڑ! وہ بھی تو پچھلے تین برس سے تیری کلاس فیلو
 ہے۔۔۔۔۔ تو ابھی تو اسے مج سے دوپہر تک دیکھا رہتا ہوگا۔۔۔۔۔
 آج سے پہلے تجھے وہ اچھی کیوں نہ لگی؟“

”آج سردی بہت تھی ابا اور میرا چائے پینے کا موڈ تھا۔“
 ”اس روز آسمان ابرا آلود تھا۔ صبح سے بادل چھائے
 ہوئے تھے مگر برس نہیں رہے تھے۔ شام دل میں کھب سی
 رہی تھی۔ ماں جی، ابا، چاچا، چاچی سب صحن میں بیٹھے تھے۔
 تمہاری ماں اچانک کمرے سے صحن میں نکل آئی۔ اس نے
 شرقی رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا اور اس کے لائے سیاہ بال
 شرقی رنگ کے ساتھ غیر معمولی جون دکھا رہے تھے۔ میں
 نے اسے دیکھا اور آنکھوں کے راستے وہ میرے دل میں
 اتر گئی۔“

”پھر؟“ نمبرون کے لہجے میں تجسس تھا۔
 ”پھر کیا۔۔۔۔۔ میں نے تجھے یہ لایا اسی سے شادی کرنی ہے۔“
 ”میں نے بھی تجھے یہ لایا ہے ابا۔“
 ”اس سے پوچھا؟“
 ”آپ نے پوچھا تھا؟“
 ”ضرورت ہی نہیں پڑی۔۔۔۔۔ ادھر میں نوکری سے لگا
 ادھر ماں جی نے کہہ دیا وہ سیم میں تیرے چاچا چاچی سے نور
 جہاں کے لیے بات کرنے لگی ہوں۔“
 ”اور آپ یہ بات کب کہیں گے؟“
 ”وہ گھر کی بات تھی۔۔۔۔۔ لڑکی کے ماں باپ سے بات
 کرنے سے پہلے تجھے لڑکی سے بات کرنی ہوگی۔۔۔۔۔ اسے
 آمادہ کرنا ہوگا۔۔۔۔۔ کی تو نے اس سے بات؟“

”ابھی کہاں۔۔۔۔۔ ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے ابا۔“
 نمبرون نے کہا۔
 ”ایٹنس ڈالو۔۔۔۔۔ بات آگے بڑھاؤ۔۔۔۔۔ بانی دی
 وے آج کیا بات ہوئی؟“
 ”کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ بس وہ مجھے اچھی لگی۔۔۔۔۔ میں
 دوسری ٹیبل پر بیٹھ گیا اور چائے منگو کر چائے پینے لگا۔“
 ”حق!“
 ”کیوں؟“
 ”ایٹنس کیوڑی کہہ کر اسی کے ساتھ بیٹھنا تھا بلکہ اس
 سے پوچھتا جائے کہیں کی۔“
 ”وہ آل ریڈی پی رہی تھی۔“
 ”بندہ تکلفا تو پوچھتا ہی ہے اور یونیورسٹی کہانی شروع
 ہوتی ہے۔“
 ”اب پوچھ لوں گا۔“ نمبرون نے کہا پھر سرگوشی میں
 بولا۔ ”ابا میرا خیال ہے مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے۔“
 ”واقعی!“ میں چونکا۔
 اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 ”آل دی بیسٹ۔“
 ”تھیک یو۔“

☆☆☆
 دو دن بعد نمبرون نے مجھے قدرے دل گرفتگی سے
 بتایا۔ ”ابا میں نے اسے چائے آفر کی مگر اس نے تو تھینکس
 کہہ کر رخ کر دیا۔“
 ”شریف لڑکی معلوم ہوتی ہے یار۔“ میں نے کہا۔
 ”مغفروں ہے ابا۔“
 ”کس بات پر؟“

”اپنے باپ کی امیری پر۔۔۔۔۔ ڈینس میں رہتی ہے
 ابا۔۔۔۔۔ سٹی کے نئے ماڈل میں یونیورسٹی آئی ہے۔“
 ”آنے دو یار تمہاری طرح جینکس تھوڑی ہوگی۔“
 میں نے نمبرون کو پُر غور نگاہوں سے دیکھا۔ میں امیر باپ
 تھا یا نہیں مجھے اپنے بچوں کی ذہانت و لیاقت پر ناز تھا۔
 ”کیا فرق پڑتا ہے ابا۔“ نمبرون کے لہجے میں دل
 گرفتگی تھی۔
 ”کیوں فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے کہا۔
 ”آپ میں بک پر اس کے گھر کا صرف فرنیچر دیو بی
 دیکھیں نا تو۔۔۔۔۔“ نمبرون نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔
 ”بے ہوش ہو جاؤں!“ میں نے اس کا مکمل جملہ
 مکمل کیا۔

نمبرون کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“
 ”تو پھر کیا مطلب تھا؟“
 ”وہ بہت امیر ہے ابا۔“
 ”اس کا امیر یا غریب ہونا ہمارا مسئلہ نہیں ہے یار۔“
 ”مگر یہ تو ہمارا مسئلہ ہے تاکہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔“
 ”آئی کوہر ابا۔“ نمبرون رو ہانسا ہو گیا۔
 ”لگے رہو اللہ شفا دے گا۔“
 ”یار ابا کیسے ہوگی شفا، وہ تو لفٹ ہی نہیں کراتی۔“
 ”اگر تمہارا عشق چاہے تو ایک دن ضرور کرائے گی۔“

☆☆☆

کچھ ہی دن گزرے کہ ایک روز نمبرون نے یونیورسٹی سے مجھے فون کیا۔ ”مبارک ہو ابا۔“
 میں سمجھا اس کے میسٹر کا نتیجہ آ گیا۔ ”کیا جی پی اے رہا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ابا آج اس نے مجھ سے بات بھی کی مجھے چائے بھی پلائی۔“ نمبرون کے لہجے میں انوکھی سرخوشی تھی۔

”مبارک!“

”تھیک ہو۔“

گھر واپسی پر نمبرون نے مجھے بتایا کہ لڑکی نے نمبرون کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر ایڈ بھی کر لیا تھا۔
 ”ابا اس نے کہا ہے مجھے اپنی اچھی اچھی تصویریں بھیجو۔“
 ”بیج دو یار۔“

”آپ بتائیے گا کون کون سی بھیجوں۔“
 ”بتا دوں گا بلکہ ایک دو میری بھی بیج دو کہ یہ لڑکے ابا ہے۔“

”آپ کو تو میں ڈائریکٹ لوادوں گا۔“ نمبرون نے حاتم طایا نہ انداز میں کہا۔
 ”رات کو فون بھی کرنے کو کہا ہے اس نے۔“ نمبرون نے آہستہ سے بتایا۔

”گنڈا وہ کرے گی کیا تم کرو گے اے؟“
 ”وہ کہہ رہی تھی میں خود کروں گی۔“ اچھا ہی ہے ابا، وہ تو بیج کر سکتی ہے میرے پاس تو بیلنس ہی نہیں ہوتا۔“
 ”یار بیلنس تو میرے پاس بھی نہیں ہوتا۔“
 ”آپ فکر نہ کریں۔ اسٹریڈ مکمل ہونے کے بعد

جواب ملتے ہی پہلا کام بھی کروں گا۔“
 ”کون سا کام؟“ میں چونکا۔
 ”بیلنس والا۔“ ہمیلی تنخواہ ملتے ہی آپ کے موبائل میں بھی بیلنس ڈالواؤں گا اور اپنے میں بھی۔“

”اور اپنی ماں کے؟“
 ”ان کے بھی۔۔۔ ایک ایک سے پوچھتی رہتی ہیں۔“
 بیلنس بے تمہارے پاس۔“ نمبرون کے لہجے میں ہلکی سا دل گرفتگی تھی۔
 ”تمہاری نانوا اور خالادوں کو جون کرنا ہوتا ہے۔“
 ”ویسے ابا اگر وہ مجھے فون کرنے کو کہہ دیتی تو گڑبڑ ہو جاتی میرے پاس تو بیلنس ہی نہیں ہوتا۔“ نمبرون نے مصرعہ اول پھر دہرایا۔

نمبرون نے ٹیکری کھولی اور ہم نے باہم مشورے سے نمبرون کی چھ آٹھ اچھی اچھی تصویریں منتخب کر کے نیلوفر کو بھیج دیں۔ اس کا نام نیلوفر مجھے اچھا لگتا تھا۔
 رات کو اس نے نمبرون کو فون کیا اور اس نے جو کچھ کہا نمبرون نے وہ سب کچھ من و عن مجھے بتا دیا۔ اس نے نمبرون کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ میں اچھے اچھے فٹنس سیمپل کو کہا تھا۔

”کیا کمٹ کروں ابا؟“

”یار وہی جو لڑکیاں سننا چاہتی ہیں۔“

”کیا سننا چاہتی ہیں۔“

”گھماڑو۔۔۔ عشق کرنے چلے ہو اور یہ نہیں پتا کہ لڑکیاں کیا سننا چاہتی ہیں۔“

”آپ بتائیں نا کیا سننا چاہتی ہیں۔“

”اپنی تعریف اور کیا۔“

”یو آر سو ہیٹ فو؟“ نمبرون نے سوالیہ لہجے میں کہا۔
 ”صرف اتنا سا جھوٹ نہیں یار۔۔۔ اور بھی بہت کچھ۔“
 ”سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔“ نمبرون مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنس دیا پھر بولا۔ ”یار ابا لڑکیاں جھوٹ کیوں سننا چاہتی ہیں!“

”ہاگلی جو ہوتی ہیں یار۔۔۔ ایسے ہی تو انہیں ناقص اہل نہیں کہہ دیا گیا۔۔۔ کیلی کی تو گواہی بھی معترف نہیں دو ہوتی چاہئیں۔“

”اسی لیے ایک مرد کو چارکی اجازت ہے۔“

”یاریں الحال تم صرف ایک پروفیسر کرو۔“

”اوکے۔“

☆☆☆

نیلوفر سے نمبرون کا عشق پورے مطہرات سے شروع ہوا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد نمبرون کا زیادہ وقت موبائل پر گزرنے لگا۔ اس کے اور نیلوفر کے درمیان ٹیکسٹ میسج کا تبادلہ ہوتا۔ ایک دوسرے کو وائس کالز کی جاتیں۔

”تمہارے علاوہ بھی کوئی دوست ہے اس کا!“ میں چونکا۔
 ”مجھ سے پہلے ہے ابا۔“ نمبرون جیسے صدمے میں تھا۔
 ”کیا مطلب؟“
 ”اس نے مجھے دھمکی دی ہے ابا۔“
 ”کیسی دھمکی؟“
 ”کہ اگر میں نے نیلوفر سے اپنی دوستی ختم نہ کی تو وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔“
 ”ایسی شوٹ کر دے گا۔۔۔ شوٹ کرنا اتنا آسان ہوتا ہے کیا۔“

”اس کے لیے آسان ہی ہو گا ابا۔۔۔ ڈیرے کا بیٹا ہے۔۔۔ ہارس رائیڈنگ کرتا ہے۔۔۔ بوننگ پر جاتا ہے۔“

ماہنامہ

ایکینہ

کراچی

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں، بہار و خزاں کی۔۔۔ پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر تشویلیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے باکرے بک کروالیں

لکھنؤ پر تصویریں بھیجی جاتیں۔ عزت کا معاملہ تھا سو میں ان کے موبائل میں بیلنس ڈلوانے میں اعانت کرتا۔ ان مجھے نیلوفر کے ٹیکسٹ میسج اور فیس بک پر اس کی اس براہ راست دکھانے میں تامل نہ کرتا۔ نمبرون نے انگریزی کا نئے سننا شروع کر دیے تھے۔ اپنے وائس ایپ بیلنس پر نمبرون نے ایک مشہور انگریزی گانے کے ساتھ نہایت دلکش اسٹوری ڈال دی تھی۔ اسٹوری شروع ہونے پر نمبرون ایک درہنچے سے باہر دیکھتا نظر آتا پھر کسی ایک کے سے انداز میں مڑتا اور دیرے دیرے زوم انٹ کر جاتا۔

دو تین ہفتے نیلوفر اور نمبرون کے معاملات دھواں مارا اور پری اور پر گئے اور نمبرون کی جج و جج روز بروز ہمتی ہل گئی۔ اسے اپنے پٹروں، جوتوں اور میز اسٹائل کا خاص خیال رہنے لگا۔ وہ جو اپنے گیٹ اپ کے سلسلے میں نہایت پرادر رہا کرتا تھا خوشبو میں بس کر یونیورسٹی جانے لگا۔ کچھ دیکھ کر مجھے اپنا زمانہ یاد آ جاتا۔ جب اس کی ماں مجھے اگلی گئے گی تھی، تب میں بھی تو یوں ہی اپنا خیال رکھنے لگا تھا۔ ہائی کی پرفیوم جو انہیں چھوٹی خالانے دینی سے لاکر دی تھی پھر اچرا کر لگاتا اور یہ نہ سوچتا کہ باہی کی پرفیوم قطعاً زمانہ خوشبو بھی جو مجھے لگا تا زیب نہ دیتی تھی۔ نہ مجھے ان دنوں زمانہ اور مردانہ خوشبوؤں کی شخصیت کا علم تھا، نہ ہی اسے جس لہجے میں خوشبو لگا کر کرتا تھا!

تیسرے ہفتے ایک روز نمبرون نہایت پریشان سا رات گزارا کہ جب میرے پاس آیا۔ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا، اس کی ماں دو چھوٹوں کی یونیفارمز پر پری کر رہی تھی۔ بڑے تین اس معاملے میں خود فیصل تھے۔
 ”ابا ذرا باہر آئیں گے۔“ نمبرون نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔

”کیوں؟“

”ہمیں تو؟“

”خیریت؟“

”یار آپ آئیں تو۔۔۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ”ہاں کیا ہوا؟“

”ابا ابھی ایک فون آیا مجھے اکی کے سامنے اس لیے

”میں بتاؤ کہ وہ پریشان ہو جائیں۔“

”کس کا فون تھا، اس کا؟“

”نہیں۔۔۔ اس کے کسی بوائے فرینڈ کا۔“

شکار کے لیے جنگل جاتا ہے..... اس کے پاس ریوا لور بھی ہے بڑی بندوق بھی۔“
 ”تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟“
 ”اس نے اپنا نام بتایا۔ میں نے سرج کیا۔“
 فیس بک پر اس کی ایک دوئیں بے شمار تصویریں ہیں۔
 دکھاؤں آپ کو؟“
 ”دکھاؤ۔“

نمبرون نے اپنے اسارٹ فون پر فیس بک سائن ان کی اور سچ اسکرین پر اپنی انگی کو دھیرے دھیرے حرکت دیتے ہوئے اپنے رقیب روسیہ کا فیس بک اکاؤنٹ کھول کر میرے سامنے کر دیا۔

وہ واقعی ویسا ہی تھا جیسے ٹی وی ڈراموں میں ڈیروں کے بیٹے ہوتے ہیں۔ ہر تصویر میں نیا لباس، ہر انداز میں ہانکین، ہر پس منظر امارت کا مظہر، ہر پیش منظر میں جملکت..... کہیں گھوڑے پر سوار، کہیں کہیں بندوق سے نشانہ لیتے ہوئے، کہیں شکار کو قدموں میں ڈھیر کیے، کہیں آباد اجداد کی تصویروں کے ساتھ، کہیں یار دوستوں کے جھگڑے میں، کسی تصویر میں حویلی کے درجوں سے جھانکتے ہوئے تو کہیں پیش قیامت لکڑی گاڑی سے اترتے ہوئے۔ اس حویلی کی تصویریں بھی لگا رکھی تھیں اس نے اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر جہاں وہ رہتا تھا اور ان مربعوں کے سرسبز و شاداب مناظر بھی جو اس کے باپ دادا کی جاگیر تھے۔ خدمتگاروں کی تصویریں بھی تھیں اس کے قدموں میں بیٹھے ہوئے۔ مزارعین بھی موجود تھے اس کے سامنے ہاتھ باندھے مودب کھڑے ہوئے۔
 میں نے نمبرون کا فون خاموشی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

”ہے نا امیر۔“ نمبرون نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں یار لگتا تو ہے۔“
 ”اب بولیں۔“
 ”کیا بولوں؟“
 ”کیا کروں؟“
 ”کیا کرنا چاہتے ہو؟“
 ”میں اسے نہیں چھوڑ سکتا یار۔“
 ”کے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نیلوفر کو۔“
 ”کون کہتا ہے چھوڑ دو۔“

”یہی..... کتا..... کینہ..... کہتا ہے اس کا پیچھا چھوڑ تو شوٹ کر دوں گا۔“
 ”اسے پتا کیسے چلا؟“
 ”کس بات کا؟“
 ”تمہاری اور اس کی دوستی کا۔“
 ”نیلوفر کے فیس بک اکاؤنٹ میں تصویریں اور دونوں کی کنوریشن دیکھ کر۔“
 ”پاس رڈ معلوم ہوئے بغیر کیسے دیکھ سکتا ہے؟“
 نیلوفر کے اکاؤنٹ میں تمہاری تصویریں اور تم دونوں کی کنوریشن۔“
 ”معلوم ہوگا نا تمہی۔“
 ”کیسے؟“

”مجھے کیا پتا۔“ نمبرون نے شانے اچکائے۔
 ”پتا کرو یار۔ نیلوفر سے پوچھو۔“ کسی کو بتا کر کا ہے اس نے اپنا پاس ورڈ؟“
 ”پوچھوں گا اس سے۔“
 ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے نمبرون کے شانے پر ہاتھ دھر کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور مزید کہا۔ ”چل کر سو۔“ صبح یونیورسٹی بھی جاتا ہے تمہیں..... دیکھ لیں گے وہ کتنے بڑے ڈیرے کا بیٹا ہے۔“ باپ ہونے کے ناتے میں نمبرون کا مورال ہائی رکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن یونیورسٹی سے آنے کے بعد نمبرون نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی میں اس کی نیلوفر سے بات ہوئی تھی اور اس نے اقرار کیا تھا کہ نمبرون سے دوستی ہونے سے قبل اس کی ڈیرے کے بیٹے سے دوستی رہی تھی۔ پھر کسی بات پر دونوں میں ان بن ہوئی تھی اور ہر قسم کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ وہ نیلوفر ہے بری طرح اینٹھ گیا تھا۔ اس نے شوکل میڈیا پر بھی نیلوفر کو ان فرینڈز تو نہ کیا تھا مگر نیلوفر کے بار بار رابطہ کرنے کے باوجود اسے جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی بے اعتنائی سے تنگ آ کر نیلوفر نے اسے جلانے کو نمبرون سے دوستی کر لی تھی۔ نیلوفر کا حربہ کامیاب رہا تھا۔ اس کے فیس بک اکاؤنٹ میں نمبرون کی پوسٹیں دیکھ کر وہ چراغ یا ہو گیا تھا۔ اس نے نیلوفر کو بھی سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی اور نمبرون کو بھی دھمکا رہا تھا۔

”ابا نیلوفر نے مجھے چیٹ کیا ہے۔“ نمبرون نہایت دل شکستہ ہو رہا تھا۔
 ”دفع کرو یار۔“ میں نے نمبرون کا دل رکھنے کی

اصل کی۔

”نہیں ابا۔“ وہ ہونٹ نکال کر رونی صورت بناتے گویا ہوا۔ ”میں تو سیریس تھا۔“
 ”چھوڑو یار..... ایسی لڑکی کے لیے سیریس ہونے کا لاکھ؟“

”آپ خود ہی تو کہتے ہیں محبت اور عشق میں فائدہ نقصان نہیں دیکھا جاتا ہے۔“ نمبرون نے مجھے قائل کرنا

مگر میں اس کا باپ تھا۔ اسے دل شکستہ اور ٹوٹا ہوا اٹھنا میرے لیے نہایت دل شکن احساس تھا سو میں نے اس پر اپنی اصل قلبی کیفیت ظاہر کیے بغیر نہایت اعتدال سے کہا۔ ”ہاں..... بشرطیکہ جس لڑکی سے آپ محبت یا عشق کر رہے ہوں وہ تمہاری ماں کی طرح خلص ہو۔“
 نمبرون مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”تمہاری ماں سے میری لائن ملے اور مجھے ملازمت ملے کے درمیانی وقفے میں تمہاری ماں کے لیے برادری کے ایک بڑے گھر سے..... رشتہ آ گیا تھا۔ ماں جی مجھ سے بولیں تو نوکری پہ ہوتا تو میں نے تیرے چچا، چاچی سے میرے لیے نور جہاں کے رشتے کی بات کرینی تھی اب کس سے کروں۔ جو رشتہ آیا ہے اونچے گھر کا ہے تیرے چچا، چاچی کیا اس رشتے سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا مگر ہمارے کیا ہوا۔“

”کیا؟“ نمبرون نہایت تجسس سے بولا۔
 ”تمہاری ماں ڈٹ گئی..... اس نے انکار کر دیا۔“
 ”کیوں انکار کر دیا؟“
 ”ابے یار وہ مجھ سے جو محبت کرتی تھی۔“
 ”آپ کے زمانے میں بھی ہوتی تھی؟“
 ”کیا؟“
 ”محبت۔“

”الو کی دم! محبت تو آدم، حوا کے زمانے سے ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں جب شیطان کے بہکانے میں آ کر دونوں انت سے نکالے گئے اور انہیں زمین پر بھیجا گیا تو ایک دوسرے کے فراق میں زار و قطار رووتے تھے اور اللہ سے اپنی غلطی کی معافی طلب کرتے تھے۔“

”میں کیا کروں ابا؟“ نمبرون نے پھر رونی صورت بنائی۔

”کس مطلب؟“
 ”آئی کوہر۔“

”نیلوفر؟“

”ظاہر ہے اسی سے۔“
 ”ڈونٹ۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔

میرے تصور میں ڈیرے کے بیٹے کی تصویریں گلدھڑ ہونے لگیں۔ گھوڑے پر سوار، بندوق سے نشانہ لیتے ہوئے، شکار کو قدموں میں ڈھیر کیے اسے فتح مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے، خدمتگاروں سے پاؤں دباوتے ہوئے، مزارعین کو مالکانہ تفاخر سے دیکھتے ہوئے! نہ جانے کیسے اس کے قدموں میں ڈھیر شکار کی جگہ نمبرون نے لے لی تھی!
 ”یار دفع کرو نیلوفر کو..... دوحرف بھیجو اس پر.....“
 میں نے نمبرون کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ”وہ تمہارے لائق تھی ہی نہیں یار۔“

نمبرون کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر میں نے اسے پوری شفقت سے معمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یار تم تو لاکھوں میں ایک ہو..... تمہارے لیے تو کوہ قاف سے پری اترے گی۔“ میں نمبرون کو ڈیرے باپ کی طرح گھڑسواری، کشتی رانی، تیر اندازی، بندوق زنی، خدمتگاروں اور مزارعین کا رعب داب نہیں دے سکتا تھا تو کیا اسے اچھے دنوں کے خواب تو دکھا سکتا تھا۔
 نمبرون غٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں یاس تھی، حسرت تھی، بے بسی تھی، شرمندگی تھی۔ دفعتاً اس کی آنکھوں میں آنسو ٹپک کرے لینے لگے۔

”کیا ہوا یار؟“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔
 ”سواری ابا۔“ وہ دل شکستہ لہجے میں بولا۔
 ”فاروہاٹ! میں چونکا۔
 ”اپنی حماقت میں..... میں نے آپ کا نام بھی ضائع کیا۔“

نوجوان بیٹے کو ناکامی عشق پر ٹوٹے ہوئے دیکھنا مجھ سے معمولی حیثیت باپ کے لیے نہایت دل شکن تجربہ حیات تھا۔ اس کی روکن اور ٹوٹنا آنکھوں کو گہرے پانیوں میں ڈوبنے دیکھنا جاں مسل تھا سو اسے دلاسا دینے کو اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے میں نے اسے گلے لگانے کے بہانے اپنا چہرہ اس کے کندھے کے دوسری جانب کر لیا کہ مجھے اپنی آنکھوں میں درآئی نمی کو بھی نمبرون سے چھپانا تھا۔

ہم غریبوں کے بچے عشق میں بھی امیروں سے مات کھا جاتے ہیں!



رنگ آسمان

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات، شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قراریوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اترا کہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرے دیا اور نہ ہی جذبات کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

مشرق و مغرب کے عجب استراج اور تاریخی جتوں خیزوں کے عبرت
اثر اشاروں میں لہرائی دلچسپ داستان



سے ٹرٹ بھٹ کر خون آلود ہو رہی تھی۔

”جینکس گاڈ از ہم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اسے میرے ٹمپے میں لے آؤ۔“ پروفیسر ہنری بولا۔ ”وہاں فرسٹ ایڈ ہاس موجود ہے۔“

شوکت کے معزوب شانے کی مرہم پٹی کر دی گئی۔ اس کے بعد اس نے سب کو اپنی عقل مندی اور رابرٹ کی بے وقوفی کے بارے میں بتایا۔

”رٹش.....!“ رابرٹ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ غصے سے شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تو اس کی جان بچانے کی خاطر گر زلی پر فائر کیا تھا۔ اب یہ مجھ پر ہی الزام عووب رہا ہے۔“

”سب سے پہلے میں نے ہی گر زلی کو دیکھا تھا۔“ شوکت نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اسے رابرٹ کی ڈھٹائی اور جھوٹ پر غصہ آ گیا تھا۔ ”مجھے شکاری مہمات کا تجربہ ہے۔ میں جانتا تھا کہ گر زلی جیسا درندہ امن پسند ہوتا ہے، جب تک کہ اسے چھیڑا نہ جائے۔ فقط بھوک اور شکار نہ ملنے کی صورت میں یہ انسانی آبادی اور خیمہ پڑاؤ کا رخ کرتا ہے۔ میں تو اس کے سامنے آ کر اسے بھکانے اور پلٹ کر جانے پر مجبور کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا کہ اچانک رابرٹ نے اس درندے پر بلا وجہ فائر کر دیا اور یوں وہ پھر گیا۔“

شوکت کی بات کو کوئی رد نہیں تھا کیونکہ سب نے اس کے ہاتھ میں پہلے ہی سے فرو لی تھیں ہوئے دیکھ لی تھی، نہ صرف یہ بلکہ اس نے بڑی بہادری سے رابرٹ کی جان بھی بچائی تھی اور گر زلی کو زخمی بھی کیا تھا، جبکہ خود رابرٹ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ رابرٹ نے دوبارہ ڈھٹائی دکھانے کی کوشش میں اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ پروفیسر ہنری جو ساری بات سمجھ چکا تھا، رابرٹ سے نہایت سنجیدگی سے بولا۔

”میرا خیال ہے تمہیں اب ایک سیو ڈر لکھنا چاہیے اور میں امید کروں گا کہ آئندہ تم ایسی بے وقوفی کا..... مظاہرہ نہیں کرو گے۔ اس مہم کو کامیابی سے سر کرنے کے لیے مشر شوکی کو میں تمام مواد بے دی اختیار دے چکا ہوں۔“

ایک ٹوک کے مقابلے میں رابرٹ کو اس سرزنش پر بری طرح اپنی سبکی کا احساس ہوا اور وہ اندر سے جل بھین گیا۔

اس کے بعد خیمہ درست کیا جانے لگا اور شوکی نے دیکھا کہ رینا، رابرٹ کے پاس کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور پلٹ کر اپنے خیمے کی طرف چلا۔ گارشا ایک طرف کھڑی بڑی گہری نگاہوں سے مسلسل اس کی طرف دیکھ جا رہی تھی۔

شوکت اپنے خیمے میں آیا۔ وہ تھا تھا۔ نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا باہر تھے۔ شوکی کا موڈ بری طرح خراب تھا، اس نے لیپ کی روشنی تھوڑی تیز کر دی تھی۔ اسی وقت کوئی اندر داخل ہوا۔ اس نے آہٹ پر اپنا سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے گارشا کھڑی تھی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ گارشا کی جگہ وہ رینا کے آنے کی توقع کیے بیٹھا تھا۔

”آئی تو..... برادر رابرٹ تمہیں بہت ہرٹ کرتا ہے۔“ گارشانے آہٹ کی سے اس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ غلطی اسی کی ہوتی ہے مگر تم نے پھر بھی اس کی دوشین بارہم دیکھی ہے۔“

”مجھے کیا فائدہ ہوتا ہے اس کی مدد کے..... میں تو صرف.....“ وہ غصے کی تیزی اور درادری میں آگے بھی کچھ ایسا کہہ ڈالنا چاہتا تھا کہ یک دم خاموش ہو گیا، لیکن گارشانے گویا اس کا جملہ مل کر دیا۔

”رینا کی خاطر کرتا ہوں..... یہی کہنا چاہتے ہو، تاہم.....؟“ شوکی کا چہرہ بے تاب رہا۔ اس نے کہا: ”ہاں.....“ ”تم رینا سے محبت کرتے ہو.....؟“ گارشانے شوکی کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو شوکی اس بار قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”مم..... میرا یہ مطلب تو نہیں تھا..... مس رینا میرے مالکوں سے تعلق رکھتی ہے اور میں ان کا احترام کرتا ہوں۔“ اس کی بات پر گارشا کے، ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور وہ اسی لہجے میں بولی۔ ”اچھا! تمہارے مالکوں سے تو ہم بھی تعلق رکھتے ہیں۔“

”تو کیا مس گارشا! میں آپ لوگوں کا احترام نہیں کرتا.....؟“ شوکت نے لیپ کی تیز روشنی میں اس کے دیکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ گارشانے کچھ کہنے کے لیے لب واپ کے ہی تھے کہ اچانک شوکی نے دیکھا گارشا کچھ کہتے کہتے ہی گئی اور خیمے کے نکاس والے راستے کی طرف باہر دیکھنے لگی، تب ہی دو گھن بعد گارشا کو کچھ لایا ہوا کہ وہ اپنے لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی اس کے قریب ہو گئی اس قدر..... کہ اس کا جذبہ سے سلگنا ہوا چہرہ شوکی کے بالکل کاندھوں سے آن لگا اور وہ اسی مخمور انداز میں بولی۔

”تم ہمارا بھی احترام کرتے ہو..... میں اس کی شک ہے بھلا.....“ یہی وہ وقت تھا جب کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ اس وقت تک گارشا، شوکی کے بالکل قریب آچکی تھی۔ آنے والی رینا تھی..... جسے دیکھتے ہی شوکی یوں بدک جیسے گھوڑا بکرتا ہے۔ اس نے گارشا کو خود سے پرے دھکیل دیا، وہ بھٹکا سا گیا تھا

گولیوں اور گر زلی کی چنگھاڑوں کی آواز پر اور لوگ بھی جاگ کئے۔ گر زلی غضب ناک انداز میں پلٹا اور رابرٹ کی طرف لپکا۔ خواتین نے خچیں مارنا شروع کر دیں اور دونوں فوجیوں نے اپنی کمن سے اس پر فائر کھول دیا لیکن گر زلی کا نہیں۔

شوکت جانتا تھا کہ جب تک گر زلی کے کسی نازک مقام پر گولی نہیں لگے گی، وہ گرے والا نہیں تھا اور یہ کام صرف ایک ماہر شکاری ہی کر سکتا تھا، جبکہ وہاں کوئی ماہر شکاری تو نہ تھا مگر شوکت کو چونکہ شکاری مہمات کا تجربہ تھا اسی لیے وہ اپنے طور پر گر زلی جیسے درندے کی ٹھوک پچھتا تھا اور اپنے مطابق اسے بھکارے دے کر ”پراس“ طریقے سے چلتا کر دینا چاہتا تھا مگر رابرٹ نے عین وقت پر گولی چلانے کی بے وقوفی کر کے معاملہ بگاڑ دیا تھا اور گر زلی جیسے درندے کو برا فر وختہ کر ڈالا تھا۔

”پلیز..... شوکی! رابرٹ کو بچاؤ.....“ دفعتاً ہی ایک بک کھڑے شوکت کے کانوں میں رینا کی جھج گئی اور شوکت گر زلی کی طرف لپکا۔ گر زلی رابرٹ کے سر پر پٹخ چکا تھا اور رابرٹ مارے دہشت و خوف کے چند لمحہ پیچھے پلٹا تو اپنے ہی خیمے کے ساتھ اچھ کر گر پڑا۔ شوکت نے ایک جھج مار کر گر زلی پر جھلانگ لگا دی اور اس کی پیٹھ پر گردن کے قریب جالپٹا۔

قرولی اس کے دائیں ہاتھ میں مغزولی سے تھمی ہوئی تھی اور اس نے وہی گر زلی کے قوتھنے پر آزما ڈالی۔ دیو قامت گر زلی کے قوتھنے پر بڑا گہرا چرکا تھا اور اس نے دل دہلا دینے والی چنگھاڑ کے ساتھ پلٹا کھایا اور ساتھ ہی اپنے دائیں ہاتھ کا پتھر اپنی گردن کے قریب سوار شوکت پر مارا۔ پتھر شوکت کے بائیں شانے پر لگا اور وہ نیچے گر پڑا۔

گر زلی کا خون آلود قوتھنا وہاں سے جھانکتے ہوئے شکاری دانت اسے مزید خوفناک بنا رہے تھے۔ گر زلی زخمی ہونے کے بعد مزید دہشت ناک ہو گیا تھا اور اس نے رابرٹ کو چھوڑ کر پتھر لی زمین پر گرے پڑے شوکت کی طرف قدم بڑھائے۔ ادھر رابرٹ، شوکت کی بروقت مداخلت کے بعد اپنی جان بچا کے بھاگا۔ ایک فوجی کو احساس ہوا اور اس نے گر زلی کے خون آلود قوتھنے کا نشانہ لے کر گولی داغ دی۔ گر زلی کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور وہ چنگھاڑ مار کر اپنے جاروں بیروں پر آیا اور ایک طرف کو بھاگ گیا۔

اس مختصر سے پڑاؤ میں اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ پروفیسر ہنری پر رینا اور گارشا..... زخمی شوکت کی طرف لپکے۔ ہنری نے شوکت کے بائیں شانے کے زخم کا جائزہ لیا۔ وہاں

گر زلی (Grizzly) کا پہاڑ سا جسم، ہلکے بھورے رنگ کے گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بڑا سا قوتھنا سیاہی مائل تھا جہاں سے دو لیے ٹیکلے اور شکاری دانت جھانک رہے تھے۔ وہ کسی دیو زاد بن مانس کی طرح اپنے پچھلے دونوں بیروں پر ارف کھڑا تھا اور تاریک آسمان کی طرف قوتھنا کیے ہوئے عجیب ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔ شوکت نے اپنی شکاری مہمات کے دوران اتنا بڑا اور غیر معمولی طور پر جتیم درندہ پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے انداز سے کے مطابق اس کا قد چھ فٹ کے قریب تھا اور لمبائی سو سینٹی میٹر سے کم تھی جبکہ اس کا پتھر دو سو سینٹی میٹر کے لگ بھگ نظر آتا تھا۔

اس عظیم الجثہ درندے کے سامنے شوکت کے ہاتھ میں تھمی ہوئی قرولی، لیکن میں رکھی سبزی کاٹنے والی ایک چھری سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

یہ درندہ اگر غضب ناک ہو جاتا تو یہاں ایک خون ریز قیامت مچا سکتا تھا۔ شوکت اسے یہ غور دیکھنے لگا۔ وہ اس کے انداز و اطوار سے بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

شوکت اسے مخصوص انداز میں پیکار کرنے لگا۔ گر زلی (ریچھ) اسے بھوکا لگ رہا تھا۔ شوکت کا تجربہ بتاتا تھا کہ ریچھ جب بھوکا ہوتا ہے تو وہ خیموں یا انسانی آبادی کا رخ کرتا ہے۔ اسے کھانے کی خوشبو آ جاتی ہے۔ یہ سوچ کر شوکت جلدی سے اپنے خیمے سے رات کے بچنے ہوئے ایک گوشت کا بچا کھچا پارچہ اٹھا لیا اور اس کے آگے سپیک دیا۔ گر زلی نیچے جھک گیا۔ اب وہ اپنی چاروں ٹانگوں پر آگیا تھا۔ وہ بڑی رغبت کے ساتھ پارچہ چبانے لگا اور شوکت نے بے اختیار سکون کی سانس لی مگر یہ سکون زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا تھا اور اچانک رات کے اس پُربول ستارے میں گولی چلنے کا دھماکا ابھرا..... پارچہ چباتے ہوئے گر زلی نے اپنا قوتھنا فضا میں اٹھا کر ایک دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری..... دوسرا فائر ہوا اور گر زلی جیسے غیظ و غضب سے پاگل ہو گیا۔ شوکت نے لرزتی نظروں سے دیکھا۔ رابرٹ ہاتھ میں لمبی نال والا پستول پکڑے اپنے خیمے کے باہر کھڑا تھا۔ اس کے پستول کی نال سے ٹینگوں دھوکوں کی لکیری بلند ہو رہی تھی۔ وہ گر زلی پر تیسرا فائر جھونکنے کی تیاری کر رہا تھا کہ شوکت چلا کر بولا۔

”اے! رکو..... رکو..... پوفل! فائر مت کرو.....“ اس کی فائر کی ہوئی دونوں گولیاں گر زلی کے وجود میں کم ہو کر رہ گئی تھیں اور شوکت کو معلوم تھا کہ وہ دو گولیاں اس دیو پیکل گر زلی کے لیے ”جوں“ سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتی تھیں البتہ اسے غضب ناک ضرور بتا سکتی تھیں اور وہی ہوا تھا۔

جدید صحافت کے بانی جناب فیاض احمد کی نو کتبیں گروپ کی تہا کے گراں گیر کر



- (1) "ای جان" (قیمت 500)
- (2) "باتیں سیاستدانوں کی" (قیمت 1,200)
- (3) "پاکستان کے خلاف سازش" (قیمت 800)
- (4) "گاندھی کے چیلے" (قیمت 800)
- (5) "ہنستا کھلتا عدنان" (قیمت 1,000)

زیر طبع - جلد آنے والی کتابیں

● قلم چمرے (صحافیوں کے تذکرے) ● نور جہاں اور دلپ کمار

ہر اچھے بک شال پر موجود ہیں۔ ہا کر یا فریبی لائبریری سے حاصل کریں۔

نہ ملنے کی صورت میں قلم فائڈیشن انٹرنیشنل، والٹن روڈ لاہور کینٹ سے حاصل کریں۔

0300-0515101/0333-4393422/03008422518/0321-4552371
qalamfoundation3@gmail.com

انجینیئر بولڈرز

- خزینہ علم و ادب، اردو بازار لاہور 042-37314169
- بک کارز جہلم 0321-5440882
- مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد 051-2278845
- سعید بک بینک، جناح سپر مارکیٹ، اسلام آباد 051-2651656
- ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی 021-32633151
- گوشہ ادب سرگرم روڈ، کوئٹہ 081-2843229
- ہندو بک ڈپو B.C. جگ، ملتان 0303-9773018
- کتاب گھر حسن آرکائیو، ملتان 0321-4510444
- ایس بک گریڈ، لاہور 0300-9545908
- محمد حسن بک پبلشرز، لاہور 047-7626420

ڈالی۔ "مشن کے دوسرے آخری مرحلے میں مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ یہ بات ہمیں مدنظر رکھتے ہوئے از حد احتیاط رکھنا ہوگی۔"

"بالکل"۔ علی ریحان نے کہا۔ وہ اپنے دل کی اڑچن بتا کر یکدم مطمئن سا ہو گیا تھا۔

ذرا دیر سنانے کے بعد یہ لوگ آگے روانہ ہو گئے۔

شائل نے انہیں اپنی رہائش گاہ کا پتا بتا رکھا تھا۔ وہاں وہ تین دوپتے کے بیوپاری کی حیثیت سے رہتا تھا۔ دونوں رات کی تاریکی کا حصہ بن کر تیز قدموں سے چلتے رہے۔ آبادی کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ ریاست کی رعایا خوب خروش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ لیکن یہ دونوں جانتے تھے کہ بہت جلد گلی تقاریبی پھیلا دیے جائیں گے کہ دو خطرناک جاسوس ریاست میں در آئے ہیں لہذا کسی بھی مشکوک یا سنے آدمی کو دیکھتے ہی ریاست کے ذمے داران کو اس کی اطلاع کریں۔ اس کے بدلے عزت کا بھارا جاچکا ہے۔ (بذات خود، جاسوسوں کی اطلاع دینے والے کو انعام و اکرام سے بھی نوازیں گے۔)

دونوں تھوڑی دیر میں ایک اندھیری گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں بھی سناٹا طاری تھا۔ وہ اطراف میں محتاط سی نگاہ ڈالتے ہوئے گلی کے آخری سرے کے دو گھر پہلے والے ایک گھر کے دروازے کے قریب جا پہنچے۔

"مشن..... دستک مت دینا....." علی ریحان نے جب شاہ زمان کا ہاتھ دروازے پر اٹھتے دیکھا تو ہلکی سی سرکشی میں اس سے کہا۔ "قریب کسی گھر میں کوئی جاگ رہا ہوگا تو اسے بھونک پڑ جائے گی کہ رات کے اس سے فلاں مکان میں دستک کی آواز سنائی دیتی ہے۔"

"تو پھر جو طریقہ کرنا ہے، جلدی کرو۔ ہم یہی نہیں بلکہ شامل بھی اس وقت خطرے میں ہے۔ شاہ زمان بولا۔ "ہم تا دیر یہاں نہیں کھڑے رہ سکتے۔"

شاہ زمان نے کہا اور پھر گلی نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر اپنے منہ سے لگا یا اور دو تین بار اٹھ کر آواز نکالی۔

کچھ نہیں ہوا۔ اندر اسی طرح سناٹا کسی لاش کی طرح پڑا رہا۔

"کیا وہ سو گیا ہے؟ اسے تو ہمارے انتظار میں....."

شاہ زمان کا جملہ حلق میں ہی اٹک گیا۔ کیونکہ اسی وقت بغیر آواز پیدا کیے دروازہ کھلا تھا، مگر اپنے سامنے دروازے کی چوکھٹ پر خلاف توقع شائل کے بجائے ایک خوبروی خاتون کھڑی تھی۔ اس نے ہلکے عتابی رنگ کا جبہ ساهمن رکھا تھا۔

وہیں کھڑے کھڑے منہ پھیرا اور پروفیسر ہنری سے بولی۔

"انکل! میں ذرا سیر کو اس طرف جاری ہوں اکیلی....." گارشیانے لفظ "اکیلی" کو ذرا اٹھ کر بلند آواز میں ادا کیا تھا جس..... پروفیسر ہنری... کا ہاتھ ہوا سر ایک دم اونچا ہوا اور وہ اپنی بینک کتھوڑا چپٹی کر کے بولے۔

"اکیلی مت جاؤ....." یہ کہہ کر اس نے شوکی سے کہا۔ "بے بڑی اتم ذرا بے بی کے ساتھ چلے جاؤ..... اور دیکھو..... زیادہ آگے مت چلے جانا....."

شوکی کو گارشیانے چالاکانہ اندازہ ہوا۔ وہ پروفیسر ہنری کا حکم کیسے ناپسند کرتا تھا۔ ناچار اسے گارشیانے کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

دونوں کافی دیر تک دوڑتے رہے تھے۔ بارش اب رک چکی تھی۔ آسمان دھلا تھا اور شفاف نظر آتا تھا۔ دور ایک اندھیری سی چٹائی اُتھ سے پورے چاند کا سنہرا اڑھ، چوٹی پر سونے کی گیند کی طرح ٹکا ہوا محسوس ہوتا تھا جیسے اب جب میں لڑھک کر نیچے وادی میں جا پڑے گا۔ تارے بھی کھکشاں بنائے ضوفاں تھے۔ وہ دونوں ایک پتھر پلے پیچھے کے نیچے آن کھڑے ہوئے جہاں سے بارش کا جمع شدہ آب استادہ بلوریں قطروں کی صورت ٹپک رہا تھا۔ سردی بڑھنے لگی تھی۔ دونوں کے جسم گرم تھے۔ وہ چٹائی دیوار سے پشت ٹکائے دم بہ خود سے بیٹھے تھے۔

چار اطراف گہرے سناٹے کا راج تھا۔ ہلکی ہلکی سی رات بیدوں بھری آہٹوں کے ساتھ دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ماسوائے چٹائی پیچھے کی گھر سے پھیلنے والے قطروں کی آواز کے اور کوئی آواز سامنتوں میں نہیں پڑتی تھی۔

"ہمیں صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے شامل کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔" شاہ زمان نے علی ریحان سے کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو..... کہ ہم مشن کے پہلے مرحلے میں کامیاب ہو چکے ہیں؟"۔ "جائے کسی خیال کے تحت علی ریحان نے ایسا کہا تھا جس پر شاہ زمان کو اچھا سا ہوا۔ وہ بولا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں کچھ سمجھ نہیں؟"

"ہمیں بڑی خاموشی سے ناگہر ریاست میں داخل ہونا تھا مگر اب دیکھتے ہوں کہ ہمارے اس طرح ریاست میں داخلے کا راز، اب راز نہیں رہا۔ پوری ریاست میں ہماری ڈھنڈی پڑی رہے گی اور ہم شاید اپنا کام اس طریقے سے سچ طور پر انجام دے سکیں۔"

"سمجھ گیا....." شاہ زمان نے گردو پیش پر ایک نگاہ

بھی کیا سوچنے لگا۔

”تمہاری بات غور طلب اور اہم ہے۔ لیکن ابھی چند گھنٹوں بعد کی صورت حال دیکھ لیتے ہیں۔“ شائل نے علی ریحان کی بات کے جواب میں کہا۔ ”تم دونوں بھی ابھی تھکے ہوئے ہو گئے۔ کچھ کھانی کر آرام کرو۔ میرے گھر کا یہ اوپری حصہ گودام کے لیے مخصوص ہے۔ فقط یہ کمرائیں نے کل ہی تم دونوں کے لیے صاف کروایا تھا۔ اگر کوئی خطرے کی بات ہوئی تو تم دونوں کو جگادوں گا۔“

شائل کی بات پر علی اور زمان نے کچھ خاص طمانیت کا اظہار نہیں کیا تو ایسے میں اریہ ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالتے ہوئے شائل کی طرف دیکھ کر بولی۔

”میرا خیال ہے انہیں اب اس کمرے کے بجائے نیچے تہ خانے میں ٹھہرا دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

اریہ کو بھی اس دوران شائل نے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ باقی وہ سب پہلے ہی سے جانتی تھی۔ ”یہاں تہ خانے تو گھر گھر بنے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے اسی کی تلاشی لی جائے گی۔“ شائل نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تلاشی گودام کمرے کی بھی ہو سکتی ہے مگر اس کی باری بعد میں آئے گی، تب تک حالات اور موقع مناسبت سے ہمیں بچاؤ کے لیے مہلت مل جائے گی۔“

اس کی بات پر اریہ نے اپنے سر کو تھپی جھنک دی تھی۔ علی ریحان اور شاہ زمان کو بھی اس تنہید کے بعد، جو کم از کم کسی تاویل کے زمرے میں نہیں آتی تھی، کہیں جا کر تسلی ہوئی تھی۔ تب ہی اریہ کی سترمیں آواز ابھری۔

”اگر ایسا ہے تو پھر یہ سب اگلے چند گھنٹوں میں ظاہر ہو جائے گا اور ہمیں ابھی سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”یقیناً۔“ شائل نے اپنا سر ہلایا۔

”ہم بھی زیادہ دیر تھک رہے ہیں۔ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہ سکتے۔“ علی ریحان بولا۔ ”کیونکہ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمیں مقررہ وقت پر اپنا مشن برصورت میں پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ لہذا اس کے لیے ہم چند گھنٹے آرام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پر شدید نگرانی اور نیند کا غلبہ طاری ہے۔“

شائل اور اریہ اس کی بات سمجھ چکے تھے۔ دونوں کو آرام کرنے کا موقع دیا گیا جبکہ شائل اور اریہ نیچے آگئے۔ شائل کچھ فکر مند نظر آنے لگا تو اریہ نے قدرے ملاحت سے پوچھا۔ ”تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو گے۔“

”اُس۔۔۔۔۔ ہاں! کچھ خاص تو نہیں بس یہی سوچ

اور عمر بے رنگ روپ آدمی کے پاس یہ اہر مثل کا کیا کام تھا؟ کیا یہ اس کی دوسری بیوی تھی؟ یا مہاراجا کے کسی اعلیٰ افسر نے کسی بات پر خوش ہو کر شائل کو یہ پری دس کیز کے طور پر ”دان“ کر دی تھی۔

وہ بڑے سلیقے سے ان کے سامنے اور شائل کے ساتھ ہاتھیں سمیٹ کر بیٹھ گئی تو شاہ زمان اس کے گدرائے ہوئے سکرے سے وجود میں جیسے کھوسا گیا۔ عورت نے بھی شاہ زمان کی نظروں کی دلچسپی کو شاید بھانپ لیا تھا، اسی سبب وہ بھی بے غار ایک نظر بے غار اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی تھی۔

”میرا یہ ہے۔۔۔۔۔“

معاشاہ زمان کو شائل کی آواز نے چونکا دیا اور اسے اپنے اس قدر کھوجانے پر فحاش کا احساس ہوا تھا۔

”یہ میرے ساتھ رہتی ہے، میری بہترین مددگار اور ساتھی ہے۔“ شائل نے اس کا مختصر اور قدرے ادھورا ادھورا ستعارف کرایا۔ شاید وہ اس سے آگے کچھ بتانے سے محترز رہا تھا، اسی سبب اس نے تھالی ان کے قریب سرکادی۔

”لو۔۔۔۔۔ قبوہ بیو۔ اریہ قبوہ بہت اچھا اور خوش ذائقہ بناتی ہے۔“

علی ریحان اور شاہ زمان نے پیالیوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ سب سے آخر میں شائل اور پھر اریہ نے پیالی اٹھالی۔

”کیا ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔؟“ علی نے ایک نظر اریہ پر ڈالتے ہوئے شائل کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنس کر بولا۔

”میں نے بتایا۔۔۔۔۔ اریہ میری بہترین ساتھی اور مددگار ہے۔ قابلِ بھروسہ تو یہ ہے ہی۔۔۔۔۔ مگر ذہین بھی بہت ہے۔ میں اکثر بعض اہم مسائل میں اس سے مشورے کرتا ہوں اور مجھے کبھی بھی اس کے مشوروں نے نقصان نہیں پہنچایا ہے، بلکہ فائدہ ہی ہوا ہے۔“

”اچھی بات ہے۔“ علی ریحان نے اختصار سے کہا۔ زمان پیالی منہ سے لگائے اریہ کے چہرے کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اریہ نے ایک نگاہ پھر اس پر ڈالی تھی۔ دونوں کی بھری تال میل نے جیسے خانہ دل کے کسی چور گوشوں میں امیدوں کے سکھ بجا ڈالے۔

”میرے ساتھ رہتی ہے۔۔۔۔۔ بہترین ساتھی۔۔۔۔۔ مددگار۔۔۔۔۔ کیا مطلب ہوا اس کا۔۔۔۔۔؟“ شاہ زمان نے شائل کے الفاظ پر غور کیا۔ ”کیا یہ اس کی رکھیل ہے۔۔۔۔۔؟ اف! میں

بارے میں بڑی صراحت سے بتا دیا جسے سن کر شائل کے چہرے پر ایک دم خنجر کی کھنڈائی۔ علی اور شاہ زمان کی نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کی آواز کھردری تھی۔

چند ثانیے متوقف رہنے کے بعد وہ بولا۔

”یہ کچھ اچھا تو نہیں ہوا۔ لیکن خیر، مگر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ کام میں کچھ تاخیر تو ہو جائے گی۔۔۔۔۔ بہ صورت دیگر ہم کل ہی اپنے مشن کی ابتدا کر سکتے تھے۔“

”ہم کل ہی ابتدا کر دیں گے۔“ شاہ زمان نے فوراً کہا۔

”نہیں۔“ شائل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی صبح صادق کی روشنی پھیلنے ہی لگیوں میں فقارے کو نجات شروع ہو جائیں گے۔ کوئی بعید نہیں کہ گھر گھر تلاشی بھی لی جائے۔ ابھی اپنے مشن کو اس طرف رکھ کے ایک مصیبت سے بچنا چاہئے۔۔۔۔۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ ہم تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیفٹیننٹ کمانڈر مائیکل شاپینے نائب پٹنی افسر جان پال کو دو ایک روز میں ایک خصوصی نشست کے لیے یہاں روانہ کرنے والا ہے۔ ہم نے اسی نشست کو سبوتاژ کر کے فوراً سے پیسٹر واپس لوٹ جانا ہے۔ اگر نشست کامیابی سے طے پاگئی جس کی سب کو امید واثق بھی ہے تو کچھ ہمارا مشن بری طرح ناکامی سے دوچار ہو جائے گا۔“ علی ریحان نے اپنے اس اہم مشن سے متعلق غایت درجے کی مجبوری اور اہمیت شائل کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے کمرے میں وہی خور و خاتون داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں گول تھالی تھی۔ اس پر چار چھوٹی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کسی اور نے تو شاید نہیں، البتہ شاہ زمان نے چار پیالیوں کو دیکھ کر فوراً طور پر اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ یہ خاتون بھی ان کی اس اہم گفتگو میں شامل ہونے والی تھی اور۔۔۔۔۔ دوسری اہم بات جو سب کے لیے نوٹ کرنے والی تھی، وہ تھا اس کا لباس۔۔۔۔۔ جو تبدیل ہو چکا تھا۔ یعنی اب وہ لمبے جے کے بجائے کاسنی رنگ کی خوب کسی ہوئی سازی میں ملبوس تھی۔ جس میں اس کا بھرا بھرا

شاب المڈا پڑا محسوس ہوتا تھا۔ شاہ زمان کو اس کا روپ سکھار چسپاں کی سانپے میں ڈھلا ہوا دکھتا تھا۔ رنگت اس کی شہانی تھی۔ نگرانی کشادہ آنکھیں جن پر گھنٹاؤں جیسی پلوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ گھنے ریشمی بال بڑے سلیقے سے کھول کر اس نے اپنے شانوں پر پھیلا رکھے تھے۔ اس کے توپ جھن بدن سے عجیب سی صورت گردنے والی نہمت آنکھیں ہوتی تھی۔

شاہ زمان کو اب بھی حیرت ہو رہی تھی کہ شائل جیسے

عمر تائیس اٹھائیس کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ وہ خاصی دراز قامت اور صحت مند جسم کی خاتون تھی۔ اس کے ہونٹوں کا گداز تھراکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ تاہم اس خاتون کو دیکھ کر دونوں ہی کچھ غصے کا شکار ہو گئے تھے، کیونکہ ان کی معلومات کے مطابق شائل اکیلا اپنی رہائش گاہ میں رہتا تھا۔ اگرچہ وہ شادی شدہ تھا مگر اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا لیکن اب تک اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

”اندر آجائیں۔۔۔۔۔ جلدی۔“ خاتون نے ان کی حیرت اور شش و پنج کی پروا کے بغیر ہولے سے کہا اور ان دونوں نے اندر قدم رکھ دیا۔ اندر کوئی روشنی نہیں کی گئی تھی۔ محض پراپرٹی منزل کے کسی کمرے کی چھت ہونے کے باعث فقط کچھ سی حصہ کھلا ہوا تھا جہاں سے مقدور بھر آسمان، قدرے روشن روشن سا نظر آ رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑے ہو گئے۔ ادھر خاتون نے دروازہ بند کیا اور ان کے عقب میں ہی کھڑے ہو کر بولی۔

”تمہارے داعیں ہاتھ پر ایک زینہ اوپر کھڑا ہے۔ شائل وہاں تم دونوں کا منتظر ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو تارکی میں نجانے کہاں غائب ہو گئی۔ دونوں کا دل دھڑکا تھا۔

اس کے بعد یہ لوگ داعیں ہاتھ کی جانب مڑ گئے۔ آسمان سے آتی ہوئی تھوڑی بہت روشنی میں انہیں پختہ اینٹوں کا بنا زینہ دکھائی دے گیا تھا۔

دونوں بغیر آواز پیدا کیے، اسے طے کرنے لگے۔ زینہ زیادہ طویل نہ تھا۔ جلد ہی دونوں اوپر پہنچ گئے تو اُلے ہاتھ پر ایک کمرے سے ہلکی روشنی آتی دکھائی دی۔ دونوں اسی طرف کو بڑھ گئے۔ دروازے کو ہولے سے اندر دھکیلا تو دونوں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئے۔

سامنے ایک عجیبی جسامت محض کھڑا تھا۔ وہ عمر میں ان سے بڑا تھا۔ قد گھٹنا، رنگ سانولا اور سر گھٹا۔ شائل کو اگرچہ علی ریحان اور شاہ زمان پہلی بار دیکھ رہے تھے، تاہم اس کا ناک نقشہ سمجھا دیا گیا تھا جو خاصا نامیاں تھا۔ اسی سبب وہ اسے جلد پہچان گئے۔ شائل جیسے عام شکل و صورت اور غیر آدمی کے ہاں اس دراز قامت حسین خاتون کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی، تاہم انہیں بھلا اس معاملے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

شائل نے پہلے مسکرا کر ان سے اپنا تعارف کروایا اور پھر انہیں لیے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بتی جلا دی تھی۔ شائل ایک خوش باش اور مخلص شخص ثابت ہوا تھا۔

”سب کچھ ٹھیک تو رہا ہے نا۔۔۔۔۔؟ میرا مطلب ہے کوئی گزب۔۔۔۔۔؟“ اس نے دونوں کے چہروں پر باری باری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا اور علی ریحان نے اسے ”گزب“ کے

سسپنس ڈائجسٹ 80

بہترین تحریریں، لا جواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ
سرگزشت
کراچی

شمارہ دسمبر 2017ء
کی جھلکیاں

عمر خیام

ضیائیں بگڑا کر کے قلم سے اس شخصیت کا
احوال جسے سائنسی علوم پر دسترس تھا لیکن
دنیا والے اسے شاعر سمجھتے رہے

مصنفہ

تنویر ریاض لائے ایک معروف قلم کار کا زندگی نامہ

جنرل کا فرار

سیاحتی تلاش، ایک ایسے جنرل کا احوال
جنہے دشمنوں نے محاذ جنگ سے گرفتار کیا تھا

رسم سال نو

دسم بن اشرف کی دلچسپ تحریر، دنیا بھر
میں سال نو کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے

محبت گزیدہ

زودیا باز کی ایک دلچسپ مگر انوکھی سچ بیانی
جس میں انتہائی انوکھی سزا تجویز ہوئی تھی

ایک عورت

بہت سی سچ بیانیاں دلچسپ
سچے قصے اور تاریخی واقعات

دسمبر 2017ء

میں۔ اس کا باپ ہمیشہ سے یہی نصیحت کرتا تھا کہ اگر اس کے
میں کوئی دوسرا بول رہا ہو تو اسے اپنی زبان بندی رہی
ہے۔ وہ یہی کہے ہوئے تھا۔ ادھر رابرٹ بری طرح زچ
ہو رہا تھا اپنے خیمے کی جانب پلٹنے لگا تو پروفیسر ہنری نے
اسے پکارا۔

”بڑی اظہر جاؤ۔۔۔۔۔“ وہ رک گیا اور اس کی جانب
مڑا۔ پروفیسر ہنری بھی جیسے آج معاملہ صاف ہی کرنے کے
میں موڈ میں نظر آتا تھا۔ اس سے متانت سے بولا۔

”اب یہ سب ختم ہو جانا چاہیے۔ میں آئندہ تمہیں شوکی
سے تو کیا کسی سے بھی الگھٹا ہونا دیکھوں۔۔۔۔۔ بصورت
دیکر میں تمہیں واپس لوٹ جانے کا پروانہ جاری کر دوں
گا۔ اس کارواں کا اس وقت میں سالار ہوں اور تم اس وقت
جنرل مائیکل شا کے پیچھے نہیں بلکہ میرے قافلے کے ایک رکن
ہو۔۔۔۔۔ اسے اب آخری وارنگ سمجھنا۔“

رابرٹ کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ جس شخص
کو وہ دیکھنے کا نوکر کہہ کر پکارتا تھا، آج اسی کے سامنے اس کی
عزت و کدوڑی کی کردی گئی تھی۔ بلاوجہ کی مخالفت اور حسد نے
بالآخر رابرٹ کو اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں رسوا کر ڈالا تھا۔

”اوکے“ فنی! رابرٹ چڑے ہوئے منہ سے بولا۔
پروفیسر ہنری بھی آج سارا ادھارا اتارنے کی تیاری میں تھے،
فوراً بنجیدگی سے بہ دستور اس کی طرف سخت نظروں سے
گھورتے ہوئے بولے۔

”نو، اٹ از ناٹ فنی۔۔۔۔۔ اینڈ نارائی فینشی، جسٹ
رہا نیلیٹی۔“

رابرٹ نے اپنے سر پر آڑے انداز میں جے ہوئے
ہیٹ کو چھوڑا اور پلٹ گیا۔ ریٹا دیو کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے
چہرے پر گہری بنجیدگی کے تاثرات ہو رہے تھے۔ شوکی نے اس
کی طرف ایک دزدیدہ سی نظر ڈالی۔ ریٹا بھی اپنا ننھلا ہونٹ
دانتوں کی اوپری قطار تلے دبائے اس کی جانب نکلے جارہی
تھی اور پھر اس سے ایک دم ہی نکالیں پھیر کر پلٹ گئی۔ وہ
رابرٹ کے پیچھے جارہی تھی۔

پروفیسر ہنری نے کوچ کے احکامات صادر کر دیے۔
موسم خاصا خوشگوار ہو چلا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی اور
اس میں ایک خوشگواریت کا احساس تھا۔ نیچے اوپر درور۔۔۔۔۔ ان
وادیاؤں کی بلندیوں اور ترائیوں میں قدرتی منائی کے
شاہکار کو دیکھیں آنے لگے تھے۔ چمن پرند سب ہی اپنی اپنی
مستیوں میں مجھو خرام و پرواز تھے۔ ان کی گونج وادی میں عجیب
ساتاثر اجماری محسوس ہوتی تھی۔

کرہو لے بے کھنکار کر اسے کسی قسم کی بد مزگی نہ پھیلانے کی
وارنگ دی تھی، اس کا جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی درمیان
میں بول پڑے۔

”رابرٹ! مائیکل یور لیگوتج۔۔۔۔۔ دیش انف ناؤ۔۔۔۔۔
اب میں تمہیں باقاعدہ وارن کرتا ہوں کہ تم قطعاً کسی سے نہیں
الگھو گے۔“ انہیں بھی غصہ آ گیا تھا۔ ”جب شوکی نے میرے
سامنے تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ گارشا کو میں نے ہی اس کے ساتھ
بیجا تھا تو بات ختم ہو جاتی ہے۔“

”انکل! گارشا یہی ہے، وہ شوکی کو نہیں جانتی۔۔۔۔۔“
رابرٹ سے شوکی کے خلاف زہرا لگتے نہیں رہی تھی۔

”تم کیا جانتے ہو شوکی کو۔۔۔۔۔“ پروفیسر ہنری اس کی
طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولے۔ انہیں بھی شاید رابرٹ کی
ڈھٹائی اور شوکی سے بلاوجہ کی جلن اور رنج رودی پر غصہ
آ گیا تھا، اسی سبب جیسے وہ خود اس کی وکالت کرنے کی ٹھان
چکے تھے۔

”یہی جانتے ہوتا تم اس کے بارے میں کہ۔۔۔۔۔ اس
نے ایک بار ریٹا کی جان بچائی، دوسری بار تمہاری اپنی ضد نے
تمہیں اس پاگل ٹھوڑی (مارکرٹ) کے ہتھے چڑھا دیا اور
تب بھی مسٹر شوکی آگے آئے اور اب یہاں گزشتہ شب
کو جو تمہاری اپنی بے وقوفی سے ہم سب ایک خوفناک حادثے
کا شکار ہوئے ہوئے بچے تھے، وہاں بھی یہی اپنی جان کو
خطرے میں ڈال کر اس خطرناک اور دیو قاتم درندے پر
کود پڑا تھا۔ بولو۔ کیا یہی جانتے ہوتا۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ یا اور کچھ
جانتے ہو تو آج ہمیں وہ بھی بتا دو۔“

پروفیسر ہنری برنارڈ طبعاً ایک سلجھے ہوئے اور با اصول
انسان تھے۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھنے کے عادی تھے
اور کسی کے معاملے میں تا نگ اڑا پسند نہیں کرتے تھے نہ ہی
اپنے کسی معاملے میں کسی کی دخل اندازی انہیں پسند تھی۔ ان
کی نظروں میں سچ ہمیشہ سچ ہی ہوتا تھا اور جھوٹ صرف جھوٹ،
چاہے سامنے والا کسی بھی ملک یا مذہب سے تعلق
رکھتا ہو۔۔۔۔۔ وہ اگر کسی غلطی پر ہوتا تو وہ اسے بری طرح ٹوک
دیا کرتے تھے۔ حلیم طبع تو وہ تھے ہی مگر اس سے زیادہ وہ
قدر شناس بھی تھے۔ اگر اس وقت ان کے سامنے رابرٹ کی
جگہ ان کا اپنا افسردہ دوست جنرل مائیکل شا بھی ہوتا تب بھی
پروفیسر ہنری اس پر شوکی کی سچائی کو ہی ترجیح دیتے۔ یہ
تو پھر رابرٹ تھا۔

بہر کیف۔۔۔۔۔ رابرٹ کو ایک بار پھر منہ کی کھانی پڑی
تھی۔ شوکی کے لیے اپنے باپ کریم بخش کی تربیت کام آ رہی

سے بولا۔

”ہنا لباس پہن لو اور جلد نکل چلو۔۔۔۔۔ ورنہ میں
تمہارے انکل ہنری برنارڈ سے شکایت کر دوں گا۔“

شوکی اس سے یہ کہتا ہوا۔۔۔۔۔ اس کی طرف سے منہ پھیر
کر چند قدم دور جا کے کھڑا ہو گیا۔ ٹھوڑی دیر بعد گارشا بھی
لباس پہنے اس کے سامنے آ گئی۔

”سوری۔۔۔۔۔ میں شاید تمہاری محبت میں زیادہ بیک
گئی تھی۔۔۔۔۔ سو سوری۔۔۔۔۔“ وہ اس سے نہامت بھرے لہجے
میں بولی تھی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ اب واپس چلو۔۔۔۔۔“

دونوں پتھر لے اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چٹائی
دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے پڑاؤ کی جانب بڑھنے لگے۔
جب پڑاؤ پر پہنچے تو شوکی کی جتنی نظروں نے دیکھا کہ
رابرٹ اور ریٹا بھی ہتھ پتھ کرتے ہوئے ایک طرف سے
چلے آ رہے تھے۔ رابرٹ کا ایک ہاتھ ریٹا کی شانگل گل جیسی
کر کے گرد حائل تھا اور ریٹا انکل اس کے ساتھ لگی چلی آ رہی
تھی۔ ایسے میں ریٹا اور شوکی کی نظریں ایک لمحے کو چارہوٹی
تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ریٹا کے ہلکے کھلاتے چہرے پر ایک دم
سنجیدگی طاری ہو گئی تھی جبکہ رابرٹ کا چہرہ ایک دم سرخ
ہو گیا۔ وہ ریٹا کو چھوڑ کر اس کی طرف جارحانہ انداز میں
بڑھا۔ اسی وقت پروفیسر ہنری کے ہولے بے کھنکار نے کی
آواز ابھری۔ رابرٹ اس ”کاشن“ کو سمجھ کر اپنے غصے
پر قابو پاتے ہوئے ایک عصبی نظر شوکی پر ڈالتے ہوئے اپنی
بہن گارشا سے بولا۔

”تم اس کے ساتھ کہاں گئی تھیں؟“

”اٹ از ناٹ آن آف یور بزنس برادر۔۔۔۔۔!“ گارشا نے
بڑی رکھائی سے بھائی کو جواب دیا تھا۔ ”آئی ایم ہینین
ابو (میں اٹھارہ سے اوپر کی ہوں) تم مجھ پر کوئی حکم نہیں
چلا سکتے۔“

اس کی بات پر رابرٹ دانت پٹیں کر رہ گیا لیکن شوکی
نے کچھ سوچ کر رابرٹ سے کہا۔

”مس گارشا کا صبح کی سیر کرنے کا جی چاہ رہا تھا۔ یہ
اکیلی ہی جا رہی تھیں لیکن انکل ہنری نے مجھے بھی ان کے
ساتھ بھیج دیا تھا۔“

”یوٹ اپ۔۔۔۔۔ میں نے تم سے بات نہیں کی
ہے۔“ رابرٹ کو جیسے شوکی پر بولنے کا موقع ملا۔ ”تم۔۔۔۔۔“
وہ غصے سے پھر کر شوکی سے اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پروفیسر
ہنری جنہوں نے ٹھوڑی دیر پہلے ہی رابرٹ کے تیور دیکھ

”تم مجھے اس کی فتوریت سے آگاہ کرنا چاہ رہی تھیں۔“ شاہ زمان نے اس کی دکھ بھری داستان میں دلچسپی لیے بغیر کہا تو وہ ایک گہرا سانس کھینچ کر بولی۔

”یہ آدمی تمہیں افحام کے لالچ میں پکڑا دانا چاہتا تھا کیونکہ تم دونوں اس کے لیے درپسین تھے۔ میں اس کی نیت بھانپ چکی تھی۔ اسے مزید بولنے کے لیے میں نے اسے اپنی نیت ظاہر کرنے کا موقع دیا اور یوں وہ مجھے بھی اپنا تم خیم لالچ میٹھا اور ہٹا کر ڈال مجھ پر عیاں کر دیا۔“

”پھر تم نے اسے چائے میں زہر دے کر مار ڈالا؟“
شاہ زمان نے اس کے دلکش مگر مغموں سے چہرے کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تھلک کے سائے
ملکھوڑے لے رہے تھے۔

”ہاں!“
”مہیں ہم سے بھلا کس جذبے کے تحت ہمدردی ہو گئی تھی؟“ زمانہ کی بات پر اربیبہ کے لبوں کی گلدازیت پر پیریدوں بھرا ارتعاش سا ستر اگیا۔ کونوں سے کھینچی ہوئی کشادہ اور گھنیری چٹکوں کے مہیں سائے تلے اس کی چشم آہو میں قوس فرخ جیسے رنگے لیے خفہ و ناخفہ جذبہ بات کی شمع غلبہ فروزاں ہوئی۔ وہ انہی نگاہوں سے چندا نیوں تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ہو لے سے بولی۔

”مجھے واقعی تم دونوں کے مقاصد یا مشن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن جہاں معاملہ داری اور وعدے و وعید طے پا جائیں تو اس کے خلاف کسی بھی بات پر میرا ضمیر مجھے مجبوراً... ڈالتا ہے۔ دھوکا، مکر اور غریب سے مجھے سخت نفرت ہے۔ جب شامل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی ذاتی جذبے کے بغیر محض دولت کے لاچ میں تم لوگوں کے لیے فخری کر رہا ہے اور اب اسی طمع کی خاطر وہ تمہیں دھوکے سے مروانا چاہتا ہے تو میرے ضمیر نے مجھے اسے ایسا کرنے سے روکنے پر مجبور کر ڈالا۔“

”تم اسے سمجھا بھی تو سکتی تھیں؟“ زمان شاید ابھی تک اس پر برہم و سا کرنے سے اجتناب برتے ہوئے تھا۔

”میں ایسا کرتی تو وہ مجھے بھی پیسوں کے لالچ میں تمہارا ساتھی بنا کر چھو سکتا تھا۔“

تب ہی اچانک شاہ زمانہ کسی حکماری بازی کی طرح قریب کھڑی نازک اندام اریبہ پر سمجھوتہ پڑا اور اس کے کھٹے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ اریبہ کے کیوں سے ملکی سی سکاری خارج ہوئی لیکن اس میں کسی درد اور تکلیف کا ذرا بھی شائبہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہی شاہ زمانہ کے اس

اکھل!“ رابرٹ نے اپنے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھتے اور ٹانگیں پھیلاتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا۔
 ”ویل! تو چلو پھر بجائے..... کرو.....“ پروفیسر ہنری برنارڈ مسکرا کر بولا اور پھر یہ لوگ روانہ ہو گئے۔

☆☆☆
 محبت کے ایک کونے پر بنے ایک چھوٹے سے سلاخ
 دار روشن دان سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ اسی روشنی میں شاہ
 زمان نے دروازے پر ایسہ کونکڑے دیکھا تھا۔ وہ
 دروازے کی چوکھٹ پر چپ چاپ کھڑی تھی۔ شاہ زمان کو اس
 کے پول خاموش خاموش سادہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے
 ہونا بہت عجیب سا لگا تھا۔ اسی سبب اس کے دھڑکتے دل کی
 رفتار ایک لمبی تیز ہو گئی تھی۔

”تنت تہتم خیریت تو ہے نا۔۔۔؟“ اس نے نکتے لہجے میں، بدستور اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔ اس کے برابر میں فرش بستر پر علی ریحان ہنوز بے سددہ درہا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ.....“ اربیتہ نے سپاٹ لیجے میں سے کہا۔ زمان اٹھ کر اسی طرح یک تک اس کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے قریب پہنچا تو وہ پلٹی اور دیکھنے اترنے لگی۔ زمان بھی حیران پریشان سانس کے نیچے چل پڑا۔

بیچے کمرے میں پہنچا تو اسے ایک حیرت آمیز بتولیں کا درخت چٹان کا سا سائے قائلین پر دو کپ رکھے ہوئے تھے۔ تو سیدھا پاڑا تھا، جبکہ دوسرا لانا دھرا تھا۔ اس کے پاس ہی نے شامل کر کے ڈھنگے انداز میں بے سدھ پڑے۔ اس طرح کہ اس کی سیاہ رو پاچھوں سے خون کی ایک رخ لکیر قطروں کی صورت بہہ کر قائلین میں جذب ہو رہی تھی۔ یہ عجیب اور دہشت ناک منظر دیکھ کر کشہ زمانہ سا آدی بھی مرپا خوف سے جھرمجھرا گیا۔

”یہ کیا ہوا..... کس نے ہلاک کیا اسے؟“
 ”میں نے.....“ اریہ نے قریب کھڑے زمان سے
 لہجے میں کہا۔ ”میں نے اسے چائے میں زہر دیا تھا۔“
 ”مگر کیوں.....؟“

”میں اس کی نفوریت سے آگاہ ہو چکی تھی۔“ وہ
 ”یہ ذیل شخص یہ ظاہر تو لوگوں کی نظروں میں میرا احسن
 اتنا تھانگن و حقیقت یہ بدعینت شخص میری مجبور یوں
 مجھے..... کھلتا رہا۔ شادی کے جھانے میں مجھے گناہ کی
 بتاتا رہا اور اپنی نوکرائی۔“

”ہمیں تو یہی پتا ہے کہ یہ کو شمالیہ کے اطراف میں بسنے والے بعض قبائل پر ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔“
”مجھے بھی یہی پتا ہے۔“ شوکی نے جواب دیا۔
”لیکن خندابا یا اور شامنا کا خیال اس بارے میں کچھ اور ہے۔“ یہ بتاتے ہوئے امجد خان نے اپنی آواز دھمی کر لی تھی۔ لہجہ ایسا کی جیڑا سا ہر اس راہو گیا تھا۔ شوکی بے تاثر سے لہجے میں بولا۔

”کیا کہتے ہیں دونوں.....؟“
 ”تمہیں شاید اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں ہے
 تو رہنے دو کیا بتاؤں.....“ امجد بولا۔ شوکی بھی خاموش رہا۔
 ایک گھنٹے بعد یہ لوگ اپنی مکمل تیاری کے ساتھ ایک
 جگہ جمع ہو گئے۔ پروفیسر ہنری نے ان سب سے مخاطب
 ہو کر کہا۔

”پہلے میرا ارادہ تھا کہ تارکہ ریل کے ذریعے پہنچنے کی کوشش کی جائے، کیونکہ میں نے یہاں قیام کے دوران دیکھا ہے کہ پورے دن میں ایک بار سامنے والی ریلوے لائن سے دو درمل کاریں گزرتی ہیں، ایک آنے والی اور دوسری جانے والی۔“

یہ کہتے ہوئے انہوں نے اس ریلوے لائن کی طرف اشارہ کیا جویدھمے ہاتھ کی طرف والی پہاڑی سربیک سے نکل کر قوس کی صورت میں ناگرہ کی طرف جاری تھی۔ یہاں انہوں نے دخانی انجن والی ایک ریل کار کو بھی گزرتے دیکھا تھا۔

”اگرچہ اس ریل کی آمد کا وقت ہوا جانتا ہے، لیکن اس علاقے کا نقشہ دیکھنے کے بعد میں نے اپنا ریل کا میس رو اگنی کا ارادہ بدل ڈالا ہے۔ کیونکہ نقشے کے مطابق ناگرہ، جو ہماری منزل ہے اس سے لمحوں کے گردور دیکھتے ہیں پور اور تریپال کے جنوب مشرق والے چوہہ کی جانب، لگ بھگ پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قبیلہ راکاشی ہے۔ لہذا اب ہم باقی کا پیدل سفر اسی سمت جاری رکھیں گے۔“

”فمننا شک..... یہی بہتر رہے گا ہنری انفل!“ گارشیا نے کلکاری مارتے ہوئے کہا۔

”میں بھی پاپا کے اس خیال سے متفق ہوں.....“
 پروفیسر ہنری کی لاڈلی بیٹی ریتا نے بھی اپنی کارن گارشا کی
 تائید میں خوش ہو کر کہا۔ ”اس طرح ہمیں مشرق کی اس
 پراسرار دُشمن کے پتھر حسن کو قریب سے دیکھنے اور اس سے
 لطف اندوز ہوتے رہنے کا بھی موقع ملتا رہے گا۔“
 ”بالکل ٹھیک..... تم خوب بھی یہی جانتے ہیں ہنری

پروفیسر ہنری برنارڈ کے ”اعلانے“ کے مطابق اب شوکی کی حیثیت اس مہمائی ٹیم کے نائب سالار کی تھی۔ ڈارنور احمد خان سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ایک بھاری جسم کا ٹھٹھنا سا بنس کھ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر جھمڈری سی ڈاڑھی تھی اور عمر تیس کے قریب تھی۔ اس نے گھٹنے تک شارٹس اور اوپر ہٹکسل والی شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ بیروں میں مضبوط سول کے جوتے پہنے ہوتے تھے۔ پڑاؤ سمیٹنے کی تیاری یہ چاروں کر رہے تھے۔ نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا سامان وغیرہ سمیٹ رہے تھے۔ باقی لوگ بھی اپنا اپنا ضروری سامان ایڈجسٹنگ میں مشغول کرنے میں مصروف تھے۔

”اس کا دیوانے کی اولاد رابرٹ سے محتاط رہنا
شوکی!“

خیمے اکھاڑنے کے دوران ڈرائیور امجد خان نے پتی
آواز میں شوکی کو متنبہ کیا۔ ”میں اس کی آنکھوں میں تمہارے
لیپے عناد اور بغض دیکھ رہا ہوں۔“

”تم نے یہ آج دیکھا ہے، میں یہ سب روائی سے بہت پہلے دیکھ چکا ہوں۔“ شوکی نے پتھر کی زمین سے ایک بڑے زنبور کے ذریعے بیج اکھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ..... تو اس کا مطلب ہے معاملہ پرانا ہے۔“
 امجد خان نے بھویں سکڑ لیں۔

”وہیے میں نے روانگی کے وقت سے ہی یہ بات محسوس تو کر لی تھی بلکہ مجھے یہ فرنگی زادہ ابتدا سے ہی ایک متعصب اور مغرور شخص لگا تھا کیونکہ میرے اور نندو بابا، اس کی بیوی شائستا کے ساتھ بھی اس کا رویہ متعصبانہ تھا مگر تمہارے ساتھ تو کچھ زیادہ ہی.....“ وہ اکھڑے ہوئے خیمے کو لپیٹتے ہوئے ایک ذرا توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ”وہیے تم نے اس مغرور فرنگی زادے کو اچھا سبق سکھایا۔ بڑی سبکی محسوس کر رہا تھا یہ اپنی، جب پروفیسر صاحب اسے ڈانٹ پلا رہے تھے۔“

شوکی نے کہا۔ ”یہ سب کشمکش میں لپیٹ لو، میں ڈرانے دوں گا یا باور
شرانے کی مدد کو آتا ہوں۔“

”ایک بات سنو۔۔۔“ امجد خان نے اس سے کہا۔ وہ رک گیا۔ ”مجھیں کچھ معلوم ہے یہ باگل سکی پروفیسر آخراں میزخاطر، برکس متعد کے لیے نکلا ہے؟“

”کیا مجھیں نہیں معلوم؟“ شوکی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بیویوں اچکا گئیں۔۔۔

دم آبدیدہ سی ہو گئی۔
 ”کیا ہوا بہن! کیا میری کوئی بات بری لگی تھیں؟“
 ”نہیں بھائی!“ اریہ اپنی اذہنی کے ایک کونے سے
 اپنی ستارہ آنکھوں کے نمناک گوشے پونچھے ہوئے بولی۔
 ”آپ کے بہن کہنے پر مجھے اپنا بھائی دینو یاد آ گیا تھا۔ وہ بے
 چارہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“ اور جب ہی اریہ نے اپنی دکھ
 بھری کتھا بھی سنا ڈالی۔ اس کے بعد بولی۔
 ”آپ دونوں آرام سے بیٹھ جائیں۔۔۔۔۔ اور مجھے
 تھوڑا وقت دیں۔۔۔۔۔ اریہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”خطرہ اب
 بھی پوری طرح سے ٹلنا نہیں ہے۔۔۔۔۔ باہر گلی کی اور چوراہوں
 پر مہاراجا اور انگریز سرکار کے سپاہی گشت کر رہے ہیں اور مجھے
 معلوم ہے کہ وہ دوبارہ بھی کسی مشتبہ نظر آنے والے مکان میں
 جا سکتے ہیں۔ میں سودا سلف کے بہانے ڈرا باہر نکل کر حال
 معلوم کر کے آتی ہوں۔۔۔۔۔“

علی ریحان نے سکر اتے ہوئے اپنا سر اٹاٹاٹا میں
 بلا دیا۔ قاتلین پر دھری پڑی شکل کی لاش کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے اریہ بولی۔
 ”اس لاش کا بھی اصرہری پڑے رہنا مناسب ہوگا۔
 کرفیو کی کیفیت ختم ہونے والی ہے۔ لوگ میرے گھر کا رخ
 کریں گے اور اذراٹے ہمدردی میری مدد کرنا چاہیں گے۔
 میں چاہتی ہوں یہ ڈراما ایسی طرح اپنے انجام کو پہنچ جائے۔“
 ”تم باہر جا کر کیا دیکھنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔؟“ زمان نے
 سوال کیا۔ اریہ نے دلفریب سی مسکراہٹ اس کے چہرے
 پر ڈالی اور بولی۔

”دبی کچھ جواب بھی بتا چکی ہوں۔۔۔۔۔“
 وہ چلی گئی اور باہر سے مکان کو تالا لگا گئی۔
 ”اس کے آنے سے پہلے پہلے میں یہاں سے نکل
 جانا چاہیے۔ ورنہ تم چوہے دان میں پھنس جائیں گے۔“
 اریہ کے جاتے ہی زمان نے علی سے کہا تو وہ مسکرا کر اس کی
 طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”تمہیں شاید ابھی اس بے چاری پر اعتبار نہیں
 آیا۔۔۔۔۔“
 ”دولت کی چمک اچھے بھلوں کو اندھا کر دیتی
 ہے۔“ زمان گہری متانت سے بولا۔
 ”جو عورت ایک جیتے جاتے شخص کو اس طرح ہلاک
 کر سکتی ہے اور پھر بڑی چالاکی سے باقی معاملات پر قابو پانے
 کی صلاحیت بھی رکھتی ہو، وہ کوئی عام عورت نہیں ہو سکتی علی!“
 اس نے کچھ دیر توقف پھر کہا۔

”تمہیں شاید ابھی اس بے چاری پر اعتبار نہیں
 آیا۔۔۔۔۔“
 ”دولت کی چمک اچھے بھلوں کو اندھا کر دیتی
 ہے۔“ زمان گہری متانت سے بولا۔
 ”جو عورت ایک جیتے جاتے شخص کو اس طرح ہلاک
 کر سکتی ہے اور پھر بڑی چالاکی سے باقی معاملات پر قابو پانے
 کی صلاحیت بھی رکھتی ہو، وہ کوئی عام عورت نہیں ہو سکتی علی!“
 اس نے کچھ دیر توقف پھر کہا۔

”اتنی دیر گزر جانے کے باوجود تم نے شکل کی لاش کو
 اصرہری پڑے رہنے دیا اب تک۔۔۔۔۔ جبکہ تم کہتی ہو کہ سپاہی
 بھی یہاں تلاشی لینے آئے تھے۔۔۔۔۔ کیا لاش دیکھ کر وہ چونکے
 نہیں؟ جبکہ اوپر ہم بھی بے خبر سو رہے تھے۔ ایسا کیسے ممکن
 ہو گیا کہ یہ لاش اور ہم ان کی نظروں سے بچ رہے؟“
 ”اسی لاش نے تو ہمیں بچایا ہے۔“ اریہ نے عجیب
 سے لہجے میں کہا۔
 ”کیا مطلب؟“

”جیسے ہی ڈونڈی پٹی گئی اور تمام لوگوں کو اپنے اپنے
 گھروں میں بھجوس رہنے کا حکم دیا گیا تو میں اپنے بال کھولے
 بین کرتی ہوئی باہر گلی میں آ گئی اور ان سے کہا کہ میرے
 گھر میں فونکی ہوئی ہے تو مجھے ڈرا دھکا کر دیا وہیں بیچ
 دیا گیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا کہ میں پھر بھی گھر کی چوٹ
 پر ریشمی بین کرتی رہی اور جب اس گھر کی تلاشی کی باری آئی تو
 شخص ایک شخص کو اندر بھیجا گیا جو شکل کی لاش کو دیکھ کر ہی
 واپس پلٹ گیا تھا۔ میں دہائیاں دینے لگی تو۔۔۔۔۔ باہر موجود
 سپاہی بیزار ہو کے مجھ سے جان چمڑا کے چلتے ہیں۔“

”اسے چھوڑ دو شاہ زمان۔۔۔۔۔ ایہ سچ بول رہی
 ہے۔۔۔۔۔“ دفعتاً باہر زینے کی طرف جانے والے دروازے کی
 تاریک سی چوٹ سے علی ریحان کی آواز ابھری۔ دن کی
 روشنی وہاں مقدور بھر ہی پہنچ رہی تھی۔ وہاں سے علی ریحان
 نمودار ہوا۔ اس کی بھی آنکھ زمان کے جاتے کے تھوڑی دیر بعد
 ہی کھل گئی تھی اور وہ کب سے تاریک سی چوٹ پر کھڑا ان کی
 باتیں غور سے سن رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے قریب آ گیا تھا۔
 ”میں نے خود اوپر سے نیچے جھانک کر دیکھا ہے،
 باہر گلی میں۔۔۔۔۔ مہاراجا کے سپاہی گردش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“
 زمان نے ایک گہری ہلکاری خارج کرتے ہوئے
 اریہ کو پھوڑ دیا۔ اس کی مٹھی سے اریہ کے گھنے ریشمی بال نکلے
 اور اریہ کی سبک کندنی پشت پر بکھر گئے۔ اس نے سر ہٹا کر
 مضبوط اور کسرتی جسم کے حامل زمان کو سکرانی نگاہوں سے
 دیکھا تھا اس کے چہرے پر ناراضگی یا رہی کے ذرا بھی آثار
 نہ تھے۔

”اریہ بہن! اگر تمہاری بات سچ ہے تو یقین کرو ہم
 تمہارا یہ احسان ساری زندگی فراموش نہیں کریں گے۔“ علی
 ریحان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے ملاعت بھرے لہجے
 میں کہا۔ ”لیکن اب ان محدود حالات میں سوال یہ
 پیدا ہوتا ہے کہ تم ہماری کیا مدد کر سکتی ہو؟“
 علی ریحان کے منہ سے ”بہن“ کا لفظ سن کر اریہ ایک

طرح اچانک جھپٹ پڑنے پر اریہ کے حسین چہرے پر کسی
 قسم کے خوف کی پرچھائیں تک کے آثار ابھرتے نظر آئے
 تھے۔ وہ مرتا بخود بہرہ کی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔
 ”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہاری باتوں میں آ جاؤں
 گا۔۔۔۔۔ سچ بتاؤ۔ کون ہو تم اور ہمارے ساتھ کیا چکر چلا
 رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ شاہ زمان نے شیرجیسی غراہٹ سے کہا۔
 ”تمہارے پیچھے اور کون کون لوگ ہیں؟“

دوسرا شاہ زمان کے لیے حیرت کا سبب بننا جب اس
 کے جواب میں اریہ نے ایک مٹھتی ہنسی اپنے خلق سے خارج
 کی تھی۔ اس ہنسی میں لاچارگی اور ناپوسی کا عنصر غالب تھا۔ اس
 نے زمان کی آہنی گرفت سے خود کو چمڑانے کے لیے ذرا بھی
 حرکت نہ کی تھی، انداز خود بہرہ کی جوں کا توں پر رقرار رہا تھا۔
 بلکہ اریہ زمان کے تقریباً ساتھ ہی لگ چکی تھی۔ شاہ زمان کو
 اس کے بھرے بھرے بدن کی گدازیت صاف محسوس
 ہو رہی تھی۔

”میرے سوال کا جواب دو۔۔۔۔۔ تم نے شکل کا قاتل کس
 مقصد کے لیے کیا؟ وہ ہمارا قاتل بھر دیا ہے۔“
 ”قاتل بھر دیا۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔ جواب میں اریہ نے
 زہرے لٹے طعنے کہا۔ ”جس کو تم قاتل بھر دیا کہہ رہے ہو وہ تم
 دونوں کی موت کا سامان کرنے والا تھا۔ حیرت ہے۔۔۔۔۔ تم
 جیسے لوگ بھی یہ نہیں جان سکتے کہ دولت کے لالچ میں تجری
 کرنے والا تمہارے ساتھ کس قدر سچا ہو سکتا ہے؟“ اس کی
 بات نے شاہ زمان کو واقعی لا جواب سا کر دیا۔ تاہم بولا۔
 ”اسی دولت کے لالچ میں تم بھی تو ہمیں مہاراجا کے
 سپاہیوں کے حوالے کر سکتی ہو۔“

”اگر ایسا ہوتا تو اب تک تم دونوں کی لاشیں بیچ
 چوراہے پر بھجوتی ہوئی نظر آ رہی ہوتیں۔۔۔۔۔ کیونکہ جس وقت تم
 دونوں نے خبردار بے سدھ سو رہے تھے، مہاراجا کے سپاہی اور
 فرنگی فوجی گھر گھر کی تلاشی لیتے ہوئے یہاں تک بھی آن پہنچے
 تھے۔ لیکن میں نے بڑی صفائی سے تمہیں چھپایا تھا۔“
 ”کیا ثبوت ہے اس بات کا۔۔۔۔۔؟“

”وہ سامنے دیکھو، کھڑکی کے پار۔۔۔۔۔ چمکتی دھوپ
 دیکھو۔۔۔۔۔ سورج نکلا ہوا ہے، کوئی دم کوسہ پہر ہونے والی
 ہے۔۔۔۔۔ اور تم دونوں صبح سوئے تھے۔ جبکہ میں نہیں بھی معلوم
 ہے کہ سویرا ہونے سے پہلے ہی تم لوگوں کی ڈھنڈ پانچا ہوا تک
 پڑ چکی تھی۔“ اریہ کی اس دوسری دلیل نے بھی شاہ زمان
 کو لا جواب کر دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں
 بڑی سرعت کے ساتھ ایک خیال چکا۔

چالاک نوکر

مالک نے سزا کے طور پر نوکر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ساری رات گھوڑے کی مالش کرے۔ نوکر نے گھوڑا فروخت کر دیا اور اس کی جگہ ایک خرگوش باندھ دیا۔ صبح مالک آیا تو گھوڑا غائب تھا۔ مالک نے غصے سے پوچھا۔ ”گھوڑا کہاں ہے؟“ نوکر نے خرگوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ بندھا ہوا ہے۔ دراصل میں ساری رات گھوڑے کی مالش کرتا رہا۔ اب یہ مہس مہس کر اتنا ہی رہ گیا ہے۔“ مالک اس سے بھی کایاں تھا بولا۔ ”چلو۔ چھوڑ دو جو ہوا سو ہوا۔ آج پوری رات تم میری کارکی مالش کرو گے۔“

کاش

ایڈیٹر، افسانہ نگار سے۔ ”آپ بہت خوبصورت کہانیاں لکھتے ہیں۔“ افسانہ نگار۔ ”کاش ای قسم کا کوئی تحریفی جملہ میں بھی آپ کے بارے میں کہہ سکتا۔“ ایڈیٹر۔ ”ضرور کہہ سکتے ہیں بشرطیکہ آپ بھی میری طرح جھوٹ بولنے کے عادی ہوں۔“

عملی مظاہرہ

ٹائپسٹ کی ملازمت کے لیے امیدوار کا انتخاب ہو رہا تھا۔ ایک امیدوار سے انٹرویو کرنے والے نے پوچھا۔ ”آپ ٹائپنگ کے علاوہ اور کیا کام جانتے ہیں؟“ امیدوار نے۔ ”مذاق کرنا۔“ انٹرویو کرنے والے نے پوچھا۔ ”کیا آپ اس کا عملی مظاہرہ کرنا پسند کریں گے؟“ امیدوار نے۔ ”کیوں نہیں؟“ امیدوار نے کہا اور دفتر سے باہر آ کر لائن لگا کر چٹخنے لگا۔ دیگر امیدواروں سے کہا۔ ”آپ سب حضرات جاسکتے ہیں کیونکہ میرا انتخاب کر لیا گیا ہے۔“ مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

انہیں سارے جھوپڑے خالی ملے تھے۔ اندر سامان بکھرا پڑا تھا۔ ایک عجیب اور پراسراری ویرانی بکھری ہوئی تھی چاروسو.....! ”کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ راتوں میں کام سے نکلتے ہوں.....“ گارشیا نے خیال ظاہر کیا تو رابرٹ بولا۔ ”ڈیم!.....! کیا فصول کو اس ہے سسر! کیا تم نے ٹور نہیں کیا؟ ان جھوپڑوں اور اس ہستی کی حالت زار بتا رہے کہ یہاں اب کوئی نہیں رہتا۔“ گارشیا نے بھائی کی بات پر منہ سبالتا اور اسی لمحے میں بولی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے ان کے جھوپڑوں میں ان کے کھنڈ پتھر ہو گا، دیکھو ہوں؟“ باہر گاڑیاں پارک ہوں گی اور اندر ریشم و کم خواب کے بستر لگے ہوں گے؟“

گارشیا کی بات پر سب ہنس دیے تھے۔ ”یہ تو بالی لوگ ہی طرح رہتے ہیں۔ جیسے یہاں ہل ہر کے مہمان ہوں۔“ ”تم نے ٹھیک کہا بیٹو ڈارلنگ! لیکن یہاں آثار کچھ ایسا بتا رہے ہیں کہ یہ لوگ ہستی چھوڑ کر جا چکے ہیں۔“ پروفیسر ہنری بولے۔

”کیا ہم راکاشی قبیلے میں موجود ہیں پاپا؟“ رینا نے باپ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ”ہاں! میرا خیال ہے ہم اپنی پہلی منزل پر کھڑے ہیں..... یہاں ہمیں ایک آدھ دن خیمہ زن ہونا پڑے گا۔“ ہنری بولا۔ ”ناگرہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ سامنے والی پہاڑی کے پیچھے ناگرہ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ دوسری منزل ہماری وہیں ہوگی جدھر ہم کچھ دن آرام سے قیام کریں گے اور سفر کی ٹکان اتاریں گے۔ اس کے بعد اگلی منزل کی طرف روانگی ممکن ہوگی جبکہ یہاں میں اپنا تحقیقی کام آج ہی سے شروع کر دیتا ہوں۔ کچھ کھانا لیا جائے، اس کے بعد ہستی کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔“

خیمے گاڑے جانے لگے۔ شوکی سمیت سارے ملازم بڑی تندہی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اس ویران ہستی کے وسط میں انہوں نے رہائش اختیار کر لی تھی۔ زادراہ جو بھی تھا، وہ آج رات کا ہی تھا۔ تھوڑا بہت تک صبح کام آجاتا۔ الاؤ روشن کردیا گیا تھا کیونکہ اسی دوران سورج چٹائی افق پر سرخیاں پھیلاتا ہوا دوسری جانب لڑھک چکا تھا۔ اب در سنگلاخ افق پر سناٹے دار تارکیاں اترنے لگی تھیں۔ فضا دکی رکی محسوس ہوتی تھی۔ ٹھنڈ بڑھنے لگی تھی۔ اوپر کھلے آسمان پر تارے چمکنے لگے۔ تھے اور چاندور

بھتر پر بیٹھی تھی۔

تھوڑی دیر ستانے کے بعد یہ لوگ پھر روانہ ہو گئے۔ سہ پہر تک یہ لوگ ایک چٹائی دڑے سے گزر کر پیالہ نما وادی میں پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر ہو چکی تھی۔ سورج کوہ شمالیہ کی مغربی چوٹیوں کی طرف جھٹکتے لگا تھا۔ وہاں انہیں ترائیوں میں ایک آبادی کے آثار نظر آئے، بے ترتیب قطاروں میں بے کھمریل کی خردلی چتوں والے جھوپڑے کچھ دیگر اشیا کے بکھراؤ کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب لوگ رک کر کھینچ دیکھنے لگے۔ پروفیسر ہنری کے چہرے پر پہلے تو چند تانے جوش کے تاثرات اٹھتے دکھائی دیے تھے اس کے بعد وہ کسی ابھمن میں مبتلا نظر آنے لگے۔ رینا نے پوچھا۔

”پاپا! ہم شاید اپنی منزل تک پہنچ چکے ہیں۔“ ”نہیں مائی بی بی! آج ادب لوگ..... لیکن ذرا دھیان سے اترنا۔“ پروفیسر ہنری نے کہا اور یہ سب لوگ پروفیسر ہنری کی ہدایت کے مطابق ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ایک چین کی صورت ڈھلان طے کرنے لگے اور بالآخر آبادی میں داخل ہو گئے۔

وہ لوگ ایک جگہ رک گئے۔ سب نے اپنا اپنا مختصر سامان پشت سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور حیرت و عجیب نظروں سے سامنے کھمریل کی خردلی چتوں والے جھوپڑوں کی طرف دیکھنے لگے۔ پروفیسر ہنری کی آنکھوں میں ابھمن نمایاں تھی۔ ”انکل! یہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا.....؟“ گارشیا نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”ہوسکتا ہے یہ لوگ سو رہے ہوں۔“ رابرٹ نے کہا۔ ”قبائلی لوگ سرشام ہی سو جاتا کرتے ہیں۔“ ”گڈ، بڈی! تم نے بالکل ٹھیک کہا۔“ پروفیسر ہنری مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”لیکن ہمیں آگے بڑھ کر دیکھنا پڑے گا۔ قدم بڑھاؤ میرے ساتھ..... اور سامان ادھر ہی رہنے دو۔“

یہ لوگ اور آگے بڑھے۔ ہر کوئی ایک جھوپڑے کی طرف بڑھا مگر حقیقت یہی تھی جو تقریباً سب نے ہی محسوس کی تھی کہ یہاں آبادی کے آثار تو نظر آتے تھے لیکن انسانوں کا دور درون تک پتا نہ تھا۔ ”یہ تو کوئی ویران ہستی ہے۔ کوئی ڈی فنس تک موجود نہیں۔ نہ انسان نہ کوئی جانور.....“ رابرٹ حیرت سے بولا تھا۔

سفر ہونا چاہیے تھا۔

یہ ظاہر رابرٹ کی بات سب کو مقبول لگی تھی۔ اس میں شوکی بھی شامل تھا مگر وہ کچھ بولنا نہیں تھا البتہ اس کی تائید میں گارشیا اور رینا پیش پیش تھیں۔

”ہاں! یہ خیال میرے دل میں بھی آیا تھا۔“ پروفیسر ہنری نے رک کر ان کی طرف گھومتے ہوئے کہا۔ ”لیکن..... میں بتا چکا ہوں کہ نقشوں کا جائزہ لینے کے دوران مجھے ایک قریبی قبیلہ راکاشی کا انکشاف ہوا۔ یہ بے حد عجیب و غریب قبیلہ ہے۔ اس کے رہن بہن کو قریب سے دیکھنے کا موقع بہت کم ہم جوڑوں کو ملا ہے۔ میرے ایک غائر جائزے کے مطابق ہم اس قبیلہ کا ”ڈزٹ“ کرنے والے دوسرے یا تیسرے ہم جوڑوں گے۔“

”ان کے رہن بہن میں ایسا کیا ہے پاپا تھوڑی تفصیل بتائیں گے ان کے بارے میں.....؟“ رینا نے پروفیسر ہنری کی طرف دیکھا۔ اس کی بلوریں سی نیلی آنکھوں میں تجسس ہو رہا تھا۔

”ج پوچھو تو مجھے اسی قبیلے کی تلاش تھی۔“ پروفیسر ہنری گویا اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید بولے۔ شوکی نے دیکھا وہ غصے سے جوش نظر آ رہا ہے۔

”میں اس قبیلے کے نام سے تو واقف نہ تھا تاہم میری ریسرچ کے مطابق انہی پراسرار اوصاف کا حامل ایک قبیلہ یہاں کوہ شمالیہ کے اطراف میں مذکورہ تینوں ریاستوں کے چودہ کے شمال مشرق میں موجود ہے۔ اب خدا کرے کہ یہی وہ قبیلہ ہو جس کا نام مجھے راکاشی معلوم ہوا ہے۔“

”پراسرار قبیلے سے آپ کی کیا مراد ہے انکل ہنری؟“ گارشیا نے سوال کیا۔ وہ اپنی پشت سے موٹی سی ایڈوچر کٹ اتار کر اسی پر تک کر بیٹھ گئی تھی۔

پروفیسر ہنری نے پاپ کا کاش لگایا اور بولے۔ ”پراسراریت مشرق کا حسن ہے۔ اسے کسی اور معنی میں نہ لیا جائے۔“

”کیا اس قبیلے تک کاراستہ ہمیں معلوم ہے اور یہ کتنی دور ہے؟“ گارشیا نے سوال کیا۔

”چند سو کئی کی مسافت مزید طے کرنے کے بعد ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔“ پروفیسر ہنری بولے۔ ”ناگرہ جانے سے ہمارا بہت سادقت برباد ہو جاتا۔ اگرچہ ہمارا تیس ٹیمپ ناگرہ ہی ہے۔ راکاشی کے بعد ہی ہم ناگرہ کا رخ کریں گے۔“ شوکی کو اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بار بار کن آنکھوں سے رینا کو دیکھتا جاتا جو رابرٹ کے قریب ایک پہاڑی

دلوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”تم سے مطلب؟“ رابرٹ نے اسے گھورتے ہوئے
 کہا تو شوکی نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ریٹا سے مخاطب
 ہو کر کہا۔

”مس ریتا! آپ کے پاپائے یہاں سے دور کہیں جانے کے لیے سختی سے منع کر رکھا ہے۔“ اس کے لہجے میں مہربانانہ سی تنبیہ تھی۔ وہ ان کے سامنے اپنے دونوں پاؤں گھیلانے پورے قدم سے مڑا تھا۔

”مگر کون ہوتے ہو؟ ہمیں نہیں آنے جانے سے روکنے والے۔۔۔“ ڈا رہٹ پھٹکا اور تیرانے راہرٹ کو ٹوک دیا۔
”ڈا رہٹ! جلیز ختم خاموش رہو۔۔۔“ پھر وہ شوکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہم زیادہ دیر نہیں جا سکتے۔ وہ دیکھ رہے ہیں۔“ اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کی سمت انگلی سے اشارہ کیا۔ ”وہ جگہ بڑی دلچسپ جگہ ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ جگہ بڑی دلچسپ جگہ ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ جگہ بڑی دلچسپ جگہ ہے۔“ اس نے کہا۔

ریتا کے کہنے کے انداز نے شو کی کوڑھاسا دیا۔ ابھی وہ کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ گارشا اندر سے نمودار ہوئی تو تینا حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”ارے! ہم جاگ رہی ہو؟ ہم تو سبچے تھے تم سوئی ہو۔“

تھے معلوم تھا کہ کم دلوں میرے سونے کا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس لیے سوئی بن گئی تھی، وہ شرارت سرے لہجہ میں بولی تو ریتانے بھی اس سے سمجھنی چھینی تھی ساتھ ساتھ کہا۔

”میں ایسا رولر سٹوکی کے ساتھ دل بہلاؤ.....“
”یہ ٹھیک رہے گا..... اب تم جا سکتے ہو.....“ گارشا
نے جیسے انہیں اجازت دی۔
”سوری! میں کوئی کہنی نہیں دے سکتا۔ میں خود
نے کے لیے جا رہا ہوں۔“ شوکی نے فوراً گہری سانس
لی۔ ”لیکن..... پلیز، بس رینا! آپ دونوں زیادہ دور
ت جائے گا اور جلد اپنے خیمے کا رخ کیجیے گا۔“ یہ کہتے
ئے شوکی گارشا کی طرف دیکھے بغیر واپس اپنے خیمے کی
طرف ہٹ گیا۔
وہ اپنے سلپینک بیگ میں سونے کے بجائے اس کے

الادسرو پڑچکا تھا۔ اس کے اطراف میں کھیریل کی
خز دہلی چھتوں والی مجموعیاں بھیلی ہوئی تھیں، جس سے
آسیب سائیک رہا تھا۔ ہر طرف ہوکا عالم تھا کہ سناٹا بھی
چنچا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ خیموں کی قتی ہوئی چادریں تاریک
پڑ چکی تھیں۔ کسی کے خیمے میں اس طرح تانکا بھاگتی کرنا اگرچہ
اسے معیوب لگا تھا مگر اس کے دل میں کوئی چور نہ تھا۔ اس نے
سب سے پہلے پروفیور ہنری کے خیمے کے اندر جھانکا۔ وہ اپنے
سلپینک بیگ میں مڑے سے لپٹے پڑے سورہے
تھے۔ وہاں رینا نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے باپ کے خیمے میں سوتی
تھی۔ اسے حیرت و تشویش ہوئی۔

یہ دیکھنے کے لیے دوسرے خیمے کی طرف آیا۔ انجمنہا کا تو چونک گیا۔ وہاں صرف گارڈیائیسی ہوئی تھی۔ وہ پلٹا اور تیز تیز

کہیں جھکا ہوا تھا گمراہ کی صفو خاںوں کے آثار دھیرے دھیرے نمودار ہونے لگے تھے۔ موسم کی مناسبت سے انہوں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان میں موٹی شالیں اور جیکٹوں کے علاوہ اونٹنی ٹوپیاں بھی تھیں۔ رینا، گارشا اور

رابرٹ نے گرم جرسیاں پہن لی تھیں۔ سلپٹنگ بیگ تیار کر لے گئے تھے۔ تندو بابا اور شتا اپنے باورچیوں کے فرائض میں مشغول ہو چکے تھے اور ڈوڈا رید بعد لکھ چکے تھے۔ کھانے کا دودھ والا تھا۔ خوراک کے خشک ڈبے، دودھ اور شکر گھسے ہوئے پھونٹے پھاڑی جانوروں کا گوشت

باقی بچا ہوا تھا۔ اسے ہی آگ پر بھونکا جا رہا تھا۔ مٹر اُلو اور چاول بنائے گئے تھے۔

کھانے سے یہ لوگ فارغ ہوئے تو پردیس ہنری کے پاس جا پہنچے۔ شوکی اور امجد بھی ساتھ تھے۔ جبکہ مندو بابا اور شامنا الاؤ پر اب کافی بنانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ لوگ

سب الاؤ کے کردا بیٹھے۔ چہرہ سوہو کا عالم تھا۔ ویرانہ کی خالی
 پین کا عجیب اور پراسرار منظر پیش کر رہی تھی۔ ہر دوڑ کا گھٹنا
 جنگل پہاڑی کے پیچھے چھپا تھا اور وہاں سے اب کسی جانور
 شولی اس کی بات پر ہنسا اور بولا۔
 ”ہمارے پاس ہتھیار ہیں۔ کوئی غفریت آتا تو ہم
 اسے گولی مار دیں گے۔“

غیر کے بولنے کی آواز اس آناظر کے ساتھ ہوجاتی تھی۔
 ذرا دیر میں نندو اور شانتانے الاؤ کے گرد بیٹھے افراد
 کے ہاتھوں میں کافی کے گم تھادیے۔ گرامر م دھواں اڑانی
 کافی کے گم تھاتے ہی انہیں ایک عجیب سی خوشگواریت

کا احساس ہوا۔ اب آپس میں باتیں کرتے ہوئے، مزے لے لے کر اس کی چپکیاں بھرنے لگے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد ہر کسی نے اپنے خیموں کا رخ کیا۔ شوکی کی نظریں ریٹا اور داربٹ پر لگی ہوئی تھیں۔

تکلیفیں۔ وہاں سے ریٹنا گارڈیا اور رابرٹ کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ امجد تو اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا جبکہ شوکی وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا دل جانے کیوں نامعلوم سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ پروفیسر ہنری کے خیمے کی جتنی بھی سمجھ تھی مگر سردی بڑھنے لگی تو شوکی بھی اپنے خیمے کی طرف سونے کی غرض سے اٹھا مگر دوسرے ہی لمحے اچانک ٹھنک کر رکا۔ اس نے دیکھا خیمے سے رابرٹ اور ریٹنا ہنسنے ہوئے نمودار ہوئے تھے۔ وہ دونوں خالی اور ویران جھوپڑوں سے آگے تار کی میں کہیں جا رہے تھے۔ شوکی نے انہیں آواز دی۔ وہ دونوں رک گئے۔

سو گئے تھے۔ دونوں فوجی بھی جھکے ہوئے تھے اور لپٹتے ہی نیندر کی وادیوں میں چلے گئے تھے۔ ریانا، گارٹیا اور رابرٹ اپنے خیمے میں گھسے بیٹھے باتوں میں معروف تھے جبکہ ڈرائیور شوکی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ رابرٹ اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟“ اس نے ان

ہنوز اس طرف سے نامعلوم سی بے چینی کا شکار تھا۔ حالانکہ اب تک اریہ نے ان دونوں کے ساتھ ایسی کوئی مشکوک حرکت نہیں کی تھی جو کسی قسم کے شہ کے دائرے میں آتی۔ علی اس پر مکمل بھروسہ کر چکا تھا لیکن زمان ہنوز اس کی جانب سے اشتباہ انگیزی کا شکار تھا۔

”دیکھو بہن!“ علی نے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم تمہارے اس جذبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن آپ کے حالات جان کر ہمیں بے حد افسوس بھی ہوا ہے۔ اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں مزید کسی ایسے حالات کا شکار بنادیں جو تمہارے لیے ایک بڑی مصیبت کا سبب بن جائے۔“

اریہ نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ زمان بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے اس سے بولا۔

”اور میرا خیال ہے کہ اب شامل کے مرنے کے بعد تم بھی آزاد ہو۔ اس کا کاروبار اور یہ مکان اب تمہاری ملکیت ہی تصور کیا جائے گا۔ تم نے اب تک ہماری جتنی مدد کی اس کا ہم تہ دل سے شکر ہے ادا کرتے ہیں۔ مجھے اور میرے ساتھی کو اب جلد از جلد یہ مکان چھوڑنا ہوگا۔“

”باہر سخت پہرہ ہے گلی گلی میں تم دونوں کو تلاش.....“ اریہ کی بات ادھوری رہی۔ زمان بول پڑا۔

”یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہم خود ہی اسے حل کر لیں گے۔“ ”تم شاید مجھ پر ابھی تک شبہ کیے ہوئے ہو۔“ اریہ نے زمان کی طرف دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا۔ ”جب میں تم لوگوں کی مدد کر سکتی ہوں تو پھر اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارا شکار صرف سینا بتی موجد سنگھ تو ہیں ہوگا نا.....“

علی نے غور کرنے کے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر اپنے ساتھی زمان سے مخاطب ہو کر رائے طلب لہجے میں بولا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اریہ کی بات مان لینی چاہیے۔“ زمان خود انچکا پھٹ میں مبتلا تھا۔ سمجھ تو وہ بھی گیا تھا کہ ان مخدوش حالات میں اریہ کا ساتھ ان کے مشن کو وسیع تر کامیابی سے ہمکنار کر سکتا تھا۔ مگر وہ ابھی تک اس کی جانب سے تشکیک میں مبتلا تھا۔

”میرا خیال ہے تمہارا ساتھی مجھ پر ابھی تک بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔“ اریہ نے زمان کی طرف دیکھتے ہوئے علی ریحان سے کہا تو علی مسکرا کر بولا۔

”نہیں بہن! ایسی بات نہیں، دراصل ہماری تربیت کا سب سے پہلا اصول یہی ہے کہ اپنے سوا کسی پر بھروسہ

نہیں کیجیے۔“ اندازہ ہو چکا ہوگا کہ بچے گلی میں کتنا سخت مارا ہے۔ مگر تلاش لینے کے باوجود بھی کسی نہ کسی آتے ہاتھ ہوتے تھے۔ اسے اچانک تلاش کے ساتھ پوچھ پگچھ شروع کر دی جاتی ہے۔ ”وہ کی تو زمان اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمائے ہوئے بولا۔

”تم کہاں کی عین؟“ ”یہ معلوم کرنے کے اب تمہارے سلسلے میں تلاش کا اگلا مرحلہ کیا اختیار کیا جائے والا ہے۔“

”کیا پتا چلا پھر؟“ ”علی نے پوچھا۔

”ابھی ٹھوڑی دیر میں ریاست کا سینا بتی موجد سنگھ..... اپنے خاص سپاہیوں کی معیت میں خود بھی نکلنے والا ہے اور کسی بھی مشکوک نظر آنے والے گھر کی تلاش لینے کے لیے بے ہوش داخل ہو جائے گا۔“

”آئی چیکنگ۔“ زمان کے منہ سے نکلا۔

”ہاں!“ اریہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مرکوا بتی پیش دی۔

”بس! ایسی ایک بڑا خطرہ ابھی سر پر مسلط ہے۔“ اریہ اور زمان نے دیکھا۔ علی ریحان کے چہرے پر ایسا ایسی عجیب سی کھیر تھاری ہو گئی تھی۔

”کیا سوچتے تھے گلی.....؟“ زمان نے اس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمارا مشن خود ہی چل کر اس طرف آ رہا ہے۔“ وہ جیسے کوکھ سے لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب؟“ زمان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”موجد سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار دینا بھی ہمارے اس اہم مشن کا ایک حصہ ہے۔“

اس کی بات پر زمان نے ایک نظر سامنے بیٹھی اریہ کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔

”اس طرح اریہ کی جان بھی خطرے میں پر دست ہے۔ یہ مشن کی نظروں میں زبردست مشکوک کہلائے گی۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔“ اریہ نے فوراً کہا۔ ”تمہیں اپنے مشن کے لیے جیسی آسانی ممکن محسوس ہو وہ کر ڈالو، میری فکر مت کرو۔“ فرنگیوں کی اس جنگ میں مجھے بھی تم دونوں اپنے ساتھ شامل سمجھو۔ ان فرنگی غاصبوں کی وجہ سے

ہی تو ہمارا گاؤں تباہ و برباد ہوا اور خود میں سے خاندان ہو کر اس حال کو پہنچی ہوں۔“ یہ بتاتے ہوئے اس کا لہجہ مغموم سا ہو گیا۔

زمان یہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ

زمان کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ ”تمہیں ابھی تک اریہ پر شبہ ہے۔“

”ہاں!“ زمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اتنی جلدی کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“

”لیکن..... میرا خیال ہے کہ اریہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔“ علی نے کہا تو زمان اس کی بات پر چونکا۔

”یہ تم نے بھلا کی طرح اندازہ لگایا؟“ زمان کی آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔

”جب میں نے اندازہ لگایا ہے تو کیا تم نے نہیں لگایا ہوگا دوست!“ ”علی مسکرایا تو زمان بے اختیار چھینپ سا گیا۔ بولا۔

”باوجود اس کے میں اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ چلو اب باتیں چھوڑو اور ڈیوٹی سنبھالو۔ ہم سب اس وقت خطرے میں ہیں۔“

دونوں باری باری چند منوں کے لیے درہنچے کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ ہندو قیس ان کے ہاتھوں میں بھی ہوئی تھیں۔ اس وقت زمان کھڑکی پر کھڑا تھا۔

وہ نیچے گلی میں دیکھ کر چونکا اور علی کو آواز دی۔ وہ فوراً بڑھا۔ اریہ نیچے کھڑی تھی۔ کچھ اریہ قریب کے لوگ باگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ ان میں عورتیں اور مرد بھی تھے۔ ان کا حلق

قریبی گھروں سے تھا۔ وہ سب اریہ کے ساتھ مکان میں داخل ہو رہے تھے۔

شاید..... شامل کی جھیز و تکلیف کی جانے والی تھی۔ نیچے شور مچنے لگا۔ دونوں اوپر ہی دیکھے بیٹھے رہے۔ ٹھوڑی دیر بعد کسی بہانے سے اریہ اوپر آئی اور ان سے سرگوشی میں بولی۔

”تم لوگ ابھی اوپر ہی رہو اور کسی قسم کی کوئی آواز مت نکالنا۔ نیچے سب کو معلوم ہے کہ اب اس مکان میں میرے سوا

اور کوئی نہیں رہا۔ شامل کے کٹھن دفن کے بعد ہی ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے۔“

اریہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔ اگلے ایک دو گھنٹوں بعد سارا معاملہ منٹ گیا۔ شامل کی میت دفنانے کے لیے لے جاتی گئی اور اب مکان میں صرف عورتیں رہ گئیں۔ ٹھوڑی دیر بعد وہ بھی ایک ایک کر کے اریہ کو تسلیاں دیتی ہوئی اپنے اپنے گھروں کو چل دیں۔

اب مکان میں ان تینوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اریہ اوپر آ گئی۔

”میں باہر کی صورت حال کی خبر لے آئی ہوں.....“ اس نے کہنا شروع کیا۔ علی اور زمان بڑے غور سے اس کی

قدموں سے اس طرف کو چلا جا رہا تھا۔ اشارہ کرتے ہوئے اس طرف جانے کی اس سے اجازت لی تھی۔ وہ وہاں پہنچا تو مزید پریشان اور فکر مند ہو گیا۔ وہ دونوں وہاں بھی نہیں تھے۔ چانک اسے اپنے دائیں جانب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ تیزی سے گھوما..... گارڈیا کے خیمے سے اس نے کسی کا سایہ لپکتے دیکھا..... اس سائے کی ساخت عجیب وضع کی محسوس ہوئی تھی۔ جیسے کوئی کبڑا انسان دو ٹانگوں کے بجائے ہاتھوں بیروں کی مدد سے چل رہا ہو..... عجیب انسان نما حیوانی سایہ تھا وہ..... شوکی ٹھنکا اور اسی جانب بڑھا مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے یہ سب اپنا وہم سمجھنے کی کوشش کی مگر جھٹکا نہ سکا لیکن ایسے ہی ایک دوسرے عجیب انسان نما حیوان کا سایہ وہ ابھی نہیں دیکھ سکا تھا جو ایک اور قریبی چٹانی اوٹ میں دیکھا ہوا اس کی جانب گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گول سی تھیں۔ اس کے عقب سے ایسے ہی عجیب وضع کے دو تین اور سائے نمودار ہوئے اور تیزی کے ساتھ کراٹنگ کرتے ہوئے پروفیسر ہنری اور گارڈیا کے خیموں کی طرف لپکے اور ان کی آڑ میں چھپ کر دیک گئے۔

”کدھر چلے گئے یہ دونوں؟“ ادھر شوکی نے ریٹا اور رابرٹ کے متعلق خود سے سوال کیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک بچہ ابھری.....

☆☆☆

مکان کی اوپری منزل کے ایک چھوٹے سے چورائے سے انہوں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ گلی میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں کچھ شاہی سطح پہاڑوں کے علاوہ سرخ درودی پوش فرنگی بھی چوک انداز میں گشت کرتے نظر آئے۔ یہی نہیں وہ لوگ کسی بھی آنے جانے والے پر اچانک شبہ کرتے ہوئے اس سے کھڑے کھڑے پوچھ پگچھ شروع کر دیتے تھے اور جامہ تلاش بھی لے ڈالتے۔

”پہرا واقعی سخت ہے دوست!“ شاہ زمان نے علی ریحان کے کان میں سرگوشی کی۔ ”ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”ہوں.....“

علی نے ہکاری بھری۔ یہ خطرہ محسوس کرتے ہی دونوں اندر کمرے میں آ گئے۔

”جب تک اریہ وہاں نہیں لوٹ آتی..... ہمیں کسی ایک کھڑکی پر بٹھائے رہتے ہوئے نیچے دروازے پر مستقل نظر رکھنا ہوگی۔“ زمان نے کہا۔

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں دوست!“ علی نے

سنگرزشت کراچی

مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیک بک اسٹال پر اپنا شمارہ محض کرا لیں

نہ کرو۔“ اور اگر کسی مددگار کا ساتھ منبر آ رہا ہو تو.....؟“ اریہ نے اس بار براہِ راست زبان کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ جس پر زمان کچھ گڑبڑا سا گیا مگر دوسرے ہی لمحے پورے اعتماد سے بولا۔

”اس کی وفاداری جانچنے کے لیے بد قسمتی سے ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا..... جتنا کہ گزرتے ہوئے وقت اور حالات سے پتا چل سکے۔“

”جانچنے والے تو غضب کی نگاہ رکھتے ہیں۔ کیا تمہیں اب بھی مجھے پرہیز و سنا نہ ہو سکا، جبکہ میں نے تم لوگوں کی خاطر شامل کوئل کیا.....“

”اس میں تمہارا بھی فائدہ تھا.....“

”اگر صرف میرے فائدے کی بات ہوتی تو میں کب کا اسے ختم کر چکی ہوتی۔“ زمان کے محتاط رویے سے اریہ کا لہجہ تلخ ہوتا جا رہا تھا۔

”تم موفقیے کی منتظر تھیں۔“ زمان بھی اس کی بردہیل رد کرنے کے درپے تھا۔

”چلو، یہی سچی..... اگر یہ بات ہے تو..... میرا کام ختم ہوا..... تم لوگ یہاں سے جاسکتے ہو.....“

”ہم تمہیں ختم کر کے ہی اب اس مکان سے نکلیں گے۔“ اچانک زمان کا لہجہ بدل گیا۔ ”تم ہمیں پھنسا سکتی ہو.....“ زمان کہے جا رہا تھا۔ اس کی اور اریہ کی بحث تھی سے

اب ایک ایسا دھنسی پر اترا آئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب اریہ نے بیہوشی ایک عجیب حرکت کر ڈالی۔ وہ زمان کے بالکل قریب آ گئی۔ اتنی کہ اس کی گرم گرم سانسوں کا تھوج زمان کو اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگا۔ اس کے بدن کی رعنائی کی

قربت اور اس سے پھوٹی قدرتی خوشبو اسے مسحور کئے دے رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ جہاں کا تھاں یک تک اسے دیکھتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ اریہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو دبوچ لیا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھوں کی گرفت بھی زمان کو ایسی غیر مرنی ہی محسوس ہوئی تھی کہ وہ خود اس سے چھڑانے کی کھنکوش ہی کرتا رہ گیا۔ اریہ نے اس کے دونوں ہاتھ

اپنی مصراہی دار گردن کے گرد کس ڈالے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”لو..... میرا گلا دبا کر ابھی ختم کر دو مجھے..... شاید جب ہی تمہیں اعتبار آئے گا مجھ پر.....“ زمان نے اس کی اپنے سامنے کھلی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں اسے دکھائی گئی کی چمک سی نظر آئی۔ اس کے تراشیدہ لب لباب دوراں کے یوجھ

تے تھر تھرا رہے تھے۔ سایہ داری گھنیری پلکیں اس کی کجاری سیاہ آنکھوں کو ایک بل کے لیے ڈھانچیں تو جیسے بھادوں میں برے ہوئے بھیکے بھیکے جنگل کا سامنا کرنا کرنے لگیں۔ انکھوں کی غناک سخت میں پلکیں چمکنے لگی تھیں اس کی۔

علی ربیان خاموش تھا، زمان مٹک..... اریہ بیچے ہٹ گئی اور اٹھ کر دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ زمان اور علی کی آنکھیں ملین تو علی نے اسے ایک مخصوص اشارہ کیا جسے سمجھ کر زمان اپنی جگہ سے اٹھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اریہ کی طرف بڑھا۔ وہ ہنوز کمرے کی دیوار سے لگی کھڑی، سر جھکائے سکے جا رہی تھی۔ تب ہی زمان نے بہت دھیرے سچ کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ اس کے کان دھیرے پر دھرا تو اریہ نے جیسے تڑپ کر اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا خوبصورت و حسین مگر اٹھارہ چہرہ حسن عملکار کا عجیب سا تاثر دیتا دکھائی دیا۔ ایسے میں پہلی بار زمان کا بھی دل اس دکھاری اور الم نصیب حسینہ پر رقت زدہ ہو گیا۔

”مجھے افسوس ہے..... میں نے آپ پر شک کر کے آپ کا دل دکھایا.....“ زمان نے ہولے سے کہا۔ اس کے لہجے میں ملاعت آمیز نرمی عود آئی تھی۔ ”درحقیقت..... ہم ایسے کا زکے سپاہی ہیں جو اپنے سائے پر بھی کم ہی بھروسہ کرتے ہیں اور یہ ہماری مجبوری تھی ہے۔ آؤ بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔“

زمان اسے محبت سے تھامے واپس اس کی جگہ پر لے آیا۔ اریہ نے خود کو اس کے سپرد کر دیا تھا۔ زمان کے اس طرح سہارنے پر اسے بھی اب اپنے دل کا بوجھ کم محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ تینوں ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ اریہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

”جب تک اریہ بہن کے مکان میں ہماری خفیہ رہائش قائم ہے، ہم اپنے مشن کو کامیابی کی طرف لے جاسکتے ہیں۔“ علی نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”ہاں! میرا بھی اب یہی خیال ہے..... اریہ کو زحمت تو ہوگی مگر.....“ زمان اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے رکا تو اریہ نے فوراً اس کی طرف گہری نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

زمان کو اس کی جمیل سی گہری آنکھوں میں عجیب سی گیرائی اور بھیدوں بھرے تاثر کا شائبہ ابھرتا محسوس ہوا تھا۔ ایسا چند بل کے لیے ہوا تھا اس کے بعد اریہ بولی۔

نہیں پس پرشہ ہوگا ایسے مکر کی تلاشی لی جائے گی لیکن پریشان
 ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم ادھر ہی ٹھہرے رہو۔“
 (ماں کواریہ کی یہ بات بالکل بچکانہ لگی جس کا اس نے
 اظہار بھی کر ڈالا۔ بولا۔
 ”یہ انتہا پر ہے۔ کی بے وقوفی ہوگی کہ ہم اس خوش فہمی
 کی وجہ سے“

گھر سواروں کا یہ دستہ پیادہ فوجیوں کی سنگت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ چند ایک گھروں میں رک کر جس گھر کی طرف موج ٹکھ اشارہ کرتا فوجی حرکت میں آجاتے اور چند ہی منٹوں میں کسی بھی مشکوک گھر کی تلاشی لے ڈالتے۔ پھیل اور گھوسوار دستہ اب ان کے مکان کے سامنے سے گزرنے لگا علی اور زمان کے دل یکبارگی زور سے دھڑکے اور وہ دونوں ایک دم رتے کے پاس سے ہٹ گئے، ہٹ بھی آہستہ کی آہستہ ساتھ ہیڑ دیا تھا۔

ٹھیک اسی وقت اسی مکان کے سامنے لوگ رک گئے۔ موج ٹنگھ نے مکان کی جانب اشارہ کیا۔ زمان اب در پیچ کے پٹ کی باریک جھری سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ پیدل سوار تے میں سے ایک دم دو افراد موج ٹنگھ کے گھوڑے کی طرف بڑھے اور مژدبانہ انداز میں دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

اس کے بعد اریہ نے پیچ جا کر سیاہ لبادہ اوڑھ لیا اور سے پرانی تاثرات قائم کر لیے۔ چوہے کا خاص طور مزہ لیا کہ ظاہر نہ ہو یہاں چوہا جلا ہے۔ اسے سرد کر دیا جائے وغیرہ کے تازہ استعمال کیے ہوئے برتن بھی ایک سمیٹ کر رکھ دیے کیونکہ خوشی والے گھر میں وہ بھی پہلے

”پلو“ اور ”د“ سے پہلے ہی زمانے نے غلی سے کہا۔
نیچے دروازہ بری طرح دھڑ دھڑا جا رہا تھا۔ یہ دونوں
لکڑی کے اسٹور میں آگئے اور تین دوپٹوں سے بھری ہوئی پوریوں
کے پیچھے جا دیے۔ اریہ کی ہدایت کے مطابق انہوں نے
اسٹور کا دروازہ بند کر دیا تھا مگر در سے کنڈی نہیں لگائی
تھی۔ باقی اسٹور میں دانستہ ہی وغیرہ نہیں چلائی تھی۔

ایسا حاور ہر اکی وقت ٹھڑسواروں کا ایک دستہ نمودار
ہوئوں نے دیکھا تلواریں اور بندوقوں سے لیں اس
اوراوں کے دستے میں ریاستی اور چندرہی فوجی بھی شامل
ان میں سب سے آگے دگھوڑے تھے اور ان کے
میں ایک گھوڑے پر کرسی بدن والا شخص مخصوص لباس
انظر آیا۔ اس کے جہرے پر مڑی ڈاڑھی اور موٹھیں
سر پر چنگلیا سا پگ تھا۔ میان سے تلوار جھول رہی
جہرے پر رعب اور دبدبے کے ساتھ ایک کرنٹل بھی

دوئوں گھوڑا رکی میں دم سادھے دیکے بیٹھے
رہے۔ تاہم ان کی دھڑکتی ہوئی سماعتیں چوک تھیں۔ نیچے
کچھ آوازیں آتی رہیں۔ اس کے بعد یکنخت خاموش
چھاگئی۔ دوئوں نے سکون کا سانس لیا کہ شاید خطرہ ٹل چکا
مگر..... دوسرے ہی لمحے یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی
کیونکہ اس کے دولمے بعد ہی ”کھٹ..... کھٹ..... کھٹا.....
کھٹ“ کی آوازیں ابھریں..... یہ ایک سے زائد افراد کے
بھاری جوتوں کی آواز تھی اور وہ لوگ اوپر ہی آ رہے تھے۔ علی

اپنی آمد کو خفیہ رکھنے کی از حد کوشش کی تھی، مگر بد قسمتی سے ہمارا آمد طشت از باہم ہو گئی۔ اس لیے ہم نے مجبوراً ریاست مسینا پتی موج سنگھ کو بھی ہلاک کرنے پر اکتفا کرنے کا سہما۔ علی ہوا۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ اب اریہہ کی مدد سے ہم اصل شکار یعنی اس فرعی آفیسر جان پال کو ہی موت کے گھاٹا اتاریں گے۔ دوسرا شکار رہار انسٹیٹیوٹ سہل ہو گا یعنی منہ سٹک.....“ زمان بولا۔

”ہماری کوشش یہی ہوگی کہ موج سٹیکہ کو بھی اچھوڑیں.....“ علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تاکہ اس طرح مغربی سامراجیوں کے دلوں میں ہی جنیں بلکہ ان سے گٹھ جوڑنے والی دیگر بیرونی ریاستوں کو بھی عبرت حاصل ہو سکے۔“

اب یہ تینوں چند ضروری باتیں کرنے لگے۔
انہیں باتیں کرتے تھوڑی دیر گزری تھی کہ باہر فہرہ
بٹے جانے کی آواز پر تینوں چونک پڑے۔ اس کے ساتھ ہی
پینچ پیس کی بآواز بلند منادی کی جانے لگی۔

”ہوشیار..... خبردار! باخبر رہیں سب..... ریاست مارہ کے سینا پتی موج سنگم..... دشمن جاسوسوں کی تلاش میں نکلے ہیں گھر کے دروازے کھلے رکھے جائیں اور جو جہاں ہو موجود رہے۔ نہ کوئی گھر سے باہر نکلے نہ اندر داخل ہو سوتا نظر آئے۔ یہ دشمن ریاست کی رعایا کے جان کے دشمن ہیں اور ان کا مقصد انتشار پھیلانا اور کاروبار ریاست کو نقصان پہنچانا ہے، اس لیے آپ سب سے بھی تعاون اور مدد کی درخواست کی جاتی ہے جس کا فرض یہاں کے ہر مرد، عورت، بوڑھے اور بچہ پورا کرے۔ اعلانِ حق ہو.....“

ڈھنڈو روٹی کی اس منادی کے بعد وہ تینوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ اس کے بعد ایک کر در بیچ کر جان بڑھے۔ در بیچ کا ایک پٹ ڈاکٹر کا کچھ نیچے کی ٹیڑھ کا ٹکڑا مخصوص دروہوں میں ملیں بہت سے مسلح افراد جو کہ کھڑے دکھائی دیے جوگی میں موجود ہر گھر پر کڑی نگاہ ڈالے ہوئے تھے۔

”میں اپنی ابھی نہیں پہنچا ہے۔“ اریہ نے سرگوشی میں کہا۔
 ”منادی کرا دی ہے، پہنچنے والا ہوگا۔“ علی بولا۔
 ”اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچے۔ ہمیں چھپنے کے
 لیے کسی محفوظ جگہ کی ضرورت پڑے گی۔“ زمان نے
 کہا تو اریہ ایک لمحہ کچھ سوچ کر بولی۔

”ضروری نہیں ہے کہ موج سنگھ ہر گھر کی تلاشی لے

”مجھے بجلا کیسی زحمت ہوگی؟ میں تو خوشی محسوس کروں گی کہ میری بے معرف زندگی کسی نیک مقصد میں کام آئے۔ اپنا منصوبہ بناؤ..... موج سیکھ لکھنے والا ہوگا.....“

”منصوبہ بھی ہے کہ ہم اسے موت کے گھاٹ اتاریں گے۔“ علی رحمان نے کہا اور تائید طلب نظروں سے زمان کی طرف دیکھا جو کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا تھا۔ تاہم ہولا۔

”میرا خیال ہے کہ موجِ ستم سے زیادہ..... اس فزغی
کمانڈر کو ستم کے گھاٹ اتارنا زیادہ سودمند رہے گا کیونکہ
تریپال اور ناگرہ کے خلاف اصل سازش وہی تیار کر کے
لارہا ہے اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ..... دلی میں
قائم..... لینڈنگ جہاز بائیکل شا..... کاتب اور خاص
آدمی بھی ہے۔“

”ہوں.....“ اس کی بات پر علی نے ایک پُرسوجھی ہنکاری خارج کی تھی۔

”اس کے ہمیں دور رس نتائج حاصل ہوں گے۔“
 زمان نے اپنی عملی حکمت عملی کی مراحت جاری رکھتے ہوئے
 مزید کہا۔

”شہر میں قابض فرنگیوں کی ایک بڑی بریگیڈ دو چوکا پہنچے گا اور ان کی بھرپور آزادیوں کو بھی ساتھ لے کر لڑنے کا خواب ایک خوف کی شکل اختیار کرے گا، کیونکہ ان کے اتنے بڑے افرکار و حملے سے ملحق باقیوں کے لیے دہشت کا ہی سبب بنے گا۔“

”طیبر..... اس کے بعد ہمیں مشن کا لگا اور آخری مرحلہ طے کرنا ہوگا“، علی نے مطمئن ہو کر کہا۔ ”ہمیں فوراً تربیال کا رخ کرنا ہوگا اور وہاں کے مسلمان نواب شہزاد خان کو اس سازش سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے..... (غبار) (ہمارا چنچر پکارتا) اور فرنگی سامراج کی اس گمناؤنی سازش کے بارے میں بھی آگاہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنی لطیف ریاستوں کو اعتماد میں لے کر آپس میں جنگ کرنے سے گریز اور رہیں اور مذاکرات کے بہانے کسی فرنگی سامراجی آفیسر کے آنے کی دعوت قبول ہرگز نہ کریں بلکہ ہر ممکن طرح سے ان کا راستہ بھی روکیں۔“

”تم دونوں کا منصوبہ بے داغ اور مربوط ہے۔۔۔“
 اسی نے کہا۔ ”مگر اس کے لیے تم دونوں کو کھنہ راجا چندر گپتا کی
 محل نما حویلی تک رسائی حاصل کرنا ہوگی، نہ صرف یہ بلکہ وہاں
 سے یہ خطرناک مشن مکمل کر کے زندہ بھی لکھنا ہوگا۔۔۔“

”ہاں! اسی کے محل وقوع کا جائزہ لینے کے لیے ہم نے

بادشاہ کی پسند

ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو کوئی میری پسند کا پھل لائے گا، اس کے برابر ہیرے جوہرات انعام دوں گا اور اگر پسند نہ آیا تو وہی پھل لانے والے کو گھٹنا پڑے گا۔ ایک مسلمان ایک ہیر لایا جو بادشاہ کو پسند نہ آیا تو مسلمان نے اسے بد آسانی سے نگل گیا۔ ہندو ایک سیب لایا وہ بھی بادشاہ کو پسند نہ آیا اور بادشاہ نے ہندو کو سیب گھٹنے کا حکم دیا۔ (دراصل شرط یہ تھی کہ پھل کھانا نہیں گھٹنا ہے)۔ ہندو رونے لگا پھر اچانک ہنسنے لگا بادشاہ نے غصے سے پہلے رونے اور بھرہننے کی وجہ پوچھی تو ہندو نے کہا: ”بادشاہ سلامت! میں پہلے رویا اس لیے کہ میں سب نگل نہیں سکتا۔ بعد میں ہنس اس لیے کہ باہر ایک کتہ بیٹھا ہوا ہے جو تریبوز لایا ہے۔“

(مرسلہ: ریاضت۔ حسن ابدال)

کود کچھ لیتا تو یقیناً خوف کے مارے لنگ ہو جاتا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر متحرک رہنے کے بعد یہ کبڑے چوپائے بھدکے ہوئے جمپونڈوں کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی موجودگی سے دیکھتے ہی دیکھتے وہی..... جمپونڈے آباد نظر آنے لگے، جو تھوڑی دیر پہلے ویرانی اور خالی پن کا منظر پیش کیے ہوئے تھے۔ وہاں روشنی ہوئی۔ الاؤ بیل پڑا۔ اس ویران بستی کی زندگی جیسے ایک ایسی بیدار ہونے لگی تھی۔ جمپونڈوں سے ان کی عجیب سی چمپنی آوازیں بھی خارج ہو رہی تھیں۔ یہ سب ایک ٹھٹھا جاری رہا اس کے بعد خاموشی چھانے لگی۔ جمپونڈوں کی دھیمی روشنیاں بھی گل ہونے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی سو گئے ہوں۔

دن چڑھے یہ سب جاگے تھے۔ سب سے پہلے پروفیسر ہنری کی آنکھ کھلی تھی۔ شوکی بھی آنکھیں صاف کرتا ہوا اپنے خیمے سے نکلا تو چونک پڑا۔ اس نے دیکھا پروفیسر ہنری نے اپنے ایک ہاتھ میں صندل سے تھام رکھا تھا اور وہ پتھر کی زمین پر تنگے جھکے کچھ دیکھتے ہوئے بھی آگے جاتے بھی پیچھے اور بھی داہیں بائیں مڑتے۔

رینا رابرٹ اور گارشا بھی جاگ چکے تھے۔ شوکی نے محسوس کیا تھا کہ رینا اب رابرٹ سے کچھ بھی چھٹی سی نظر آ رہی

تھی۔ وہ ابھی تک درطو حیرت میں مبتلا تھا کہ یہ کچھ کچھ تھا؟ رینا رابرٹ کے سامنے آتی ہے بس کیوں تھی؟ اچانک اس کی نظر چاند کی طلسمانی روشنی میں سامنے پڑی۔ وہ دونوں اب تیز تیز قدموں سے پڑاؤ کی طرف جا رہے تھے۔ رینا آگے گئی اور رابرٹ اس کے پیچھے..... شوکی نے بھی ان کی نظروں میں آئے بغیر قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ اس نے دیکھا کہ رینا اپنے خیمے کے پاس پہنچ کر رکی۔ رابرٹ نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر رینا نے ہنسی کے ساتھ اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اندر داخل ہوئی۔ رابرٹ تھوڑی دیر تک بیٹھے کے دروازے پر کھڑا رہا، اس کے بعد وہ اس اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔ شوکی بھی اپنے خیمے میں آ کر لیٹ گیا۔

پہلے منظر میں سر بفلگ پہاڑیوں کی چوٹیاں تاریک خلا میں برجیوں کی طرح بیست ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور وہاں چاند لگا ہوا تھا۔ ان کے درمیان بادلوں کے ٹکڑے تیرتے ہوئے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ دور کھین کی پہاڑی بھڑبھڑانے چاند کی طرف تھوڑی سی اٹھا کر ہو گئی۔ رابرٹ نے ماحول کی اسراریت کو دو چند کر ڈالا تھا۔

پڑاؤ پر رات کا سناٹا طاری تھا۔ ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ دھیمی دھیمی چاندنی میں خالی جمپونڈوں کے مدھم مدھم سے نظر آ رہے تھے۔ شوکی سوچا تھا۔ رات اپنے نصف چہرے میں تھی۔ اچانک وہی پراسرار سانس کراٹھ کرتے ہوئے دھیرے دھیرے خیموں کی جانب بڑھنے لگا اور ایک ایک خیمے کے اندر جھانکتے رہے۔ ان کے جسم پر ہنہ تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے بغیر پونوں کے ہوں۔ البتہ..... ان کے چہرے انسانی لگتے تھے، مگر قدرے غریبی تھے۔ رنگت سیاہ تھی۔ ان کی جسمانی ساخت انہیں ایک دوسرے سے مختلف جنس ظاہر کرتی تھی۔ یعنی مرد اور عورتیں بھی تھیں، جمپونڈی بڑی عمروں کے بچے بھی تھے۔ شیر خوار بچے ماؤں کی پشت اور سینے کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ ان کی وضع انہی کی طرح کی تھی۔ ان کی ہاتھوں پیروں کی ہڈیاں خم کھائے ہوئے تھیں اور بڑھ کی ہڈی بھی خم کھائے ہوئے تھی، جس کی وجہ سے یہ لوگ اپنے دونوں پیروں پر چلنے کے بجائے چوپایوں کی طرح چلنے پر مجبور تھے۔

چند سائے ٹھنڈے ضرورتاً اپنے دو پیروں پر بھی کھڑے ہونے کی کوشش کرتے۔ ان کی تعداد کافی ہو چکی تھی۔ وہ سب آزادانہ ادھر ادھر بھدکتے پھر رہے تھے اور عجیب عجیب سی آوازیں بھی خارج کرنے لگتے۔ اگر اس وقت خیموں میں گہری نیند سوئے کسی کی آنکھ کھل جاتی اور وہ باہر نکل کر ان

”اسے چھوڑ دو..... رابرٹ!“ شوکی نے اپنے اندر غلط تعلق کے بل..... پورا زور دیتے ہوئے کہا۔ اس کا آنکھوں سے خون ناکا مترشح ہو رہی تھی۔ وہ جیسے رابرٹ کو بھاڑ کھانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اسے پستول نکالتے دیکھ کر وہ اس سے صرف دو تین قدموں ہی کے فاصلے پر رک گیا تھا۔ رینا ہراساں تھی۔ شوکی کو اس کے حسین چہرے پر سرخ سرخ خراشیں دکھائی دی تھیں۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے.....“ رابرٹ بھیڑیے جیسی آواز میں اس کی طرف گھور کر غرایا۔ ”ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔“ ”ذاتی معاملہ ایسا نہیں ہوتا.....“ رابرٹ سے یہ کہنے ہوئے شوکی نے رینا کے سر اس پر چڑھ کر بھیڑیے جیسی..... ”یہ بزدلی ہے اور تم رینا کو ہرٹ کر رہے ہو.....“ ”بتاؤ بے بی اسے..... کہ ہمارا اور تمہارا کیا معاملہ ہے.....؟“ رابرٹ نے رینا کے کان کی طرف اپنا دہیست چہرہ لے جاتے ہوئے اس سے کہا تو شوکی کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن تھیں..... رابرٹ کے کہنے کے انداز میں شوکی کو ایک طرح کا جبرائے حکم محسوس ہوا تھا اور اسے رینا سے بس سی نظر آ رہی تھی۔

”تم پہلے چھوڑ دیجئے..... رابرٹ!“ رینا نے بالآخر گھٹنے گھٹنے کچھ بھیجے۔ ”نہیں، پہلے اسے جانے کا کہو.....“ رابرٹ بدستور اپنے سامنے کھڑے شوکی کی طرف گھورتے ہوئے رینا سے بولا۔ ”شش..... شوکی! تم جاؤ.....“ رینا نے اکتے ہوئے لمحے میں شوکی سے کہا تو وہ رینا کی بات پر بھونچکا رہ گیا۔ اسے دکھ بھی ہوا، پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ رینا ایسی صورت حال میں اس سے یہ بھی کہہ سکتی ہے۔

”چلو اب دفع ہو جاؤ یہاں سے اور اپنی اوقات میں رہنا آئندہ.....“ ”تمہی.....“ رابرٹ کو یارینا کی شے پر شوکی سے بولا۔ ”ی..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو رینا.....! یہ جہیں ہرٹ کر رہا ہے.....“ شوکی نے دکھ آہیز حیرت سے رینا کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کی پرچھائیاں اتر آئی تھیں۔ ”شوکی! پلیز..... کو.....“ رینا نے دے دے لیچے میں ایک بار پھر شوکی کو جانے کے لیے کہا تو شوکی اپنے ہونٹ کچھ کر رہ گیا۔ وہ چند ثانیے دونوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد وہاں پلٹ گیا۔ مگر اوٹ سے ہٹنے کے بعد وہ ایک جگہ چٹائی دیوار کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس بار اگر رینا کی چیخ سنائی دی تو وہ رینا کی پروا کیے بغیر رابرٹ

اور زبانی کے پورے وجود میں اندیشا کہ وسوسوں کے سناٹے اترتے چلے گئے۔

☆☆☆

چیخ کی آواز پر شوکی بری طرح چونکا..... اس چیخ پر وہی پراسرار کبڑے سائے بھی ٹھٹھے تھے اور شوکی کی نظروں میں آئے بغیر ادھر ادھر کو لپکتے لگے تھے۔ ان کی تعداد بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اریب قریب کی چٹائی دیواروں میں چھپے ہوئے اپنی چندی چندی چمپنی آنکھوں سے اس مختصر پڑاؤ کو تکتے جا رہے تھے۔ کچھ خیموں کے قریب بھی دیکھے ہوئے تھے۔

شوکی چیخ سے مشابہ اس آواز کو ہزار آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ رینا کی چیخ تھی، جو زیادہ بلند تو نہ تھی، مگر کھین قریب سے آتی ہوئی ضرور محسوس ہوئی تھی۔ تب ہی جیسے اس کے پورے وجود میں یکھٹ بجلیاں دوڑ گئیں۔ وہ بکولے کی طرح پلٹا اور آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے تاریکی میں اسی پہاڑی کی طرف لپکا جہاں سے چیخ کی آواز ابھر رہی تھی۔ اسے یوں ایک دم دوڑنا دیکھ کر اطراف میں چھپے ہوئے وہ پراسرار کبڑے نما سائے بھی دیکھ رہے تھے۔

بانی سب لوگ ٹھن کے سبب بے سدھ سو رہے تھے۔ شوکی..... چمپنی ہوئی چاندنی میں پتھر کی اور نامور سی زمین پر دوڑتا ہوا، مذکورہ چٹائی اوٹ کے پیچھے جا پہنچا اور تب ہی ایک منظر نے جیسے اس کا پورا وجود آگ اور شعلوں سے بھر دیا۔ اس سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر چدرہ اوپنی اور سنگلاخ دیوار تھی، اس کے نیچے خشک سی روئیدی چمپلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے رابرٹ کو کسی شکرے کی طرح رینا کو بوچھڑے ہوئے پایا اور رینا معصوم چڑیا کی طرح اس کی آہنی گرفت سے نکلنے کے لیے پھل رہی تھی۔ رابرٹ نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھا ہوا تھا تاکہ وہ دوبارہ نہ چیخ سکے۔ رابرٹ کی اس چیخ حرکت کو دیکھ کر صاف نظر آتا تھا کہ وہ رینا سے دست دراز کی کی کوشش کر رہا تھا۔ شوکی کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ آنکھیں شعلوں کے مانند دھنکے لگیں۔ اس نے وہیں سے ایک جست بھری..... اور رابرٹ کے سر پر جا پہنچا..... اسے دیکھتے ہی رابرٹ نے اپنے ایک ہولسٹریے پستول نکال لیا۔ یوں اسے رینا پر گرفت ڈرنا ڈھکی کرنا پڑی تھی۔

”رک جاؤ ادھر ہی..... ورنہ کوئی مار دوں گا.....“ وہ شوکی کی طرف دیکھ کر غرایا۔ اس نے شاید شوکی کی غضب ناک کا اندازہ..... لگایا تھا کیونکہ خود رابرٹ کے چہرے پر بھی تشویش و پریشانی کی جھلک ابھر رہی تھی۔



جیون دان

دسیم بن اشرف

کہتے ہیں جتنی جس کی سانس... اتنی اس کی آس مگر ایک دوسرے کے لیے جینے مرنے والے فقط ایک لمحے میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کسے کس کے لیے جینا اور مرنے... اپنے لیے یا دوسروں کے لیے... اور اسی ایک لمحے پر مشتمل یہ تحریر بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔

جیون دان کرنے والے ایک مجلس دوست کا قصہ

ستمبر کی سہانی شام تھی، آسمان پر بادلوں کے تیرتے ٹکڑوں کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ سمندر کی لہریں ہوا کے خوشگوار جموں کوں کے ساتھ جھوٹو محسوس تھیں۔ شاندار بحری جہاز دھیرے دھیرے سمندر کا سینہ چیرتا اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ مسافروں میں سے کچھ اپنے کینوں میں آرام کر رہے تھے، کچھ ڈانٹنگ ہال میں پیٹ پوجا میں مصروف تھے، بہت سے ڈیک پر سمندر کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ڈیک پر ہی دونو جوان ریٹنگ کا سہارا لیے لہروں کا رقص

پڑے سو رہے تھے۔ "ہنری بولا۔
"اب آپ ہی بتائیے جناب! آپ کو ایسا کیوں اور کیسے محسوس ہوا کہ یہاں کوئی اور لوگ بھی آئے تھے؟" اس بار امجد نے سوال کیا۔

"وہ لوگ جو کوئی بھی تھے، اس بستی کے باسی ہیں۔ دن بھر میں کہیں چلے جاتے ہیں اور رات کے کسی پہر لوٹتے ہیں۔ یہاں پسند لگتے ہیں اور یہ چارے شاید کسی معیبت میں مبتلا ہیں۔" ہنری پر غور سے انداز میں کہے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک جوش سا ابھرتا محسوس ہوتا تھا۔ اس میں رخ کی خوشی بھی تھی اور کچھ کرنے کا جذبہ بھی۔ اس نے بات جاری رکھی اور آگے بولا۔ "مجھے خوشی ہے کہ میں اپنی بہم کی پہلی منزل پر پہنچ چکا ہوں۔ میری علمی تحقیق کا آغاز اسی راکشی قبیلے کی بستی سے ہوگا۔ یہ لوگ کیوں اور کیسے اس حال کو پہنچے، میں نے نہ صرف اس کا کھوج لگانا ہے بلکہ ان کی مدد بھی کرنا ہے۔"

"بات اب بھی کلیئر نہیں ہوئی ہے انکل ہنری!" گارشیا نے کہا۔ وہ سب سے زیادہ تجسس ہو رہی تھی۔ "آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ وہ یہاں آئے تھے؟"
"ان کے پیروں کے نشانات... جو بہ ظاہر انسانی لگتے ہیں، مگر کسی بھوری کی بنا پر یہ چو پاؤں کی طرح چلنے پر مجبور ہیں۔ یہ رات کو آئے تھے اور پھر چلے گئے۔ نجانے کہاں جاتے ہیں اور کیوں؟" یہ نہیں سمجھ میں آیا۔
"میں نے کل رات ایک ایسا ہی سایہ اپنے جیسے کے باہر دیکھا تھا مگر میں نے اسے اپنا وہم سمجھا تھا۔" بالآخر شوکی بولا۔ ہنری نے مسکرا کر کہا۔

"یقیناً دیکھا ہوگا..." پھر وہ کرسی چھوڑتے ہوئے بولے۔ "اگلے کوچ کی تیاری کرو۔۔۔۔۔ اب ناگرہ پہنچ کر اپنا بیس کیپ سنبھالنا ہے۔ میں دوبارہ یہاں آؤں گا، کیونکہ یہ جگہ یہاں سے دور نہیں ہے۔"

ایک بار پھر کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس نئے انکشاف کے بعد ہر کوئی اپنے اندر ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ ہر کسی کو تجسس ہو رہا تھا کہ آخر پتا تو چلے یہ پراسرار چکر تھا کیا...؟

ناگرہ یہاں سے چند سوکوں کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ روانگی کے وقت سے ذرا پہلے جب شوکی تھا اپنے خیمے میں ضروری سامان باندھ رہا تھا کوئی اندر داخل ہوا۔ کسی کی آہٹ پر اس نے گردن گھما کر دیکھا تو چونک پڑا۔

جاری ہے

تھی۔ تاہم وہ اب بھی اس کے ساتھ تھوڑی بہت بات کر لیتی تھی، البتہ لگ ایسا ہی رہا تھا جیسے کچھ ہوا نہیں ہو۔
"خیریت پروفیسر؟ کچھ ہوا ہے یہاں۔۔۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھو... شش... شش... پروفیسر ہنری اپنے کام میں محو رہے اور پھر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ان کا رخ اب جموینڈوں کی طرف تھا۔ وہ اندر گئے۔ وہاں بھی اسی طرح جبکہ کر فرش پر کچھ دیکھتے رہے۔ اس کے بعد پلٹ آئے۔ شوکی حیران تھا کہ آخر پروفیسر ہنری برنارڈ کو ایک رات گزرنے کے بعد ایسا کیا نظر آ گیا تھا؟

بہر کیف... اس وقت تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا لیکن... ہلکے ہلکے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ایک عجیب و غریب انکشاف کر ڈالا۔

"رات کے کسی پہر... اس ویران بستی کو آباد کیا گیا تھا۔"
ان کی بات نے سب کو ایک دم چونکا دیا تھا۔ رینا اور گارشیا سمیت تندو بابا اور اس کی بیوی شانتا کے چہروں پر دبا دبا ہراس بھی ابھرا تھا۔ البتہ شوکی اس لیے پروفیسر کی بات پر چونکا تھا کہ اس نے خود بھی رات کے پہر ایک عجیب و غریب وضع کا سایہ دیکھا تھا جو تیزی سے ایک جانب کو لپک گیا تھا۔ اس نے اسے اپنے وہم یا کسی چھوٹے موٹے آوارہ جانور پر محمول کیا تھا۔ تاہم ہر دست خاموش رہا۔

یہ پانچوں دائرے کی صورت میں ایک گول فولڈنگ ٹیبل کے گرد اسی طرح کی چیئرز پر بیٹھے تھے۔ شوکی کو بھی پروفیسر ہنری اپنے ساتھ بٹھایا کرتا تھا۔ باقی ملازمین تندو بابا، شانتا، امجد خان اور دونو فوجی ان کے گرد کھڑے غور سے پروفیسر کی باتیں سن رہے تھے۔ البتہ شوکی کو پروفیسر کے ساتھ والی کرسی پر بٹھائے جانے پر رابرٹ نے ناک بھوں ضرور چڑھائی تھی۔

ایک نیا اور چونکا دینے والا موضوع چھڑ جانے کے باوجود شوکی گزشتہ شب والے واقعے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ پروفیسر ہنری سے رابرٹ کی شکایت کرے یا نہیں... کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ رینا ناراض ہو سکتی تھی۔ نجانے ان کا آپس میں ایسا کیا رشتہ تھا کہ رینا، رابرٹ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے ہتر دھمی؟
"انکل ہنری! اس بستی کو تو ہم نے آباد کر رکھا ہے۔ ہمارے علاوہ اور تو کوئی ابھی تک نظر نہیں آیا۔۔۔۔۔؟" رابرٹ نے بے تاثر سے لہجہ میں کہا۔

"یہ سب اس وقت ہوا ہے جب ہم لوگ گہری نیند میں

دیکھ رہے تھے ایک نوجوان جس کے بال سنہری اور آنکھیں گہرے نیلے رنگ کی تھیں اپنے سامھی سے مخاطب ہوا۔
 ”جانتے ہو علی یہ لہریں کہاں جا رہی ہیں؟“
 علی نے دوست کے سرفی مائل حسین دھمیل چہرے پر نظر ڈالی اور جواب دیا۔
 ”اگلیڈ..... کیونکہ یہ ہمارے جہاز کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔“
 ”کیا لہریں اس بات سے واقف ہیں کہ ان کی منزل کہاں ہے؟“ نوجوان نے پھر سوال کیا۔
 ”شاید نہیں..... لیکن راجر تم ایسے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟“ علی بولا، راجر نے گہرا سانس لیا پھر بولا۔
 ”انسان کی زندگی بھی ان لہروں کی طرح غیر یقینی ہے، کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کہاں ہے لیکن پھر بھی سب چل رہے ہیں، جیسے چلتے رہتا ہی ان کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔“
 علی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”یہ شاعروں کے سوچنے کی باتیں ہیں، ہم سپاہی ہیں، ہمارے سوچنے کا انداز دوسرا ہونا چاہیے۔“
 راجر نے فوری جواب دیا۔ ”تم غلط کہتے ہو علی، سپاہی ہونے سے انسان کے جذبات بدل نہیں جاتے۔ مثال کے طور پر سوئی چھوونے سے سپاہی کو بھی اتنا ہی درد ہوگا جتنا کسی شاعر کو ہوگا۔“
 علی غلام میں گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تو اتنا جانتا ہوں کہ شاعر ایک خیالی دنیا کا باشندہ ہوتا ہے لیکن زندگی کے بارے میں ایک سپاہی کا نظریہ دوسرا ہی ہوتا ہے، وہ دشمن کو انجام تک پہنچا کر دوست کی ہٹا کا ذریعہ بنتا ہے، اس کے دل میں دوسروں کے لیے قربانی دینے کے جذبات ہوتے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ راجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایسے کتنے سپاہی ہیں جن کے دل میں دوسروں کے لیے قربانی دینے کے جذبات اتنے مستحکم ہو چکے ہیں کہ وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز پر اپنا سب کچھ بھجوا کر دیتے ہیں۔ میں خارجی حالات کی بات نہیں کر رہا ہوں جن سے مجبور ہو کر بھی کسی انسان کو اپنے جذبات کے خلاف بھی کوئی کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ میں تو صرف ایسے لوگوں کی تعداد پوچھ رہا ہوں جو اپنی خوبی سے دوسروں کا جیون روشن کرنے کے لیے اپنے جیون کا دھپ خود ہی بھجادیتے ہیں۔“
 علی نے سر کھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”مگنی تو میں بھی نہیں کر سکتا..... لیکن اتنا بھتا ہوں کہ صرف ایسے ہی لوگ حقیقت

میں انسان کہلانے کے مستحق ہیں اور ان کی عظمت کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرتا ہوں۔“
 اسی وقت ماحول میں ٹھنکتا ہوا ہتھکڑہ کوخ اٹھا، دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو مسز فرم اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلی آ رہی تھیں۔ قریب آ کر مایاں بیوی نے راجر اور علی سے موسم کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد مسز فرم بولے۔
 ”اچھا دوستو! پھر ملیں گے، اس وقت ہم ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں۔“
 علی نے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے آپ ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں؟“
 مسز فرم زور سے ہنس پڑیں، پھر بولیں۔ ”بد قسمتی سے مجھے دو تین مہینے کیا آگئیں کہ انہیں وہم ہو گیا کہ میری طبیعت ناساز ہے، اب زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں۔“
 راجر ہنس پڑا، کہنے لگا۔ ”آپ تو بڑی خوش نصیب ہیں کہ اتنی محنت کرنے والا شوہر ملا ہے آپ کو، مجھے تو رشک آتا ہے آپ کی زندگی پر۔“
 مسز فرم کے لبوں پر تبسم تھا، کہنے لگیں۔ ”ضرورت سے زیادہ محنت بھی کبھی سمیت بن جاتی ہے۔“
 مسز فرم نے اس کا ہاتھ پھینچتے ہوئے کہا۔ ”اب چلو گی بھی یا یونہی باتیں بناتی رہو گی۔“
 پھر ملنے کا وعدہ کر کے دونوں رخصت ہو گئے، علی آسمان پر تیرتے بادلوں کے رنگین ٹکڑے دیکھنے لگا۔ شام کے ڈوبنے سورج نے فضا کو چمکدار اور دلکش رنگوں سے سجا رکھا تھا۔ علی کی نظریں آسمان سے پھسلتی ہوئی پانی کے چیلے تخت پر دور تک پھیل چکی تھیں۔ خودکلائی کے انداز میں بولا۔ ”دودن اور دو راتیں، پورے اڑتالیس گھنٹے ابھی پانی ہی سہی سڑکنا ہے۔“
 علی نے پوچھا۔ ”راجر تم سیدھے وینٹ ورتھ جاؤ گے، روتھ کے پاس؟“
 ”اس بھری پری دنیا میں میرا صرف ایک ہی ٹھکانا ہے۔“ راجر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”علی نے پھر سوال کیا۔ ”تھیں پورا لیٹیں ہے کہ روتھ تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی تم اس سے کرتے ہو؟“
 راجر پر اعتماد لگے میں بولا۔ ”وہ مجھ سے کہیں زیادہ پیار کرتی ہے، اس کی محبت میں بناوٹ نہیں ہے، وہ صنعت سے پاک ہے۔ جب میں اگلیڈ سے رخصت ہو رہا تھا تو میں نے اس کو شادی کی پیشکش کی تھی، پتا ہے اس کا جواب کیا تھا، اس

لے کہا تھا، وہ راجر شادی دلوں کی ہوتی ہے جسم کی نہیں، یہ تو دو روحوں کے ملاپ کا نام ہے، ہماری شادی ہو چکی ہے، اس وقت تمہیں تمہارا فرض بیکار رہا ہے، میں تمہارے راتے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی۔“
 علی دور اس لکیر کو دیکھنے لگا جو آسمان اور سمندر کے ملنے سے بن گئی تھی، سورج کی کرنیں طویل مسافت کے بعد مٹیالے پانی کو چھونے آئی تھیں، ماحول کچھ اور ٹھنک گیا تھا۔
 راجر نے..... کھوئے کھوئے لہجے میں..... پوچھا۔
 ”علی تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“ علی نے راجر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔
 ”دوست مجھے محبت کرنے کے لیے کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ بچپن میں ہی میرے باپ کی بیٹائی ختم ہو گئی، جس عمر میں بچے پر یوں کی کہانیوں سے دل بہلاتے ہیں، اس عمر میں مجھے بہت کا جہنم سہرہ کرنے کی فکر لگ گئی تھی، تب سے اب تک میری زندگی کشین کے پیسے کی طرح گھوم رہی ہے۔“
 راجر کا دل بھر آیا، وہ بولا۔ ”منو علی! جنگ ختم ہو چکی ہے، طویل عرصے بعد زندگی میں سکون اور فرصت کے لمحات میسر آئے ہیں، تم کچھ دن میرے ساتھ وینٹ ورتھ چلو، تھوڑا گھوم بھر کر اپنے گھر چلے جانا۔“
 علی نے راجر کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا۔ ”تمہارے اس غلوں کا شکر ہے، لیکن میں سیدھا گھر جاؤں گا، میرے بوڑھے ماں باپ میری راہ تک رہے ہوں گے، میں ان کی زندگی کا واحد سہارا ہوں۔“
 اسی اثنا میں جہاز تھوڑا سا ڈگمگایا، دونوں یہ مشکل سمجھلے۔ جہاز کے انجن والی جانب سے شور سانسائی دیا، ابھی وہ اس شور کی وجہ بھی نہ جان پائے تھے کہ خطرے کا الارم بج اٹھا، ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی، ہل چل کچ گئی، مسافروں کے چروں کا رنگ اڑ گیا۔ راکر پریشانی کے عالم میں تھا، اسی دوران لاؤڈ اسپیکر پر کپتان نے اعلان کیا کہ مشرق کی جانب سے خوفناک طوفان آ رہا ہے، جہاز خطرے میں ہے۔ مسافروں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، اوپر آسمان پہنچے گہرا سمندر، ابھی مسافر ٹھٹھکے ہی نہ پائے تھے کہ طوفان سر پر آ پہنچا، چھوٹی چھوٹی لہریں پانی کی اونچی دیواروں میں تبدیل ہو کر جہاز سے ٹکرانے لگیں، اچھا خاصا بڑا جہاز کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈگمگانے لگا۔ چاروں طرف سے جہاز میں پانی بھرنے لگا۔ مٹلے کی بھر پور کوششوں کے باوجود صورت حال قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ مسافر اس قدر فی افادے گہرا کر اوپر والی منزل کی جانب بھاگنے لگے، کبھی کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

گویا

○ پیار تو اندھا ہوتا ہے گویا لیکن پیار کرنے والوں کی تو آنکھیں ہوتی ہیں۔
 ○ پیار کرنے والوں کی ”آنکھیں جار“ ہوتی ہیں گویا لیکن انہیں دیکھنے والی آنکھیں ہزار ہوتی ہیں۔
 ○ پیار کرنے والے کسی سے نہیں ڈرتے گویا سوائے محبوب کے بھائی کے جوتوں سے۔
 ○ پیار کیا نہیں جانتا، یہ تو بس ہو جاتا ہے گویا تو جب پتا چلے کہ ہو گیا ہے تو کرنا چھوڑ دو۔
 ○ پیار میں بھوک پیاس اڑ جاتی ہے گویا لیکن عقل کھاس چرے چلی جاتی ہے۔
 ○ پیار کرنے والوں کی آنکھوں سے نیند روٹھ جاتی ہے گویا کیونکہ وہ جانی آنکھوں سے خواب بننے لگتے ہیں، جو کبھی بچ نہیں ہوتے۔
 ○ پیار دو دلوں کا بھوک ہے گویا دو زندگیوں کا روگ ہے۔
 ○ پیار آنکھوں کا نور ہے گویا عقل کا فتور ہے۔
 ○ پیار جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے گویا خود کشی کے طریقے سمجھاتا ہے۔
 ○ پیار جذبات کی خوبصورتی کا نام ہے گویا اعصاب کی ٹھنکی کا نام ہے۔
 ○ پیار میں ہر موسم سہانا لگتا ہے گویا پھر شادی کے چند دنوں بعد ہی اپنی اس سوچ پر پچھتانا پڑتا ہے۔
 اسی بھگڑ میں نہ جانے کتنی عورتیں اور بچے سیزمی سے پھسل کر کبھی نہ اٹھنے کے لیے نیچے جا کرے، لوگ انہیں پکٹتے ہوئے اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاز میں قیامت مفری بپا ہو چکی تھی۔ جہاز کے ذمہ دار افسروں نے جان بچانے والی چھوٹی کشتیاں پانی میں اتارنا شروع کر دیں، پہلی کشتی میں ہی اتنے مسافر بھر گئے کہ وہ بوجھ برداشت نہ کر سکی، مسافروں کی بڑ بڑکے نے معاملہ اور بھی خراب کر دیا۔ پہلی کشتی نے چند چکر کاٹے اور متعدد مسافروں سمیت غرق آب ہو گئی، جہاز میں کشتیاں کم اور مسافر زیادہ تھے، پہلی کشتی کا بھیا یک انجام دیکھ کر جہاز کے افسروں نے فیصلہ کیا کہ جتنے مسافر بچ سکتے ہیں ان کو بچایا جائے جو رہ گئے، وہ خدا کے سپرد۔

تیسرا کوشش

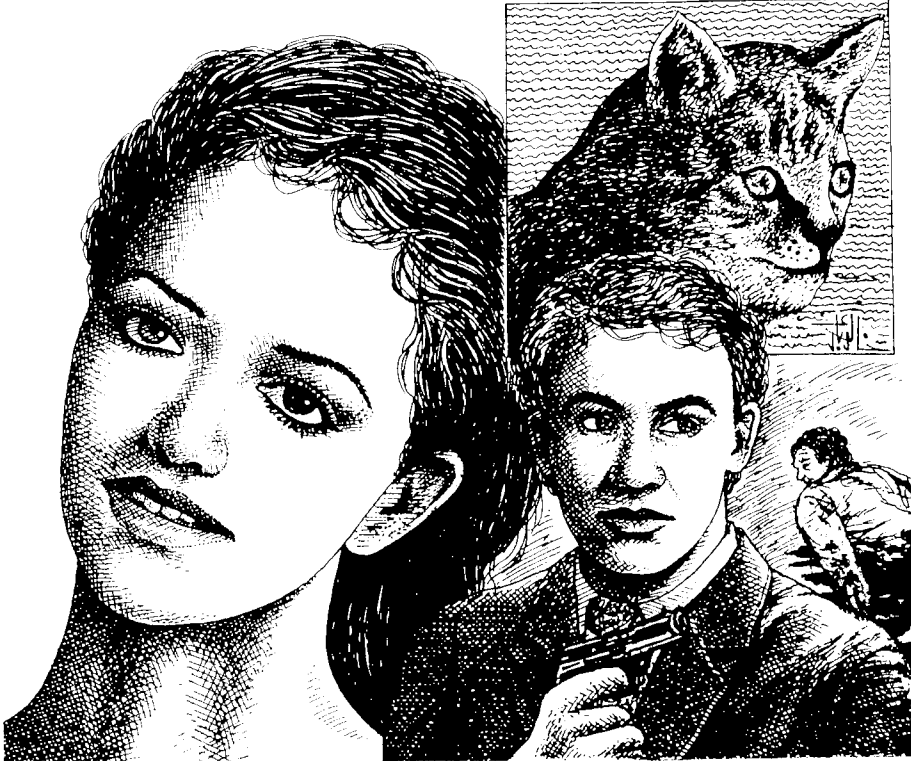
تویر ریاض

جسے جان سے گزرتا ہوتا ہے کتنے ہی جی جان سے اس کی حفاظت کر لی جائے... وہ گزرتا ہی جاتا ہے اور جسے جینا ہوتا ہے اس کی جان کے دشمن بھی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی اسرار بھرے معاملات یہاں بھی چل رہے تھے جب وہ شریک سفر کسی کے ساتھ مجرمانہ سرگرمیوں میں شریک ہوا تو ان کا سفر بھی اپنی سمت بدل گیا۔

قاتل سے متوکل بننے والے ایک مجرم کی کارروائی کا اجرا

”کیا کہہ رہی ہو؟“
”کچھ نہیں۔“ جینی نے بے پروائی سے کہا۔
”میرا خیال ہے کہ مجھے دفتر واپس جانا چاہیے۔ کافی کام کرنا ہے۔“

میزویم میں رکھے ہوئے چھوٹے سے سیاہ رنگ کی مٹی کے جیسے کو دیکھ کر جینی نے بے ساختہ کہا۔ ”شاید قدیم مصری بلیوں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔“ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا اس کا شوہر جان مارک اس کی بات نہ سمجھ سکا بولا۔



علی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے راجر کی طرف غور سے دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر موت کی پرچائیوں کی بجائے اسے دور دور تک نظر نہ آئیں۔ علی نے قدم آگے بڑھانا چاہا لیکن جیسے اس کی ٹانگیں کسی نے جکڑ لی ہوں، اس کے دماغ میں آنکھیں سی جلنے لگیں، اس نے طوفانی موجوں کو دیکھا جو جہاز کو نکلنے کے لیے بے قرار تھیں پھر ایک نظر اس چھوٹی شہتی پر ڈالی جو موت کے آئینے پر زندگی کا گیت گنگنا رہی تھی۔ راجر نے علی کا ہاتھ مغربی سے تمام لیا اور دھیرے سے بولا۔

”علی تم اپنے یوڑھے والدین کا واحد سہارا ہو، اگر تم نہ رہے تو وہ بے موت مرجائیں گے، تمہیں نئی زندگی مبارک ہو، جاؤ اور اپنے والدین کی خوب خدمت کر کے اپنی آخرت سنوار لو۔“

”لیکن..... لیکن روتھ..... وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے، میرے دوست۔“ علی ہم آہنگی سے بولا۔

”وہ زندگی بھر میرا انتظار کر سکتی ہے، میں جانتا ہوں اس میں اتنی ہمت ہے۔“ راجر بولا۔ ”بھئی بھی اسے سیری یاد آئے گی کہ وقت بڑے بڑے گماڑ بھر دیتا ہے، اس کا دکھ بھی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا جائے گا پھر بھی نہ بھی میں اس کے دل و دماغ سے نکل جاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے راجر نجیدہ ہو گیا، علی نے اسے گلے لگا کر زور سے سمجھا، اس کے ماتھے پر الوداعی بوسہ دیا اور پیچھے دیکھے بغیر اپنی شہتی میں اتر گیا۔ وہ کشتی میں بیٹھا ڈوبے جہاز کو دیکھ رہا تھا، کشتی دھیرے دھیرے دور ہونے لگی اسے راجر جہاز کی سیزمی پر کھڑا ہاتھ ہلاتا نظر آیا، اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ لگا تار نکلنے والے جینکوں سے خود کو سنہالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پانی کی ایک بڑی لہر نے جہاز کو سمندر کا لقمہ بننے پر مجبور کر دیا، جہاز پر پہنچ دیکار بھی ہوئی تھی، بے بسی کی موت مرنے والوں کی دل دہلا دینے والی عینوں سے شاید آسمان کے بھی آنسو نکل پڑے تھے۔ آسمان سے بوندیں برس رہی تھیں۔

راجر ڈیک کے آخری کونے پر بیٹھ گیا تھا اسے آسمان کو الوداعی نظروں سے دیکھنے لگا، جہاز دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ جہاں راجر کھڑا تھا وہ حصہ بھی تباہ ہو گیا، راجر نے آنکھیں بند کر لیں اور بندش والی ہاتھ بند کر لیا، ڈوبتے ڈوبتے جب مٹی بھی غرق آب ہونے لگی تو اس نے بندش کھول دی۔ اس کی مٹی سے ایک پرچی نکلی اور سطح آب پر تیرنے لگی، اس دوسری پرچی پر بھی علی کا ہی نام لکھا ہوا تھا۔

جہاز کچی پتنگ کی طرح پانی میں پکڑا رہا تھا۔ پانی بہت تیزی سے بھر رہا تھا، نکاسی آب کے راستے کھولنا صورت حال کو مزید خراب کرنے کے مترادف تھا۔ مسافروں کو سامنے موت نظر آ رہی تھی، دل بری طرح دھڑک رہے تھے، ہر کسی کی شدت سے اپنی باری کا انتظار تھا۔ انتظامیہ نے فوری فیصلہ کیا کہ قعر اندازی کی جائے گی، جن جن کا نام نکلے گا وہ خوش نصیب کشتیوں میں اترے جائیں گے، چنانچہ کشتیوں میں صرف انہی افراد کو اتارا جا رہا تھا جن کا نام قعر اندازی میں نکل رہا تھا۔ نام نکلنے کا مطلب زندگی اور نہ نکلنے کا مطلب گویا خوفناک اور بے بسی کی موت تھا اسی دوران مسافر دم کا نام پکارا گیا۔ وہ زندگی کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے لیکن بد قسمتی سے مسافر دم کا نام نہیں نکلا تھا۔ فرد نے بیوی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کشتی میں اتر گئے۔ مسافر دم شوہر کی تنگ دلی پر رو پڑیں۔

”ڈارلنگ تم تو مجھے جان سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے اب موت کے حوالے کر کے جا رہے ہو۔“ فرد نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کشتی میں اترنے کی جلدی کی۔ اس نے صرف ایک بار اپنی بیوی کی طرف منور دیکھا تھا۔ وہ یقیناً یہی سوچ رہا تھا کہ بیوی تو اور بھی مل سکتی ہے لیکن زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔

علی اور راجر نے گہری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی قسمت کا فیصلہ بھی ہونے والا تھا کہ اچانک راجر آگے بڑھا اور نائب کپتان سے مخاطب ہوا۔

”جی فرمائیں۔“ کپتان نے جواب دیا۔
”میں اور علی ویرینہ دوست ہیں، ہم اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ بھی خود کرنا چاہتے ہیں۔“ راجر نے جواب دیا۔
”کیا مطلب؟“ کپتان نے استفسار کیا۔
”ہم اپنی پرچی خود نکالیں گے آپ دو پرچیاں اور قلم عنایت کر دیں۔“ راجر بولا۔

نائب کپتان کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، اس نے فوراً دو پرچیاں اور قلم راجر کو دے دیا۔ راجر نے دونوں پرچوں پر نام لکھنے کے بعد اچھی طرح تیک اور کپتان کو قلم لوٹانے کے بعد بولا۔ ”پرچی بھی آپ ہی اٹھائیے گا۔“ راجر نے دونوں ہاتھوں میں پرچوں کو اچھی طرح ہلایا اور مٹی کھول دی، کپتان نے ایک پرچی اٹھالی۔

”مسٹر علی! تمہیں زندگی مبارک ہو۔“ علی کے نام کی پرچی نکلنے پر وہ بولا۔ ”راجر نے دوسری پرچی مٹی میں سمجھ لی،

ان کی ملاقات کھانے کے وقفے میں ہوئی تھی اور وہاں سے وہ میوزیم آگئے تھے۔ ان دنوں وہ قدیم مصریوں پر ایک کتاب کی ایڈیٹنگ کر رہی تھی اور بولوں کے اس عجائب گھر میں مصری نوادرات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔

”میں جلدی گھر آ جاؤں گا۔“ جان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا اور ٹیکری میور کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ ایک عورت اس پر نظر پڑی جمائے ہوئے تھی، جب اس نے دیکھا کہ جینی بھی اسے ہی دیکھ رہی ہے تو اس کی نگاہوں کا زاویہ بدل گیا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اکثر کئی عورتیں اس کے شوہر کو دیکھنے لگتیں۔ ”دفع کرو“ اس نے سوچا۔ ”وہ میرا ہے صرف میرا۔“ اس میں ان عورتوں کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ اتنا خوش شکل اور پینڈم تھا کہ سب کی نظریں اس پر جم ہی جاتیں۔

جینی دوبارہ شوکیس کی جانب متوجہ ہوئی۔ وہاں مٹی سے بنی ہوئی بہت سی چیزیں رکھی ہوئی تھیں لیکن وہ بلی کا مجسمہ اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ابھی وہ اسے دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی عورت تھی جو جان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تقریباً جینی کی ہی ہم عمر تھی۔ اس کا چہرہ پر کشش اور لمبے سیاہ بال تھے۔

”معاف کرنا میڈم۔ وہ شخص.....“

جینی اس کی پوری بات نہیں سمجھ سکی۔ گوکہ اس کی فرانسیسی بہتر ہو رہی تھی لیکن اب بھی اسے لوگوں کی بات سمجھنے میں مشکل ہوتی تھی۔

”تم بہت تیز بول رہی ہو۔“ جینی نے کہا۔

”اوہ میں سمجھی۔ تم انگریز ہو۔“ اس عورت نے کہا۔

”وہ شخص جو ابھی تمہارے پاس سے گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے جانتی ہوں۔ کیا وہ تمہارا دوست ہے؟“

”نہیں۔ وہ میرا شوہر ہے۔“

”تمہارا شوہر۔ کیا وہ ویل ہے اور اس کا تعلق بینریرز سے ہے؟“

”نہیں وہ بینریرز میں اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔“

جان مارک کسی زمانے میں قانونی معاون تھا لیکن وہ لیون کا رہنے والا تھا اور بولوں آنے سے پہلے اس نے کچھ عرصے پیرس میں اسٹیٹ ایجنٹ کے طور پر کام کیا تھا۔ بینریرز نامی قصبہ فرانس کے جنوب میں کہیں واقع تھا اور جینی جانتی تھی کہ وہ بھی وہاں نہیں رہا۔

”معذرت خواہ ہوں۔“ عورت نے کہا۔ ”مجھے یقین تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔“

یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور وہاں سے چلی گئی۔ جینی نے

میوزیم کی چھوٹی سی دکان سے وہ بلی کا مجسمہ خریدا اور گھر آگئی۔ کانچ کے دروازے پر ایک اصلی بلا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ اور سفید تھا اور وہ اس کے پڑوس میں رہنے والی مصریہ کی ملکیت تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھا تا کہ جینی اس کی کمر پر ہاتھ بھیرے لیکن وہ اسے ہاتھ لگائے بغیر اندر داخل ہوئی۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور اوپر اپنی اسٹڈی میں چلی گئی۔

کاپی ایڈیٹنگ نہیں بھی ہو سکتی تھی اور وہ زیادہ تر کام اپنے ہی گھر میں کرتی۔ کبھی کبھار وہ لندن کا چکر بھی لگاتی۔ اس کے والدین کا فی کس دولت مند تھے اور ان کا تعلق ڈاکٹری کے پیشے سے تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ جینی بھی کوئی ایسا ہی کام کرے۔ جینی کو بڑے ہو کر احساس ہوا کہ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس کا باپ اس وقت مر گیا جب وہ نو عمر تھی اور ماں کا انتقال ایک سال پہلے ہوا تھا۔ ان کی ساری دولت اس کے حصے میں آئی۔ اس کی ملاقات جان سے اس وقت ہوئی جب وہ اپنی ماں کا فرانسیسی مکان فروخت کرنے یہاں آئی۔ چھ ماہ بعد اس نے جان سے شادی کر لی اور فارم باؤس فروخت کرنے کے بجائے وہ جان کے ساتھ اس میں منتقل ہوئی۔

اس نے مجھے کوکانڈ کے تھیلے سے نکالا اور تھیلی پر رکھ کر اسے دیکھنے لگی جب جان کام پر چلا جاتا تو وہ دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی ایک بلی پالے لیکن جان کو بلیوں سے الرجی تھی لہذا وہ اس چھوٹے سے مجسمے سے ہی دل بہلا سکتی تھی۔ قدیم مصری تہذیب میں بلیوں کو بہت مقدس مانا جاتا تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور اس بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرنے لگی۔ قدیم مصری تہذیب میں بلی کو ادوار کا درجہ حاصل تھا اور اسے خوشی، محبت اور راحت کی دیوی سمجھا جاتا تھا۔

اس نے ایک جمائی بلی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مشرد پینے سے اسے نیند آنے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ باہر کا ایک چکر لگایا جائے۔ اس نے گھر کو تالا لگا دیا اور اس سڑک پر جانے لگی جو جنگل کی طرف جاتی تھی پھر اسے میڈیلین کا خیال آیا جو ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی جو کسی ماہر جنگلات کی ملکیت تھا۔ وہ وہاں سے گزر رہی تھی کہ میڈیلین باہر آگئی۔ وہ ان عمر رسیدہ فرانسیسی عورتوں میں سے تھی جو اپنا خیال رکھتی ہیں۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے جنگ کے زمانے میں ایک جرمن سپاہی کو قتل کیا تھا جو فرانسیسی فوج کی چلائی لائن کو سبوتاژ کر رہا تھا گوکہ کبھی اس

نے اس کا اعتراف نہیں کیا لیکن تردید بھی نہیں کی۔

جینی اس کے بارے میں مزید جانتا چاہتی تھی۔ ان کے درمیان ہائے بلو ضرور ہوتی لیکن میڈیلین نے بھی اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کی حالانکہ اس کا رویہ غیر دوستانہ نہیں تھا۔ وہ پڑوسی ہونے کا حق ادا کر رہی تھی لیکن اس کا رکھ رکھاؤ اکثر خوفزدہ کر دیتا تھا۔ اس روز اس نے جینی کو اشارہ کیا اور فرانسیسی میں کچھ کہا جو وہ نہ سمجھ سکی۔

اس نے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے جہاں بہت دور سے فائرنگی آوازیں آ رہی تھیں۔ تب جینی کی سمجھ میں آیا۔ جنگل میں شکاری آگئے تھے۔ وہ جنگلی خنزیر اور خرگوشوں کی تلاش میں تھے۔ وہ یہ بات پہلے سے جانتی تھی کہ شکار کا موسم شروع ہونے کے بعد جنگل کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ ہر سال کئی لوگ حادثات کا شکار ہو جاتے تھے لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ سڑک پر محفوظ ہے جبکہ میڈیلین اسے آگے جانے سے روک رہی تھی۔

جینی نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور یہ سوچتی ہوئی گھر آگئی کہ اب وہ موسم بہار کی آمد تک جنگل کی طرف چہل قدمی کے لیے نہیں جاسکے گی۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی تو اسے فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ جان کا فون تھا کہ اسے گھر آنے میں دیر ہو جائے گی۔ ”ایک پارٹی بڑا مکان خریدنا چاہ رہی ہے لیکن وہ لوگ کل صبح بکے واپس جا رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں دیر تک کام کرنا ہوگا میں اور آرئلڈ کچھ کھالیں گے۔“

ان دنوں وہ کبھی کبھار دیر تک کام کرتا تھا۔ یہ ایک اچھی بات تھی اور اس کا مطلب تھا کہ جائیداد کی خرید و فروخت میں تیزی آگئی ہے۔ جینی نے آلیٹ بنا کر کھالیا اور اسٹڈی میں چلی گئی۔ اس نے نو بجے تک کام کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ بستر پر ہی اس نے نینت پر مقامی اخبار کا مطالعہ کیا۔ وہ باقاعدگی سے مقامی خبریں پڑھا کرتی تھی۔ اس سے اسے اپنی فرانسیسی بہتر بتانے میں مدد ملتی تھی۔ زیادہ تر خبریں گھروں میں آتشزدگی اور کار حادثات سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ البتہ بڑی خبر ہالی ڈے ہومز میں ڈکیتیوں کی تازہ دہر کے بارے میں تھی۔

وہ نیم خود کی کیفیت میں تھی جب جان خاموشی سے آکر لیٹ گیا اور اس سے چھینڑ چھاؤ شروع کر دی۔ وہ اس کی عادی تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن جان کے ہانپنے کی آواز سے دوبارہ

جاگ گئی۔ اس نے اٹھ کر سائیکل بیک کا سوئچ آن کیا۔ وہ بیڈ کی دروازے میں کچھ ٹپٹول رہا تھا۔ جینی نے بستر سے چھلانگ لگائی اور اسے ان ہیلر لا کر دے دیا۔ اس وقت جان کی حالت ایک دوپٹے ہوئے شخص جیسی تھی۔ اس نے کبھی اسے اتنا بیمار نہیں دیکھا۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ وہ عجیب سی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور آنکھیں باہر کو نکھل رہی تھیں۔

اس نے ان ہیلر تاک سے لگایا اور بہ مشکل اتنا کہہ سکا۔ ”بلی..... بستر پر۔“

”میں دیکھتی ہوں۔“

اس نے پورے گھر کا چکر لگایا۔ تمام بتیاں جلا دیں اور کرسیوں کے بیچے جھانک کر دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ بھڑکی کسی طرح اندر آ گیا ہو لیکن اسے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔

”وہاں کوئی نہیں ہے۔“ اس نے جان کو بتایا۔

جان کا سانس اب اعتدال پر آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

”میرے سینے پر ایک بو بھٹا۔ نرم بالوں سے بھرا ہوا۔“

”شاید تم نے خواب میں ایسا محسوس کیا ہو کیونکہ تمہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔“

”شاید۔“ اس نے بے یقینی کے انداز میں کہا اور

ٹکے پر سر رکھ دیا۔

اگلے ایک اینڈر پر موسم خوشگوار تھا۔ وہ ٹپک منانے گئے اور شام کو اپنے پسندیدہ ریستوران میں چھوٹی بھیڑ کا ٹھکین بننا ہوا گوشت کھایا۔ کار میں بیٹھے ہی جینی پر غنودگی طاری ہو گئی پھر اچانک ہی ایک دھماکا ہوا اور زور سے بریک لگنے کی آواز آئی۔ وہ آگے کی طرف جھکی لیکن سیٹ بیلٹ نے اسے گرنے نہیں دیا۔

”یہ کیا تھا؟“ وہ متحوش ہوتے ہوئے بولی۔

”معاف کرنا سوئی۔“ جان بولا۔ ”سڑک پر کوئی جانور آ گیا تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے جس کے جسم پر سیاہ اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ ہاں بچہ۔ وہ نیوے کی نسل کا ہوتا ہے تم خدک تو ہو؟ بس ہم گھر پہنچنے ہی والے ہیں۔“ اس نے کار دوبارہ اسٹارٹ کی اور اپنے گھر کے ڈرائیوے میں لا کر کھڑی کر دی۔

”کیا وہ تمہاری کار سے ٹکرایا تھا؟“

”وہ بھاگ گیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ زخمی ہوا ہوگا۔“

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں اسٹریٹ لائٹس نہیں تھیں البتہ سیکوئی کے لیے بتیاں جل رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

دو دن بعد صبح کے وقت میڈی لین اس کے دروازے پر آئی۔ جینی اس وقت نیٹ پر مقامی اخبار پڑھ رہی تھی جس میں ایک اور ڈکیتی کا ذکر تھا جو وہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہوئی تھی۔ تب ہی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ جینی نے دروازہ کھولا تو میڈی لین تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ وہ کافی بے چہن نظر آ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ ہنری دو دن سے غائب ہے۔ وہ ہمیشہ صبح کو آ جاتا تھا۔ اس نے پوچھا کہ وہ شاید کہیں بند ہو کر بیٹھا ہو۔

”ہم دیکھ لیتے ہیں۔“ جینی نے کہا۔

وہ گھر سے ہوتی ہوئی باغ میں گئیں اور شڈ میں دیکھا لیکن وہاں ہنری نہیں تھا۔ وہ پھلوں کے باغ کے آخری کونے تک گئیں اور اس کا نام لے کر کارا۔ جینی کو امید تھی کہ وہ جنگل کی طرف نہیں گیا ہوگا ورنہ خرگوش کے دھوکے میں کسی شکاری کی گولی کا نشانہ بن جاتا پھر انہیں ایک باڑے سے اس کی دردناک میاؤں سنائی دی۔ جینی نے گھنٹوں کے بل جبکہ کر شاخوں کو ہٹایا۔ ہنری پھلکس چپکا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

لگتا تھا کہ اس کی ٹانگ میں چوٹ آئی ہے اور وہ شدید تکلیف میں تھا۔ میڈی لین کے پاس کار نہیں تھی اور وہ بس یا اپنی بیٹی پر انحصار کرتی تھی جو اسے ہر شے خریداری کے لیے لے جاتی۔ لہذا جینی اسے اور ہنری کو اپنی کار میں جانوروں کے اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اسے کسی کار نے ٹکڑ مارا ہے اور اس کی ٹانگ کو ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ اسے آپریشن کے لیے دو دن اسپتال میں رکنا ہوگا۔

جینی اسے گھر چھوڑنے آئی تو میڈی لین نے اسے خاطر تواضع کے لیے روک لیا۔ اس کا سنگ روم جینی کے تصور کے عین مطابق تھا۔ وہاں بھاری فرنیچر، آرائشی چیزیں اور بچوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جب میڈی لین بچن سے کھانے پینے کا سامان لائی تو جینی اس کی جوانی کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مونچھوں والے شخص کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جس کے دوسرے ہاتھ میں ایک بندوق اور قدموں میں کتا بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ میرا شوہر ہے۔“ میڈی لین نے بڑے پیار سے کہا۔ جب جینی واپس جانے لگی تو میڈی لین نے گرم جوش سے اس کا ہاتھ میچ لیا۔ جینی نے بھی جواب میں ایسا ہی مظاہرہ کیا۔ اسے ایک دوست مل گئی تھی۔ گھر آ کر اس نے غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے سچ کرنے بیٹھ لی۔ اس دوران وہ یہی سوچتی رہی کہ اس کی گلی میں عام طور پر کاریں نہیں آتیں۔ جان کا کہنا تھا کہ اس کی کار کے آگے ایک بچو

آ گیا تھا۔ اگر وہ ہنری ہوا تو..... ہو سکتا ہے کہ کم روشنی میں جان کو نظر نہ آیا ہو اور وہ ہنری کو بوجھ بیٹھا۔ اسے یاد آیا کہ جان نے اس جانور کو دیکھنے کے باوجود کاریں روکی اور بچو کو گھر مارنے کے بعد ہی بریک لگا دیا، اگر وہ واقعی بچو ہی تھا۔

شام کو اس نے جان کو ہنری کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو اس نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا تاہم اس نے ہنری اور میڈی لین کو اسپتال لے جانے والی بات گول کر دی اور نہ ہی یہ بتایا کہ جب ہنری ٹھیک ہو جائے گا تو وہ اسے لینے اسپتال جائے گی۔ البتہ اس نے جان سے یہ ضرور پوچھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بچو ہی تھا۔ کہیں تم نے ہنری کو توکر نہیں ماری؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پورا یقین ہے ڈارلنگ۔ سیکورٹی لائسنس روشن تھیں اور میں نے واضح طور پر دیکھا تھا۔ وہ جانور بلی سے بہت بڑا تھا اور اس کی شکل بھی مختلف تھی۔“

وہ غسل کرنے گیا تو جینی بستر برلیٹ کر مقامی اخبار پڑھنے لگی۔ اس کی شہرخی تھی۔ ڈسٹنٹ میں ایک عورت کا پر اسرار قتل، کورسنٹ ساحل کے کنارے ایک چھوٹا سا خوب صورت ریسورٹ تھا۔ وہ بھی کھار وہاں جاتے تھے۔ اس نے خبر پڑھنا شروع کی۔ عورت کی لاش ایک خالی کمرے میں پائی گئی۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ابھی لاش کی شناخت نہیں ہو سکی۔ ابھی یہ واضح نہیں ہے کہ اس قتل کا تعلق ڈکیتی کی واردات سے ہے۔

جان غسل کر کے وہاں آئی اور بستر میں گھس گیا۔ اس نے معمول کے مطابق جیمیز چھانڈ شروع کر دی۔ جینی نے بھی گرم جوش سے جواب دیا اور کچھ دیر کے لیے وہ دنیا کو بھول گئے پھر وہ سو گیا اور جینی پہلو میں لیٹی اس کے خزانوں کی آواز سنتی رہی۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ دونوں میں بڑی محبت تھی اور وہ اس پر پورا بھروسہ کرتی تھی۔ ٹھیک ہے اسے بلیاں پسند نہیں تھیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہنری کو مار دے پھر اچانک ہی اسے خیال آیا کہ اگر جان کی گاڑی نے کسی جانور کو گھر ماری ہو تو اس کا کوئی نہ کوئی نشان کار پر ضرور ہوگا مثلاً خون یا کھال کے بال۔

وہ خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ سیزھیان اتر کر اس نے کوٹ پہنا اور پچھلے سے تارچ لے کر گھر سے باہر چلی گئی جہاں جان کی کار کھڑی تھی۔ اس نے تارچ روشن کر کے کار کے اگلے حصے کو غور سے دیکھا۔ اگلے پچھلے کے کنارے پر اس کی انگلیاں بالوں کے میچے سے

گھراہیں لگے کہ وہ خون آلود نہیں تھا لیکن بالکل سفید، ملائم اور ربڑی تھا۔

اگلے روز وہ اپنی میز پر بیٹھی کام کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جان کی کار سے ٹکرانے والا ہنری ہی تھا لیکن یقیناً اس نے جان بوجھ کر ہنری کو ٹکر نہیں ماری ہوگی۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ جان اتنا سنگ دل بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ اس نے کافی بتائی اور نیٹ پر اخبار پڑھنے لگی۔ اس عورت کے بارے میں مزید تفصیلات دی گئی تھیں۔ اس کی ابھی تک شناخت نہیں ہوئی تھی اور پولیس نے اس سلسلے میں لوگوں سے مدد کی اپیل کی تھی۔ اس کا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا، اس کے مطابق اس کی عمر تیس کے لگ بھگ، لمبے گہرے براؤن بال اور ہونٹوں پر تل کا نشان۔ اس کے دماغ میں گھٹنیاں بیٹنے لگیں لیکن کئی فون پر آنے والے ایک پیغام سے اس کی توجہ جھٹ گئی۔ ”بولون پہنچ گئی ہوں۔ تم سے جلد ملاقات ہوگی۔“

بہریت اس کی دوست تھی۔ وہ اس سے لچ میں ملنا چاہ رہی تھی۔ جینی نے اپنا کوٹ اور بیگ اٹھا یا اور اس سے ملنے چلی گئی۔ ان دونوں کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی جہاں جینی انگریزی اور بہریت فرانسیسی پڑھ رہی تھی۔ اب وہ خود انگریزی اور ویک اینڈ پر اپنے دوستوں سے ملنے تارمنڈی جا رہی تھی۔

”تم جان کے ساتھ خوش تو ہو؟“ بہریت نے پوچھا۔ لمحہ بھر کے لیے جینی الجھ گئی۔ وہ کیا کہتی کہ میرے شوہر نے بڑوں کے بلے کو جان بوجھ کر مار دیا۔ وہ کسی صورت میں بھی جان کے ساتھ نا انصافی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ بہریت اس کے شوہر کو اچھا سمجھے۔ اس کے کچھ دوست یہ سن کر بڑے حیران ہوئے تھے کہ وہ ایک ایسے شخص سے شادی کر رہی ہے جسے وہ صرف چند ماہ سے جانتی ہے تاہم بہریت جان کو شروع سے ہی پسند کرتی تھی۔ اسی وقت ایک شخص ان کی میز کے پاس آ کر رک گیا۔ ”جینی! ایسی ہو؟“

وہ جان کا پارٹنر آرنلڈ تھا۔ جینی نے بہریت سے اس کا تعارف کروایا۔ انہوں نے معاہدہ کیا اور کچھ رکھی جیلے ادا کیے۔ آرنلڈ کو بہریت کے لہجے پر بہت توجہ ہو تو جینی نے وضاحت کی۔ ”بہریت فرانسیسی پڑھاتی ہے۔“

”تم لوگ باتیں کرو۔ میں کچھ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ آج ہمارا ایک سودا ہو گیا ہے۔“

بے ضرا

سرکس کے میجر نے نوجوان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تمہیں نوکری چاہیے تو شہر کے بچرے میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ یہ شیر بالکل بے ضرر ہے۔“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”میں بھی دودھ پر پلا ہوں۔“

کون کن سورج

☆ لوگ تو ہماری خوشی میں شریک نہیں ہوتے..... غم میں کون شریک ہوگا۔

☆ اگر موت میں لطف نہیں تو بیچے کا انتظار کلف ہے۔

☆ دنیا کو ہٹانے والا تھانوں میں روتا بھی ہے۔

☆ ناپسندیدہ انسان سے پیار کرو، اس کا کردار بدل جائے گا۔

☆ اگر کیفیت یا یکسوئی نہ بھی میسر ہو تو نماز ادا کرنی چاہیے۔ نماز فرض ہے۔

☆ اس دوست کا گھر کر رہے ہو جو دھوکا دے گیا۔ گھر اپنی عقل کا کرو کہ دھوکا دینے والے کو دوست سمجھتے رہے۔

☆ سب سے پیارا انسان وہ ہوتا ہے جس کو پہلی بار دیکھنے سے دل کہتا ہو، میں نے اسے پہلی بار سے پہلے ہی دیکھا ہوا ہے۔

چند پسند سود مند

☆ خاموشی بغیر سخت کے بادشاہی ہے۔

☆ دعا مانگتے رہو کیونکہ دعا گناہوں کے داغ ایسے مٹاتی ہے جیسے راوا آب اپنے نشانہات۔

☆ روز و شب بامقصد طریقے سے گزارو ورنہ ایسے گرا جاؤ گے جیسے سوکھے ہوئے پتے۔

☆ اپنا غم کسی دوسرے کو مت سناؤ کیونکہ اس سے دشمن خوش، دوست پریشان اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

☆ باتوں کو لوگوں کی زبان ان کے قابو میں نہیں رہتی، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بولتے ہیں۔

☆ ہماری سب سے بڑی خوبی یہ بھی نہ مرنے میں نہیں بلکہ ہر دفعہ مرنے کے بعد اٹھنے میں ہے۔

☆ اور یہی کامیابی کا راز ہے۔

☆ مرسلہ: دوزیر محمد خان۔ محل ہزارہ۔

”کہیں تم اس بڑے ولا کی بات تو نہیں کر رہے جو دیر و کس میں واقع ہے؟“
 ”ہاں دی۔ ہم ابھی رجسٹرار کے یہاں سے آئے ہیں۔ ساری کارروائی بڑی تیزی سے مکمل ہوئی۔ دو مہینے کے اندر۔“

جینی سوچنے لگی کہ اس روز جان کس کو یہ مکان دکھانے گیا تھا، کیا اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی؟
 آرئلڈ نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا جہاں کچھ لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ”مجھے چلنا چاہیے۔“
 رخصت ہوتے وقت ہیریٹ نے جینی سے کہا۔
 ”جینی! اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے ضرور بتانا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“
 گھر آ کر جینی نے اپنی سائٹ کی ویب سائٹ کھولی۔ وہ ولا جو آج ہی فروخت ہوا، وہ سائٹ سے ہٹا دیا گیا تھا۔
 فرانس کا نظام انگلستان سے مختلف ہے۔ اگر فروخت کی کارروائی آج مکمل ہوتی ہے تو معاہدے کی رقم کا دس فیصد بطور ایڈوانس کئی ماہ پہلے جمع کر لیا ہوگا اور اس مکان کو مارکیٹ سے ہٹا دیا گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں کوئی اور ولا برائے فروخت نہیں تھا پھر جان اس رات گاہک کو کون سا مکان دکھانے گیا تھا جب وہ رات گئے دفتر میں کام کرتا رہا؟

اس نے سیاہیلی کا مجسمہ اٹھایا اور اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگی پھر اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ چھ بجے فارغ ہوئی تو اس نے یہ دیکھنے کے لیے ایک نظر اخبار پر ڈالی کہ شاید اس عورت کے بارے میں کوئی خبر ہو لیکن اس کے بجائے مصافحاتی علاقے میں ڈیکٹی کی ایک خبر نظر آئی۔ وہ جگہ اس کے گھر سے چند میل کے فاصلے پر تھی اور ڈاکو کسی وقت بھی یہاں آ سکتے تھے۔ وہ دن بھر اکیلی رہتی تھی اور پڑوس میں کچھ فاصلے پر صرف ایک بوڑھی عورت تھی۔ ان دنوں جلدی اندھیرا ہوجاتا تھا۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ جان جلدی گھر آ جائے۔

اس رات جینی کو ٹھیک طرح نیند نہیں آئی۔ یہی حال جان کا بھی تھا۔ وہ سانس کی تکلیف سے ایک سے زائد مرتبہ بیدار ہوا اور اسے ان ہیکلر استعمال کرنا پڑا۔ اگلے روز صبح جان کے جانے کے بعد وہ میڈی لین کو لے کر اسپتال گئی اور ہنری کوڈسٹارج کروا کر واپس لے آئی۔ میڈی لین نے ایک بار پھر اسے گھر میں آنے کے لیے کہا لیکن جینی نے منع کر دیا اور کہا کہ اب وہ شام چھ بجے اس کے گھر آئے گی۔ وہ جانتی

تھی کہ جان ساڑھے سات بجے تک گھر آتا ہے۔

سر پہر میں اس نے مقامی اخبار کی ویب سائٹ کھولی۔ اس عورت کی شناخت ہو گئی تھی جس کی لاش وینٹ کے مکان سے ملی تھی۔ خبر کے ساتھ اس کی بڑی سی تصویر بھی تھی، جینی کی نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ یقیناً یہ وہی عورت تھی جو اسے میوزیم میں ملی اور اس سے جان کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ عورت چھٹیوں پر وہاں آئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی شناخت میں دیر ہوئی۔ دراصل وہ بینرز میں رہتی تھی۔ اسے یاد آ گیا کہ اس عورت نے میوزیم میں بھی بینرز کا تذکرہ کیا تھا اور وہ غلطی سے جان کو دیکھ کر بھڑک اٹھی تھی۔

جینی نے گوگل پر بینرز کو تلاش کیا۔ وہ جنوبی فرانس میں اسپین کی سرحد کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی آبادی پچھتر ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ایک کونے میں وہاں پیش آنے والے اہم واقعات درج تھے۔ اس کی نظر ایک سرخی پر گئی جو کسی قتل کے بارے میں تھی۔ اس نے وہ لنک کھولا تو ایک مقامی اخبار کی خبر سامنے آ گئی۔ چار سال قبل ایک مقامی وکیل جین مائیکل کیزن گھر پہنچا تو اس نے اپنی بیوی کی لاش دیکھی۔ اس کی شادی صرف چھ ماہ قبل ہوئی تھی۔ بظاہر لگتا تھا کہ وہ ڈیکٹی کی مزاحمت کرتے ہوئے ماری گئی۔ خبر کے ساتھ نوٹیاں بتا جوڑے کی تصویر بھی تھی۔ مرد کی شکل جان سے ملتی تھی۔ البتہ بالوں کا اسٹائل مختلف تھا اور اس نے چشمہ لگایا ہوا تھا لیکن ناک اور چہرہ بالکل ایک جیسا تھا۔ اس نے خبر کو غور سے پڑھا اور اس کا ایک ایک لفظ ذہن میں بٹھالیا۔

اس نے ایک بار پھر تصویر دیکھی۔ اس عورت کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ وہ جان نہیں ہو سکتا۔ اس کا اپنا ایک پس منظر تھا۔ شادی میں آنے والے مہمان اسے جانتے تھے۔ اس نے ان مہمانوں کے بارے میں سوچا۔ وہ اپنی ماں کی موت کی وجہ سے زیادہ لوگوں کو بلا نا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں کا کوئی بڑا خاندان بھی نہیں تھا۔ جان کے والدین وفات پا چکے تھے اور اس کا کوئی بھائی بہن نہیں تھا۔ صرف ایک کزن امریکا میں رہتی تھی۔ اس نے شادی کے موقع پر ایک تحفہ اور کارڈ بھیجا تھا۔ اب یہ بات جینی کی سمجھ میں آئی کہ شادی میں شریک ہونے والے چند مہمان وہ تھے جن سے اس کی حال ہی میں بیس میں ملاقات ہوئی تھی۔ انہی میں آرئلڈ اور اس کی بیوی بھی شامل تھی لیکن یہ ایک احقانہ سوچ تھی۔ بیس آئے سے پہلے جان کی رہائش لین میں تھی۔

وہ سیزھیاں اتر کر اس چھوٹے سے شنگ روم میں گئی جو جان اپنے ہوم آفس کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس نے

دیکھا۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ اس کا شوہر غالباً ایک قاتل ہے۔ یہ ایک احقانہ بات ہوئی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ دونوں سیزھیاں چڑھ کر اوپر گئیں اور جینی نے لپ ٹاپ کھول کر مقامی اخبار کی ویب سائٹ پر جین مائیکل کیزن کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

”کیا اس کی شکل جان سے نہیں ملتی؟“
 ”ہاں۔ تو بڑی بہت۔“
 ”جین مائیکل کافی عرصے سے آن لائن نہیں ہے اور مجھے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا کہ جان چار سال سے کہیں گیا ہو۔ تم پوری خبر پڑھو۔“

ہیریٹ نے وہ خبر پڑھی۔ تبھی جینی کو یاد آ پا کہ بینرز ایک جانا بچھا تا نام کیوں لگا۔ ”کیا یہ وہی جگہ نہیں ہے جہاں تم معادن پتھر تھیں۔ کیا یہ واقعہ تمہارے ہوتے ہوئے پیش نہیں آیا؟“

”ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ لیکن جینی تم یہ سوچو کہ.....؟“
 ”یہ دونوں ایک ہی ہیں ہیریٹ اور مجھے اس کا یقین ہے۔ کیا ہوا اگر جین مائیکل نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا اور جان ہی جین مائیکل ہو؟“

”لیکن شوہر پر بیوی کے قتل کا الزام عام نہیں ہوا؟“
 ”اس کا کہنا ہے کہ جب گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گھر میں ڈیکٹی ہوئی تھی اور وہاں اس کی بیوی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ان دنوں اس علاقے میں ڈیکٹی کی وارداتیں ہو رہی تھیں اور یہاں بھی یہی ہو رہا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہیریٹ کو میوزیم میں لے والی عورت کے بارے میں بتایا۔
 ”یہ وہی عورت ہے جس کا خیال تھا کہ اس نے جان کو پہچان لیا ہے۔ وہ بھی قتل کر دی گئی۔“

وہ کہنا چاہ رہی تھی۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ میرے قتل کا منصوبہ بھی بنا رہا ہو۔“ لیکن وہ کہہ نہ سکی۔
 ”اوہ جینی۔ کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ جو کچھ جین مائیکل کے ساتھ پیش آیا۔ وہ محض حادثہ نہیں؟“

جینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کمپیوٹر اسکرین پر نوجوان لہجہ کی تصویر دیکھ رہی تھی، ہیریٹ نے کہا۔ ”لیکن اس کا شوہر قاتل نہیں ہو سکتا۔ اس کے پاس جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کا ثبوت موجود ہے۔ اس نے دفتر سے اپنی بیوی کو اس کی موت سے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا۔ کیوں نہ ہم ایک کپ چائے پی لیں۔ اس پر بعد میں سوچیں گے۔“

جب وہ دونوں سیزھیاں اتر کر نیچے آئیں تو جینی نے

فائل کینٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں زیادہ تر گھر کے بل تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کی ذاتی فائل کہاں ہے۔ اس نے میز کی دراز میں کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ مقفل تھیں۔ وہ واپس اوپر چلی گئی۔ باہر اندھیرا چھیل رہا تھا، اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور یوں لگا جیسے باغ میں کوئی درختوں کے درمیان کھڑا ہے لیکن شاید یہ اس کا وہم تھا کیونکہ جب اس نے دوبارہ دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس کے بارے میں آن لائن معلومات حاصل کروں۔ جب وہ پہلی بار جان سے ملی تو اسے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ سوئٹل میڈیا کا زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ جب اس نے گوگل کھولا تو وہاں فیس بک پر صرف اس کی اسٹیٹس اپنی ہی کا متوجہ تھا لیکن اس نے اپنا ذاتی اکاؤنٹ نہیں بنایا تھا۔ اب اس نے دوبارہ گوگل پر دیکھا لیکن اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

جینی نے جین مائیکل کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا چاہیں لیکن اس کے حوالے سے کوئی نئی بات نظر نہیں آئی۔ البتہ جس فرم میں وہ کام کرتا تھا، اس کے کچھ پرانے اشتہارات ضرور موجود تھے۔ اس کا بھی کوئی فیس بک اکاؤنٹ نہیں تھا۔

وہ تھک کر بیٹھ گئی اور اس بارے میں سوچنے لگی لیکن اس کا دماغ صحیح طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کسی پُر سکون جگہ بیٹھ کر غور و فکر کرنا چاہتی تھی، لیکن کہاں جائے؟ اس کا فیصلہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔ فی الحال تو اسے گھر سے باہر نکلنا تھا۔

جیسے ہی وہ سیزھیاں اتر کر نیچے آئی، شنگ روم میں روشنی پھیل گئی۔ وہ دم بخود بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جس سے باہر کی سیکورٹی لائٹس کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ دروازے کی کھنکی کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ یہ جان نہیں ہو سکتا، اس کے پاس بیرونی دروازے کی چابی تھی اور نہ ہی جینی نے کار کی آواز سنی تھی جینی نے ایک گھر اس لیا اور دروازے کی کھنکی سے جھانکنے لگی۔ وہاں ہیریٹ کھڑی تھی۔ جینی نے دروازہ کھول دیا اور اس سے لپٹ گئی۔

”مجھے تمہارے پاس آنا تھا۔“ ہیریٹ نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”میں کل ہی سمجھ گئی تھی کہ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔“
 ”اوہ ہیریٹ۔ میں بتا نہیں سکتی کہ اس وقت تمہیں یہاں دیکھ کر کتنی خوش ہو رہی ہے۔“
 ”کیا مسئلہ ہے مجھے بتاؤ؟“

جینی نے ہیریٹ کے پُر سکون چہرے کی طرف

کہا۔ ”تم نے اپنی کار کہاں چھوڑی ہے؟ میں نے گاڑی کی آواز نہیں سنی۔“
”وہ کچھ تنگ کر رہی تھی۔ اسے میں نے لین کے باہر ہی چھوڑ دیا۔“

وہ دونوں کچن میں گئیں اور جینی نے چائے کا پانی ایلنے کے لیے رکھ دیا لیکن کوئی بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ اس نے ہیریٹ کی طرف دیکھا جس نے ابھی تک باہر نکلنے کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں تک کہ دستانے بھی نہیں اتارے تھے۔
”کیا تم کوٹ نہیں اتار دو گی؟“ جینی نے پوچھا۔
”میں یونہی ٹھیک ہوں۔“

جینی کے ذہن میں سوال ابھرا۔ ”کیا وجہ ہے کہ ہیریٹ دستانے نہیں اتارتی؟“ پھر اسے اخبار میں شائع ہونے والی خبر کا خیال آیا جس میں جین مائیکل کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی تھیں پھر ہیریٹ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ دونوں باتیں ایک ساتھ اس کے ذہن میں آئیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ یہ واضح نہیں تھا۔ اس کی سوچ کا دائرہ پھیلتا چلا گیا اور پھر جو منظر نامہ ابھرا، وہ ناقابل یقین تھا۔

اسے جان کے بارے میں سوچ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اس کے بارے میں پہلے سے سب کچھ جانتا تھا اور جینی سے ملنے سے پہلے ہی اسے معلوم تھا کہ وہ ایک دولت مند عورت ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جان نہیں بلکہ ہیریٹ اسے قتل کرنے آئی ہے۔

جائے گا پانی گرم ہو گیا تو بجلی کی کیتلی سے ایک سیٹی نما آواز نکلی جس نے خاموشی کا سینہ چیر دیا۔ ہیریٹ کا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی جیب میں گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے کچن کے سلیب پر رکھی ہوئی جینی کی کار کی چابی اور اس کا موبائل اٹھالیا۔

”میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔“ اس نے وضاحت پیش کی۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح پرسکون تھا لیکن اب وہ ایک مختلف عورت تھی۔

اسی وقت دروازے کی کھٹکی بجی۔ ”یہ کون آ گیا؟“ ہیریٹ نے کہا۔
ایک لمحے کے لیے جینی بھی نہ سمجھ سکی پھر اسے یاد آ گیا۔ ”یہ پردوس میں رہنے والی میڈیلیں ہوگی۔ میں نے اسے مدعو کیا تھا۔“

”اس کو بھی اسی وقت آتا تھا۔ تم دروازے پر جا کر

اس سے معذرت کرو اور کہو کہ آج تمہاری طبیعت خراب ہے۔ اس لیے اس کی خاطر تو اسے نہیں کر سکتیں۔ بجائے یا ہوشیار بن دیکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اس کے ساتھ تمہیں بھی گولی بارودوں کی۔“

کھٹکی دوبارہ بجی تو ہیریٹ نے سختی سے کہا۔ ”جاؤ اور اس سے جان چمراؤ۔“

جینی کو اس کے رویے پر بڑی حیرت ہوئی لیکن اسے ہیریٹ کے کہے الفاظ پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس نے کبھی ایسی بات نہیں کہی جس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کیا وہ کسی طرح میڈیلیں کو ممکنہ خطرے کے بارے میں کوئی اشارہ دے سکتی ہے؟

میڈیلیں دروازے کے باہر کھڑی ہمیشہ کی طرح پرسکون نظر آ رہی تھیں۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ جینی نے پھلتے ہوئے کہا۔ ”سر میں درد ہے۔“

میڈیلیں نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا اور جب جینی نے دوسرے دن آنے کی تجویز پیش کی تو اس نے تائید میں سر ہلادیا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ جینی نے اسے آنکھوں کے ذریعے پیغام دینے کی کوشش کی لیکن میڈیلیں کی آنکھوں میں اس کے لیے صرف ہمدردی تھی۔ وہ جانے کے لیے مڑی اور جینی نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے آخری موقع بھی گنوا دیا تھا۔

ہیریٹ کچن سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ”آؤ بیٹھ جاؤ۔“ پھر اس نے کھڑکی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”دس منٹ میں فون کی کھٹکی بجے گی۔ جان کا اسسٹنٹ یہ بتانے کے لیے فون کرے گا کہ تمہارا شوہر کسی پارٹی کو مکان دکھانے گیا ہے اور در سے گھر آئے گا۔ میڈیلیں کی گواہی بھی بہت اہم ہوگی۔ وہ تصدیق کرے گی کہ جب وہ آئی تو تم اس وقت زندہ تھیں۔“

وہ دونوں کافی کی میز پر آئے سانسے بیٹھی ہوئی تھیں اور درمیان میں فون رکھا ہوا تھا۔ ہیریٹ نے ابھی تک کوٹ کی جیب سے ہاتھ نہیں نکالا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ جینی کی نظر پورا پورا پر جائے۔

”تم نے مجھے کب سے نظروں میں رکھا ہوا تھا؟“ جینی نے پوچھا۔ ”یقیناً جان اس ارادے سے بولون نہیں آیا ہوگا۔“

ہیریٹ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ محض ایک اتفاق تھا لیکن تمہاری ماں کی موت کے بعد ہمیں اس

منصوبے پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔“
فرامیسی قانون وراثت کے تحت والدین کے مرنے کے بعد بچے اس کے ترکے میں بچیس فیصد کے حق دار ہوتے ہیں۔ جینی کے والدین مر چکے تھے اور اب اس کا سارا ترکہ جان کے حصے میں آتا۔

جینی کی پہلی چوٹ گئی۔ یہ محض خوف کی وجہ سے نہیں تھا۔ کمرے میں اچانک ہی خشکی کی لہر دوڑی۔ ہیریٹ نے بھی یقیناً اسے محسوس کیا ہوگا اور اس نے اپنے کوٹ کا کارل بند کر لیا تاہم اس نے جب سے ہاتھ نہیں نکالا۔ کیا کمرے کی کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی؟

ہیریٹ کی پشت کچن کے دروازے کی طرف تھی۔ لہذا جو کچھ جینی نے دیکھا، وہ اسے نظر نہیں آیا۔ کچن کا دروازہ دھیرے دھیرے کھل رہا تھا۔ اسے جینی کے چہرے پر حیرت کے آثار محسوس ہوئے۔ مڑ کر دیکھا تو میڈیلیں ایک شکاری بندوق لیے کھڑی ہوئی تھی اور اس کی نال کارخ ہیریٹ کی جانب تھا۔

اسی وقت فون کی کھٹکی بجی۔ جینی نے لپک کر میڈیوراٹھا لیا اور ہڈیائی انداز میں چلاتے ہوئے بولی۔ ”ہیریٹ..... یہاں ہیریٹ موجود ہے۔“

ہیریٹ کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو میڈیلیں نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور ہیریٹ کے ہاتھ سے ریوالتور نیچے گر گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنا بازو پکڑ لیا۔ ریوالتور جینی کے قریب پڑا ہوا تھا۔ میڈیلیں جینی کو اشارہ کر کے چلا رہی تھی لیکن جینی ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکی اور اسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ آگے کی طرف جھکی اور اس نے ریوالتور اٹھالیا۔

ہیریٹ شدید تکلیف میں مبتلا تھی۔ اس نے میڈیلیں کی طرف دیکھا اب اس کے پاس اپنے بھانڈوں کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میڈیلیں کی آنکھوں میں سفاکی دیکھ کر اس نے پسا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بیرونی دروازے تک گئی اور اس نے کھست تسلیم کرنے کے انداز میں اپنا بازو اوپر اٹھالیا۔

اس سے پہلے کہ جینی کچھ سمجھ سکتی، ہیریٹ دروازے سے باہر جا چکی تھی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو جینی اس جانب لپکی۔ ایک گاڑی کا انجن غرایا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ چند لمحوں میں اس کی عقبی روشنیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ہیریٹ اس کی کار میں فرار ہوئی تھی۔ اگلے پلے جب جینی اپنا سامان باعہر دیکھی تو اس پر

انکشاف ہوا کہ جان بلیوں سے ڈرنے میں حق بجانب تھا۔ وہ ہیریٹ کی شکر گزاری میں جس کی وجہ سے جان کی موت واقع ہوئی۔

ہیریٹ گاڑی چلاتی ہوئی اس مکان تک گئی جہاں جان جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی کا ثبوت دینے کے لیے ایک گاڑی کو لے کر گیا تھا۔ ہیریٹ کے بازو سے بری طرح خون بہہ رہا تھا۔ لہذا جان نے اسٹیرنگ دھکیل سنبھال لیا۔ وہ جیس کی جانب جا رہے تھے کہ جینی کی کار میں رہ جانے والے ہماری کے بالوں کی موجودگی محسوس کر کے جان کو نیسے کا دورہ پڑ گیا۔ گاڑی اس کے قابو سے باہر ہوئی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ ہیریٹ کو نسبتاً کم چوٹیں آئیں لیکن اسے کافی عرصہ ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد اس کی بقیہ عمر جیل میں گزرے گی کیونکہ اس نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ جان کی پہلی بیوی اور میوزیم میں جینی سے ملنے والی عورت کو اس نے جان کے کہنے پر قتل کیا تھا کیونکہ اس نے جان کو پہچان لیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس کی اصلیت ظاہر نہ کر دے۔ ہیریٹ نے یہ بھی اعتراف کیا کہ وہ شروع دن سے ہی جان کو چاہتی تھی اور جان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جینی کی دولت ہاتھ آئے کے بعد وہ اس سے شادی کر لے گا۔

جینی نے سوٹ کیس بند کیا۔ وہ واپس لندن جا رہی تھی۔ اس نے آرنلڈ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس مکان کی فروخت کا بندوبست کرے۔ دروازے کی کھٹکی بجی۔ وہ سیزرھیاں اترنے ہی والی تھی کہ اسے خیال آیا کہ وہ کچھ بھول گئی ہے۔ وہ واپس اسٹڈی میں گئی اور مسرری بیلی کا مجسمہ اٹھالیا جو عورتوں کی محافظ ہی نہیں بلکہ محبت اور خوشی کی دیوی بھی ہے۔ اس وقت جینی اپنے آپ کو اس مریضہ کی طرح کمزور محسوس کر رہی تھی جو طویل بیماری سے ابھی ہو اور اسے صحت یاب ہونے میں وقت لگے گا لیکن اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر سکے گی۔

اس نے وہ مجسمہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا اور سیزرھیاں اترتی ہوئی نیچے گئی جہاں دروازے پر آرنلڈ اور میڈیلیں اسے آرنلڈ پورٹ لے جانے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میڈیلیں کا شکر یہ ادا کیا جس کی بروقت مداخلت سے ہیریٹ تیسری بار اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔

ناکتلے

ملک صنفِ درحیات

زن، زن زمین کو ازل سے فتنہ و فساد کی جڑ تصور کیا جاتا رہا ہے اور شاید ابد تک ایسا ہی سمجھا جاتا رہے گا... کیونکہ ان کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات اور ضمیر سے بہت گہرا ہوتا ہے اور جانے کب جذبات کے دریا میں طغیانی آجائے، جانے کب احساسات اپنی سمت بدل ڈالیں اور جانے کب ضمیر نیند کے ہلکورے لیتا لیتا سو جائے مگر... قدرت اپنا کام مخصوص رفتار سے جاری رکھتی ہے اور جہاں کسی کے قدم لڑکھڑائے... اسے درست سمت چلانے کے لیے ایسا عبرتناک سبق ترتیب دیتی ہے کہ ساری دلفریب خوش گمانیاں ایک بھیانک فریب میں ڈھل کر مجرم کو دنیا کے سامنے عبرت کا نشان بنا دیتی ہے... وہ جو ناک تلے جذبات کے طوفان میں بہے جارہے تھے اچانک بھنور میں پھنسے تو احساس ہوا کہ مردہ ضمیری نے انہیں کس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

عشق کے نام پر دیوانگی میں بسنے والوں کی لرزہ

خیز روداد

مکھور سب سے زیادہ کام کا بندہ لگا تھا لہذا تھوڑے ہی عرصے میں اس کے ساتھ میری ابھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ وہ ایک باشعور، ذہین اور محنتی پولیس افسر تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

”ملک صاحب! خبر بڑی سنسنی خیز ہے۔“

اس کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کر سوال کیا: ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

اس سے پہلے کہ مکھور میرے سوال کا جواب دیتا، ایک کانشیل ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ مکھور سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”آپ ٹھنڈا پانی پیئیں، پھر بتاتا ہوں۔“

اے ایس آئی کا انداز میرے اندر جس جگا چکا تھا۔ جب میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے تھانے کے برآمدے میں چند افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ابھی مکھور حسین نے جس سنسنی خیز خبر کا ذکر کیا تھا، اس کا تعلق یقیناً انہی افراد سے تھا۔

گندم کی کٹائی چل رہی تھی۔ جو لوگ کاشت کاری کے حوالے سے معلومات رکھتے ہیں، ایسے واقفان حال بہ خوبی جانتے ہیں کہ گندم کی کٹائی کے وقت موسم گرما شباب پر ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی تھا ہوا دن تھا۔

ان دنوں میری تعیناتی نوشہرہ درگاں کے تھانے میں تھی۔ میرا تھانہ مذکورہ موضع سے باہر ٹھوڑے فاصلے پر سڑک کے کنارے واقع تھا۔ رہائش حسب معمول تھانے کے عقبی حصے میں ہے۔ ہونے سرکاری کوارٹر میں تھی۔ جب میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو تیز چمکی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ صبح کا وقت تھا لیکن دھوپ کی حدت اور موسم کی شدت سے ایسا محسوس ہوتا تھا گو یا سورج سوائیز پر اتر آیا ہو۔۔۔!

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد مکھور حسین سے پوچھا۔ ”کیا خبریں ہیں؟“

مکھور حسین اے ایس آئی تھا۔ اس تھانے میں مجھے

میں نے صرف ایک گلاس پانی پر اکتفا کیا اور منگھوڑی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”اب بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟“

”معاملہ کافی سنگین ہے ملک صاحب۔“ وہ سمجیر انداز میں بولا۔ ”نوشہرہ درکار گاؤں میں قتل کی ایک واردات ہوئی ہے۔ مقتول کا باپ اور گاؤں کے دو افراد اسی سلسلے میں باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں موقع واردات پر فوراً پہنچنا ہوگا۔“

”تو کچھ، تمہارا انتظار ختم ہو گیا۔“ میں ایک جھکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بانی باقی راتے میں ہوں گی۔“ نوشہرہ درکار جانے کے لیے منگھوڑی حسین نے ایک تانگے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جولوگ اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے آئے تھے، ہم نے انہیں بھی تانگے پر سوار کیا اور فوراً سے پیشتر موضع نوشہرہ درکار کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہمارے بیچ جو کھٹکھو ہوئی، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

مقتول کا نام آفتاب تھا۔ مقتول، فیاض علی کا بڑا بیٹا تھا۔ آفتاب سے چھوٹا ذوالفقار تھا جس کی عمر تین سال تھی۔ مقتول آفتاب اپنے بھائی سے دو سال بڑا تھا۔ آفتاب کی شادی ایک ماہ پہلے ہوئی تھی۔ مقتول کا باپ فیاض علی ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ نوشہرہ درکار میں اس کے پاس دس ایکڑ اراضی تھی۔ دونوں بیٹے کا شکاری میں باپ کی مدد کرتے تھے۔ میرا تھانا گاؤں کے نزدیک ہی واقع تھا لہذا چند منٹ میں ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

وہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا ڈیرا تھا جو کھیتوں کے اندر بنا ہوا تھا۔ مذکورہ ڈیرا فیاض کی اراضی کا ہی حصہ تھا۔ دونوں کمروں کے آگے ایک کشادہ مگن تھا جس کے ایک حصے میں کئی ہوئی گندم کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس ڈھیر کے کھل رقبہ میں سے بچیں سر ملے ہوگا۔ کراچی کے رہائشی جاسو گزرتھ لیں۔ یہ نسبتاً ایک چھوٹا ڈیرا تھا کمروں ایکڑ اراضی کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ فیاض علی کی رہائشی میں، میں ڈیرے کے عقبی حصے میں سہنے ہوئے کمروں میں سے ایک کے اندر پہنچ گیا۔ مقتول آفتاب کی لاش اسی کمرے کے اندر موجود تھی۔ کمرے کے ایک حصے میں ایک چارپائی پھی ہوئی تھی۔ آفتاب کی لاش مذکورہ چارپائی کی پائنتی کی طرف کمرے کے فرش پر پڑی تھی۔

میں نے اکڑوں پیچہ کر بغور لاش کا جائزہ لیا۔ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ

آفتاب اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ وہ منہ کے ٹل کمرے کے کچے فرش پر بے بس وحشت پڑا تھا۔ اس کے منہ کے پیچے اور سر کے نزدیک نیم دائرے کی شکل میں خون کا ایک ننھا سا تالاب بنا ہوا تھا۔ لاش کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ مذکورہ خون مقتول کی کھوپڑی میں سے نکل کر نیم دائرے کی شکل میں فرش پر پھیل گیا تھا۔ مقتول کی کھوپڑی کا عقبی حصہ بری طرح زخمی تھا۔ بادی انٹھریں میں کچھ بھیج میں آتا تھا کہ کسی شقی القلب شخص نے کسی آہنی چیز کی مدد سے مقتول کے سر کے عقبی حصے کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ وار اتنا کاری ثابت ہوا کہ مقتول آن واحد میں منہ کے بل زمین یوں ہو گیا اور پھر اسے ہلکی سی جتنب کا بھی موقع نہ مل سکا۔ زمین پر گرتے ہی وہ اس جہان سے اس جہان میں منتقل ہو گیا تھا۔

میں نے مقتول کے سر کے عقبی حصے کا بڑی توجہ سے معائنہ کیا۔ کھوپڑی بری طرح کٹی گئی تھی۔ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ اپنے دل میں مقتول سے شدید نوعیت کی نفرت رکھتا تھا۔ کمرے کے فرش پر پھیلے ہوئے خون کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس خونچکاں واقعے کو پیش آئے چار پانچ گھنٹے ہی گزرے تھے۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔ میرے مطابق اندازے کے مطابق، مقتول آفتاب کو کچھ پانچ اور چھ بجے کے درمیان موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

میں نے لاش والے کمرے کی تسلی بخش تلاشی لی لیکن مجھے کہیں بھی آلہ قتل یا کوئی بھی ایسی اہم چیز نہیں ملی جو اس واردات پر روشنی ڈالتی یا قاتل تک میری راہنمائی کا وسیلہ بنتی ہو۔ میں نے اس کمرے سے ملحقہ دوسرے کمرے کا بھی تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کمرے میں مختلف نوعیت کے زرعی آلات رکھے ہوئے تھے اور ایک کونے میں بیج والی بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

میں نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا پھر جائے واردات کی ضروری کارروائی کے بعد مقتول آفتاب کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے منگھوڑی اسپتال روانہ کر دیا۔ اسے اس کی منگھوڑی حسین کو میں نے لاش کے ساتھ اسپتال بھیج دیا تھا۔

جب ہم اس ڈیرے پر پہنچے تھے تو ڈیرے کے باہر درجن بھر افراد جمع تھے۔ ان سب کے چروں پر خوف و ہراس کو یہ آسانی دیکھا اور پڑھا جاسکتا تھا۔ ظاہر ہے، قتل کی واردات کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا۔ گاؤں والوں کا پریشان ہونا عین فطری تھا۔ لاش کو سب سے پہلے مقتول کے باپ فیاض علی نے دیکھا تھا لہذا میں نے تفتیش کا آغاز بھی اسی سے کیا۔

تالک تیل

”فیاض علی! مجھے تمہارے جوان بیٹے کی المناک موت کا افسوس ہے۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد آفتاب کے قاتل کو قتل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دوں گا لیکن اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔“

”میں تعاون کروں گا جی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میرا بیٹا جان سے گیا ہے۔ جب تک آفتاب کا قاتل پکڑا نہیں جاتا، میں سکون کی سانس نہیں لے سکوں گا۔“

”میں تمہاری کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں فیاض علی۔“ میں نے غم بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے بتاؤ، آفتاب کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا میرا صاحب۔“ وہ رہنمائی ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”آفتاب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟“ ”تمہارا صاحب آفتاب تو بڑا ہی پھلے مٹاں انسان تھا۔“ وہ گھوگھرا آواز میں بولا۔ ”دشمنی تو بہت دور کی بات ہے جی۔ اس کا تو آج تک کسی سے جھگڑا ہی نہیں ہوا تھا۔“

”فیاض علی! تم نے اپنے بیٹے کی لاش دیکھی ہے نا۔“ میں نے اس کی اداس آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”آفتاب کو جس بے دردی سے قاتل کے گھاٹ اتارا گیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کو تمہارے بیٹے سے بہت سخت ہیر تھا۔“

”میں اس کے کسی دشمن کو نہیں جانتا جناب۔“ وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔“

اس کے لہجے سے سچائی کی مہک آتی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”فیاض علی! مجھے قاتل کی تلاش کے لیے کسی نہ کسی اشارے کی ضرورت ہے۔ میں نے قانون کا جو سبق پڑھ رکھا ہے اس کی روشنی میں کوئی کسی کو خوار خواہ فی قتل نہیں کر دیتا۔ اگر تمہیں کسی پر شک ہے تو بتا دو تاکہ میں جلد از جلد تمہارے بیٹے کے قاتل تک رسائی حاصل کر سکوں۔“

”اگر مجھے کسی پر شک ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں تو خود یہی چاہتا ہوں کہ آپ آفتاب کے قاتل کو گرفتار کر کے میرے تاک سزا دلوا دیں۔“

”یہ تو مجھے کتنا ہی ہے۔“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”تم نے کتنے بجے آفتاب کی لاش دریافت کی تھی؟“

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ وہ

روزانہ صبح آٹھ بجے تک کھیتوں میں جاتا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے اس سے کافی پہلے گھر سے نکل جاتے تھے۔ آفتاب عموماً صبح پانچ بجے اور اس کا چھوٹا بھائی ذوالفقار عرف زلفی چھ بجے تک کھیتوں میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ جب وہ خود گھر سے نکلتا تو بیٹوں کا ناشا بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

”کیا آج بھی تم آٹھ بجے ہی گھر سے نکلے تھے؟“ ”جی.....! اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”اور تمہارے دونوں بیٹے اس سے پہلے کھیتوں کی جانب روانہ ہو چکے تھے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”دونوں نہیں، آج صرف آفتاب ہی کھیتوں کی طرف گیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور زلفی.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”زلفی کی رات سے طبیعت خراب ہے۔“ فیاض علی نے بتایا۔ ”جب میں کھیتوں کی طرف آ رہا تھا تو زلفی گھر میں پڑا سو رہا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں جس آفتاب کے لیے ناشا لے کر جا رہا ہوں وہ مجھ سے بہت دور جا چکا ہے۔“

اس کی آواز بھیگ گئی۔ میں نے چند لمحات کے لیے اسے آزاد چھوڑ دیا۔ جوان بیٹے کی موت نے اس کے اعصاب کو توڑ چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان لمحات میں، میں سوچ رہا تھا کہ اس عورت کی کیا حالت ہوگی جو ایک ماہ پہلے اس گھر میں بہو بن کر آئی تھی۔ مقتول آفتاب کی نوبت پتا یہی کہ نام خالہ معلوم ہوا تھا۔ خالہ، آفتاب کے تایا کی بیٹی تھی۔

میں نے منگھوڑی کو لاش کے ساتھ روانہ کرتے وقت ہدایت کر دی تھی کہ وہ قاتل کے کسی کا نشیمل کو میرے پاس بھیج دے۔ سرکاری اسپتال کا راستہ میرے قاتل کے سامنے سے گزرتا تھا۔ اسے ایس آئی نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کا نشیمل ساجد کو جائے وقوعہ پر بھیج دیا تھا۔ میں نے آتے ہی ساجد کو کام پر لگا دیا۔

”تم اس ڈیرے کے اندر اور باہر اچھی طرح گھوم پھر کر ایک ایک چیز کا جائزہ لو۔“ میں نے ساجد سے کہا۔ ”اور اگر کچھ بھی اہم اور غیر معمولی نظر آئے تو فوراً مجھے رپورٹ کرو۔“ ”اوکے سر۔“ ساجد نے فرماں برداری سے کہا اور کام میں جت گیا۔

فیاض علی کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو میں نے تفتیش کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا۔ ہونے سوال کیا۔ ”آج آٹھ بجے صبح جب تم ناشا لے کر ڈیرے پر پہنچے تو تم نے اپنے بیٹے کو کون میں سر رکھے جسے وحشت پایا۔ کسی نے آفتاب کو قتل کر دیا تھا۔

پھر تم اس واقعے کی رپورٹ درج کرانے تھانے چلے آئے تھے..... ہیں نا؟“

”آپ کی بات کافی حد تک درست ہے لیکن.....!“

اس نے جملہ ادھر اچھوڑا تو میں نے پوچھا۔ ”لیکن کیا فیاض علی؟“

”بات دراصل یہ ہے جناب کہ میں گھر سے سیدھا کھیتوں کی طرف جاتا ہوں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کیونکہ دونوں بھائی کھیتوں ہی میں مصروف ہوتے ہیں۔ آج بھی میں نے کھیتوں ہی کا رخ کیا تھا۔ ہم نے کل جہاں پر کٹائی کا کام چھوڑا تھا، آفتاب کو وہیں سے آج کام شروع کرنا تھا لیکن جب میں مذکورہ مقام پر پہنچا تو آفتاب مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے کھیتوں میں ہر طرف نگاہ دوڑائی مگر وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد ہی میں ڈیرے کی طرف آیا تھا اور پھر.....“

وہ ایک مرتبہ پھر وہاں ہانسا ہو گیا۔ بیٹھے کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈب آتی تھیں۔ میں نے اپنا تہ بھرے انداز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے، آفتاب کسی ضروری کام سے ڈیرے کی طرف آ گیا ہو۔“

”نہیں جناب.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”سوال یہ پیدا نہیں ہوتا فیاض علی؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔

”کس چیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا فیاض علی؟“

”جناب! آپ نے آفتاب کے جسم پر جو لباس دیکھا ہے نا، یہ وہی پکڑے ہیں جو وہ گھر سے پہن کر نکلا تھا.....“ اس نے سختی خیز انداز میں جواب دیا۔

”تو.....“ میں نے ابھمن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

”اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟“

”تھانیدار صاحب! میرا آفتاب دوسرے لوگوں سے بہت مختلف تھا۔“ وہ ایک پوچھ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”کھیتوں کے اندر اس کا لباس عام کھیت مزدوروں والا ہوا کرتا تھا لیکن کھیتوں کے باہر وہ اپنے پھتاوے کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ وہ جب بھی کھیتوں کا رخ کرتا تو سب سے پہلے اس ڈیرے پر آتا تھا۔ یہاں وہ لباس تبدیل کرتا اور پھر کھیتوں میں جا کر اپنے کام میں جت جاتا تھا۔ شام کو جب ہم کام کو ختم کرتے تو وہ ایک بار پھر ڈیرے پر آ کر لباس تبدیل کرتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا تھانیدار صاحب۔“

میں نے اس کی بات کی تہ میں اترتے ہوئے کہا۔ ”تو تم

یہ کہنا چاہتے ہو کہ آج آفتاب کھیتوں کی طرف جا ہی نہیں سکا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ لباس تبدیل کر کے اپنے کام میں مصروف ہوتا، کسی نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا.....“

”جی..... جی.....“ وہ سر کو اٹھائی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ میرے نکتے کو سمجھ گئے ہیں تھانیدار صاحب۔“

فیاض علی کی بات کو میں نے اس لیے بھی درست مان لیا کہ مقتول آفتاب کے بدن پر میں نے صاف ستر لباس دیکھا تھا۔ علاوہ ازیں کمرے کی ایک دیوار پر مجھے آفتاب کا کھیت مزدوروں والا لباس ایک کھوٹی پر لٹکا دکھائی دیا تھا۔

”ہوں.....“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر کبھی انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل، آفتاب کی آمد سے پہلے اس ڈیرے پر موجود تھا.....!“

”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ بد بخت آفتاب کے ساتھ ہی یہاں پہنچا ہو۔“ وہ قیاس آرائی کرنے والے انداز میں بولا۔

”نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا۔“ میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ”میں نے لاش کا شبہ غور جائزہ لیا ہے۔ قاتل نے آفتاب کی بے خبری میں عقب سے اس پر وار کیا تھا اور ایسا کاری وار کر کہ آفتاب کو اپنے پچاؤ کے لیے ایک لمحے کی مہلت نہ مل سکی۔ اگر قاتل، آفتاب کے ساتھ اس ڈیرے پر پہنچا ہوتا تو پھر وہ اتنی آسانی سے آفتاب کی جان نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ قاتل کمرے میں پہلے سے موجود تھا۔ قبل اس کے کہ آفتاب لباس تبدیل کرتا، قاتل کا داؤ چل گیا۔“

”لیکن ڈیرے کے دونوں کمرے اور داخلی دروازے ہم بند کر کے گھر جاتے ہیں اور تینوں دروازوں پر تالے بھی لگاتے ہیں۔“ وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کوئی بند کمرے میں پہلے سے کیسے مٹھ سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی ڈیرے کی دیوار پھلانگ کر اندر مٹھن میں کود جائے..... پس!“

میں فیاض علی کو حیران و پریشان چھوڑ کر دوبارہ اس کمرے میں آ گیا جہاں آفتاب کو بڑی سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میں دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کمرے میں داخلے کے لیے دروازے کے سوا اور کوئی راستہ بھی تھا یا نہیں۔ کمرے کے اندر پہنچتے ہی میری نگاہ ایک کھڑکی پر پڑی۔ مذکورہ کھڑکی کا سائز تین بائی تین فٹ رہا ہوگا۔ یہ دوپٹ والی ایک عام سی چوبی کھڑکی تھی جو اندر کی جانب کھلتی تھی۔ اس وقت کھڑکی کے پٹ بھڑے ہوئے تھے لیکن اس میں کٹڑی یا تالا وغیرہ

نالت تھے

لٹک لگا ہوا تھا۔

فیاض علی بھی میرے پیچھے ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ میں نے کمرے کی عقبی دیوار میں داغ واحد کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استفسار بہ انداز میں کیا۔

”اگر آپ لوگ کمرے کے دروازے پر تالا لگا کر جاتے ہو تو کوئی بندہ اس کھڑکی کے راستے بھی تو کمرے کے اندر داخل ہوسکتا ہے..... اور یہ کھڑکی کھلی ہوئی بھی ہے..... اس پر کٹڑی نہیں لگی ہوئی؟“

”حیرت ہے.....“ وہ بے یقینی سے کھڑکی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ایسی کھڑکیاں دونوں کمروں میں موجود ہیں لیکن ہم ڈیرے سے رخصت ہوتے وقت کھڑکیوں کو کٹڑی لگانا بھی نہیں بھولتے، خاص طور پر یہ کھڑکی کیونکہ دوسرے کمرے کی کھڑکی عموماً بند ہی رہتی ہے۔ وہاں زرعی آلات اور دوسرا قیمتی سامان رکھا ہوا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کمرے کی کھڑکی کھلی کیسے رہ گئی۔“

”ہوسکتا ہے، کل تم لوگ یہ کھڑکی بند کرنا بھول گئے ہو۔“ میں نے مذکورہ کھڑکی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور قاتل کھلی کھڑکی کے راستے اندر آ گیا۔“

میں نے کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ دور تک کھیت نظر آئے۔ میں نے گردن باہر نکال کر کھڑکی کے زریں حصے کا جائزہ لیا۔ زمین سے کھڑکی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ کوئی بھی شخص بہ آسانی کھڑکی کے راستے کمرے تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ کھڑکی میں کسی بھی نوعیت کی سلاخیں یا کوئی جالی وغیرہ لگی ہوئی نہیں تھی۔ ڈیرے کی عقبی دیوار اور کھیتوں کے بیچ میں پانچ چوٹ چوڑا ایک تالا گزرتا تھا جس کے اندر نیلا پانی رواں دواں تھا۔ یہ تالا کھیتوں کی سیرابی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس تالے کے کنارے اور کھڑکی والی دیوار کے درمیان لگ بھگ ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر کھڑکی پر چڑھنا اور پھر کمرے کے اندر کودنا کوئی مشکل کام نہیں تھا بے شرط یہ کہ مذکورہ کھڑکی کو اندر سے کٹڑی نہ لگائی گئی ہو۔

میں نے کھڑکی کو بند کر کے اندر سے کٹڑی لگا دی پھر مقتول کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فیاض علی! اب میں تمہارے گھر چلوں گا۔“

”گھر..... وہ کس لیے جناب؟“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”وہ اس لیے فیاض علی کہ تم تو اس واردات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے، تمہارے گھر کے افراد میں سے کوئی قاتل کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ تمہارے گھر میں کل کتنے افراد ہیں؟“

”میرے علاوہ میری گھر والی سلطانہ ہے، آفتاب کی بیوی..... میرا مطلب ہے، بیوہ خالدہ اور میرا چھوٹا بیٹا ذوالفقار عرف زلفی۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

”لیکن میرا خیال ہے، وہ لوگ بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے ہوں گے۔“

”مجھے تمہارے اس خیال پر کوئی اعتراض نہیں فیاض علی۔“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں قانون کے تقاضے پورے کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ کیا تم اس بات میں کوئی قیاحت محسوس کر رہے ہو کہ میں تمہارے افراد خانہ سے چند سوالات کروں؟“

”ہرگز نہیں جناب.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ ضرور میرے ساتھ گھر چلیں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ آفتاب کا قاتل جلد از جلد گرفتار ہو جائے۔“

فیاض علی کے تعاون بھرے انداز کے بعد میں نے ڈیرے کے دونوں کمروں کی کھڑکیوں کو اچھی طرح چیک کر کے اندر سے کٹڑی لگائی پھر جانے دوئے والے کمرے کے دروازے پر سرکاری تالا لگانے کے بعد فیاض کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ زرعی آلات والے کمرے پر جوتا لگا ہوا تھا، میں نے اسے تبدیل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے اس کے اندر موجود کھیتی باڑی کے آلات کو اچھی طرح چیک کر لیا تھا۔ خصوصاً آلہ قتل کی تلاش کے سلسلے میں، میں نے بڑی باریک بینی سے وہاں کا جائزہ لیا تھا اور کوئی بھی مشکوک چیز میری نگاہ سے نہیں گزری تھی۔ میں نے اس بات کی بھی تسلی کر لی تھی کہ دونوں کمروں کے بیچ آمد و رفت کا بھی کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔

☆☆☆

مقتول کے گھر کے اندر کافی لوگ جمع تھے جن میں غالب تعداد خواتین کی تھی۔ وہاں کا ماحول انتہائی بوجھل اور سوگوار تھا۔ مقتول کی بیوہ خالدہ اور ماں سلطانہ عورتوں میں گھری ہوئی تھیں۔ مجھے وہاں پر مقتول کا چھوٹا بھائی ذوالفقار عرف زلفی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس فضا میں، میں اہل خانہ سے کوئی کام کی بات اٹھاؤں سکوں گا۔

”فیاض علی!“ میں نے مقتول کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے گھر پر آنا فانا میں جو قیامت ٹوٹی ہے اس

مجلد چھٹی کے شاہکار تاریخی ناول

جہانگیر بکس

450/-	انسان اور یوتا	475/-	معظم علی	550/-	آخری معرکہ	550/-	آخری معرکہ
300/-	پاکستان سے دیا بزم تک	300/-	خاک اور خون	300/-	ثقافت کی تلاش	300/-	ثقافت کی تلاش
450/-	آخری چٹان	450/-	کلیسا اور آگ	475/-	اندھیری رات کے مسافر	475/-	اندھیری رات کے مسافر
225/-	سوسال بعد	599/-	قافلہ حجاز	300/-	داستان مجاہد	300/-	داستان مجاہد
325/-	سفید جزیرہ	425/-	محمد بن قاسم	450/-	پردہ کی درخت	450/-	پردہ کی درخت
475/-	شاہین	300/-	پورس کے تہمتی	500/-	یوسف بن تاشیفین	500/-	یوسف بن تاشیفین

سبق آموز کتب سلسلہ



اقوال حضرت علی المرتضیٰ

اقوال امیر کرام

حکایات گلستان سعدی

اقوال شمس الدین

حکایات رومی

دلچسپ و عجیب حقائق

حکایات بوستان سعدی

042-35757086
051-5539609

022-2780128
042-37220879

ادولفت

(جامعہ شریف)

منہجی طرز سے لکھنے والے ناول کے ساتھ اردو زبان سے پہلا ناول

جہانگیر بک ڈپو

میں نے اور کاشییل ساجد نے اس کے ہاتھ سے بوتلیں لے لیں پھر میں نے اس سے پوچھا۔
”چاچا! تم کتنے عرصے سے یہ دکان چلا رہے ہو؟“
”ساری عمر نوشہرہ دکان ہی میں گزری ہے سرکار۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”پہلے میرا باپ حق نواز یہ دکان چلاتا تھا اور اب میں چلاتا ہوں۔“
”یہ خبر تک تو پہنچ ہی گئی ہوگی کہ آج صبح کی فیاض علی کے بیٹے آفتاب کو اصرار دیر سے پرل کر دیا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”کیا بات کرتے ہیں جناب۔“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”اس واردات کی خبر تو پورے نوشہرہ دکان میں گردش کر رہی ہے۔ یہ علاقہ ہے ہی کتنا بڑا!.....!“
رب نواز عرف نواز جابل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے تب نوشہرہ دکان ایک چھوٹا سا پنڈا ہوا کرتا تھا۔ میں نے ٹھنڈی بوتل کے گھونٹ سے طلق کو تر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
”تمہارا اس واردات کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”بہت بڑا ہوا جناب۔“ وہ افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آفتاب بڑا گہرو جوان تھا۔ بزرگوں کا بڑا احترام کرتا تھا۔ وہ بہت خوب صورت کھلاڑی تھا۔“
”کھلاڑی.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”آفتاب کس چیز کا کھلاڑی تھا؟“
”کبڈی کا۔“ اس نے بتایا۔ ”نوشہرہ دکان نے کبڈی کے بہت سے نامور کھلاڑی پیدا کیے ہیں۔ آفتاب انہی میں سے ایک تھا۔ پتا نہیں، اس جوان کو کس نامرادی نظر لگ گئی۔ ابھی ایک ماہ پہلے ہی تو اس کی شادی ہوئی تھی۔“
بات کے اختتام پر نواز ادا اس ہو گیا۔ ”چاچا! میں نے آفتاب کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ کسی سفاک شخص نے بڑی بے دردی سے اسے قتل کیا ہے۔ کیا تم اس واقعے پر کوئی روشنی ڈال سکتے ہو؟“
”جی کیا؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
”میرا مطلب ہے، آفتاب کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے خیال میں اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟“
”یہ تو سو منہاں ہی جانتا ہے سرکار۔“ وہ محتاط انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں اس بارے میں!“

نے سب کچھ نکیر کر رکھ دیا ہے۔ تم افراد خانہ کو سنبھالو۔ میں پھر کسی وقت یہاں آ کر پوچھتا چھ کروں گا۔“
”جیسی آپ کی مرضی جناب۔“ وہ ابدیدہ ہو گیا۔
”آپ کا اپنا گھر ہے۔ جب جی چاہے، آپ تشریف لائیں۔ میرے گھر کا دروازہ آپ کو ہمیشہ کھلا ملے گا۔“
میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا چھوٹا بیٹا کہیں نظر نہیں آ رہا؟“
”زلی کو اس واقعے کی اطلاع دینے کے لیے دوڑا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”بے چارے کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں لیکن یہ کام بھی تو کرتا ہے نا۔“
میں فیاض علی کو قتل دلا سادے کر اس کے گھر سے نکل آیا۔ ابھی تک مجھے آفتاب کے قتل کے حوالے سے کوئی اہم بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ میں کاشییل ساجد کے ساتھ اس تانے کی جانب قدم بڑھانے لگا جس پر سوار ہو کر ہم تھانے سے یہاں تک آئے تھے۔ مذکورہ تانہ کو چوان کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی ہم کئی کے کڑ پر پہنچے، میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ یہ خیال ایک دکان کو دلچھ کر آتا تھا۔
وہ کرپانے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جس پر ایک ادیبز عمر غرض پیندا کا نگہ انداز تھا۔ کبھی کسی علاقے میں کرپانے کی دکان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ایسا دکاندار علاقے کے تمام افراد اور ان کے معاملات سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے۔ میں نے اس دکاندار سے آفتاب کے قتل کے حوالے سے کچھ معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے پاس چلا گیا۔
دکاندار مجھے اپنی سمت بڑھتے دیکھ کر چونکا ہوا گیا تھا پھر جب میں اس کے نزدیکی پہنچا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خیر مقدمی انداز میں بولا۔ ”آجیں جی تمہارا صاحب..... بسم اللہ.....“
”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
اس نے بتایا۔ ”میرا نام رب نواز ہے تمہارا صاحب لیکن پنڈ والے مجھے نواز کہہ کر پکارتے ہیں مگر میں.....“ وہ دکان کے اندر دھکی دھکی کر گئی۔ اس کی زبان اپنے کام میں مصروف رہی۔ ”آج بہت زیادہ گرمی ہے۔ میں ٹھنڈی بوتلوں سے آپ کی تواضع کرتا ہوں۔“
میرے دیکھتے ہی دیکھتے نواز نے لکڑی کی ایک پٹنی کا ڈھکن اٹھایا پھر برف میں دبی ہوئی دو ٹھنڈی بوتلیں نکال کر ہماری جانب بڑھا دیں اور بولا۔ ”میں جی..... ٹھنڈی بوتلیں پئیں اور اپنی پیاس بجھا لیں۔“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہا ہو مگر پھر کسی خیال کے تحت رک گیا تھا۔ میں نے ذرا زانو یہ بدل کر سوال کیا۔

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آفتاب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ بھی تھی؟“

”نہیں جی۔ آفتاب تو بڑا ہی بی بائندہ تھا۔“ نوجوان نے جواب دیا۔ ”اس کا مزاج لڑائی جھگڑے والا نہیں تھا۔ دشمن بنانا تو بہت دور کی بات ہے۔“

”چاچا! دشمن بنانے نہیں جاتے، بن جاتے ہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اور شذوری کے کھیلوں میں تو یہ بڑی عام ہی بات ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں سرکار مگر میں نے بتایا ہے نا، آفتاب بڑے دھیمے مزاج کا جوان تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”مگر کبھی بدمزگی کی صورت حال پیدا ہو بھی جاتی تو وہ ہمیشہ تحمل مزاجی سے کام لیتا تھا۔ چند روز پہلے کبڑی کے ایک مقابلے میں اچھی خاصی ہنگامہ آرائی ہو گئی تھی۔ اگر اس موقع پر آفتاب مجھ داری سے کام نہ لیتا تو پھر خون خرابا لایا ہی تھا۔“

نوجوان کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ”ہنگامہ آرائی کس بات پر ہوئی تھی۔ مجھے اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ؟“

”بس جی، پنڈے کے جوانوں کا آپس میں کبڑی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔“ وہ بتانے لگا۔ ”کسی بات پر دونوں نیوں میں رخ کھائی ہو گئی۔ آفتاب کی مخالف ٹیم میں سے کسی کھلاڑی نے بے ایمانی کی تھی۔ جب آفتاب نے اس پر احتجاج کیا تو دونوں طرف کی فضا گرم ہو گئی۔ بے ایمانی کرنے والے کھلاڑی کا نام فیضی تھا اور فیضی کا ایک ساتھی جیدا اس کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ یہ چوری اور سینہ زوری والا معاملہ تھا تھانیدار صاحب.....“

”تھانی تو قوت کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”فیضی اور جیدا خامسے پھڑے باز قسم کے جوان ہیں۔ جیدا، آفتاب کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ فیضی سے اپنی دوستی کا حق نبھاتے ہوئے خون خوار لہجے میں بولا۔

”فیضی نے کوئی بے ایمانی نہیں کی، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہاری شادی کیا ہو گئی کہ تم نے خود کو نوشہرہ درکاش کا ہیرو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن کبڑی کے کھیل میں فیصلہ میدان میں ہوتا ہے۔“

”بالکل، کبڑی کا فیصلہ میدان ہی میں ہوتا ہے۔“

آفتاب نے قہقہے لہجے میں کہا۔ ”مگر ہر کھیل کے کچھ قاعدے اور قانون ہوتے ہیں جن کی پاس داری ہر کھلاڑی کو کرنا پڑتی ہے۔ دنیا کے کسی کھیل میں بے ایمانی کی کوئی گنجائش نہیں۔“

”تمہارے دماغ پر بے ایمانی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔“ جاوید عرف جیدا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”لیکن تم فکر نہیں کرو، بہت جلد ہم تمہارا ہی بھوت اتار دیں گے۔“

”تم زیادتی کر رہے ہو جیدا! آفتاب نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

جیدا ابھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں حق سچ کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تمہیں یہ زیادتی نظر آ رہی ہے تو جا کر اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ۔“

”جیدا جس حقیر آمیز انداز میں یہ بات کی تھی، اگر آفتاب کے بجائے اس کے سامنے کوئی گرم دماغ والا ہوتا تو ادھر ہی خطرناک جنگ ہو جانا تھی۔“ نوجوان نے اپنی بات کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ”مگر آفتاب نے کمال برداشت کا مظاہرہ کیا اور چپ چاپ کھڑا کیا۔ اس کے بعد بھی گاؤں میں کبڑی کا کھیل جاری رہا مگر آفتاب نے پھر بھی اس کھیل میں حصہ نہیں لیا۔“

”یہ واقعہ کتنا عرصہ پہلے کا ہے؟“ نوجوان کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

نوجوان کی باتوں نے مجھے تشویش میں ڈال دیا تھا۔ اگر سب کچھ ویسے ہی پیش آ رہا تھا جیسا نوجوان نے بیان کیا تھا تو پھر اس کیس میں جیدا نے بھی تشویش ہونا لازمی تھی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ فیاض علی نے اس واقعے کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا۔

”یہ واقعہ آفتاب کی شادی کے چند روز بعد کا ہے جناب۔“ نوجوان نے بتایا۔

”لیکن فیاض علی نے مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔“ میں نے انھیں زندہ انداز میں کہا۔

”تھانیدار صاحب! فیاض کا جوان بیٹا قتل ہوا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ایسے واقعات تو بڑے بڑوں کی مت مارو تھے۔“

نوجوان کی بات میں وزن تھا۔ عین ممکن ہے، اپنی پریشانی میں فیاض علی کا اس واقعے کی طرف دھیان نہ گیا ہو یا اگر اس کے ذہن میں یہ بات تھی بھی تو اس نے اسے اہم نہ سمجھا ہو۔ وہ جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا، اس میں اس سے صد فیصد ہوش مندی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

میں چند منٹ مزید نوجوان سے بات کرتا رہا پھر واپس تھانے آ گیا۔ نوجوان نے جیدا کے حوالے سے کافی گفٹ گفٹ

مطلبات فراہم کی تھیں۔ تھانے پہنچ کر میں نے ایک آدمی کو جاوید عرف جیدا کی جانب روانہ کر دیا۔ میں چاہتا تھا گاؤں کے اہل اپنی موجودگی کے دوران ہی میں جیدا کو تلاش کروا کر اس سے پوچھتا ہوں کہ کیا میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس واقعہ پر اسے گاؤں پر مائی فضا نے پہنچے گاؤں کے سب سے اہم آدمی کو روک دیا۔ اس نے جیدا کے ساتھ ہر آدمی کی روشنی میں، میں جیدا سے کہاں میں بات کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے تھانے کا محل زیادہ موزوں تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میرا بھیجا ہوا آدمی واپس آ گیا۔ میں نے اسے اکیلے دیکھا تو پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”جیدا گاؤں میں موجود نہیں ہے ملک صاحب۔“ اس نے بتایا۔

کانٹھیل کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”اگر وہ گاؤں میں نہیں تو پھر کہاں گیا ہے؟“

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ ہو سکتا ہے، آفتاب کے قتل میں جیدا کا کوئی ہاتھ ہو اور وہ اسی وجہ سے کہیں غائب ہو گیا ہے لیکن کانٹھیل کے جواب نے میرے اس خیال کی تردید کر دی۔

”جناب! وہ کسی کام سے غلہ منڈی گیا ہوا ہے۔“ کانٹھیل نے بتایا۔ ”اس کے گھر سے پتا چلا ہے کہ جیدا شام سے پہلے واپس آ جائے گا۔ میں نے اس کے گھر والوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ جیسے ہی واپس آئے، اسے فنانس پیس دیں۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔“ میں نے سناٹھی نظر سے کانٹھیل کی طرف دیکھا۔ ”لیکن ہم جیدا کے گھر والوں پر ہمسوا کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔ کسی بندے کو سادہ لباس میں گاؤں کی طرف روانہ کرنا ہوگا تاکہ وہ گاؤں کے داخلی راستے پر نظر رکھے اور جیسے ہی اسے جیدا دکھائی دے، وہ اسے پکڑ کر قتل لے آئے۔“

”جی ملک صاحب۔“ کانٹھیل نے فرماں برداری سے کہا۔ ”میں ابھی اس کا بندوبست کر دیتا ہوں۔“

سہ پہر میں اسے ایس آئی مٹھور حسین اسپتال سے واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ آئندہ روز کسی وقت آفتاب کی لاش واپس کر دی جائے گی۔

مٹھور حسین اس تھانے میں کافی عرصے سے کام کر رہا تھا وہ نوشہرہ درکاش کے تقریباً تمام لوگوں کو اچھی طرح جانتا

تھا۔ میں نے تازہ ترین حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔

”تم نوشہرہ درکاش میں بسنے والے افراد سے بہ خوبی واقف ہو۔ کیا تمہیں اس گاؤں کے حالات کی کبھی گنجائش ہے؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”جی ملک صاحب! مجھے گاؤں کے حالات سے کافی حد تک آگاہی حاصل ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ آپ کے پوچھنے کا مقصد کیا ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو.....“

اس نے معنی خیز انداز میں ہلہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھنے سے باز رہا۔ ”اگر تم غلطی پر نہیں تو پھر کیا؟“

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ آفتاب کے قتل کے حوالے سے آپ کے ہاتھ کچھ لگ گیا ہے.....“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں..... کچھ ہاتھ لگا تو ہے.....“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”مگر اس کی اہمیت پر روشنی تم ڈالو گے۔“

”آپ حکم کریں ملک صاحب۔“ وہ سیدھا ہوا کر بیٹھ گیا۔

”جاوید عرف جیدا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”کبڑی کا اچھا کھلاڑی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کبڑی کا کھلاڑی تو آفتاب بھی تھا! میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

”جی ملک صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات مجھے معلوم ہے۔“

”مجھے پتا چلا ہے کہ چند روز پہلے جیدا اور آفتاب کے بیچ کبڑی کے میدان میں اچھی خاصی رخ کھائی ہو گئی تھی؟“

”جی، میں نے بھی اس ناخوشگوار واقعے کے بارے میں سنا تھا۔“

”تو کیا تم ایسا نہیں سوچتے کہ آفتاب کے قتل میں اس واقعے کا کوئی ہاتھ ہو؟“ میں نے کہا۔ ”ہم ان دونوں کے جھگڑے کو نظر انداز تو نہیں کر سکتے۔“

”آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ ہم اس کیس میں معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن مجھے ایسا نہیں لگتا۔“

”کیا مطلب..... جہیں کیا نہیں لگتا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ نے جس واقعے کا ذکر کیا ہے اس جھگڑے میں اگر غلطی آفتاب کی ہوئی اور آفتاب نے جیدا کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہوئی تو ہم سوچ سکتے تھے کہ جیدا نے

انتقام آفتاب کی جان لے لی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میری معلومات کے مطابق، معاملہ اس کے برعکس تھا۔“

”تمہاری بات میں وزن ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے جیدا کی طرف بندہ دوڑایا تھا مگر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ گاؤں میں موجود نہیں۔ وہ کسی کام سے غلہ منڈی گیا ہوا ہے اور شام سے پہلے لوٹ آئے گا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جیدا بڑا گرم دماغ کا ہے۔“

”جی..... واقعی وہ خاصا غصہ ور ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور آفتاب کے حوالے سے تو اس کا غصہ اور بھی تیز ہو جاتا ہے۔“

”ایسا کیوں.....“ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ”کیا آفتاب نے اس سے کوئی قرض لے لیا ہے؟“

”قرض لے نہیں رکھا بلکہ قرض چڑھا رکھا ہے۔“ وہ معنی خیز لہجہ میں بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا۔

”مکتور نے بتایا۔“ میری معلومات کے مطابق، جیدا کی بہن فریدہ کی آفتاب کے ساتھ شادی ہونے والی تھی۔ ان کی منگنی تقریباً ایک سال تک رہی پھر آفتاب کے گھر والوں نے منگنی توڑ دی۔ اس کے کچھ عرصے بعد آفتاب کی شادی اس کے تایا کی بیٹی خالدہ سے ہو گئی تھی..... وہ سانس ہمارا کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”بہن کی منگنی نوٹ جانے کے سبب وہ آفتاب کو ناپسند کرتا تھا لیکن آپ نے جس واقعے کا ذکر کیا، وہ خالدہ کی کبڑی کے کھیل کا جھگڑا تھا۔“

”میرے لیے کبڑی کے کھیل والے جھگڑے سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ جیدا کے دل میں مقتول کے لیے ناپسندیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اب تو اس کا انٹرویو اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔“

پھر میرے اور اسے ایس آئی کے بیچ مختلف زاویوں سے آفتاب مرڈینس پر بات چیت کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے اسے ایس آئی مکتور کو ضروری ہدایات دیں اور خود فیاض علی سے ملنے نوشہرہ درکار روانہ ہو گیا۔ میری غیر موجودگی میں تھانے کی کمان مکتور کے ہاتھ میں ہوئی تھی۔ وہ امور تھانیداری سے بے خبری آگاہ تھا۔ ایک بات بتاتا چلوں کہ گزشتہ روز جیدا تھانے نہیں آیا تھا۔

فیاض علی کی طرف جاتے ہوئے میں جیدا ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مکتور نے مجھے جیدا کی بہن کی منگنی ٹوٹنے کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا، اس کی روشنی میں جیدا کی ذات خشک کی دبیز چادر میں لپٹی نظر آتی تھی اور پھر کبڑی کے میدان میں ہونے والا جھگڑا بھی اہمیت کا حامل تھا۔

فیاض علی کے گھر میں سوگاری کی فضا جوں کی توں تھی تاہم لوگوں کا اس وقت رش نہیں تھا۔ میں نے سب سے پہلے مقتول کی بیوہ سے اظہار تعزیت کیا۔ انسان کی زندگی کا زیاں اتنا بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ اس کی تلافی کے لیے الفاظ بہت حقیر اور چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ بہر حال، متاثرہ شخص کی خشک شوکی کے لیے کسی نہ کسی طرح رسم دنیا بھٹاتا ہی پڑتی ہے۔ خالدہ ایک خوب صورت اور دلکش نقوش کی مالک لڑکی تھی۔ اس واقعے نے اس کے حسن اور عنایت کو چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک بت کے مانند کم مٹتی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ بہت جلد میں اس کے شوہر کے قاتل کو گرفتار کر لوں گا۔ اس کے بعد میں فیاض علی اور اس کی بیوی سلطانہ کو مل کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

”تھانیدار صاحب! آفتاب کی لاش کب تک ہمیں مل جائے گی؟“ سلطانہ نے پوچھا۔

”آج شام تک اسپتال سے آپ کے بیٹے کی لاش آ جائے گی۔“ میں نے سلطانہ کو بتایا پھر فیاض علی سے پوچھا۔

”تم نے تو کہا تھا کہ آفتاب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ نہیں تھی لیکن میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے۔“

”کیا سنا ہے آپ نے؟“ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

”مجھے پتا چلا ہے، شادی کے فوراً بعد کبڑی کے میدان میں آفتاب کا جیدا نامی ایک کھلاڑی سے جھگڑا ہو گیا تھا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب! آپ کو پتا ہی ہے، کھیل کو دھم لڑائی جھگڑے کا امکان تو رہتا ہی ہے۔“ اس نے سادگی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے، بات ادھر میدان ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں لگتا، اس معمولی سے واقعے کی وجہ سے جیدا کو سنگین قدم اٹھانے۔“

”آپ بہت سیدھے ہواں لیے آپ کو دوسرے لوگ بھی معصوم اور بے ضرر نظر آتے ہیں۔“ سلطانہ نے فیاض علی کو گھورتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تھانیدار صاحب! آپ درست سمت میں سوچ رہے ہیں۔ ہمارے دشمنوں میں ایسا ہو گیا ہے۔ جیدا نے اس دن آفتاب سے جو جھگڑا کیا، اس کے پیچھے فیاض کا دماغ تھا۔“

فیاض کا نام میں نے نواجہ کی زبانی سنا تھا۔ اس جھگڑے

ناتک تھے

اصل کردار فیاض ہی تھا۔ فیض نے کبڑی کے کھیل میں بے اہالی کی تھی اور..... جیدا اپنے دوست فیض کی حمایت میں آفتاب کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

فیاض علی کی یہ نسبت اس کی بیوی مجھے زیادہ ہوشیار اور گھبرائی تو تھی۔ اسی سے پوچھا تھا شروع کر دی۔

”ہاں..... میں نے فیض کا ذکر بھی سنا ہے۔ جیدا سے اس کی بڑی گہری دوستی ہے۔ ایک بات پوچھوں۔ اس کا بالکل درست جواب دینا.....“

”جی پوچھیں۔“ سلطانہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی۔“

”مجھے پتا چلا ہے خالدہ سے شادی سے پہلے آفتاب کی جیدا کی بہن فریدہ سے منگنی ہوئی تھی۔“ میں نے سلطانہ کے گھر پر گاہے جماتے ہوئے کہا۔ ”یہ منگنی سال بھر رہی پھر آپ لوگوں کی طرف سے منگنی توڑ دی گئی۔ اس واقعے کی بنا پر بھی جیدا آفتاب سے نفرت کر سکتا ہے۔“

”جی، آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”واقعی یہ منگنی ہم نے ہی طعمن کی تھی۔“

”منگنی توڑنے کی کوئی خاص وجہ؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے تھانیدار صاحب اس لیے آپ کو سب کچھ کھول کر بتاؤں گی۔“ سلطانہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”یہ خشک ہے کہ آفتاب کی ایک سال تک فریدہ کے ساتھ منگنی رہی لیکن اس دوران میں ہمیں فریدہ کے کردار کے حوالے سے چند ایسی شرمناک باتیں پتا چلیں کہ کوئی بھی عزت دار انسان فریدہ کو اپنے گھر کی بیوہ بنانے کا فیصلہ نہیں کر سکتا لہذا ہم نے منگنی توڑ دی۔“

”چھوڑ سلطانہ۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود سے وار ہے۔“ فیاض علی نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تھانیدار صاحب! منگنی توڑنے کے چھ ماہ بعد ہم نے آفتاب کی شادی خالدہ سے کی تھی۔ اگر جیدا کے دل میں آفتاب سے انتقام لینے کا خیال ہوتا تو وہ ان چھ ماہ میں کوئی نہ کوئی اچھی حرکت ضرور کرتا۔“

”آپ یہ بات نہیں سمجھ سکتے کہ شاطر دشمن وقت اور موقع کا انتظار کرتے ہیں۔“ سلطانہ نے اپنے شوہر سے کہا۔

”اور اب تو اس بد بخت جیدا کے ساتھ ایک اور غمیش بھی جو گیا ہے۔“

”کون غمیش؟“ میں نے بے اختیار سوال کیا۔

”میں فیض کی بات کر رہی ہوں تھانیدار صاحب۔“ اس

نے منہ پر ہونے لہجہ میں کہا۔ ”مجھے تو فیض پر پکا شک ہے۔ جیدا کی بہن کی تو صرف منگنی ہی ٹوٹی تھی، آفتاب کی شادی نے تو فیض کی گردن جھکا دی ہے۔“

مجھے نواجہ کی بتائی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کبڑی والے جھگڑے کی تفصیل بتاتے ہوئے جیدا اور آفتاب کے مکالمے بھی شامل کیے تھے۔ جب آفتاب نے فیض کی بے ایمانی پر آواز اٹھائی تھی تو جیدا نے اس کی شادی کا حوالہ دے کر کہا تھا..... تمہاری شادی کیا ہوئی کہ تم نے خود کو شوہر درکار کا کہا ہیرو بھٹکا شروع کر دیا ہے..... وغیرہ وغیرہ..... اور اب سلطانہ بھی کچھ ایسی نوعیت کی بات کر رہی تھی۔

”آفتاب کی شادی سے فیض کی گردن کیسے جھک گئی تھی؟“ میں نے سلطانہ سے سوال کیا۔

”کبڑی کے میدان میں تو میرا بیٹا فیض کو ہمیشہ لڑاتا ہی تھا۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ”لیکن خالدہ سے جب آفتاب کی شادی ہوئی تو یہ فیض کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ آفتاب نے کبڑی کے میدان سے باہر اسے گلست فاش دی تھی تھانیدار صاحب.....“

”میں اس گلست فاش کی تفصیلات جانتا چاہتا ہوں۔“

میں سیدھا ہونے لگا۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ۔“

”میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔“ فیاض علی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”خالدہ میرے بڑے بھائی کی بیٹی ہے۔ بھائی خدا حسین گوجرانوالہ شہر میں رہتا ہے۔ وہاں اس کا بچپن کے برتنوں کا کارخانہ ہے۔ کسی زمانے میں بھائی خدا بھی ادھر نوشہرہ درکار ہی میں رہتا تھا۔ پھر اس نے ساری اراضی فروخت کر دی اور بیوی بچوں کو لے کر گوجرانوالہ منتقل ہو گیا۔ اب وہ ایک طویل عرصے سے ادھر گوجرانوالہ شہر میں ہے۔ شہر جا کر اس نے خوب ترقی کی اور زمیندار سے کارخانے دار بن گیا۔ اس کی صرف دو اولادیں ہیں۔ ایک خالدہ اور خالدہ سے تین سال چھوٹا ایک بھائی جس کا نام سعید ہے۔“

”یہ آپ تھانیدار صاحب کو فضول کہانی سنا رہے ہو۔“ سلطانہ نے اپنے شوہر کو ٹوٹے ہوئے کہا۔ ”وہ فیض اور آفتاب والے معاملے کے بارے میں جانتا چاہتے ہیں۔“

”تو پھر تم خود ہی تھانیدار صاحب کو سب کچھ بتا دو۔“ فیاض علی خشکی آمیز لہجے میں بولا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے اضافہ کیا۔ ”تھانیدار صاحب! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ آپ سلطانہ سے سوال جواب کریں۔“

اپنی بات کے اختتام پر وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ نے کہا۔ ”لوٹی..... میں نے تو کوئی غلط بات

نہیں کی۔ یہ تو خواہ مخواہ ہی ناراض ہو رہے ہیں۔“
”جوان بیٹے کی موت کوئی معمولی حادثہ نہیں ہوتی
سلطانہ۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”فیاض علی کی
ذہنی حالت کو میں اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔“

”آفتاب صرف فیاض ہی کا بیٹا نہیں تھا تھانیدار
صاحب۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ میرا بھی خلیفہ
جگر تھا۔ اس کی جدائی نے مجھے اندر سے مار دیا ہے۔“ وہ م
ہوئی ہوئی آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے
بولی۔ ”لیکن کیا کریں..... سر نے والے کے ساتھ مرا تو نہیں
جاتا..... اگر ہم ہمت ہار بیٹھ گئے تو پھر قاتل کی گرفتاری کے
سلسلے میں آپ کی مدد کوں کرے گا.....!“

”تم بڑی بہادر اور حوصلے والی عورت ہو سلطانہ!“ میں
نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بتاؤ، اصل
کہانی کیا ہے؟ آفتاب کے قتل کے حوالے سے تمہیں کس پر
شک ہے؟“

اب تک کی گفتگو سے میں نے بہ خوبی یہ اندازہ لگالیا تھا
کہ فیاض علی کی بہ نسبت سلطانہ سے کوئی کام کی بات اگلوئی
جاسکتی تھی۔ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”تھانیدار صاحب! میں نے اپنے بیٹے کا خون ہوتے
نہیں دیکھا اس لیے قسم اٹھا کر تو میں قاتل کی نشاندہی نہیں کر سکتی
لیکن میرا شک صرف اور صرف فیاض پر جاتا ہے۔“

”اس شک کا سبب کیا ہے؟“ میں نے مقتول انداز
میں کہا۔ ”میں ان ٹوکوں و جوبات سے آگاہی حاصل کرنا
چاہتا ہوں جن کی بنا پر تم فیض کو اپنے بیٹے کی موت کا ذمے
دار سمجھتی ہو۔“

”تھانیدار صاحب.....“ وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے
ہوئے بولی۔ ”اس معاملے کو سمجھنے کے لیے آپ کو تین گھرانوں
کی آپس کی رشتے داریوں سے آگاہ ہونا پڑے گا۔ یعنی ہمارا
گھرانہ، خالدہ کا گھرانہ اور فیض کا گھرانہ۔“

”ابھی تمہارے سامنے فیاض علی نے بتایا تو ہے کہ خالدہ
اس کے بڑے بھائی فدا کی بیٹی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس
طرح دو گھرانوں کا رشتہ تو واضح ہو گیا۔“

”ہاں۔“ دو گھرانوں کی رشتے داری آپ کے علم میں
آچکی ہے۔“ وہ بڑی رمان سے بولی۔ ”لیکن تیسرا گھرانہ ابھی
باتی ہے اور اس کی رشتے داری بڑی ییزمی ہے۔ میرا اشارہ
فیض کے گھرانے کی طرف ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے فیض کے گھرانے کے بارے میں
بتاؤ۔“ میں نے گہری تنجید کی کہا۔ ”اس کی ٹیڑھیں نکالنے کا

کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”فیض کے گھرانے کی ہم سے کوئی رشتے داری نہیں
مطلب براہ راست ہمارے بیچ کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ اس نے
بتایا۔ ”لیکن ان کی فدا حسین کے گھرانے سے بڑی گہری
رشتے داری تھی۔“

”رشتے داری تھی..... سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں
نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ آج کل شدید نوعیت کی ناراضی چل رہی
ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”رشتے داری تو اپنی جگہ پر موجود ہے مگر
دلوں کی ریشیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ دونوں گھرانوں کے افراد
ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے رو دار نہیں ہیں۔“

”اس نفرت آئینہ بایکاٹ کی کیا وجہ ہے؟“ میں نے
وچسپی لینے ہوئے سوال کیا۔

”فیضی اور آفتاب کا رشتہ۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔
”میں سمجھا نہیں.....؟“ میں نے انہیں زدہ نظر سے اس

کی طرف دیکھا۔

”خالدہ کی ماں شاہدہ، فیضی کی خالہ ہے یعنی فیضی کی ماں
زاہدہ کی چھوٹی بہن۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”زاہدہ
کی خواہش تھی کہ وہ فیضی کی شادی اپنی چھوٹی بہن کی بیٹی خالدہ
سے کرے لیکن دوسری جانب سے صاف انکار ہو گیا۔“

”اوہ..... اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔“ میں
نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”ظاہر ہے، یہ
انکار خالدہ کے باپ نے کیا ہوگا کیونکہ وہ خالدہ کی شادی اپنے
چھوٹے بھائی کے بیٹے آفتاب سے کرنا چاہتا تھا۔“

”نہیں جناب! آپ بالکل بھی نہیں سمجھ۔“ وہ نفی میں
گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بتایا ہے نا، ان دونوں
خاندانوں کی رشتے داری بہت ٹیڑھی ہے۔“

”تو پھر تم ہی بتاؤ.....“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے
اسے دیکھا۔ ”اس رشتے سے کس نے انکار کیا تھا؟“

”شاہدہ نے!“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔
”یعنی چھوٹی بہن نے بڑی بہن کو انکار کر دیا.....؟“

”جی بالکل چٹا انکار۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ”ورنہ
فدا حسین کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہدہ کسی بات پر
زاہدہ سے ناراض ہو گئی ورنہ انکار کی کوئی وجہ یہ ظاہر
دکھائی نہیں دیتی۔“

”آپ کی اس بات سے پورا نوشرہ درکاں اتفاق
کرے گا کہ یہ ظاہر رشتے سے انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی

ناک تیلے

میں مزید چند منٹ سلطانہ کے پاس بیٹھا بھر جانے کے
لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سرسری انداز میں پوچھا۔ ”تمہارا چھوٹا
بیٹا کہاں ہے؟ ابھی تک اس سے میری ملاقات نہیں
ہوئی.....!“

”ذلفی آپ کے آنے سے پہلے تو ادھر گھر ہی میں تھا۔“
وہ چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ ”گھر میں، میں باہر
کلی میں دیکھتی ہوں۔ بھائی کی موت نے اسے بھی بہت متاثر
کیا ہے۔ وہ اپنی بیماری کو بھول کر مارا مارا پھر رہا ہے۔“

”تم آرام کرو سلطانہ۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ذلفی
سے ملنا ضروری نہیں۔ میں نے تو بس ایسے ہی روروازی میں
پوچھا تھا تھا۔“

مجھے اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے اچھا خاصا
مواد مل گیا تھا۔ سلطانہ سے حاصل ہونے والی معلومات کی
روشنی میں یہ آسانی میں قاتل تک رسائی کے راستے کا تعین
کر سکتا تھا۔ میں نے دو افراد کے ناموں پر دائرہ لگایا اور فیاض
علی کے گھر سے باہر نکل آیا۔ یہ دو نام تھے..... جاوید عرف
جید اور فیض عرف فیضی۔ یہ دونوں مقتول کو سخت نا پسند کرتے
تھے اور ان دونوں کے پاس مقتول کو نقصان پہنچانے کا بہانہ
بھی موجود تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ جید اور فیضی کے بیچ
گہری دوستی بھی تھی۔

جب میں باہر نکلی میں آیا تو مجھے فیاض علی نظر آ گیا۔ اس
کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص اور ایک نوجوان لڑکا بھی موجود
تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کے چہرے میں فیاض علی کی شبابہت پائی
جاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فیاض علی تعارف کرانے والے انداز
میں بولا۔

”یہ فدا بھائی ہیں۔ آفتاب کی موت کا سن کر گوجرانوالہ
سے آئے ہیں۔“ پھر وہ نوجوان لڑکے کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے بولا۔ ”یہ سعید ہے، خالدہ کا چھوٹا بھائی۔“

میں فدا حسین اور اس کی بیٹی سے غائبانہ طور پر متعارف
ہو چکا تھا۔ میں نے فدا حسین سے مصافحہ کیا اور آفتاب کو پیش
آنے والے دھتے پر اظہارِ افسوس بھی کیا۔

فدا ایک دنگ شخص تھا۔ رکی علیک سلیک کے بعد اس
نے مجھ سے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! آفتاب مجھے بہت عزیز
تھا۔ میں نے خالدہ کو اس کے نکاح میں دے کر اسے اپنا بیٹا
بنالیا تھا۔ اس کی موت میرے لیے ایک عظیم جذباتی نقصان
ہے اور اس نقصان کی تلافی صرف اور صرف آپ کر سکتے ہیں۔“

..... لحاظی توقف کر کے اس نے میری آنکھوں میں دیکھا پھر
گمبیر لہجے میں مستغرق ہوا۔

”اس انکار سے پہلے دونوں بہنوں میں بڑے گہرے
لگاتے تھے اور ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بھی
..... وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن فیضی کے رشتے
..... ان کے بعد سے زاہدہ کا دل ایسا کھٹا ہوا ہے کہ وہ شاہدہ
..... لینا بھی پسند نہیں کرتی اور..... زاہدہ کے گھر والے
..... کو تو ایسا صدمہ پہنچا کہ بے چارے کو قاتل.....
..... ہو گیا ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”آپ
لوگوں نے بتایا کہ خالدہ کا میکا گوجرانوالہ شہر میں ہے۔ کیا فیضی
ادھر ہی رہتا ہے یا یہ لوگ بھی گوجرانوالہ ہی کے دستیک ہیں؟“
”صرف فدا حسین اپنے بیوی بچوں کو لے کر
گوجرانوالہ چلا گیا تھا اور وہ بھی کئی سال پہلے جب خالدہ اور
مہ بہت چھوٹے تھے۔“ سلطانہ نے بتایا۔ ”بائی سب لوگ
ادھر نوشرہ درکاں میں ہی ہیں۔ زاہدہ کا گھرانہ بھی اسی گاؤں
میں آباد ہے۔“

”تو تمہارا یہ خیال ہے کہ فیضی کو اس بات کا بہت غصہ تھا
کہ اس لڑکی کی شادی اس سے نہ ہو سکی وہ آفتاب کی بیوی بن کر
..... میں نے اصل موضوع کی طرف آتے
..... کہا۔ ”لہذا انہیں شک ہے کہ آفتاب کے قتل میں فیضی کا
..... ہو سکتا ہے.....؟“

”اگر میں ایسا سوچتی ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں
..... وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ”آپ پورے
..... میں محوم پھر کہ فیضی کے بارے میں معلومات انٹھی
..... آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کتنا کمینہ اور
..... لہد پرور ہے۔“

”اس بات کا مجھے کافی حد تک اندازہ ہو چکا ہے۔“ میں
..... کہا۔ ”بائی ماندہ میں اس کے گھر جا کر معلوم کر لوں گا۔ ان
لوگوں سے ملنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”آپ ضرور ملیں ان سے بھی اور دوسرے لوگوں سے
..... وہ ایک پوجمل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔
..... ہرے کیجیے میں تو اس وقت غصہ پڑے گی جب آفتاب کا
..... اس پھانسی کے پھندے میں لٹکا ہوا نظر آئے گا۔“

”یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد تمہارے
..... کی غنڈک کا بندوبست کر دوں گا۔“ میں نے پُر عزم
..... میں کہا۔ ”اس سلسلے میں تمہیں مایوسی کا منہ نہیں دیکنا
..... اے گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانیدار صاحب!“
..... ادا ہوا تاک لہجے میں بولی۔

ساتھ ٹرائل روم میں لے جانا۔ تمہیں اس کی خاطر مدارات کی کھلی اجازت ہوگی۔“ میں نے کانشیل کو فری ہینڈ دیتے ہوئے کہا پھر جیڈا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”تمہارے دونوں سوالوں کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ یہ توکل ہی مجھے چاہیے تھا کہ تم نوشہرہ ورکا میں موجود نہیں ہو اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تم شام سے پہلے واپس آ جاؤ گے مگر تم نہیں آئے۔ آخر تم اس دوران میں تھے کہاں اور کیا کرتے پھر رہے تھے؟“

”جناب! مجھے پروگرام کے مطابق، شام سے پہلے واپس آنا تھا۔ بس پھر دیر ہوگئی اور میں رات کو کافی دیر سے گھر پہنچا ہوں اور صبح ہوتے ہی آپ کا بندہ پکڑ کر مجھے تھانے لے آیا ہے۔“ وہ فریادی لہجے میں بولا۔

”میرے بندے نے جو کچھ بھی کیا اس میں میری مرضی شامل تھی۔“ میں نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ”مجھے بتاؤ تم کئے کہاں تھے؟“

اگرچہ جیڈا کے گھر والوں سے یہ معلومات مجھ تک پہنچ چکی تھیں کہ وہ کسی کام سے غلہ منڈی گیا ہوا تھا لیکن میں تفتیشی تقاضے پورے کرتے ہوئے یہ سب اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ جیڈا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”میں غلہ منڈی گیا ہوا تھا جی۔“

”کون سی غلہ منڈی۔“ میں نے پوچھا۔ ”پرانی یا نئی؟“

”پرانی غلہ منڈی جناب۔“

”وہاں کس کام سے گئے تھے تم؟“ میں نے سوال کیا۔

”سبز یوں کے بیج لانا تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کے علاوہ گندم وغیرہ کی مارکیٹ بھی چیک کرتا تھی۔ آج کل گندم کا سبز چل رہا ہے۔ کاشت کار کو ہر چیز کی خبر رکھنا پڑتی ہے جناب۔“

”تم کل صبح کتنے بجے گھر سے روانہ ہوئے تھے؟“

میں نے سوالات کے سلسلے کو دور کرتے ہوئے پوچھا۔

”لگ بھگ سات بجے میں گھر سے نکلا تھا۔“ اس نے بتایا۔

میرے اندازے کے مطابق، آفتاب کی موت صبح پانچ اور چھ بجے کے درمیان ہوتی تھی اور اس کی خوشچکان لاش کو آٹھ بجے فیاض علی نے ڈیرے کے ایک کمرے میں دریافت کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب جیڈا اپنے گھر سے روانہ ہوا تو اس سے پہلے آفتاب کھل چکا تھا اور جب آفتاب کی موت کی خبر منظر عام پر آئی تو تب تک جیڈا گاؤں سے جا چکا تھا۔ اس تناظر میں جیڈا کسی بھی صورت آفتاب

ادھر جیڈا کی بات ختم ہوئی، ادھر اس کے پیچھے مگرے ہوئے قوی ایلٹھ کانشیل نے نہایت ہی پھرتی سے ساتھ جیڈا کی گردن پر ایک دو ہنتر سید کیا اور خوٹوں خوار میں بولا۔

”ملک صاحب کے سامنے سوال نہیں۔۔۔۔۔ صرف جواب!“

”یہ تو آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔“ وہ نیم اطمینانی انداز میں چلایا۔

کانشیل نے ایک مرتبہ پھر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیڈا کی کمر پر سرکاری بوٹ کی ٹھوکر جمانی اور غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”ملک صاحب کے سامنے آواز پہنچی۔۔۔۔۔!“

کانشیل کے اس خیر مقدمی سلوک نے جیڈا کے کسبل کافی حد تک نکال دیے۔ میں نے تھانیدارانہ انداز میں کہا۔

”ابھی تو میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی

جیڈا لیکن اگر تم نے میرے سوالات کے سیدھے اور سچے جوابات نہ دیے تو پھر تمہیں زیادتی کے مہموم سے آشنا کرنے کے لیے مجھے مجبوراً تمہیں دو چار ٹھٹھوں کے لیے ڈرائنگ روم کی سرکرائٹا پڑے گی۔ ہمارے ڈرائنگ روم کی ضیافت بڑے بڑوں کو کھایا پیسا بگلنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔۔۔۔۔!“

وہ خوشزدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ

پہنچیں جی۔۔۔۔۔ میں آپ سے کوئی غلط بانی نہیں کروں گا۔“

”تم نے آفتاب کو کیوں قتل کیا؟“ میں نے سرسراتی

ہوئی آواز میں پوچھا۔

”مم۔۔۔۔۔ میں نے۔۔۔۔۔“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے

ہوئے الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ”میں نے کسی کو قتل نہیں

کیا۔۔۔۔۔ تھانیدار صاحب۔۔۔۔۔“

”میں نے تم سے کسی کو قتل کرنے کے بارے میں نہیں

پوچھا۔“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

کہا۔ ”میں آفتاب کی بات کر رہا ہوں۔“

”جناب! میں آفتاب کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں

جانتا۔“ وہ منت ریز انداز میں بولا۔ ”مجھے تو خوشدل رات کو اس

واقعے کا پتا چلا ہے۔ میں توکل کا پورا دن ادھر نوشہرہ ورکا میں

تھا ہی نہیں اور۔۔۔۔۔ پھر میں آفتاب کو کیوں قتل کروں گا؟ میری

اس سے کیا دشمنی؟“

”ملک صاحب! اس بد بخت کو تھوڑی دیر کے لیے آپ

میرے حوالے کر دیں۔“ کانشیل نے مجھ سے مخاطب ہوتے

ہوئے کہا۔ ”میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ نہیں رہی۔ یہ آپ

سے سوال پر سوال کیے جا رہے۔“

”اب اگر یہ کوئی سوال کرے تو پھر تم اسے اپنے

”لیکن ہم یوں چلتے پھرتے کئی کوچوں میں لوگوں کو ان کے بے کی تفصیلات پڑھ کر نہیں سنایا کرتے۔ ایسے کاموں کے اٹھانہ ہے نا۔۔۔۔۔!“

”معافی چاہتا ہوں سرکار۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا،

”میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے گرفتار ہو کر

تھانے میں پیش ہونا پڑے۔“

”بس تو پھر تمہیں فکر مند ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔“

میں نے سرسری انداز میں کہا اور تانگے پر سوار ہو گیا۔

لوا جانے جیڈا کی گرفتاری کی بات کر کے مجھے بے چہم

کر دیا تھا۔ میں توکل شام ہی کو جیڈا کی تھانے میں آمد کی نوٹ

کر رہا تھا لیکن کل کی تاریخ میں میری یہ توقع پوری نہیں ہو پا

تھی۔ خیر۔۔۔۔۔ دیر آید، درست آید!

☆☆☆

جاوید عرف جیڈا میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے عقد

میں ایک پھرتیلا کانشیل بھی موجود تھا تا کہ میرے سوالات کے

دوران میں اگر جیڈا کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو وہ ان

اپنے مخصوص ہتھکنڈوں سے ”سیدھی راہ“ دکھائے۔

جیڈا کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک

آدور اور صحت مند جوان تھا۔ رنگت گندمی اور سر کے بال

۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک خاص نوعیت کی کھنکھائی پائی جا

تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس سے بات کی جائے تو وہ فو

لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس کی شخصیت سے ایک

جھگڑا لوانسان کا تاثر ابھرتا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سخر

لہجے میں کہا۔ ”بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔۔۔۔۔ ہوں؟“

”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے پکڑ کر یہاں کیا

لایا گیا ہے؟“ وہ بیزار سی بولا۔ ”آخر میرا قصور کیا ہے؟“

”ہم تمہارے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تھا

سجا کر نہیں بیٹھے ہوئے۔“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہیں یہاں ضروری پوچھ کر کچھ کے لیے لایا گیا ہے۔ سوال

کر س کے اور جواب تم دو گے۔ اس سوال و جواب میں تمہا

قصور کھل کر سامنے آ جائے گا۔ بات آئی سمجھ میں یا۔۔۔۔۔“

دوسرے طریقے سے سمجھاؤں؟“

جیڈے کے آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک

پائی جاتی تھی۔ میرے جارحانہ انداز نے اسے محسوس

کر دیا کہ انھیں اس سے کام نہیں چلے گا لہذا اس۔

الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

”آخر آپ مجھ سے کس قسم کی پوچھ کرنا چاہتے ہیں؟“

”آپ میری بات تو سمجھ گئے ہیں نا؟“

”میں آپ کی بات کی تدبیر میں اتر گیا ہوں جناب۔“

میں نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ ”آپ فکر ہی نہ کریں۔

آپ بہت جلد آفتاب کے قاتل کو قاتل کے کٹہرے میں

دیکھیں گے۔“

”بس۔۔۔۔۔ میں یہی چاہتا ہوں۔“ وہ مطمئن انداز میں

گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس سلسلے میں اگر کسی بھی نوعیت

کے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“

”اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو زحمت دینے

میں کسی سوچ بچار سے کام نہیں لوں گا۔“ میں نے کہا۔

”شکریہ تھانیدار صاحب۔“ وہ ممنونیت بھرے انداز

میں بولا پھر پوچھا۔ ”آفتاب کی لاش کب تک ہمارے حوالے

کر دی جائے گی؟“

”آپ لوگ تدفین کی تیاری کر لیں۔“ میں نے مغمو

لہجے میں کہا۔ ”شام سے پہلے کسی وقت بھی آفتاب کی لاش

اسپتال سے تھانے پہنچ جائے گی۔ کاغذی کارروائی پوری کرنے

کے بعد میں لاش کو آپ کے سپرد کر دوں گا۔“

فدا حسین نے میرا شکریہ ادا کیا پھر اپنے بھائی فیاض

کے ساتھ گھر کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں تانگے کی

سمت قدم اٹھانے لگا۔ میں جس تانگے پر سوار ہو کر نوشہرہ

ورکا آیا تھا، وہ وہاں گریبانہ فروش کی دکان کے قریب ہی

کھڑا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو نوا جانے مجھے سلام کیا اور انکشاف

انگیز لہجے میں بولا۔

”تھانیدار صاحب! آخر آپ نے نوشہرہ ورکا میں

گرفتاری ڈال ہی دی۔۔۔۔۔“

فوری طور پر میں اس کی بات کو سمجھ نہیں پایا۔ میں نے

قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ”چاچا! تم کس گرفتاری کی

بات کر رہے ہو؟“

”وہ جی۔۔۔۔۔ ابھی آپ کے تھانے کا ایک بندہ جیڈا کو

اپنے ساتھ لے کر گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اوہ اچھا۔۔۔۔۔“ میں نوا جانے بات سمجھ گیا اور کہا۔ ”یہ

سب تفتیش کا حصہ ہے چاچا۔ اگر ضرورت پڑی تو تمہاری

گرفتاری بھی میں مل لائی جاسکتی ہے۔“

آخری جملہ میں نے ایسے ہی ٹانک دیا تھا۔ میری بات

سن کر وہ ہم گیا اور خوشزدہ لہجے میں بولا۔ ”جناب! میں نے کون

ساجرم کیا ہے؟“

”جیڈا نے بھی میرے بندے سے یہ سوال ضرور پوچھا

ہوگا۔“ میں نے نوا جانے آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

کے قتل میں ملوث نظر نہیں آتا تھا لیکن یہ جیسا کہ بیان تھا کہ گزشتہ روز وہ صبح سات بجے گھر سے نکلا تھا اور میں آنکھیں بند کر کے اس کے بیان پر یقین نہیں کر سکتا تھا لہذا حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے جیسا کہ زبانی کلامی اور ضرورت پڑنے پر ہاتھ پاؤں کے موثر استعمال سے رگڑائی منجھائی کرنے میں مجھے عار نہیں تھی۔

”جب تم گھر سے روانہ ہوئے تو تمہیں پتا نہیں تھا کہ آفتاب کو کسی نے بے دردی سے قتل کر دیا ہے؟“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں گزشتہ رات اس واقعے کی خبر ہوئی تھی۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہے؟“

”جی!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”بالکل ایسا ہی ہے۔“

”تم نے پرانی غلہ منڈی کی کس دکان سے سبز یوں کے بیج وغیرہ خریدے تھے؟“ میں نے معتدل انداز میں استفسار کیا۔

”چودھری نواز علی اینڈ سنز سے۔“ اس نے جواب دیا۔

”چودھری نواز علی اینڈ سنز تو کافی مشہور دکان ہے۔“ میں نے کہا۔ ”غلہ منڈی میں ان کا ایک نام ہے اور وہ اپنی دکان سے خریدی ہوئی ہر چیز کی رسید ضرور دیتے ہیں۔ کیا تم نے ان سے سبز یوں کے بیج خریدے تھے اس کی رسید لی تھی؟“

”جی بالکل لی تھی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”وہ رسید اس وقت بھی میری ڈب میں موجود ہے۔“

”لاؤ۔۔۔۔۔ وہ رسید مجھے دکھاؤ۔“ میں نے کہا۔

جیسا نے پالمین کا کرتہ اور بے بند پٹن رکھا تھا۔ میرے رسید کے مطالعے پر اس نے اپنی دھوئی کی ڈب میں سے ایک مڑاڑا کاغذ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ لیں جناب۔ دیکھ لیں رسید۔“

تہ بند یاد دہنی کے پلوں کو کھما کر کمر کی دونوں جانب ایک مخصوص انداز میں اڑس لیا جاتا ہے جو کہ ”ڈب“ کہلاتی ہے۔ اکثر دیہاتی ہلکی پھلکی چیزیں اپنی ڈب میں رکھ لیتے ہیں۔ ڈب ایک طرح سے جیب کا کام دیتی ہے۔

میں نے جیسا کی فراہم کردہ رسید کا یہ غور جائزہ لیا۔

”وہ چودھری نواز علی اینڈ سنز کی ہی پرغز رسید تھی۔ رسید کے بالائی حصے میں جلی حروف میں ”چودھری نواز علی اینڈ سنز“ چھپا ہوا تھا۔ نیچے خریدے گئے سامان کی تفصیل تھی۔

میں نے وہ تفصیل پڑھی۔ رسید کے مطابق، سبز کرہ بالا دکان سے مختلف سبز یوں کے بیجوں کی خریداری کی گئی تھی۔ میرے

لیے اس رسید میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل وہ تاریخ تھی جس روز یہ خریداری کی گئی تھی۔ رسید پر گزشتہ روز کی تاریخ درج تھی یعنی رواں مہینے کی اٹھارہ تاریخ۔ یہ کیش سیمو اس امر کا بین ثبوت تھا کہ گزشتہ روز یعنی اٹھارہ تاریخ کو جیسا نے چودھری نواز علی اینڈ سنز سے مختلف سبز یوں کے بیج خریدے تھے۔ اس رسید کی رو سے جیسا کی جائے واردات سے عدم موجودگی ثابت ہوئی تھی مگر میرا شک ابھی تک دور نہیں ہوا تھا۔ میری نسلی اس وقت ہوئی جب میں اس رسید کی تصدیق کر لیتا۔

میں نے مذکورہ رسید کو اپنی میز کی دراز میں ڈالا اور جیسا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”تو تمہارا یہ دعوئی ہے کہ تم نے آفتاب کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس واقعے سے تمہارا دور دور کا واسطہ ہے۔۔۔۔۔؟“

”جی۔ میں نے یہی کہا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور میں اپنے اس بیان پر کھڑا ہوں۔“

”تمہارے خیال میں آفتاب کو کس نے قتل کیا ہے؟“ میں نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

”مجھے کیا پتا جی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”آفتاب کے قاتل کو ڈھونڈنا تو آپ کا کام ہے۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔“ میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا ہی کام ہے اور میں اپنے کام میں مصروف ہوں لیکن اس کام میں ایک رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔“

”کسی رکاوٹ تمہارا تھانیدار صاحب؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”اس رکاوٹ کا نام ہے جاوید عرف جیسا۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب۔“ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”میں بھلا آپ کے راستے کی رکاوٹ کیسے بن سکتا ہوں۔۔۔۔۔؟“

”وہ اس طرح کہ میں اپنی تفتیش کے گھوڑے کو جس بھی سمت دوڑاتا ہوں، سامنے ہی ٹھکڑے دکھائی دیتے ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ بیج ہے کہ خالہ سے شادی سے پہلے آفتاب کی تمہاری بہن فریدہ کے ساتھ منگنی ہوئی تھی؟“

”جی۔ یہ بات بالکل درست ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایک سال تک یہ منگنی برقرار رہی پھر ٹوٹ گئی۔“

اپنے جملے کے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے

نالت تیلے

چہرے پر تپتی کے تاثرات ابھرا آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

”منگنی کیسے ٹوٹ گئی؟“

”آفتاب کے گھر والوں نے منگنی تو زدی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”منگنی ٹوٹنے کا سبب کوئی بھی رہا ہو، میں اس بحث میں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے گہری تنبیہ کی سے کہا۔ ”لیکن یہ بات تو تم مانو گے تاکہ اس منگنی کے ٹوٹنے سے تمہیں دلی صدمہ پہنچا تھا؟“

”ظاہری بات ہے جناب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”فریدہ میری اکلوتی چھوٹی بہن ہے۔ اگر کسی لڑکی کی منگنی ٹوٹ جائے تو اس کی ذات پر ایک طرح کا دھبہ سالگ جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے منوس بھی سمجھتے لگتے ہیں اور اس کا رشتہ ڈالنے والے یہ تحقیق بھی کرنا لازمی سمجھتے ہیں کہ پہلی منگنی کیوں ٹوٹی تھی۔“ لچائی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر افسردہ لہجے میں بولا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔ فریدہ کی منگنی ٹوٹنے کا مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ اس واقعے کو لگ بھگ ایک سال ہوئے تو آجائے لیکن ابھی تک ہم راہ دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔ کہ اس کا کوئی رشتہ آئے۔۔۔۔۔!“

بات کے اختتام پر وہ اچھا خاصا مغموم ہو گیا تھا۔ میں اس کے درد کو سمجھ سکتا تھا اور اس دکھ سے اتفاق کرتا تھا۔ اس کا مسئلہ واقعی جینیون تھا۔ محبت کرنے والے بھائی اپنی بہنوں کے رشتوں کے لیے اسی انداز میں پریشان اور فکر مند ہوا کرتے ہیں۔ سلطانہ نے مجھے اس منگنی کو توڑنے کا جو سبب بتایا تھا، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ اس بحث میں فریدہ کی کردار کشی کا پہلو اجاگر ہوتا تھا۔ بیٹیاں اور

بہنیں سب کی ساجھی ہوتی ہیں۔ کسی کی بیٹی یا بہن کے بارے میں لب کشائی کرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے اپنے گریبان میں ضرور دھماک لپٹا چاہیے۔ کسی سیانے کا بڑا خوب صورت اور ممتی آفریں قول ہے۔۔۔۔۔ باحیا کو حیا مارتی ہے اور بے حیا ہر سے بھی نہیں مرتے!

عین ممکن تھا کہ سلطانہ کے بیان میں کوئی حقیقت نہ ہو۔ یہ اس کا وہم یا گمان یا غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے جیسا سے کہا۔

”بہن کی منگنی ٹوٹنے سے تمہیں جوازیت پہنچی تھی تم اس تکلیف کا اظہار کا ہے بگاڑ کرتے رہتے تھے۔“

”جی، ایسا ہی ہے۔“ اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

”تم اپنی تکلیف کے اظہار کے لیے آفتاب کے خلاف

بھی باتیں کرتے رہتے ہو۔“ میں نے غیر محسوس انداز میں جیسا کو ایک خاص مقام کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری باتوں سے آفتاب کے لیے نفرت لگتی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”تھانیدار صاحب! آفتاب اور اس کے گھر والوں نے میری بہن کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے بعد میں ان لوگوں کو پھولوں کے بارو پہناتا نہیں سکتا۔“ وہ کڑواہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں آفتاب اور اس کے گھر والوں سے شدید نفرت کرتا ہوں۔“

”اور تمہاری یہ نفرت حق دوستی کی انجام دہی کے سبب دو آتشہ ہو چکی ہے۔۔۔۔۔!“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”حق دوستی؟“ اس نے ابھرنے زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھانیدار صاحب!“

”فیضی سے تمہاری دوستی ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی، جی۔ فیضی میرا بھری یار ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”اگر بھری یار پریشان ہو تو تمہارے جگر میں بھی درد ہوگا نا۔۔۔۔۔ یا نہیں؟“

”ہوگا جی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”فیضی کی تکلیف میری تکلیف ہے۔“

”اور تم دونوں کا درد بھی مشترک ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آفتاب نے ایک طرف تمہاری بہن کو مسترد کر کے تمہارے دل میں بخرمھو پنا ہے تو دوسری جانب اس نے خالہ سے شادی کر کے فیضی کی اتنا اور غیرت کو لگا کر تھا۔

فیضی اپنی خالہ کی بیٹی خالہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اسے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس رشتے سے انکار کی وجہ چاہے کچھ بھی رہی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ خالہ، فیضی سے چھین گئی تھی۔۔۔۔۔ ہیں نا؟“

”جی۔۔۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایسا ہی ہوا تھا۔“

”موت جب ہمارے کسی پیارے کو ہم سے چھین لیتی ہے تو ہمیں بہت گہرا صدمہ پہنچتا ہے۔“ میں نے گہری تنبیہ کی سے کہا۔ ”ہم کئی دنوں تک بیچے ہوئے دل اور دیران آنکھوں کے ساتھ بولائے بولائے پھرتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے

سمندر میں جتنا بھی پانی ہوتا ہے، اسے ہم آنسوؤں کی صورت بہا دیتے ہیں حتیٰ کہ ہماری آنکھوں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں لیکن پھر وقت کا ہمارے دل و جگر کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے اور رفتہ رفتہ ہم نازل زندگی کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ ایسا

ہوتا ہے نا؟“

”جی۔ ایسا ہوتا ہے۔“ اس نے میری بات کی تائید کر دی۔
”اور اگر ہم سے چھن جانے والا جینا جاگتا شخص، ہمارے
آس پاس، ہماری نظروں کے سامنے، کسی دوسرے انسان کے
تعریف اور اعتبار میں ہوتا پھر ہمیں کیسا محسوس ہوتا ہے؟“ بات ختم
کر کے میں نے نطوکی ہوئی نظر سے جیدا کو دیکھا۔

”بہت برا محسوس ہوتا ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔
”دل چاہتا ہے، ہماری پسندیدہ سنی کو چھیننے والے کی ایسی کم تہی
کردیں۔۔۔۔۔ اس کا وہ حشر نشر کریں کہ آئندہ کسی کو ایسی جینا
چھٹی کی جرات نہ ہو سکے۔“

”مطلب، اس نوعیت کی ذہنی کیفیت میں انسان اپنے
رقیب رو سیاہ کی جان بھی لے سکتا ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔ یہ ناممکن نہیں۔“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔
”تمہارا اپنے دوست کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
میں نے تھکے لیجے میں استفسار کیا۔

”کون دوست جناب؟“ وہ بے ساختہ بولا۔
فوری طور پر میری بات جیدا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”میں فیضی کی بات کر رہا ہوں۔ آفتاب کی شادی ایک
ایسی لڑکی سے ہوئی تھی جس سے فیضی شادی کا خواہاں تھا۔ اپنی
پسندیدہ چیز چھین جانے کے کم میں وہ انتقاماً آفتاب کی جان بھی تو
لے سکتا ہے۔!“

”آپ۔۔۔۔۔ یہ کہنا۔۔۔۔۔ چاہتے ہیں کہ۔۔۔۔۔ آفتاب کو فیضی
نے قتل کیا ہے؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”منطقی طور پر ایسا سوچنے میں مجھے تو کوئی قباحت نظر
نہیں آ رہی۔“ میں نے صاف کوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے
کہا۔ ”تم کیا کہتے ہو؟“

”مم۔۔۔۔۔ میں کیا ہوں جناب۔“ وہ فکر مند ہی بولا۔
”آپ نے تو مجھے اگلا کر رکھ دیا ہے۔“

”سردست نوشہرہ ورکاں میں صرف دو افراد ایسے ہیں
جن کے دل و دماغ میں مقتول کے لیے نفرت ہی نفرت بھری
ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی آفتاب کو موت کے گھاٹ اتار
سکتا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکنے
کے بعد سناٹے ہوئے لیجے میں کہا۔ ”ان دو افراد میں ایک کا
نام ہے، جاوید عرف جیدا اور دوسرے کا نام ہے، فیض عرف
فیضی۔۔۔۔۔ اور اتفاق سے یہ دونوں افراد آپس میں گہرے
دوست بھی ہیں۔ میرے محتاط تجربے کے مطابق ان دونوں ہی
میں سے کسی نے آفتاب کو بے دردی سے قتل کیا ہے۔“

”میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا۔“ وہ احتجاجی انداز میں
بولا۔ ”آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لیں۔ آفتاب کے
قتل کے معاملے سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔!“

”بیٹا جی! پولیس ڈیپارٹمنٹ میں قسمیں کھانے سے
معاملات حل نہیں ہوا کرتے۔“ میں نے دونوں کے انداز میں کہا۔
”ہمارا تفتیش اور تحقیق کا اپنا ایک طریقہ کار ہے اور میری
ریسرچ یہ بتاتی ہے کہ اگر آفتاب کو تم نے قتل نہیں کیا تو پھر اس کا
قاتل فیضی کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا۔“

”میں یہ مانتا ہوں کہ میرے اور فیضی کے دل میں
آفتاب کے لیے بہت زہر بھرا ہوا ہے۔“ وہ راست گوئی
کا مظاہرہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن
میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں نے
آفتاب کی جان نہیں لی۔ باقی جہاں تک فیضی کا تعلق ہے تو
اس کے حوالے سے بھی میرے پاس معلومات نہیں ہیں۔
میں صرف اپنی ذات کی قسم کھا سکتا ہوں، کسی دوسرے کی
نہیں۔ آپ فیضی کو بلادہ کر پوچھنا چاہتے ہیں پھر آپ کی تسلی
ہو جائے گی۔“

”برخوردار! میں اپنی تسلی کے لیے محض پوچھنا چاہتا ہوں کہ
محدود نہیں رہتا۔“ میں نے قدرے دھیمے مگر مستحکم خیز لیجے
میں کہا۔ ”تم تصور نہیں کر سکتے کہ اس سلسلے میں، میں کہاں تک
جاسکتا ہوں۔“ لچائی توقف کر کے میں نے ایک گہری
سانس خارج کی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے۔“

وہ بہت سن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”جی ہاں۔۔۔۔۔!“
”تمہاری ذات بھی شک کے دائرے سے باہر
نہیں نکلی۔“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ”تم نے مجھے جتنی
بھی کہانیاں سنائی ہیں میں ان پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں
کروں گا۔ جہاں جہاں بھی تعقیب کی ضرورت محسوس ہوگی،
میں اس کام میں ذرا غفلت یا کوتاہی نہیں برتوں گا لہذا۔۔۔۔۔“
میں نے لچائی توقف کر کے اس کے چہرے کے تاثرات کا
جائزہ لیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ جب تک اس کیس کی
تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، تم نوشہرہ ورکاں سے باہر قدم نہیں
نکالو گے اور اگر تمہارا گاؤں سے باہر جانا ناگزیر ہو تو پھر تم اس
مقصد کے لیے پیشانی تھانے میں اطلاع دو گے۔“

”جو حکم تمہارا در صاحب۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔
میں نے کہا۔ ”اور میں۔۔۔۔۔ اب بھی تمہیں تھانے میں طلب
کروں۔ تم فوراً تے پیشتر یہاں پہنچو گے۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے ہر وقت
موجود ہوں گا۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں نے اسے چند ہدایات دینے کے بعد رخصت کر دیا۔
اسی روز سہ پہر کے بعد اسپتال سے آفتاب کی پوسٹ
مارل مشورہ لاش آئی گئی۔ لاش کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی
رپورٹ بھی آئی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، آفتاب کو
الغارہ تاریخ کی صبح پانچ اور چھ بجے کے درمیان موت کے
گھاٹ اتارا گیا تھا۔ موت کا سبب وہ کاری دار بتایا گیا تھا جو
اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر کیا گیا تھا۔ اس وارے مقتول
کی کھوپڑی کو بری طرح چنچا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل
دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا
گیا تھا کہ مقتول کے سر کے عقبی حصے پر کسی بھاری آہنی چیز
سے مہلک ضرب لگائی گئی تھی اور یہ وار مقتول پر اس کی بے
خبری میں کیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے اندازے کی تصدیق
کرتی تھی۔ میں نے کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد
آفتاب کی لاش کو فیض علی کے گھر بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔

معاملہ خاصا نمبر اور پیچیدہ ہو گیا تھا۔ قاتل کے حوالے
سے ابھی تک کوئی حتمی اور دونوں بات سامنے نہیں آئی تھی۔
اب تک کی تفتیش سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آفتاب کے
متوقع قاتلوں کے حوالے سے جیدا یا فیضی میں سے کوئی ایک
ہو سکتا تھا۔ جیدا کو تھانے بلادہ کر میں نے اس کا بھرپور ”انٹرویو“
کر لیا تھا لیکن اس عمل سے کوئی کام کی بات سامنے نہیں آ سکی تھی
تاہم جیدا کے دورے غلہ منڈی کی چینگا ابھی مانی تھی۔ اب مجھے
فیضی کا انکسارے کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی کسی حتمی نتیجے پر
پہنچا جاسکتا تھا۔

جیدا کو میں نے آسانی سے جانے کی اجازت دے دی
تھی تاہم میں نے ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کو اس کی نگرانی پر
متعین بھی کر دیا تھا۔ مذکورہ اہلکار جیدا کے رخصت ہوتے ہی
تھوڑا وقفہ دے کر تھانے سے روانہ ہو گیا۔ اگر جیدا واقعی
آفتاب کے قتل میں ملوث تھا تو وہ کوئی ایسی غلطی ضرور کرتا جس
سے مجھے اس کی گردن تاپنے کا موقع مل جاتا۔ میں ابھی تک بند
کلی میں کھڑا تھا لیکن مایوس نہیں تھا۔

☆☆☆

اٹھارہ تاریخ کی صبح آفتاب کو بے دردی سے موت کے
گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور انیس تاریخ کی شام اس کی تدفین
ہوئی۔ میں تاریخ کی صبح میں نے دو اہم کام کیے۔ اول، میں
نے اے ایس آئی منگلور حسین کو پرانی غلہ منڈی روانہ کر دیا

ناک نیک

تا کہ وہ ”چودھری نواز علی اینڈ سنز“ جا کر جیدا کے بیان کی
تصدیق کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے وہ
رہید بھی اے ایس آئی کے حوالے کر دی تھی جو جیدا نے اپنے تہ
بند کی ڈب سے نکال کر مجھے دی تھی۔ دوم، میں نے ایک اہلکار کو
شوکت علی کے گھر کی جانب دوڑا دیا تا کہ وہ فیضی کو پکڑ کر تھانے
لے آئے۔

میرے تھانے سے غلہ منڈی کا فاصلہ اچھا خاصا تھا
تاہم نوشہرہ ورکاں چند منٹ کی دوری پر تھا چنانچہ اے ایس آئی
کی واپسی سے بہت پہلے فیضی کو تھانے پہنچا دیا گیا۔ وہ میرے
سامنے حاضر ہوا تو میں نے تعقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیا۔

فیض عرف فیضی کی عمر تیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ
اپنے طبع اور جتنے سے ایک فتنہ پرور اور پھندے باز قسم کا شخص
لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے آثار بڑے واضح طور پر
دیکھے جاسکتے تھے۔ میرے پیچھے ہوئے پولیس اہلکار نے اسے
باقاعدہ پھنکڑی پہنا کر یہاں تک نہیں پہنچایا تھا تاہم وہ غصیلے
لیجے میں مستغرق ہوا۔

”تمہارا صاحب! مجھے کس سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے؟“
”مذاکرات کے لیے۔۔۔۔۔“ میں نے اس کے چہرے پر
نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک نہایت ہی اہم اور ہنگامی
مسئلے پر مذاکرات کے لیے تمہیں تھانے بلایا ہے۔ پولیس
ڈیپارٹمنٹ کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”میری مدد کی ضرورت۔۔۔۔۔“ وہ بے یقینی سے مجھے
دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور وہ بھی پولیس کو۔۔۔۔۔ میں کچھ سمجھا
نہیں۔۔۔۔۔“

”میں نے سنا ہے کہ تم نے بد معاشی اور غنڈا گردی کی
دنیا میں نیا ناما قدم رکھا ہے اور پورے نوشہرہ ورکاں میں تم نے
غمر ٹھکی چا رہی ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے
ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”یہاں کا ہر چھوٹا بڑا بد معاش اور
لچا لٹکا تمہارے سامنے ہاتھ باندھے ایک ناک پر کھڑا رہتا
ہے۔!“

”ہاں نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟“ وہ
شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے تو کچھ پہلے
نہیں پڑ رہا۔“

”تمہارے لیے میں تو میں اتنے وزنی بات ڈال دوں گا
کہ تمہارے لیے کرسی سیدھی رکھ کر اور گردن کو اٹھا کر چلنا بھی ممکن
نہیں رہے گا۔“ میں نے درشت لیجے میں کہا۔ ”بتاؤ۔۔۔۔۔ تم نے
آفتاب کو کیوں قتل کیا؟“

میرے آخری سوالیہ جملے پر وہ اس طرح اچھلا جیسے اس

نے غلطی سے بجلی کے نیچے تار کو چھو لیا ہو۔ پھر حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے لکت زدہ انداز میں بولا۔

”مم..... میں نے..... آفتاب کو..... قتل کیا ہے..... یہ آپ..... کیا کہہ رہے ہیں.....؟“

”جو تم نے سنا، میں نے وہی کہا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بات آئی مجھ میں یا تو چار کا لٹر منگوا کر تمہاری لٹروں کو رواؤں؟“

ہمارے زمانے میں ابتدائی تفتیش کے لیے نوضرب چار اچ کا ایک چمڑے کا جوتا نما ہتھیار استعمال کیا جاتا تھا۔ جوتے سے مشابہت کی بنا پر اسے چھتری یا لٹر کہا جاتا تھا۔ جب بھی کسی مجرم کو گرفتار کر کے تھانے لایا جاتا، پہلے مرٹلے پر اسے مرغابنا کر اس کی تشریف مبارک پر اسی چھتری یا لٹر کی سلاخی دی جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہر چیز تبدیل ہو گئی ہے۔ تفتیش کے نئے طریقے اور انداز وضع کر لیے گئے ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق اب بھی بعض تھانوں میں اس روایتی تفتیشی ہتھیار ”چھتری“ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

”میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا۔“ وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔

”تو کیا تمہارے باپ نے کیا ہے.....؟“ میں نے کڑک دار آواز میں کہا۔ ”تمہارا باپ تو مظلوج ہے۔ وہ اتنا بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا اور پھر اس کے پاس اس کام کا کوئی جواز بھی نہیں ہے۔“

میرے جارحانہ رویے کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ قدرے نرم پڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”تو میرے پاس آفتاب کو قتل کرنے کا کیا جواز ہے؟“

”تم آفتاب سے نفرت کرتے تھے، اسے اپنا رقیب سمجھتے تھے، اسے غاصب اور خود کو خرم تصور کرتے تھے۔“ میں نے اس کے کان کے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خالہ شاہدہ نے تمہیں رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور پھر اسی لڑکی کی شادی آفتاب کے ساتھ ہو گئی۔ یہ تمہاری ہار دار آفتاب کی جیت تھی۔ وہ کبڈی کے میدان میں تو اکثر تمہاری درگت بناتا ہی رہتا تھا، زندگی کی بساط پر بھی اس نے تمہیں مات دے دی تھی۔ تم اسے فاتح اور خود کو مفتوح سمجھنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ تمہارے پاس اپنی ہزیمت، اپنی ناکامی اور اپنی شکست کا بدلہ لینے کا ایک ہی راستہ تھا کہ اس پتھر کو راستے سے ہٹا دو جس نے تمہیں خود تمہاری نظر سے گرا دیا تھا اور پھر..... تم نے اپنی مجروح ان کی مرہم ہنی کے لیے آفتاب کی زندگی کا چراغ

مکمل کر دیا.....!“

وہ حیرت اور الجھن کے طے جلے تاثرات کے ساتھ آنکھیں پھیلانے میری بات سن رہا اور جیسے ہی میں خاموش ہوا، اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہارا صاحب! آپ کی زیادہ تر باتیں درست ہیں۔ میں واقعی آفتاب سے شدید نفرت کرتا تھا۔ فنی مرہم میں نے جذبات سے مفلوج ہو کر اس کی جان لینے کے بارے میں بھی سوچا لیکن کبھی بھی میں اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔“

”تو گویا تم مجھے یہ بتا رہے ہو.....“ میں نے کاٹ دار آواز میں کہا۔ ”گر تم نے آفتاب کو قتل نہیں کیا..... ہوں؟“

”جی، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مگر حقیقت ہے۔“

”اگر تم نے آفتاب کے خون میں ہاتھ نہیں رکھے تو پھر اس کا قاتل کون ہے؟“ میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا۔“

”تو جاننے کی کوشش کرو اور سوچو کہ آفتاب کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے جواب چاہیے..... دو ٹوک اور حتمی جواب..... اور جب تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل جاتا، تم میرے تھانے کی حوالات میں بند رہو گے!“

وہ بہت تھکایا اور اس نے رسی تڑانے کی بھی حتی الامکان کوشش کی لیکن میں نے اس کی ایک نہیں سنی اور ایک کا نشیل کو بلا کر فیضی کو حوالات میں بند کروا دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ فیضی پر پکا ہاتھ ڈالنے کے لیے میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا لہذا میں نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے مار پیٹ سے گریز کیا تاہم اسے زیر حراست رکھنے کا میرا ایک مقصد تھا۔ حوالات میں بیٹھ کر وہ موجودہ صورت حال پر غور و فکر ضرور کرتا اور اگر اس کے ذہن میں اس کیس کے حوالے سے کوئی اہم اور مفید معلومات تھیں تو وہ انہیں میرے سامنے اگنے کے لیے ضرور تیار ہو جاتا۔ فیضی کی زبان کھلوانے کے لیے یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ اس نوعیت کے تجربات اکثر کامیاب رہتے ہیں۔

فیضی کی گرفتاری کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیضی کی ماں اداہہ دو تین گاؤں والوں کے ہمراہ تھانے پہنچ گئی۔ میں نے باقی لوگوں کو برآمدے میں روک کر زائدہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے مجھ سے استعاج کرنے لگی۔

”تمہارا صاحب! آپ نے میرے بیٹے کو خواہناہ بند کر دیا ہے۔ آخراں اس کا قصور کیا ہے؟“

”میری سب جاننے کے لیے تو میں تمہارے بیٹے کو یہاں لا رہا ہوں کہ اس کا قصور کیا ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”تمہیں اس کے لیے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ معمول کی پوچھ گچھ ہے۔ میں آج کی تاریخ میں اسے مار دے گا۔“

”مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے فیضی کو آفتاب کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”نہ..... ہمارا آفتاب کے قتل سے کیا لینا دینا۔“ وہ ہاتھ بٹا کر بولی۔ ”غور سلطانہ نے آپ کو ہمارے خلاف بھڑکایا ہوگا۔“

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ زائدہ، مقتول کی ماں کے لیے اپنے دل میں شدید نوعیت کا غم و ہمدردی محسوس کرتی تھی۔

”زائدہ لی بی! میری بات غور سے سنو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارا ہوں ذرا دکھری ٹائپ کا۔ میں کسی کے بھرانے اور بھڑکانے میں نہیں آتا۔ میں اپنے دماغ کو استعمال کر کے قانونی تقاضوں کے اندر رہ کر کام کرتا ہوں۔ فیضی کی گرفتاری تفتیشی عمل کا حصہ ہے۔ اگر وہ بے گناہ ہے تو اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوگا، میں تمہیں اس بات کا اطمینان دلاتا ہوں۔“

”میں نے سلطانہ کا نام اس لیے لیا کہ وہ ہر وقت ہمارے خلاف ادھر ادھر زہر لگتی رہتی ہے۔“ وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں، ہم نے اس کا کیا کیا زاپہ۔ اس نے ہمیں نشانے پر کیوں رکھا ہوا ہے.....؟ پر کسی کو کیا دوس دیں جب.....“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھر ادھر باتیں پوچھتے بنا نہ رہ سکا۔

”جب کیا.....؟“

”جب اپنی کٹی چوروں کے ساتھ مل جائے تو پھر گھر کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے!“ اس نے زہر لیے لہجے میں جواب دیا۔

زائدہ کا اشارہ اپنی چھوٹی بہن شاہدہ کی طرف تھا۔ میں اب تنازع کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ شاہدہ نے فیضی کے لیے اپنی بیٹی خالہ کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور پھر خالہ کی شادی مقتول آفتاب

نات لے

سے ہو گئی تھی۔ جب میری سلطانہ سے بات ہوئی تھی تو اس نے اپنے بیٹے کے قتل کے حوالے سے فیضی پر بڑے قوی شک کا اظہار کیا تھا۔ گویا زائدہ کا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ سلطانہ اس کے لیے اپنے دل میں ٹائپنڈی کے جذبات رکھتی تھی۔ دوسری جانب زائدہ بھی سلطانہ کو ایک شرانگیز اور فتنہ پرور عورت سمجھتی تھی بلکہ ابھی اس نے ایک محاورے میں سلطانہ کے لیے چوروں کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یہ معما ابھی تک میری بھی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ چھوٹی بہن نے اپنی بیٹی کے لیے بڑی بہن کے بیٹے کا رشتہ کیوں ٹھکرا دیا تھا.....؟

جب کوئی شے کسی سمجھ دار انسان کی سمجھ میں ٹھیک طرح نہ بیٹھتی تو وہ اندر سے مضطرب ہو جاتا ہے۔ ان لحاظ میں، میں بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے زائدہ کو غیر محسوس انداز میں ٹھکرا شروع کیا۔

”زائدہ لی بی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھ دار انداز میں کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے اپنی چھوٹی بہن شاہدہ کے لیے تکی (کتنا) اور سلطانہ کے بھرانے کے لیے چوروں کے الفاظ کا استعمال کیا ہے کہ ان لوگوں کی ملی بھگت سے آفتاب کی شادی خالہ سے ہو گئی اور تمہارا بیٹا فیضی دیکھا اور ہاتھ ملتا رہ گیا.....“ میں نے چند سیکنڈ کے توقف کے بعد ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

”تم نے شاہدہ کو جو ناشل دیا ہے اس کی مناسبت سے میں تمہارے بیٹوں کے لیے کتے کا لفظ تو استعمال نہیں کروں گا لیکن اگر تمہیں توفیق ہو تو چند لحظات کے لیے یہ ضرور سوچنا کہ ممکن ہے، اس سارے کشمکش میں شاہدہ کا کہیں کوئی قصور نہ ہو۔ فدا حسین نے چھوٹے بھائی کی محبت کے جھکاؤ میں اپنی بیٹی کا رشتہ فیاض کے بیٹے آفتاب کو دے دیا ہو.....!“

”سب جائیں جہنم میں۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔ ”میں تو یہ جانتی ہوں، شاہدہ کو شہر کی ہوا نے خراب کر دیا ہے۔ جب وہ گاؤں میں تھی تو ایسی نہیں مٹی۔“

”اگر شہر کی ہوا نے شاہدہ کا دماغ خراب کیا ہوتا تو وہ خالہ کو کو شہرہ ورکاں بیٹا بنے کے بجائے ادھر کو گرجا نوالہ میں یا پھر لاہور میں اس کا رشتہ طے کرتی۔“ میں نے زائدہ کی بے بسی بات کے جواب میں ایک منطقی دلیل دی۔

”بہر حال.....“ وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ ”مجھے کسی اپنے پرانے، ایرے غیرے، نحو خیرے کی پروا نہیں ہے۔ میں صرف اور صرف اپنے خاندان کے لیے پریشان ہوں۔“

میرا سارا دھیان شوکت علی میں لگا ہوا ہے۔“
یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ فیضی کے باپ پر
فانچ کا ایک ہوا تھا۔ اس کے بدن کا زیریں حصہ بے جان ہو کر
رہ گیا تھا۔ صرف اوپر کے دھڑ میں جان تھی۔ ٹھنکی علاج جاری
تھا مگر وہی بات کہ فانچ کا مرض گھوڑے کی رفتار سے آتا ہے اور
جوں کی رفتار سے جاتا ہے، ٹھنکی علاج سے ابھی تک شوکت علی کو
خطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تھا۔

”کیا ہوا تمہارے خاندان کو؟“ زاہدہ کی بات کے جواب
میں نے استفسار کیا۔

”آپ کو یہ بات پتہ ہی ہوگی کہ شوکت کو فانچ کا ایک
ہوا تھا۔“ وہ غمزہ لہجے میں بولی۔ ”جب شاہدہ نے فیضی کو
خالدہ کا رشتہ دینے سے انکار کیا تو اس کے فوراً بعد ہی شوکت
پر فانچ گرا تھا۔ شروع میں وہ بات چیت کرتا تھا۔ بولنے کی
طاقت اب بھی ہے اس میں لیکن خالہہ کی شادی کے بعد اس
نے زبان پر تلا ڈال دیا ہے، ہونٹ سی لیے ہیں۔ بس ہر
وقت بیٹھا آسو بہا تارہتا ہے۔ میں تو شوکت کی اس کسپری
اور بے بسی کی ذمے دار شاہدہ کو سمجھتی ہوں۔ اس کی مہٹ
دھری اور عاقبت نااندریشی نے ہمارے ہنسنے بھسنے گھر کو جاڑ
کر رکھ دیا ہے۔“

زاہدہ نے بات ختم کی تو اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے اس
پر ترس آیا۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔
”زاہدہ! تم مطمئن ہو کر گھر جاؤ۔ فیضی نے کچھ نہیں
کیا تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔ تم گھر جا کر شوکت علی کی دیکھ بھال
کرو۔ میں بھی آج کسی وقت تمہارے گھر آ کر شوکت کی
خیریت دریافت کروں گا۔“

میری تسلی بھری باتوں نے اس کی آنکھوں میں بے
فکری کے دے روشن کر دیے۔ اس نے امید افزا نظر سے مجھے
دیکھا اور میرا شکریہ ادا کر کے تھانے سے رخصت ہو گئی۔
اس تیس کے مختلف کرداروں نے مجھے جذباتی کشش
سے دوچار کر دیا تھا۔ ہر کردار ایک لمحے تصور دار اور دوسرے
لمحے بے گناہ دکھائی دیتا تھا۔ میں محل کرکسی پر تہمتی کرنے کے
بارے میں سوچتا تو اس کی ذات کا مظہم پہلو میری نگاہ میں
اجاگر ہو جاتا اور جب کسی کو رعایت دینے کا فیصلہ کرتا تو اس
کے اندر کوئی نہ کوئی خرابی جلوہ افروز ہو جاتی۔

یہ غمگین ہے کہ میں ابھی کر رہ گیا تھا لیکن میں مایوس
ہرگز نہیں تھا۔ میں مایوس کو گناہ بکیرہ تصور کرتا تھا۔ میرا یہ ماننا
تھا اور ملکی زندگی کا تجربہ بھی یہی تھا کہ انسان کی کامیابی اور
ناکامی کے بیچ میں ایک پل صراط کے مانند پتلی لکیر کا فاصلہ

ہوتا ہے۔ انسان جس لمحے مایوس ہو کر ہمت ہار بیٹھے، وہ
ناکام ہو جاتا ہے۔ اگر وہ تھوڑی سی ہمت اور کر کے امید کے
دامن کو تھام کر صرف ایک قدم آگے بڑھ کر اس لکیر کو عبور
کر لے تو لکیر کی دوسری جانب کامیابی بائیں داکے اسے
کلے لگانے کے لیے تیار کھڑی ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا
ہے..... ہمت مرواں، مدد خدا!

میں نے بھی امید کے دامن کو تھامے رکھا اور سہ پہر میں
میری مراد برآئی۔ اے ایس آئی مشکور حسین کی دواہی نے اس
کیس کو ایک نئی سمت سے روشناس کر دیا تھا۔

مشکور حسین میرے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے اس
کے چہرے پر دبا دبا سا جوش نظر آیا جیسے اس نے کوئی اہم
کتبت دریافت کر لیا ہو۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں
نے پوچھا۔

”کیا تمہیں چودھری نواز شعلی اینڈ سنز آسانی سے مل
گئی تھی؟“

”جی ملک صاحب! یہ غلہ منڈی کی بہت مشہور دکان
ہے۔“ اس نے جواب دیا پھر قدرے آگے کو جھپک کر
اکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”میں فوری طور پر جیدا کو گرفتار
کرنا ہو گا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونک کر اس کی
طرف دیکھا۔ ”تم پرانی غلہ منڈی سے کون سی خاص خبر
لائے ہو؟“

اے ایس آئی نے اپنی جیب میں سے تہ شدہ کاغذات
نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ خود دیکھ لیں۔
میں کیسی سنسنی خیز خبر لے کر آیا ہوں.....!“

میں نے وہ تہ شدہ کاغذات اس کے ہاتھ سے لے کر
انہیں کھول کر دیکھا۔ ان میں سے ایک تو وہی مختلف بیجوں کی
خریداری کی رسید تھی جس کی تصدیق کے لیے میں نے اے
ایس آئی کو پرانی غلہ منڈی روانہ کیا تھا اور دوسرا کاغذ اسی کیش
میو کی کاربن کاپی تھی۔ رسید یک میں سے جب کوئی رسید کاٹ
کر گا ہک کو دی جاتی ہے تو اس کی کاربن کاپی اسی رسید یک کے
اندر محفوظ رہ جاتی ہے۔

میں نے وہاں نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا اور
پوچھا۔ ”اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟ ایک رسید ہے
اور دوسری اس کی کاربن کاپی.....!“

”ملک صاحب! وہ زیر پرل مسکراتے ہوئے معنی خیز
انداز میں بولا۔ ”آپ اس رسید پر درج خریداری کی تاریخ
تو دیکھیں!“

”رسید پر اس ماہ کی اٹھارہ تاریخ ڈلی ہوئی ہے۔“
میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”جب جیدا سبزیوں کے بیج کی
خریداری کے لیے پرانی غلہ منڈی گیا تھا اور اسی روز بیج پانچ اور
چھ بیجے کے درمیان آفتاب کو بڑی بے دردی سے موت کے
گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔“

”بالکل غمگین۔“ اے ایس آئی کی مسکراہٹ گہری
ہوئی۔ اس نے رسید کی کاربن کاپی کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے کہا۔ ”اب ذرا آپ اس پر درج تاریخ کو پڑھیں۔“

میں نے پڑھا اور چونک اٹھا۔ کاربن کاپی پر خریداری
کی تاریخ اسی ماہ کی تین ڈلی ہوئی تھی۔ جب میں نے اصل رسید
اور اس کی کاپی کو پہلو بہ پہلو کر کے غور جائزہ لیا تو مجھے یہ سمجھے
میں قطعاً کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ کسی نے رسید کے تاریخ
والے حصے میں کاریگری کر کے تین کے ہند سے کو آٹھ بنا ڈالا تھا
اور پھر اس آٹھ کے بائیں پہلو میں ایک کا اضافہ کر کے اس
تاریخ کو تین سے اٹھارہ میں بدل دیا تھا اور یہ ”کسی“ جیدا کے
سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

”جیدا تو بڑا فنکار نکلا ملک صاحب۔“ اے ایس آئی
نے سرسری ہوئی آواز میں کہا۔

”اس کی ساری فنکاری تو میں پتا نہیں، کہاں کہاں سے
نکالوں گا۔“ میں نے دانت کچکاتے ہوئے کہا۔ ”تم انہی نوشرہ
درکال جاؤ اور جیدا کو گرفتار کر کے یہاں لے آؤ۔“
اے ایس آئی فی الفور میرے حکم کی تعمیل میں نوشرہ
درکال روانہ ہو گیا۔

اس امر میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ
مذکورہ رسید میں جعل سازی جاوید عرف جیدانے ہی کی تھی گویا
اس نے حقیقت کو ڈھانپنے کے لیے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔
ایسی کون سی بات تھی جو وہ چھپانا چاہتا تھا۔ فی الحال میرے پیش
نظر تو صرف ایک ہی اہم معاملہ تھا اور وہ تھا، آفتاب کے قاتل
تک رسائی حاصل کرنا۔

پرانی غلہ منڈی سے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ
وقعہ کے رد ذیل یعنی اٹھارہ تاریخ کو نہ تو جیدا وہاں گیا تھا اور نہ ہی
اس نے چودھری نواز شعلی اینڈ سنز سے کوئی چیز خریدی تھی۔ یہ
سارا پکڑا اس نے جانے واردات سے اپنی غیر موجودگی کو ثابت
کرنے کے لیے چلایا تھا..... آخر کیوں؟

جب کوئی شخص دروغ گوئی یا تخریری جعل سازی یا
غلط بیانی سے کام لیتا ہے تو دراصل وہ اپنے کسی جرم پر پردہ
ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ تو کیا..... آفتاب کو جیدا نے
قتل کیا تھا؟

دل

دل اور آنکھوں میں کس قدر گہرا رشتہ ہے۔
آنکھیں دل کی ترجمان ہوتی ہیں۔ دل پر چوٹ پڑے
تو آنکھوں کا پتلا نہ جھپک پڑتا ہے۔ اگر دل میں
جذبات موجود ہیں تو آنکھیں خوشی سے مہک اٹھتی ہیں،
کڑکیز پھوٹ پڑتی ہیں۔ محبت سے خالی دل اس غار
کے مانند ہے جس میں جانور بھی داخل ہونے سے خوف
کھاتے ہیں۔ حقیقی خوبصورتی کا سرچشمہ دل ہے۔ اگر
دل سیاہ ہو تو چمکتی آنکھیں کچھ کام نہیں دیتیں۔

مسکراہٹ

☆ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔
☆ یقین دلاتی ہے کہ مسکرانے والے کا دل
کدورتوں سے پاک ہے۔
☆ مایوسی کے تاریک بادلوں میں امید کی کرن ہے۔
☆ ایک ایسا تحفہ ہے جو دینے والے کو غفلت کیے
بغیر پانے والے کو بہت کچھ دیتا ہے۔
☆ ایک ایسا نذرانہ جو غمگرا یا نہیں جاسکتا۔
☆ ایک ایسا پردہ ہے جس کے پیچھے ہزار راز
پنہاں ہوتے ہیں۔
☆ دینے والے کو بھی مسرور کرتی ہے اور سامنے
والے کو بھی سرشار کر دیتی ہے۔

☆ زندگی جینے کی ہر آن نئی امید پیدا کرتی ہے۔
مرسلہ: عید الجبار رومی انصاری۔ قصورٹی

یادیں

یادیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ دل کی گہرائیوں
سے کھرہنے کی کوشش کر دو تو ردی خراشیں پڑ جاتی ہیں۔
بھلا یاد بھی کبھی مٹ سکتی ہے وہ تو چاند کے کبھی نہ مٹنے
والے داغ کی طرح ہے جو سدا نمایاں رہتا ہے.....
زندگی بیت جاتی ہے لیکن زندگی کی راہ گزر پر بیٹا ہوا
کوئی لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا ہے۔ پانے کی خواہش تو
صرف ایک لمحے کی ہوتی ہے لیکن پا کر کھودینے کا غم
جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ ہر غم اسی طرح تازہ رہتا ہے
جیسے کل ہی کی بات ہو۔

مرسلہ: دیر محمد خان۔ بطل ہزارہ

اس سوال کا جواب ”ہاں“ یا ”نہ“ میں حاصل کرنے کے لیے مجھے اسے ایسے آئی کی واپسی کا انتظار کرنا تھا اور..... یہ انتظار آدھے گھنٹے میں ختم ہو گیا۔

جیسا ایک مرتبہ پھر میرے کمرے میں موجود تھا لیکن اس بار میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ بات شروع کرنے سے پہلے ہی میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار ہانچہ رسید کیا پھر اسل اور کا پی دونوں اس کو دکھاتے ہوئے خوار لہجے میں پوچھا۔

”اس کی ضرورت کیوں پیش آئی تھیں؟“
”مم..... میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا.....“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کو کوئی غلطی ہوئی ہے۔“
”اے غلط فہمی کی اولاد.....!“ میں نے کہا جانے والی نظر سے اسے گھورا اور سخت انداز میں کہا۔ ”میں آفتاب کے قتل کے بارے میں نہیں، اس رسید کی تاریخ میں تبدیلی کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔ تم نے تاریخ میں ردوبدل کیوں کیا؟“
میرے کڑے سوال پر اس کا رنگ اڑ گیا، وہ لوٹکر اہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کیا جناب۔ یہ رسید مجھے بھانسنے کے لیے.....“

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے دوسرے گال کو بھی ”شرف“ بخش دیا پھر غونفناک لہجے میں دریافت کیا۔ ”اشارہ تاریخ کا پورا دن تم نے کہاں گزارا تھا؟“
”جی..... میں نے آپ کو..... بتایا تو تھا کہ..... میں سبزیوں کے بیج..... لینے پرانی غلہ منڈی گیا تھا.....“ وہ اپنے جھوٹ کو طاقت کا ٹکڑا ٹکڑا لگاتے ہوئے بولا۔ ”میں پرانی غلہ منڈی.....“

اس کی ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے میں نے باقاعدہ اس کی وھلائی شروع کر دی۔ اس دوران میں اسے میں ”تبدیلی تاریخ“ والے اس کے کارنامے سے بھی آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں پٹا رہا اور اس کے ”علم“ میں خاطر خواہ ”اضافہ“ بھی ہوتا گیا۔ جب اس کے پاس کوئی راہ فرار نہ رہی تو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”تھانیدار صاحب! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے رسید کی تاریخ کیوں تبدیلی کی تھی لیکن آپ میری بات کا یقین کریں کہ میں نے آفتاب کو قتل نہیں کیا۔ آپ اگر مار مار کر مجھے اداہمرا کر دیں گے یا میری جان بھی لے لیں گے تو میرا بیان تبدیلی نہیں ہوگا کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ آفتاب کی موت سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔“

جیدانے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ چند لمحات کے

لیے میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے لہجے سے بے پناہ اعتماد جھلکتا تھا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا۔
”اگر آفتاب کے قتل میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں تو پھر تم نے اپنی جعل سازی سے تین تاریخ والی رسید کو اشارہ تاریخ والی رسید کیوں بنایا۔ وہ بھی عین اس روز جب آفتاب کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ تمہارے اس عمل کے پیچھے کون سا مقصد چھپا ہوا تھا؟“

وہ اپنی قمیص کی آستین سے ہونٹوں سے رتنے والے خون کو صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے باپ کو دھوکا دے کر کچھ رقم حاصل کرنا چاہتا تھا۔“
میں نے غصے میں اس کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی تھی۔ میرے چائوں اور گھونٹوں نے اس کے چہرے کی کھال کوئی جگہ سے بری طرح مجروح کر دیا تھا اور بعض مقامات سے باقاعدہ لہو بھی رس رہا تھا۔ اس ذیل میں اس کے ہونٹ سرخسرت تھے۔ مجھے اس کی حالت زار پر ترس بھی آیا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

تین تاریخ کو جیدا پرانی غلہ منڈی سے مختلف مزیوں کے بیج خرید کر لایا تھا اور ان کی اصل رسید بھی اس کے پاس تھی۔ جیدا کے باپ کی یادداشت گزربڑکا شکارتھی۔ اسے پیڑیوں کی ضرورت تھی۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس کے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ آ گیا۔ اس نے سبزیوں کے بیج والے تھیلوں کو نہیں چھپا دیا اور باپ سے کہا کہ بیج لائے ہیں۔ اسے پیسے دے۔ باپ نے اس ذیل میں جیدا کو کچھ رقم دے دی۔ جیدانے اپنے منصوبے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تین تاریخ..... کو اشارہ تاریخ کی رسید بنادیا۔ گھر پہنچ کر اس نے چھپائے ہوئے تھیلے باہر نکال لیے اور اپنے باپ کو مطمئن کر دیا کہ وہ غلہ منڈی سے سبزیوں کے بیج خرید کر لے آیا ہے۔ اس کی فحشیت کہ اس نے اس کام کے لیے جو دن چٹائی روز آفتاب کا قتل ہو گیا اور جیدا اس کیس کی نقیشتیں کی لپیٹ میں آ گیا۔

میں نے جیدا کی کٹھا کو گہری سنجیدگی سے سنا اور جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”تم نے اپنے باپ کو دھوکا دے کر جو رقم حاصل کی اس کا تم نے کیا کیا؟“

میرے سوال پر وہ مذہب کا شکار ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہا ہے لیکن کسی اندرونی

نالت تلے

انکچا ہٹ کے باعث وہ اپنے ارادے پر عمل نہیں کر پا رہا۔ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”جیدا! اس خوش فہمی میں نہیں رہنا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری کہانی پر یقین کر لوں گا اور یہ فرض خیال میں ایک لمحے کے لیے تمہاری داستان کو بچ مان بھی لوں تو تمہیں بتانا ہوگا..... تم نے کس مقصد کو پورا کرنے کے لیے دھوکا دہی سے رقم حاصل کی تھی؟“

”تھانیدار صاحب! میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔“ بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”بات یہ ہے جناب کہ مجھے جو اکھیلنے کی لگت ہوئی ہے۔ میں نے یہ رقم جو اکھیلنے کے لیے حاصل کی تھی۔ ادھر پرانی غلہ منڈی کے نزدیک میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں اپنے اس دوست کے ساتھ جوئے کے ایک اڈے پر جا کر بازی لگا تا ہوں۔ ہار جیت اس کھیل کا حصہ ہے لیکن اشارہ تاریخ والا دن میرے لیے بہت محسوس ثابت ہوا۔ ایک تو میں ساری رقم جوئے میں ہار گیا اور جب نوشہرہ ورکاں واپس آیا تو مجھے آفتاب کے قتل کے الزام میں دھرا لیا گیا۔“

میرا اندازہ تو یہی کہہ رہا تھا کہ جیدا اور وہ کوئی سے کام نہیں لے رہا لیکن میں نے اپنے اس اندازے کو چہرے کے تاثرات سے جھٹکنے نہیں دیا اور جیدا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حتیٰ لہجے میں کہا۔

”جب تک تمہارے بیان کی تصدیق نہیں ہو جاتی، تم تمہانے کی حوالات میں میرے مہمان رہو گے۔ مجھے اپنے اس دوست کا نام بتاؤ جو پرانی غلہ منڈی میں رہتا ہے۔ میں تمہارے بیان کی پرکھ کے لیے بیج اپنے کسی بندے کو پرانی غلہ منڈی روانہ کروں گا۔“

”اس کا نام حنیف ہے۔“ جیدانے بتایا۔ ”حنیف غلہ منڈی میں لیے داری (مزدوری) کرتا ہے۔“

”اور تم لوگ جو اکھیلنے کا ڈسے پر جاتے ہو.....؟“
”بد مزید کے اڈے پر۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس اڈے کا نام پتلی بتاؤ؟“
اس نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

میں نے ایک کاغذ پر یہ تمام معلومات نوٹ کیں پھر ایک کانٹیل کو ہلا کر جیدا کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کو حوالات میں بند کر دو۔ آج کی رات یہ ہمارا مہمان ہے۔“

کانٹیل نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”کیا اسی حوالات میں یا.....؟“

میں فوراً سے پیشتر اس کا اشارہ سمجھ گیا اور پھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نہیں..... دوسرے کمرے میں۔ یہ تھانہ ہے۔ باہر کے رشتوں اور تعلقات کی یہاں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوستی بھانسنے کے لیے نوشہرہ ورکاں کی فضا ہی کافی ہے.....!“
جیدا کے کان کھڑے ہو گئے۔ خاصا ہوشیار دماغ بنایا تھا اس نے۔ ایک جھپٹے میں وہ میری بات کی تہ میں پہنچ گیا اور سرسرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کیا..... آپ نے فیضی کو بھی..... بند کر رکھا ہے؟“
میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆ ☆ ☆
اکس تاریخ کی صبح میں نے ایک جیتا جاں باز قسم کے کانیاں کانٹیل کو پرانی غلہ منڈی روانہ کر دیا تاکہ وہ حنیف اور بد مزید سے ملاقات کر کے جیدا کے بیان کی تصدیق کر سکے۔ یہ جیدا کے لیے آخری موقع تھا۔ اگر اس مرحلے پر وہ جھوٹا ثابت ہو جاتا تو پھر اس کی بچت کے امکانات معدوم ہو جاتے۔

گزشتہ شب میں نے فیضی کو نہیں چھوڑا تھا بلکہ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں خود اس کے گھر چلا گیا تھا۔ زاہدہ کی زبانی شوکت علی کے جو حالات مجھ تک پہنچے تھے، انہوں نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ میں شوکت علی کی اٹکن شوٹی کی غرض سے اس سے ملنے گیا تھا۔

شوکت علی سے یہ مختصر ملاقات نہایت ہی اہم، سسنی خیز اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ وہ اپنے گھر کے صحن میں ایک چارپائی پر سونے نیکے سے نیک لگائے نیم دراز تھا۔ جب زاہدہ نے اسے میری آمد کی اطلاع دی تو وہ جلدی سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ زاہدہ نے میرے بھیننے کے لیے شوکت علی کے نزدیک ایک کرسی رکھ دی تھی۔ میں شوکت علی سے مصافحہ کرنے کے بعد اس کرسی پر بیٹھ گیا مگر اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا اور زاہدہ کی جانب دیکھتے ہوئے نگاہوں میں نگاہوں میں اپنی بیوی کو دہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

جب زاہدہ رخصت ہو گئی تو شوکت علی نے میرے ہاتھ کو تھامے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے اس کی بند آنکھوں کے گوشے جھپک گئے۔ اس نے بد دستور میرے ہاتھ کو تھام رکھا تھا جس کے سبب مجھے اس کے بدن پر طاری دھبے لرزے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ چھوٹے ہی مجھ سے فیضی کو چھوڑنے کی بات کرے گا لیکن اس نے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد بند آنکھوں کی چپ سا دھلی تھی۔

وہ زبان سے خاموش تھا لیکن یہ زبان خاموشی اس کا پورا

سے کہا۔ ”آئندہ ایسی غلطی نہیں ہونا چاہیے۔“
”جی ملک صاحب! میں وعدہ کرتا ہوں۔“ وہ فرماں
برواری سے بولا۔

”جاؤ..... فیضی کو حوالات سے نکال کر یہاں لے آؤ۔“
میں نے حکماندہ انداز میں کہا۔

ساجد نے فی الفور میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ جب فیضی
میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا تو میں نے یہ غور اس کے ہاتھوں کا
جائزہ لیا۔ وہ بے چینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کڑے لہجے
میں استفسار کیا۔

”تمہاری انگوٹھی کہاں ہے؟“

”کون سی انگوٹھی تمہانیدار صاحب!“ اس نے حیرت اور
الہجھن کی ملی جلی کیفیت سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”میں نے تو کبھی
کوئی انگوٹھی پہنی ہی نہیں.....“

وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ اگر وہ کوئی انگوٹھی پہننے کا
عادی ہوتا تو اس کی کسی نہ کسی انگلی پر انگوٹھی کی بیشک کا مخصوص
نشان ضرور بن گیا ہوتا۔

میں نے ساجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جیدا کو بھی
یہاں لے آؤ۔“

تھوڑی دیر کے بعد جیدا بھی لائن حاضر ہو گیا۔ میں نے
وہی سوالات جیدا سے بھی کیے جو اس سے پہلے فیضی سے پوچھ
چکا تھا اور حسب معمول جیدا کے جوابات بھی وہی تھے۔ جیدا
کے ہاتھوں کی تمام انگلیاں بھی اس بات کی گواہی دے رہی
تھیں کہ وہ انگوٹھی پہننے کا شوق نہیں رکھتا۔ اس صورت حال نے
مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا۔

فیضی نے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہانیدار صاحب! یہ انگوٹھی کا
کیا معاملہ ہے؟“

میں چند لمحات تک ٹٹولنے والی نگاہ سے باری باری ان
دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا پھر اپنی میز کی دراز میں
سے مذکورہ انگوٹھی کو نکال کر میز کے اوپر رکھتے ہوئے ان سے
سوال کیا۔

”کیا تم اس انگوٹھی کو پہناتے ہو؟“

وہ بے یک زبان ہو کر بولے۔ ”یہ تو زلفی کی ہے.....!“

☆☆☆

کچا وارد اتنا جب کچے ہاتھوں کی گرفت میں آتا ہے تو
صرف دو زٹے وار طرپٹے اور دو سکتے ہوئے سوال اس کا پتا
پانی کرنے کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ذوالفقار عرف زلفی
کو جب گرفتار کر کے میرے سامنے لایا گیا تو میں نے اس کے
گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا پھر مانک جزی انگوٹھی اس کی

کے درمیان براجمان دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ستاروں کے
جبرمٹ میں چاند سرگرا ہو رہا۔

ساجد نے اس انگوٹھی کی نسبت سے اپنی کسی غلطی کا ذکر
کیا تھا لہذا میں نے کڑے لہجے میں سوال کیا۔ ”یہ انگوٹھی تم نے
کہاں سے چرائی ہے؟“

”میں نے یہ انگوٹھی چرائی نہیں ملک صاحب۔“
وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پڑی ہوئی
ملی تھی۔“

”کہاں پڑی ہوئی ملی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے اضطرابی انداز
میں ساجد سے استفسار کیا۔ ”کمرے کی عقبی کھڑکی کے نیچے
ہے؟“

”جی جی.....“ وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے
بولا۔ ”بالکل وہیں ہے۔“

میری چھٹی حس نے سنسنی دیا، اس انگوٹھی کا آفتاب کے
قتل سے گہرا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں نے سرزنش کرنے والے
انداز میں ساجد سے کہا۔

”اور..... تم تین دن کے بعد یہ انگوٹھی مجھے دکھا رہے
ہو۔ تم نے اس انگوٹھی کے پتے کچالنے کے لیے کسی سرخی کے
نیچے تو تین رکھ دیا تھا.....؟“

”نہیں ملک صاحب۔“ وہ سرکٹنی میں حرکت دیتے
ہوئے بتانے لگا۔ ”میں نے اس خیال سے یہ انگوٹھی اٹھا کر
اپنی جیب میں رکھ لی تھی کہ اندر جا کر آپ کو دوں گا پھر پتا
نہیں، کس طرح یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی اور انگوٹھی
میری جیب کے اندر ہی پڑی رہ گئی۔ یہ تو کل جب گھر میں
میری یونیفارم دھوئی گئی تو اس کی جیب سے انگوٹھی برآمد
ہوئی.....“ لمحائی توقف کر کے اس نے لاجبت آمیز نظر سے
مجھے دیکھا اور بولا۔

”مجھے معاف کر دیں ملک صاحب!“

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔
میں نے آفتاب کے قتل کے شبے میں اس وقت دو افراد کو کھانے
کی حوالات میں، الگ الگ کمروں میں بند کر رکھا تھا۔ میرے
مخاطب انداز سے کے مطابق، اگر جیدا یا فیضی میں سے کسی نے
آفتاب کو موت کے گھاٹ اتارا تھا تو اس انگوٹھی کا تعلق اسی سے
ہونا چاہیے تھا اور اس بات کو چیک کرنا بہت آسان تھا کیونکہ وہ
دونوں میری تحویل میں تھے۔

”ٹھیک ہے ساجد! میں تمہاری اس کوتاہی کو نظر انداز
کرتا ہوں۔“ میں نے کانسٹیبل کی جانب دیکھتے ہوئے نرمی

شوکت علی کے ایک ایک لفظ میں سوسو بھید چھپے ہوئے
تھے۔ قبل اس کے کہ میں اس سے اس کے آخری جملے کی وضاحت
مانگتا، وہ بند آنکھوں کے پیچھے سے کرناک آواز میں بولا۔

”تمہانیدار صاحب! میں زیادہ دن تک جی نہیں سکوں
گا۔ مجھے نہیں امید کہ ہماری دوبارہ بھی ملاقات ہو پائے، اس
لیے میں آپ کو اپنی زندگی کے سب سے اہم راز سے آگاہ کرنا
چاہتا ہوں..... وہ راز جو صرف میرے، شاہدہ اور اللہ کے بیچ
میں ہے اور اب آپ اس راز میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنا
کان ادھر لائیں.....“

میں نے بے ساختہ اپنا کان اس کے ہونٹوں کے
نزدیک کر دیا پھر یہ زبان سرگوشی شوکت علی نے میری سماعت
میں پھلکا، وہ ایسا انڈیل دیا تھا۔

میں گزشتہ شام سے اب تک شوکت علی کے الفاظ کے
سحر میں گرفتار تھا۔ سچ بچ کر دہواتا ہے اور سچ بولنے والا بہت
بہادر۔ میری نظر میں شوکت علی ایک بہادر انسان تھا۔

میں شوکت علی اور اس کی برأت کے بارے میں سوچ
ہی رہا تھا کہ کانسٹیبل ساجد میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس
کے چہرے پر پریشانی نے ڈیرا جھرا رکھا تھا۔ میرے قریب پہنچ
کر وہ گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا
ہو ساجد! تمہاری شکل پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں؟“

”مجھ سے ایک سنگین غلطی ہوئی ہے ملک صاحب!“ وہ
ملتھانیا انداز میں بولا۔ ”آپ مجھے معاف کر دیں سر.....“

”معاف کرنا یا سزا دینا تو بعد کی بات ہے، پہلے مجھے یہ
تو پتا چلے کہ تم نے کون سا چاند چڑھا دیا ہے۔“ میں نے اسے
گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”اور اس بات کا فیصلہ بھی میں
ہی کروں گا کہ تمہاری غلطی سنگین ہے یا نہیں..... اس لیے شروع
ہو جاؤ..... شاباش!“

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک انگوٹھی برآمد کی
پھر مذکورہ انگوٹھی کو میری جانب بڑھاتے ہوئے ندامت آمیز
لہجے میں بولا۔

”مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے ملک صاحب!“

میں نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لے کر یہ غور جائزہ لیا۔
وہ چاندی کی ایک خوب صورت انگوٹھی تھی جس کے اندر ایک
دلکش مانک جڑا ہوا تھا۔ مانک کا وزن لگ بھگ دس قیراط ہو گا۔
مانک کے گرد بیضوی شکل میں نئے نئے فیروزے جڑے ہوئے
تھے۔ فیروزی اور سرخ رنگ کے گدگدوں کے امتزاج نے اس
انگوٹھی کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ مانک کو فیروزوں

جسم کو کلام تھا اور بند آنکھیں آنسوؤں کی تحریر میں باقاعدہ
منطق کو کر رہی تھیں۔ میں قشقی آمیز انداز میں اس کا ہاتھ پھٹکے لگا۔
”سب ٹھیک ہو جائے گا شوکت علی۔“ میں نے اپنا ہاتھ
بھرے لہجے میں کہا۔ ”اللہ نے ایسی کوئی بیماری پیدا نہیں کی
جس کا علاج بیماری سے پہلے زمین پر نہ اتارا ہو۔ دیکھ لینا، تم
بہت جلد تندرست ہو جاؤ گے۔“

”موت بھی ایک بیماری ہے تمہانیدار صاحب.....“ وہ
بند آنکھوں کے پیچھے سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”جس کا
کوئی علاج نہیں۔ میں بھی چند دن کا مہمان ہوں۔ بہت جلد
موت مجھے گلے لگالے گی۔“

”حوصلہ رکھو شوکت علی۔“ میں نے اسے تسلی دی۔
”واقعی، موت کا کوئی علاج نہیں لیکن میری نظر میں موت کو بیماری
سے تعبیر کرنا مناسب نہیں۔ موت تو ایک ایسی ٹرین ہے جس پر
سوار ہو کر انسان اپنے خالق کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس ٹرین کو
اپنے ٹریک پر رواں دواں رہنا چاہیے تاکہ خالق اور مخلوق کی
ملاقات کا سلسلہ جاری و ساری رہے۔“

شوکت علی کے بدن کی ہر تھڑا ہٹ ہاتھ کے راستے
میرے وجود میں منتقل ہو رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی
دقت محسوس نہیں ہوئی کہ صرف آنکھیں ہی نہیں بلکہ اس کا دل،
جلگرتی کہ جسم کا رواں دواں جو گمرہ زنجاری تھا۔ وہ آنکھوں کو یہ
دستور بند رکھتے ہوئے تمناک آواز میں بولا۔

”لوگ سمجھتے ہیں، فیضی کی خالدہ سے شادی نہ ہو سکے
کے سبب مجھے پہنچنے والے صدمے سے میں مفلوج ہو گیا
ہوں۔ یہ لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں شاہدہ
کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں۔ اگر شاہدہ اس رشتے کے
لیے راضی ہو بھی جاتی تو میں انکار کر دیتا۔ یہ زاہدہ کی خواہش
تھی کہ وہ خالدہ کو اس گھر کی ہو بیٹا کر لائے۔ میں ہرگز اس
کے حق میں نہیں تھا.....“

شوکت علی نے لمحائی توقف کیا تو میں نے اس سے کوئی
سوال پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالانکہ اس نے جس
انداز کی بات کی تھی، اس پر سو استفسارات بنتے تھے۔ اس کی
آنکھیں اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اس کے گالوں کو بیگور رہی
تھیں۔ وہ اپنی بات تو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”انسان خطا کا پتلا ہے تمہانیدار صاحب۔ کوئی چاہے کتنا
بھی عقل مند ہو، اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ شاہدہ نے بھی
ایک سنگین غلطی کی تھی۔ والدین کو اپنی اولاد کی پسند و ناپسند کا
خیال رکھنا چاہیے۔ اگر وہ خالدہ کا رشتہ آفتاب کے بجائے زلفی
کو دیتی تو یہ زیادہ مناسب ہوتا۔“

آنکھوں کے سامنے لاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تمہاری ہے نا؟“

انگوٹھی پر نگاہ پڑتے ہی اس کا رنگ اڑ گیا، حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے استفسار کیا۔

”یہ آپ کو کہاں سے ملی؟“

”جہاں سے تم کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر پہنچے تھے۔“ میں نے اس کے دوسرے گال کو نشانہ بناتے ہوئے زہر خند لیچے میں کہا۔

وہ ہکا بکا ہو کر میری صورت دیکھنے لگا۔ شوکت علی کے نم ناک الفاظ میری ساعت میں گردش کرنے لگے۔ کوئی چاہے کتنا بھی عقل مند ہو، اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ شاید نے بھی ایک سنگین غلطی کی تھی۔ والدین کو اپنی اولاد کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر وہ آفتاب کے بجائے خالدہ کا رشتہ زلفی سے کرتی تو یہ زیادہ مناسب ہوتا۔

”کیا خالدہ تمہیں پسند کرتی ہے؟“ میں نے زاہدہ کے خیالات کی روشنی میں زلفی سے استفسار کیا۔

”جی..... یہ سچ ہے۔“ وہ تھوک تلکتے ہوئے بولا۔ ”میں بھی خالدہ کو بہت چاہتا ہوں۔“

”تو کیا اپنی پسند اور چاہت کے حصول کے لیے تم نے مجھے بھائی کی جان لے لی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نفرت بھرے لیچے میں پوچھا۔

”خود غرضی اور سفاکی کی اس سے زیادہ بدترین اور کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔“

اس نے مجرمانہ انداز میں گردن جھکا دی۔

اگلے ایک گھنٹے کے اندر میں نے اس کا اقبالی بیان ریکارڈ کر لیا۔ واقعات کے مطابق، خالدہ اور زلفی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن آفتاب کی شادی کے موقع پر دونوں نے اپنی زبیاں بند رکھیں۔ خالدہ بیاہ کر گوجرانوالہ شہر سے زلفی کی بھائی کی حیثیت سے نوشہرہ وراکاں آ گئی۔ اس صورت حال نے زلفی کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ ہمہ وقت خالدہ کے حصول کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر اس نے ایک شیطانی منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا..... مجھے بھائی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ!

اپنے منصوبے کے مطابق، وقوع سے ایک روز پہلے اس نے اپنی بھاری کا پڑا کامیاب ڈراما چایا اور اٹھارہ تاریخ کی صبح وہ بہ ظاہر کمیٹوں کی طرف پیش کیا۔ وہ رات کو کھجور پر سوتا تھا۔ اس لیے کسی کو اس کی کارکردگی کا پتا نہ چل سکا۔ کسی کو کانٹوں کان خبر کیے بغیر وہ مقتول سے پہلے چپکے سے ڈیرے پر پہنچ

گیا۔ اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ گزشتہ روز کمرے کی عقبی کھڑکی کو بھیڑ آ یا تھا مگر اس کی کٹنی بند نہیں کی تھی۔ وہ دروازے کی اوٹ میں چھپ کر آفتاب کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کا انتظار ختم ہو گیا۔ آفتاب جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھول کر لباس تبدیل کرنے کی غرض سے اندر آیا، زلفی نے ایک آہنی وزنی ریش پانے سے اس کے سر کے عقبی حصے پر ایک خوفناک وار کر دیا۔ اگلے ہی لمحے آفتاب کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند دھڑام سے زمیں بوس ہو گیا۔

کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر کودتے وقت اس کی انگلی سے مائک والی انگوٹھی نکل کر کھال (ٹالے) کے کنارے جا گری تھی۔ اگر مذکورہ انگوٹھی ساجد کے ہتھے نہ چڑھتی تو شاید اس گیس کو حل کرنے میں مجھے مزید جوہم اٹھانا پڑتے۔ دیر آید، درست آید کے مصداق میں آفتاب کے اصل قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”زن، زر، زمین“ کو ازل سے فتنہ و فساد کی جڑ تصور کیا جاتا ہے اور میرے خیال میں اب تک ایسا ہی سمجھا جاتا رہے گا۔ زندگی کے ننانوے فیصد تنازعات کے پیچھے انہی تینوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ کامل دخل ہوتا ہے۔

میں جانتا ہوں، آپ کے ذہن میں یہ سوال بڑی بے قراری سے گردش میں رہا ہو گا کہ اس شام شوکت علی نے میرے کان میں کون سی راز دارانہ سرکشی کی تھی!

اب اس واقعے کو اتنا زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ اس وقت متعلقہ کرداروں میں سے کوئی بھی یہ قید حیات نہیں ہے لہذا آپ سے شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں شوکت علی کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔

”تھانیدار صاحب! میں زیادہ دن تک جی نہیں سکوں گا اس لیے میں آپ کو اپنی زندگی کے ایک اہم راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ راز جو صرف میرے، شایدہ اور اللہ کے بیچ میں ہے اور اب آپ اس راز میں شریک ہو رہے ہیں..... میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ خالدہ، میری اور شایدہ کی ٹکلی مگر جائز اولاد ہے۔ جب شایدہ کی فدا حسین سے شادی ہوئی تو خالدہ اس کے پیٹ میں اپنی زندگی کا سفر شروع کر چکی تھی.....“

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے جید اور فیضی کو اسی روز ہار کر دیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

وہ بڑی مشکل سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لاشیٰ ٹپکتا ہوا آگے بڑھتا، پاؤں آگے رکھتا اور اپنے کانٹے ڈالتے وجود کو لاشیٰ کے سہارے متوازن کرتا اور پھر قدم قدم آگے بڑھتا۔ چہرے پر کہن زندگی کی چغلی کھائی جھریاں، کسی بے ترتیب سفید ڈاڑھی..... جو حجام تک عدم رسائی کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ اپنے رعشہ زدہ وجود کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یوں جیسے اس کا کوئی قدم غلط پڑا تو جسم کی ساری ترتیب بگڑ کر رہ جائے گی۔ کلی کے درمیان ٹین کی وٹکس بنائے لڑکے ربر کی گیند سے کرکٹ

تجائی کا عکار زہرے والے چہروں کے مہمان کا انداز بیان

داستان کگو علی اختر

خیالوں میں گم رہنے والا ہوا خیالات کو لفظوں کا پیرا بن پھانے کا ماہر ہو..... اکثر ایسی ہی دلفریب کہانیاں تراش کر بیان کرتا ہے کہ سننے والا گرویدہ ہو جائے..... یہی حال اس کا بھی تھا جس نے دل کے کسی گوشے میں چھپی نا آسودہ خواہشات کو داستان میں ڈھال کر من کا بوجھ اتارنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا۔



کھیل رہے تھے۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا ان کے درمیان آ گیا۔ لڑکے اپنا کھیل روک کر اس کے ابھر اُدھر ہونے کے منتظر تھے مگر وہ خاصی دیر میں یہ شکل دو یا تین قدم آگے بڑھا پایا ہوگا کہ اسی دوران..... میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے بے بسی کے ساتھ مجھے مخاطب کر کے کہا۔

”بیٹا۔ ذرا مجھے آگے کر دینا۔“

میں نے اس کی لامٹی پکڑنا چاہی تو وہ ایک بار پھر سے بولا۔
”نہیں میرے بچے! ایسے نہیں۔ تم مجھے صرف اپنا کندھا دو۔ اس لامٹی کی مدد سے میں ایک قدم خود آگے بڑھا تا رہوں گا اور تمہارا کندھا مجھے دوسرا قدم اٹھانے میں مددگار ثابت ہوگا!“

تب میں نے خاموشی سے اپنا کندھا اس کے آگے کر دیا۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا دی۔

”کہاں جاؤ گے؟“ میں نے اپنی چال کو بہت آہستہ کر کے اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملائے۔

”وہ سانسے جو برگد کا درخت ہے، وہاں تک جانا ہے مجھے۔“ بوڑھے نے آہستگی سے جواب دیا۔

”اس دیرانے میں اور اس قدر گرمی میں..... صبح ہی صبح وہاں جانے کی کیا ضرورت پڑیگی؟ مگر والوں نے آپ کو نہیں روکا!“ میں نے استفسار کیا۔

”روکا تھا۔ بہت روکتے ہیں مگر ایک عادت سی پڑ گئی ہے۔ جب تک وہاں نہ جاؤں، بے چینی ہی رہتی ہے۔ تم تو دفتر جا رہے ہو گے۔ بڑی تکلیف دی ہے تمہیں۔“ بابا نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں لیکن ابھی براؤت پڑا ہے۔ اس لیے آپ کو وہاں پہنچا کر آگے نکل جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے اور تمہیں جزا دے۔“ اس نے اسی لمحے میں کہا۔

”تمہارا کوئی نہیں ہے بابا؟ جو تمہیں میرا مطلب ہے..... وہاں تک پہنچا جایا کرے۔“ میں نے اگلا سوال کیا تو وہ بولا۔

”کیوں نہیں..... بیٹے ہیں جو تمہاری طرح ملازم ہیں۔ پوتے پوتیاں ہیں جو اسکول جاتے ہیں۔ انہیں صبح اسکول جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ میرا ساتھ نہیں دے پاتے اور پھر اگر آج بھی جائیں تو ان کی مائیں انہیں برا

بھلا کہتی ہیں۔ وہ میرے لیے کہاں اتنا تردد کریں گے۔ میں خود ہی اپنی عادت نبھائے چلا جا رہا ہوں۔ اگر نہ آؤں، وہاں تک تو وہ بہت گھبراتا ہے۔ بڑی شکایت ہوتی ہے اسے۔“ وہ ذرا سار کا تو میری رگ تجسس پھڑک اٹھی۔

”تو کیا وہاں کوئی اور بھی ہوتا ہے..... آپ کے علاوہ بھی؟“

”ہاں ہاں۔ وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود ہوتا ہے۔ ہر بار مجھ سے پہلے وہاں پہنچ کر مجھے شرمندہ کر دیتا ہے!“ وہ بولا۔

”مگر میں نے تو سنا ہے برگد کا یہ بوڑھا اور پرانا درخت بڑا بیماری ہے۔ سچی تو وہاں جاتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں۔ وہاں کوئی آسیب یا ہوائی مخلوق موجود ہے۔

کیا واقعی وہاں ایسی چیزیں موجود ہیں۔ آپ نے تو ضرور دیکھی ہوں گی۔“ میں نے اپنے اندر کا خدشہ اس پر ظاہر کیا۔

میری بات سن کر اس کے بوڑھے کاچپے ہونٹوں پر لمحہ بھر کے لیے مسکراہٹ کی چاندنی اتری۔

”ارے نہیں بیٹا۔ جن کو لوگ بھوت اور چڑیلین سمجھتے ہیں..... وہ تو سب میری پرانی یادوں اور کہانیوں کے وہ کردار ہیں جو یہ روپ دھارے بیٹھے ہیں۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہتے۔

میں وہاں جاتا ہوں تو وہ سارے میرے ارگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کے آنے سے میری برسوں کی تنہائی دور ہو گئی ہو۔ یہ جو درخت تم دیکھ رہے ہو نا۔ یہ میرا بڑا پرانا یار ہے اور اگر میں اس کے پاس نہ آؤں تو ٹھکوسے شکایت لے کر بیٹھ جاتا ہے۔“

اس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں مگر مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے میں اسے وہاں چھوڑ کر اپنے آفس چلا آیا۔ دفتر آ کر اپنے کاموں میں اس قدر الجھ گیا کہ مجھے اس کی یاد ہی نہ رہی۔ البتہ جب شام کو میں ادھر سے گزرا تو اچانک میری نظریں اس جانب اٹھ گئیں مگر اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔

میں اس راستے سے روزانہ گزرتا تھا اور جب سے میرا اس بوڑھے سے تعارف ہوا تھا، میں اب نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف ضرور دیکھنے لگا تھا جہاں اس روز میں نے ات چھوڑا تھا مگر اب کتنے روز سے میرا اس سے ٹکراؤ نہیں ہوا تھا پھر ایک دن میں نے اسے دیکھا بھی مگر میں اس روز جلدی میں تھا۔ وہ اس وقت درخت کے تنے سے لگا بیٹھا تھا اور اس کی ہڈیوں اور لمبی رگوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا جو زمین کے سینے سے باہر اُٹھ رہی تھیں۔

اسے معروف دیکھ کر میں بھی مسکرا کر آگے نکل گیا حالانکہ اس کی باتیں میرے ذہن میں ابھی تک گونج رہی تھیں بلکہ اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ میں جب بھی کہیں تنہا بیٹھتا، وہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ دفتر میں میرے ساتھی مجھے یوں مرا تے میں بیٹھے دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ اس روز بھی میں آنکھیں بند کر کے اپنی سیٹ سے فیک لگائے ذرا فارغ بیٹھا تھا کہ مجھے اس کی باتیں یاد آئیں اور میں خود بخود مسکرانے لگا۔ میرے قریب بیٹھنے والے میرے ساتھی نے اپنی میز کو زور سے جکا کر مجھے مخاطب کیا۔

”نار صاحب! کہاں پہنچے ہوئے ہیں اور یہ یوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ آپ کے اندر کی چمکی کہاں بیان کر رہی ہے!“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بس یونہی ذرا!“ میں نے پورے طور پر اپنے حواس بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ہم جانتے ہیں۔ آپ چاہے بتائیں یا نہ بتائیں۔ پیار کے ابتدائی دنوں میں۔ چاہتوں کے وصل لمحوں میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اس نے مجھے سمجھ سے کچھ اگلوٹا چاہا مگر کچھ تھا ہی کیا جو میں انہیں بتا لیکن وہ بھند تھے۔

”ارے۔ تم یہ کیا بکھیرا لے بیٹھے ہو۔ قسم لے لو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے اپنی معافی پیش کی۔

”ہم سے بھی قسم لے لیں۔ ہم آپ کے ہمدر ہیں۔ آپ کے دوست اور ساتھی ہیں۔ ہم پر اعتماد کر کے تو دیکھیں۔ ہم یہ معاملہ بھابی سے بھی چھپا کر رکھیں گے۔“ وہ سارے بیک زبان ہو کر بولے۔

میں نے بڑی مشکل سے جان چھرائی۔ اگرچہ میں انہیں مطمئن نہ کر سکا۔ میری یہی حالت گھر میں بھی تھی۔ مگر میں بھی جب بھی میں اکیلا ہوتا تو مجھے وہ بابا اور اس کی باتیں یاد آ جاتیں اور پھر میرے لبوں پر مسکراہٹ نے تو فنی یا میری بیگم کوئی شک میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں اس سے کس طرح جان چھڑاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس روز بھی میں بیٹھنا جانے خیالوں کے کن راستوں سے بھٹکتا ہوا اس بوڑھے پر آ رہا تھا اس روز مجھے یوں تنہائی میں اکیلے مسکراتے دیکھ کر میری بیگم نے قدرے غصے سے مجھ سے کہا۔

”میں کتنے دنوں سے آپ کی حالت دیکھ رہی ہوں۔ کیا یاد آ جاتا ہے کہ یکا یک خاموشی اور چپ رہنے کے باوجود خود آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی بھرنے لگتی ہے۔ کہیں کوئی معاملہ گزرتا ہو نہیں ہو گیا؟“

تب میں نے فوراً جواب دیا۔
”نہیں عاصم! جو تم سوچ رہی ہو ایسی بات نہیں ہے اور ویسے بھی اب ایسے معاملات سے ہماری عمریں آگے نکل چکی ہیں!“

”گھوڑے اور مرد کے پھسلنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے!“ اس نے جواب دیا۔

تب میں نے اس روز والا سارا ادا تھا اور بابے کی باتیں اسے سنا ڈالیں۔ اس نے ساری باتیں سننے کے بعد پوچھا۔
”تو آپ خود کہیں اس برگد کے بچے تک نہیں گئے؟“

”ہوں!“ میں نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے سر لگاتے ہوئے کہا۔
”تو نار..... مجھے لگتا ہے کہ برگد پر رہنے والے سارے کا اثر آپ پر بھی ہو گیا ہے۔ کیا بتا تھا آپ نے کہ اس درخت پر ہوائی چیزوں کا بسیرا ہے!“ اس نے پریشانی سے کہا۔

”ارے نہیں عاصمی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس بابے کی باتیں ہی اس قدر دلچسپ تھیں کہ مجھے جب بھی یاد آتی ہیں تو مسکراہٹ میرے لبوں پر خود بخود آ جاتی ہے۔“ میں نے اسے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

”دوبارہ نہیں ملے اس سے؟“ اس نے پوچھا۔
”جی تو چاہتا ہے مگر وقت ہی نہیں ملا۔“ میں نے مختصراً جواب دیا

اور واقعی میری یہ خواہش دن بدن میری سوچوں کو جکڑنے لگی تھی کہ میں اس سے دوبارہ ملوں۔ مجھے وہ خاصا دلچسپ لگنے لگا تھا لیکن صبح آفس جانے کی جلدی اور شام گھر آنے کی پھرتی پھر رفتہ رفتہ یہ باتیں میرے ذہن سے محو ہونے لگیں۔ اس روز اتوار تھا۔ آفس سے چھٹی تھی۔ میں نے اپنے پروگرام پہلے سے طے کر رکھے تھے مگر اچانک جیسے ایک کوئٹا سا ذہن میں لپکا۔ کیوں نہ آج بابا سے ملاقات کر لی جائے۔

اس روز بھی صبح ہی سے سورج نے سلگنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے دوسرے سارے پروگرام ادھورے چھوڑ دیے اور گھر سے نکل کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں برگد کا یہ بوڑھا اور پرانا درخت کھڑا تھا۔ یہ ہماری نئی بنی ہوئی کالونی سے ذرا ہٹ کر قدرے ویران جگہ تھی اسے میری خوش قسمتی جانے کہ وہ مجھے اسی درخت کے پیچھے ہی ہوتی صرف سٹری کی جگہ پر بیٹھا گیا۔

میں پیچھے کی جانب سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو مجھے اس کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ یوں جیسے وہ کسی

سے ہمکلام ہو مگر وہاں دوسرا کوئی نہ تھا۔ میں اس کے نزدیک ہو گیا۔ وہ اپنی ہی دھن میں ہاتھیں کر رہا تھا۔

”اوہ۔ یار غصہ تم کو دے۔ کہا نا۔ بیمار ہو گیا تھا میں نہیں چلا جا رہا تھا مجھ سے۔ آج بھی بڑی مشکل سے اٹھ کر آیا ہوں۔ اعتبار کر میرے پر اور تمہارا منہ ابھی تک بنا ہوا ہے۔ معاف کر دے نا مجھ نے کو۔ تیرے سوا اب ہے بھی میرا کون جس سے اپنا دکھ درد دکھ سکوں۔ وہ تو سارے اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس مجھ سے باتیں کرنے کا وقت ہی نہیں!“ ابھی نہ جانے وہ اور کیا کیا باتیں کر تا کہ میں بیچ میں ہی بول اٹھا۔

”جو گیا..... بیٹھے کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا اور اپنے ایک ہاتھ کی اوک بنا پر اپنی آنکھوں کے اوپر دکھ کر تقریباً مجھے پچھتاتے ہوئے بولا۔

”آگئے ہوئے پتر۔ میں بڑے دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

اس کی یہ بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے اسے واقعی میرا انتظار رہا ہو۔

”جو گیا.....“ میں نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

”نہ پتر۔ میں نے یہاں کونسا جوگ لیا ہے۔ نہ میں سنیا ہی ہوں اور نہ جوگی۔ سیدھا سادہ بندہ ہوں۔ اس ہمدرد کے پاس آ جاتا ہوں اپنا دکھڑا سانس نہ مگر یہ بھی ناراض ہو گیا ہے۔ ترے کر رہا ہوں دیکھو کب مانتا ہے! نیشو۔ اور تمہیں بتا دوں۔ میرا نام جو گیا نہیں، علم وین ہے!“

میں اس کے نزدیک ہی برگد کی چھتری چھاؤں تلے بیٹھ گیا۔

”یہ برگد کا درخت میرا یار ہے۔ اس نے میرے جسم پر اترتے سارے موسم دیکھے ہیں۔ یہ میری ساری باتوں کا سا بھی ہے۔ یہ جگہ جہاں آج کل نئی کالونی بنی ہے، یہاں کبھی غلہ منڈی ہوا کرتی تھی اور برگد کا یہ درخت اس کے درمیان میں ہوا کرتا تھا۔ میں یہاں بڑی مدت سے آیا کرتا تھا۔ گرمیوں کی سفید دودھ دو پہریں جب سانولی ہونے لگتی تھیں، ہم اس کے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ میری طرح اور بھی بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں کے جس سے تنگ آ کر یہاں آ جاتے تھے۔

”یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک روز یہاں آیا تو مجھ سے پہلے یہاں دو چار بڑی عمروں کے لوگ بیٹھے تھے۔ درمیان میں رکھے

ہوئے جنے کی نے گھومتی ہوئی کبھی کسی کے اور کبھی کسی کے ہاتھ آ جاتی۔ وہ سارے کسی اور کے منتظر تھے۔ جب وہ کتنی دیر تک نہ پہنچا اور ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی تو ان میں سے ایک اچھڑا آدمی مجھے مخاطب کر کے بولا۔

”پتر! پڑھ لکھے ہو؟“

”ہاں جی۔ اللہ کا کرم ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پتر! ادھر آؤ، اگر فارغ ہو۔ جب تک رہاں نہیں آتا تو ہمیں یہ کتاب ہی پڑھ کر سنا دو۔“

”میں چنگا پتا ہوا آگے بڑھ کر ان کے درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کتاب اٹھالی۔ یہ بوسیدہ اور اوراق والی ایک بڑی سی کتاب تھی۔ شاید امیر حمزہ کی داستان تھی۔ میں نے پڑھنا شروع کی۔ وہ سارے بڑی خاموشی کے ساتھ اسے سن رہے تھے۔ درمیان میں کبھی کبھی حد کو گزرنے کی آواز آنے لگتی۔ جوں جوں میں اسے پڑھتا جا رہا تھا، میری اپنی دلچسپی اس میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شام کی سانولی رنگت دھیرے دھیرے رات کی گہری سیاہی میں بدلنے لگی تب انہوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

”بس پتر! یہاں نشانی رکھ کر اسے بند کر دے۔ اللہ تمہیں حیاتی دے۔ باقی کل پھر سنی۔ شاید کل رہاں بھی آ جائے۔ وہ آگے سے شروع کر دے گا۔“

”بس اسی روز سے میرا شوق پڑھنا چلا گیا۔ میں اب روزانہ وہاں آنے لگا تھا اور جس روز رہاں نہ ہوتا اس روز میں کتاب پڑھتا تھا اور یوں میرا نام داستان گو رکھ دیا گیا حالانکہ میں صرف پڑھنے والا ہوتا تھا۔ ایک روز میں جب وہاں پہنچا تو میری طرح دو تین بندے اور آ کر ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ ابھی چوپال جتنے میں دیر گئی کہ ان میں سے ایک بولا۔

”داستان گو پتر! تمہیں پتا ہے رتے کے بیٹے نے اپنا مکان بیچ دیا ہے۔ وہ کل یہاں سے کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔ اس لیے کہانی سنانے کی ڈیوٹی آج سے تمہارے حصے میں آگئی ہے۔ لہذا آئندہ سے تم ہمارے لیے یہ کام سرانجام دو گے۔ تمہیں علم ہے کہ ہم یہاں صرف اسی خاطر آتے ہیں۔ گھر والے ویسے ہی ہماری شکلوں اور باتوں سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہم سب یہاں آ جاتے ہیں۔ کچھ ایک دوسرے کے دکھ درد سننے اور کچھ اپنا دل بہلانے۔“

”میں ابھی اس سوچ میں تھا کہ انہیں کیا جواب دوں کہ دور سے ایک چھ سات سال کا بچہ ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ہمارے قریب آ کر رک گیا اور پھر اس نے

ہاتھ میں پکڑا ہوا روپے کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو!“

میں نے نوٹ پکڑ کر بچے سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے پتر!“

”یہ میری باجی نے بھیجا ہے۔ وہ ادھر کھڑی ہے۔“

اس نے دوڑ کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

”کس لیے؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”آپ مانگتے والے نہیں ہو!“ لڑکے نے جواب دیا تو ایک بوڑھے نے جواب دیا۔

”ہم بھکاری نہیں ہیں پتر۔ جاؤ واپس لے جاؤ۔“

”اس نے وہ نوٹ میرے ہاتھ سے تقریباً کھینچتے ہوئے اسے دوبارہ پکڑا دیا۔ وہ نوٹ لے کر واپس پلٹ گیا۔ میری نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔ جب وہ لڑکی کے قریب پہنچا تو چند لمحے ان کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں پھر اس نے مسکراتے ہوئے نوٹ واپس لیا اور آگے چلی گئی۔

”پتا نہیں کیوں اس لمحے میرا اس لڑکی سے ملنے اور باتیں کرنے کو دل چاہنے لگا تھا۔ پتر! شاید سنا نے لوگوں نے اسی کا نام خواہش رکھا ہو۔ بہر حال کچھ تھا ضرور جو اس دن اور اس لمحے سے میرے دل میں کہیں اپنا گھر بنانے لگا تھا۔

”پھر میں نے بھی روائت نہ شام کو یہاں آنے کی ہامی بھری۔ اب میں روزانہ ان کے درمیان آ کر بیٹھ جایا کرتا اور داستان سنانے لگتا۔ بزرگوں کا وہ ٹولہ جو رتے کے جانے کی وجہ سے بھگتا رہا تھا، دھیرے دھیرے دوبارہ جمع ہونے لگا۔ میں ان کے درمیان روزانہ آ کر بیٹھ جایا کرتا۔ یہ اب میرا روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔ میں ان دنوں محنت مزدوری کر کے یہاں ایک قریبی کوارٹر میں آ جایا کرتا جہاں میں رہائش پزیر تھا۔ میرے والدین گاؤں میں رہتے تھے اور یہاں میں اکیلا۔ اس وقت یہ برگد بھی میری طرح جوان تھا۔ ہم اس کے نیچے اس وقت تک بیٹھے رہتے جب تک مکمل اندھیرا نہ ہو جاتا۔

”پھر اس لڑکی کا کیا ہوا؟“ میں نے اس کی کہانی کا سب سے دلچسپ ٹکڑا اٹھا لیا۔

”وہ لڑکی تو جیسے میری سوچوں کا ایک حصہ بن کر رہ گئی تھی۔ میں وہاں جاتا تو مجھے اس کا انتظار شروع ہو جاتا کہ کبھی تو وہ دوبارہ یہاں سے گزرے گی۔ اس کے ذہن میں تو شاید یہ بات ہوئی بھی نہیں کہ کوئی اس کا اس طرح شدت سے انتظار کرتا ہوگا۔

”اس برگد کے قریب سے گزرنے والا واحد رستہ تھا جو ارد گرد کی آبادیوں کے لیے شہر پہنچنے کا واحد ذریعہ تھا۔ اسی

لیے لوگ عموماً اسے استعمال کرتے تھے۔ میں اپنے کام سے فارغ ہو کر یہاں آ جاتا پھر ہولے ہولے دوسرے بھی آ جاتے۔

”اس روز بھی حسب عادت میں ہی وہاں پہلے پہنچا تھا۔ ان میں سے ایک اچھڑا عرصہ میں جو ہر روز برگد کے نیچے وہ زمین پر پانی کا پھڑکاؤ کرتا تھا، ابھی آیا ہی تھا اور وہ سرکاری ننگے سے پانی لیے گیا تھا۔ میں نہ جانے کن خیالوں میں تھا کہ مجھے وہ آئی ہوئی دکھائی دی۔

”اس بات کا احساس میرے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں نے مجھے دلایا تھا۔ یقیناً وہ اور اس کے ساتھ آنے والا چھوٹا لڑکا وہی تھے۔ میں برگد کی چھاؤں تلے بیٹھا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر وہ رک گئی اور پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوٹ اس لڑکے کو دے کر میری طرف اشارہ کر کے بھیجا اور خود وہیں کھڑی رہی۔ لڑکا روپیہ لے کر میری طرف آیا اور میرے نزدیک روپیہ چھیک کر واپس مڑنے والا تھا کہ میں نے آواز دی۔“

”سنو بیٹے.....!“

وہ رک کر میری طرف پلٹا۔

”یہ روپیہ کس لیے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری باجی نے بھیجا ہے۔ آپ مانگنے والے ہوتا۔“ لڑکے نے حیرانی سے میری طرف دیکھ کر پوچھا اور واپس مڑنے لگا کہ میں نے پھر اس سے پوچھا۔

”بیٹے۔ میں تمہیں مانگنے والا لگتا ہوں؟ اور سنو، کیا نام ہے تمہارا؟“

وہ دوبارہ پھر گیا اور بولا۔ ”پتا نہیں۔ میرا نام جبار ہے!“

”پڑھتے ہو؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”ہوں۔ چوچی کلاس میں پڑھتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور وہ تمہاری باجی، اس کا کیا نام ہے؟ وہ بھی پڑھتی ہے کیا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”شبینہ باجی..... وہ پڑھنے سے اچھ گئی ہے؟ اب کہتے ہیں شبیناں زیادہ نہیں پڑھا کر تیں۔“ جبار نے بتایا۔

”اس کے منہ سے اس کا نام سن کر میرے دل میں جیسے کھٹنیاں سی گئیں کتنی تھیں۔ میں نے اپنے دل میں سر اٹھاتی بے شمار خواہشوں کو سنیتے ہوئے کہا۔

”چلو میں تمہاری باجی کو بتاؤں کہ میں بھیک مانگنے والا نہیں ہوں۔“ میں نے اس کا پھیکا ہوا روپیہ اٹھا لیا اور اس کے ساتھ ادھر چل دیا۔

”وہ تقریباً میری ہم عمر ہی تھی۔ اس قدر خوب صورت

بھی نہ تھی کہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان ملائے جائیں۔ بس جوانی کی چمچی دھوپ نے اس کے جسم کے سارے زاویے کچھ اس طرح خوبصورت کر دیے تھے کہ دیکھنے والے کے دل میں خواہ مخواہ گلدگدی سی ہونے لگتی..... میں اس کے قریب پہنچا تو وہ تھوڑا سا سکرانی۔

”میں آپ کو جھپک مانتے والا لگتا ہوں؟“ میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”ان کے ماتھے پر بھی نہیں لکھا ہوتا۔ ان میں اور تم میں اتنا ہی فرق ہے۔ وہ فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر بیٹھتے ہیں اور تم درخت کے نیچے دوڑنا دے کر بیٹھے ہو۔ وہ آتے جاتے لوگوں کا راستہ روک کر مانتے ہیں مگر تم آتے جاتے لوگوں کو تنگ نہیں کرتے۔“ اس نے شریہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔ کہاں رہتی ہو؟“ میں نے بات بدل کر کہا۔

”پچھلے بڑے کا ارادہ ہے۔“ وہ ایک بار پھر بھینکی۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ سوچا تھا باتیں کرنے والی گزیا کا کوئی تو ٹھکانا ہوگا مگر کچھ تم بھی میری طرح ہی ہو!“ میں نے بھی باتوں کو گھمانے کا فن آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

”ادھر نلہ منڈی کی اس طرف۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

”کیا کرتی ہو؟“ میں نے ایک لائینی سا سوال کیا۔

”گھر میں رہتی ہوں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”بڑے دن بعد آئی ہو۔ ادھر سے روزانہ نہیں گزرتیں؟“ میں نے پوچھا تو وہ میرے سوال پر ہنس دی۔

”جب شہر کام ہوتا ہے تو آتی ہوں، روز روز کام ٹھوڑا ہوتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اب آیا کرو گی؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”کس لیے؟“ اس نے استفسار کیا۔

”میرے لیے۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

”چلو بھی باجی۔“ جبار نے مداخلت کی تو مجھے بہت ناگوار لگا۔

”سوچیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

”جو کیا! تمہاری داستان خاصی رنگین لگتی ہے مگر مجھے جلدی ہے۔ کیوں نہ ایسا کریں کہ آج ہم کہاں یہیں ختم کر دیں۔ اگلی ملاقات پر دوبارہ یہیں سے شروع کریں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”پتا نہیں پتر! دوبارہ کتن ہوتا ہے یا نہیں۔ کون جانے!“ اس نے مایوسی سے کہا۔

میں جانتا تھا کہ اس کا ارادہ مجھے مزید بٹھانے رکھنے کا تھا مگر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔ اگرچہ جی میرا بھی چاہتا تھا کہ میں اس کی پوری کہانی سن لوں لیکن نہ جانے کیوں میں نے اسے اگلی ملاقات کے لیے کہا تو وہ بولا۔

”پتر! آج برسوں بعد دل پر رکھا ہوا کچھ بوجھ ہلکا ہوا تھا۔ آج یوں لگا جیسے مدتوں بعد میری باتیں سننے کے لیے کسی نے وقت نکالا ہے۔“

میں اٹھنے لگا تو میں نے دوبارہ پوچھا۔

”جو کیا! ابھی اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“

”یہ تو نے مجھے جوں کی بنا دیا ہے۔ کہا ہے تاکہ میرا نام علم دین ہے۔ میں ابھی اس کیسے کو سناؤں گا۔ تم جاؤ۔ اگر وقت مل جایا کرے تو آجایا کر دو۔“ اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

”کیوں نہیں جو گیا۔“ میں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

میری اور اس کی ملاقات میں تقریباً دوڑ بڑھ ہفتے کا وقت گزر گیا۔ اس دوران نہ تو مجھے فرصت ملی اور نہ ہی سربراہ اس سے ملاقات ہو پائی۔

اس دوران دو مین چٹھیاں اتفاقاً ایک ساتھ مل گئیں۔ میری بیوی، بچوں کو ساتھ لے کر والدین کے پاس چلی گئی اور مجھے فرصت مل گئی۔ اس روز میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس سے ملنے وہاں گیا تھا اور وہ مجھے وہیں مل بھی گیا۔ میں حسب سابق آہستہ سے چلتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔

”جو گیا۔!“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ارے پتر! آگے ہو۔ آؤ آؤ، دیکھ لو۔ میں نے اپنے دوست کو سنا لیا ہے۔“

اس نے یہ بات کہی تھی کہ گرم لوکا پیچیر آیا تو برگد کے سارے پتے گھڑ گھڑاٹھے۔

”دیکھو، اب کمینہ تالیاں بجا رہا ہے۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

میں ایک بار پھر اس کے قریب آتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”ہاں تو جو گیا۔“

”مڑے لیتے ہو تا میرا نام لگاؤ کے۔ چلو اگر تمہیں اچھا لگتا ہے تو یونہی سہی!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہوں۔“ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا اور ایک ماہر داستان گو کی طرح سلسلہ وہیں سے جوڑا۔

”شینہ اور میری ملاقاتیں آہستہ آہستہ ہونے لگی تھیں لیکن میرا یہاں سے رابطہ بھی قائم تھا۔ میں روزانہ شام ہوتے ہی یہاں آ کر داستان سنا تا اور اب تو داستان سننے والے بڑے بوڑھوں

کی ایک بڑی تعداد یہاں جمع ہونے لگی تھی۔ تنہائی کے بوجھ تلے دبے ہوئے اور اپنوں کے دیے دکھوں سے نجات حاصل کرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اب تو ان میں سے ایک اپنے گھر سے منی کے تیل کا گیس لیمپ بھی اٹھالایا تھا جس کی روشنی میں ہم یہاں اب خاصی رات تک بیٹھے رہتے تھے۔

”شینہ بھی یہاں سے گزرتے ہوئے مجھ مل جاتی یا پھر میں اس کے گھر کے ارد گرد اسے ملنے چلا جاتا۔ ہم دونوں کے درمیان رابطہ جبار ہوتا تھا۔ ایک انجانہ جذبہ تھا جو دھیرے دھیرے میری اور شینہ کی سوچوں کے ارد گرد اپنا حصار بناتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ شاید اسی کو محبت کہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا نام سننے ہی میری سوچوں میں ایک انجانا سا خوف اور دل کی دھڑکنوں میں بکھراؤ سا کیوں پیدا ہونے لگا تھا۔ میں اگر اسے کسی دن نہ دیکھتا تب پھرے ارد گرد نامعلوم سی اداسی اپنا گھیرا تنگ کرنے لگتی تھی۔ وقت کو جیسے پر لگ چکے تھے۔“

”ان ہی دنوں مجھے گاؤں سے پیغام ملا کہ گھر والوں نے مجھے جلدی بلایا ہے۔ بس معاملہ اسی روز سے بگڑ گیا۔ میں گھر گیا تو مجھے پتا چلا کہ میری شادی کے معاملات طے کئے جا رہے ہیں۔ میں نے انکار کیا تو میری والدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے انہیں بہت سمجھا مگر والدہ کی التجائیں اور زیادہ ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر میرے والد نے مجھے الگ ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ کچھ مجھ نہیں آ رہا تھا کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے کچھ اس طور مجھے گھیرا کہ میں جب گاؤں سے واپس آیا تو میری شادی ہو چکی تھی۔“

”میں اس رات اسی برگد کے نیچے پہنچا تو یہاں کی محفلیں بھی اجڑ چکی تھیں۔ وہ سارے ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔ البتہ ان میں سے ایک ابھی تک یہاں آتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سارے میرا بڑی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ وہ روزانہ سرشام یہاں آتے لیکن پھر میرے نہ ہونے پر آہستہ آہستہ مایوس ہوتے چلے گئے۔“

”ارے ہاں۔ دو ایک بار ایک بچہ تمہارا یہاں پوچھنے ضرور آیا تھا۔ جیسا نام تھا اس کا۔ شاید میں بھول گیا ہوں۔“

”اس نے مجھے بتایا۔ میں سمجھ گیا۔ وہ یقیناً جبار ہوگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر سے بے ترتیب ہونے لگیں۔ میں اس سے اجازت لے کر شینہ کے گھر کی طرف چلا گیا۔

گزارہ

نبلی ڈاکٹر ایک کھٹے سے کمرے کے اندر مریض کے معائنے میں مصروف تھا۔ بیوی بچے دوسرے کمرے میں بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کڈا کڈا خبر لے کر آتا ہے۔ آخر ڈاکٹر کمرے سے برآمد ہوا اور مریض کی بیوی کے پاس پہنچ کر بولا۔

”میں اس وقت آپ کے شوہر کو جس حالت میں دیکھ کر آ رہا ہوں مجھے وہ ٹھیک نہیں لگ رہے۔“

”مجھے تو وہ بھی بھی ٹھیک نہیں لگے لیکن کیا کروں بچوں کی خاطر گزارہ کر رہی ہوں۔“ بیوی نے غمزہ لہجے میں جواب دیا۔

زندگی

زندگی اس جزیرے کے مانند ہے جہاں پر خواہوں اور عذابوں کے بہت سے درخت ہوتے ہیں۔ دھوپ لگے تو سارے نہیں دیتے اور بھوک لگے تو پھل دور ہوتا ہے۔ زندگی نہ جانے کس کا انتظار کرتی ہے اور موت بن بلائے مہمان کی طرح اچانک آ جاتی ہے۔ دولت کمانا مشکل ہے مگر اپنی محنت حاصل کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ ہل دو مل کی زندگی میں اگر کسی کا انتظار شامل ہو جائے تو یہ ہل بھی نہیں گزرتے۔

”کتنی دیر تک ادھر ادھر جکر لگنے کے بعد میں مایوس ہو کر وہاں سے مڑنے والا تھا جب مجھے جبار نظر آ گیا۔“

”ارے جبار! تو.....“ میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

”کہاں تھے آپ۔ میں نے آپ کو بڑا تلاش کیا۔ باجی روز مجھے ادھر بھیجا کرتی تھی مگر آپ وہاں تھے ہی نہیں۔ کہیں گئے ہوئے تھے آپ؟“ اس نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال کر ڈالے۔

”اب کہاں ہے شینہ؟ اسے بتاؤ۔“ میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

”وہ..... وہ تو اپنی سرسرا چلی گئی ہیں۔ بھائی جان سے صلہ ہو گئی ہے!“

”کون بھائی جان۔“ میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

”تو کیا آپ کو نہیں پتا..... ان کے خاندان۔ وہ سارے اکٹھے ہو کر آئے تھے۔ کتنے دن یہاں خاصی گرما گرمی رہی۔ باجی تو مان ہی نہیں رہی تھی مگر ان کے آگے نہ چل سکی۔ اس لیے مجبوراً پھر باجی کو ان کے ساتھ بھجوا دیا گیا۔“

”وہ مجھے نہ جانے کیا کیا بتا رہا تھا مگر میں تو کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔“

”تو کیا وہ پہلے سے ہی شادی شدہ تھی؟“ میرے دل کے کسی گوشے نے تصدیق پتی چاہی۔

”ہاں تو اور کیا۔ آپ کو نہیں بتایا تھا باجی نے۔ وہ تو یہاں روٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اب صبح ہوئی تو اسے جانا ہی تھا۔“

”میں وہاں سے بڑا مایوس ہو کر واپس آ گیا تھا۔ اس سے اگلی شام جب میں دوبارہ اس کے پاس آیا تو یہ کیسینہ بچوں کی طرح تالیاں بجا کر مجھ پر ہنسا تھا۔ میں یہاں آنے لگا تو رفتہ رفتہ یہاں دوسرے بھی آنے لگے مگر نہ تو پھر یہاں ویسی جو پال جم سکی اور نہ ہی ویسی مخلل۔ ان میں سے بھی کوئی آ جاتا اور بھی کوئی۔ میں نے بڑی کوشش کی مگر ناکام رہا۔“

”پھر میں نے بھی اپنی بیوی کو یہیں شہر میں اپنے اسی کوارٹر میں بلالیا۔ اب ہی دنوں یہاں سے منڈی اٹھنے لگی۔ رفتہ رفتہ پتلا کرک اب یہاں الاٹمنٹ کے بعد دوبارہ پکی دکائیں نہیں کی۔ درمیان والا رستہ جو کہ اس منڈی سے شہر تک آنے کا مختصر راستہ تھا، بند کر دیا گیا۔ لوگوں نے الاٹ منٹس لے کر یہاں دکائیں بنانا شروع کر دیں مگر یہ درخت نہیں کاہیں رہا۔ میرے بھی بچے ہو گئے۔ میں نے بھی ادھر ہی چھوٹا موٹا کام شروع کر دیا۔ اللہ نے برکت دی اور پھر میں ہمیشہ کے لیے یہیں کا رہا۔“

”پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ایک بار پھر سے افواہ پھیلی کہ یہاں منڈی کی جگہ کالونی بنے گی۔ اب تو میرے بچے بھی بڑے ہو چکے تھے۔ ان میں سے میں نے ایک کی شادی بھی کر ڈالی۔ جب مجھے اسی کالونی میں ایک مکان مل گیا۔ وقت بدل گیا۔ لوگوں کی سوجھ بوجھ بدل گئیں۔ اب یاریاں جیب، عہدہ اور رتبہ دیکھ کر کی جانے لگی ہیں۔ لوگوں کے رویے تبدیل ہو گئے۔ وقت میں ایک تناؤ اور تیزی آ گئی لیکن نہیں بدلتا تو یہ درخت نہیں بدلا اور اب پھر میری بوسیدہ اور پرانی باتیں۔ جنہیں اب کوئی سننے والا نہیں رہا۔“

”میں نے کئی بار اپنے پوتوں اور پوتیوں کو کہانی سنانے کا پوچھا۔ کئی جانتی راتوں کو ان کے من کہانی سنا کر بہلانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ہر بار مجھے ٹوک دیا۔“

”میں نے ایک بار زبردستی اپنی پوتی کو کہانی سنا

چاہی۔ میں نے کہانی شروع کی۔“

”ایک بھی شہزادی! تو اس نے فوراً مجھ سے پوچھا۔“

”ذاتیات کی طرح تھی۔ سچی دادا مجھے ڈیانا بڑی اچھی لگتی تھی۔ کیا بالوں کا اسٹائل تھا اس کا!“

”اس کی یہ بات سن کر میں شرمسار ہو گیا اور پتا ہے، اگلے دن میں نے اپنے چھوٹے پوتے کو اپنے پاس لٹاتے ہوئے کہا۔“

”مکڑو! آؤ میں تمہیں کہانی سناؤں۔“

”وہ میرے قریب آ کر لیٹ گیا۔ میں نے ابھی کہانی شروع کی کہ ایک تھا بادشاہ..... اس نے فوراً اپنا منھا سا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھا اور کہنے لگا۔“

”چھوڑو دادا۔ اس وقت کبل پر میرا پسندیدہ ڈراما لگا ہے۔ ان کہانیوں سے زیادہ خوب صورت اور دلچسپ ہے۔ کہانی پھر سن لوں گا۔ اب مجھے جانے دو۔“ یہ کہہ کر وہ میری گرفت سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ٹی وی پڑا ہے۔“

”میں اسی روز سے دوبارہ یہاں آنے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے وجود کو تنہائی کی دیمک جلد ہی چاٹ جائے گی۔“

”یقین کرو۔ تنہائی کا یہ خوف مجھے اندر ہی اندر سے کھانے لگا تھا۔ میں ان لوگوں سے دور ہو جانا چاہتا تھا جو میری سنا نہیں جانتے اور مجھے اب فالتو شے سمجھنے لگے تھے۔“

”میں نے بچوں کے اس رویے کی اپنے پتر پتر اور اپنی بہو سے شکایت کی تو انہوں نے انہیں ڈانٹنے کے بجائے مجھے کہا۔“

”ابا۔ یہ نئی نسل کے بچے ہیں اور سائنس کا دور ہے۔ بھلا وہ آپ کی دنیا نوی باتوں کو کہاں سمجھیں گے۔“

”اس لیے میں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔“ اس نے اپنے اندر کے دکھوں کو کھولتے ہوئے بتایا۔

”یہ سب وقت کی بات ہے جو گیا۔ ایسا ہوتا ہی چلا آیا ہے۔“ میں نے دوبارہ اس کی ڈھارس بندھائی۔

”پترا! یہ سمجھتے کیوں نہیں کہ بڑے بوڑھے اور مادی اشیا میں بہت فرق ہے۔ اشیا کو نے میں پڑی بھی رہیں تو فرق نہیں پڑتا مگر بوڑھے..... ان کے خیف جسموں میں اللہ نے دل نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو کسی عمر اور کسی وقت بھی اپنے ہونے کا اظہار کم نہیں ہونے دیتا۔ بوڑھوں کو کسی کو نے کھدے میں ڈال کر یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان لوگوں کا بھی باتیں کرنے اور اپنا دکھ سکھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کا بھی دل کرتا ہے کوئی ان کی سنے۔ کوئی ان سے

کہے مگر اب وقت کس کے پاس ہے۔ کون ہے جو ہم ایسے بوڑھوں کو پسند کرے گا۔“

اس کی بوڑھی ویران آنکھوں میں اداسی کی گہری ٹوپ گھٹا ٹوٹ کر برسنے کو تیار تھی اور اس کی ابتدا بھی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے بوڑھے کا پتے ہاتھ کی پوروں سے آنکھوں کے پچھلے کونوں کو صاف کیا اور کہنے لگا۔

”میں یہاں نہ آؤں تو کہاں جاؤں مگر اب یہ کیسینہ بھی غرے دکھانے لگا ہے۔ جب ناراض ہو جاتا ہے تو بڑے ترلے اور تیشیں کراتا ہے۔“

اس روز میں وہاں سے اداسی کا ایک بہت بڑا بوڑھ لے کر واپس آیا تھا۔ شاید یہ بھی اب وہاں بھی نہ جاتا کہ ایک روز میں نے دیکھا، برگد کے اس پرانے اور بوڑھے درخت کے نیچے اسی طرح کا ایک اور بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جانا کہ شاید وہ بھی اسی طرح کا ہوگا۔ ویسے بھی اس روز میں کسی کام کے سلسلے میں جلدی گھرا گیا تھا۔ اس لیے میں سیدھا چلا آیا۔

اس سے اگلے کئی دن تک میں اپنے کاموں میں الجھا رہا۔ ایک روز اچانک پھر مجھے وہی بوڑھا نظر آیا تو میں تصدیق کے لیے ادھر چلا گیا۔ وہ یقیناً کوئی اور ہی تھا۔ میرا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”وہ یہاں علم دین آتا تھا۔ تمہیں پتا ہے، کہاں ہوگا؟“

”وہ..... لیکن آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بڑی مدت سے وہ اسی برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر کبھی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ اس وقت سے میں اسے جانتا ہوں۔ بلکہ میں تو اس کا مدتوں سے بھیدی اور سانس رہا ہوں۔ اچھی پرسوں ترسوں اس سے ملاقات ہوتی تھی تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں ہر روز آتا ہے۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

”ہاں۔ آتا تو ہے۔ شاید آ نہ آیا ہو۔ اچھا تو آپ بھی.....“ میں نے اس سے باتیں کرنا شروع کیں تو مجھے لگا جیسے وہ بھی جو کیا بابا کی طرح تنہائی کا ڈسا ہوا ہے۔

”پھر تو آپ ایک دوسرے سے اتنے خاصے واقف ہوں گے؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”ہاں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا آپ اس سے بھی واقف ہیں جو یہاں اس سے ملنے آیا کرتی تھی؟“ میں نے پتا پچھکا۔

”کون..... جہاں تک مجھے یقین ہے، میں نے تو یہاں کسی کو آتے ہی نہیں دیکھا۔ میں بھی ان دنوں یہاں تقریباً ہر روز آیا کرتا تھا۔“

”شاید اس کا نام شہینہ تھا۔ مجھے خود بابا نے بتایا تھا جو کبھی کبھی اس سے یہاں ملنے کی خاطر آیا کرتی تھی اور بابا اس سے بڑی شدید محبت کرتا تھا۔“ میں نے وضاحت سے پوچھا۔

میری بات سن کر وہ بڑے زور سے ہنسا۔ ایسے کہ اس کی بوڑھی ہڈیاں بھی جتنے تھیں۔ اس کی ہنسی سے برگد کے درخت پر بیٹھے پرندے بھی اڑنے لگے۔ تب اس نے اپنی ہنسی ملی کھائی کو قاف بکرتے ہوئے کہا۔

”ارے میرے بچے! تو بھی کس قدر سادہ اور بھولا ہے۔ نہیں جانتا۔ ارے اس نے یہاں برسوں ہم جیسے بوڑھوں کو داستانیں سنائی ہیں۔ بڑی ہی دلفریب اور خوب صورت داستانیں۔ اپنے سے بڑے لوگوں کو۔ ایسے کئی کردار تو اب وہ خود بھی بتا لیتا تھا۔ اس نے یقیناً کوئی اپنی گھڑی ہوئی کہانی تمہیں سنائی ہوگی۔ خود سے منسوب کر کے۔ بہت بڑا فنکار بن گیا تھا وہ۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے اس کی باتوں پر اعتبار کر لیا، یقین کر لیا اس کی کہانی پر۔ ارے وہ تو ساری عمر تیار رہا بلکہ اس بات کا اکثر تذکرہ بھی کرتا تھا کہ بھائی رشید! کیا ہم سے کوئی اس طرح ٹوٹ کر محبت نہیں کر سکتی جیسے داستان امیر حمزہ کے شہزادے سے لڑکیاں کرتی تھیں۔ بڑا ہوشیار ہو گیا ہے یہ داستان گو۔ آنے دے اسے۔ پوچھوں گا ضرور پوچھوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔

اس کی یہ باتیں سن کر میں ششدر رہ گیا تھا اور پھر میں خفت کے مارے وہاں سے بھاگ آیا تھا۔

کتنے دنوں کے بعد اس شام میرا گھر وہاں سے ہوا تو میں نے دیکھا۔ کار پوریشن کے کتنے ہی مزدور اس بوڑھے برگد کو گرانے کے لیے کوشاں ہیں اور علم دین سے یہ جو کیا لپا کر رہا تھا، ان سب سے انتہا بھری آواز میں جھگڑ رہا تھا۔ وہ انہیں برگد کے درخت کو کاٹنے سے روک رہا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے برگد کے اس درخت کو کاٹ ڈالا۔ اس پر بسرا کرنے والے سارے پرندے درخت کے گرتے ہی ادھر ادھر اڑنے اور چپختے لگے تھے۔ بے گھر پرندے اور بے گھر بے چارے بوڑھے..... ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔



مکمل شہر و سخن

✽ ایم سخاوت کرنا ہی..... آزاد کشمیر
مجھے اس سے کچھ گل نہیں سو میں نے جیون ہار دیا
اے کاش بھی تم جان سکو جو عشق نے ہمیں آزاد دیا
✽ اوشارا بھی..... مٹھی سندھ
جہاں عشق میں گو پیکر وفا ہوں میں
تیرہ نگاہ میں جب کچھ نہیں تو کیا ہوں میں
✽ شبانہ حسن..... لاہور
اچھا بن کر کیا ملنا جو برا بنا تو کیا کھوتا
دنیا کھیل تماشا ہے ہر شخص پہ تالی بجاتی ہے



✽ زرین خان آفریدی..... حیدر آباد
ابھین میں نے کئی جھک کے بھی سلجھائی ہیں
لوگ سارے تو نہیں..... قد کے برابر ہوتے
✽ محمد شفیق حسین..... نیوکراچی
میری خوبی پر جتنے ہیں یہاں اہل زبان خاموش
میرے عیوب پہ چرچا ہوتا تو کتنے بھی بول پڑتے ہیں
✽ عرفان شاہ، عتیق الرحمن..... فیصل آباد
زمانے میں کون کرتا ہے وفا ایک سے ایک
دل کے دو حروف ہیں وہ بھی جدا ایک سے ایک
✽ مایہ ن فاطمہ..... جگرہ شاہ مہتمم
دے دیا تہی ہوئی دھوپ کے صحرا کا سحر
میں نے خوشبو کی رفاقت کا سفر مانگا تھا
✽ داؤد اشفاق..... جگرہ شاہ مہتمم
ہے ادھر شہر نگار ان تو ادھر دشت جنوں
آج کس موڑ پر قسمت ہمیں لے آئی ہے
✽ ملائکہ حریم..... جگرہ شاہ مہتمم
پلٹ سکوں نہ میں آگے ہی بڑھ سکوں جس پر
مجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اک شخص

✽ عبدالجبار رومی انصاری..... قصور
گہرائی الگ لہروں کا پھیلاؤ الگ ہے
ساحل سے مگر موجوں کا ٹکراؤ الگ ہے
جو خود کو سینے ہوئے بیٹھا ہے بظاہر
اس ٹوٹے ہوئے شخص کا بکھراؤ الگ ہے
✽ نعیم احمد..... بہاولپور
اپنا جلوہ تم دکھا دو سب کو نامعلوم ہو
ہم جو کہتے ہیں تمہیں رشک تفرج ہے کہ جموٹ
کھینچتے ہیں آج اے دل ان کو ہم اپنی طرف
دیکھتے ہیں جذب اللہ میں اڑج ہے کہ جموٹ
✽ وزیر محمد خان..... بلبل ہزارہ
پوچھا تھا حال اس نے بڑی مدتوں کے بعد
مجھ پر گیا ہے آگے میں یہ کہہ کے رو پڑے

✽ ثناء سلمان..... کورنگی، کراچی
کی نہیں تھی کسی چیز کی مگر اکثر
اکیلے بیٹھ کے رویا ہوں زار زار بہت
✽ باسط ولید الرحمن..... تلہ گنگ، سکھر
میرے حجرے میں نہیں، اور کہیں پہ رکھ دو
آساں لائے ہو، لے آؤ، زمیں پہ رکھ دو
✽ مظہر بلال..... تلہ گنگ، سکھر
گھر کی دشت سے لرزتا ہوں پر نہ جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے
✽ محمد رشید سیال..... سکھر
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیکھ
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
✽ نوشہہ گلزار..... سکھر
ہم ایسے نہیں ہیں کہ جو آگھ اپنی جھپک جائے
کو برق سی ہر دم تری کشمیر سے چپکے
آگ نہیں وہ کہ بھادے جسے پانی
عشق اور مرے گریہ کی تاثیر سے چپکے
✽ جاوید اختر رانا..... پاکپتن شریف
نہیں ہم کو شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے روٹے ہوئے ہیں
بظاہر خوش ہیں لیکن سچ بتائیں
ہم اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے ہیں
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
کس کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے درو سنا ہے ہم
ماری دنیا چھانی ہم نے اک نہ ایسا فرد ملا
✽ ثمنہ کمال..... لاہور
بن تیرے عجب حال مری جان ہے میرا
بیٹھا ہوں کہیں اور کہیں دھیان ہے میرا
حال دل ٹھنک نہیں نہ کہا میں نے کسی سے
اے حضرت غم تم پہ یہ یہ احسان ہے میرا
✽ اشفاق شاہین..... لاہور
گر بتا دیں گے بادشاہی کے
ہم فقیروں سے دوستی کرلو
✽ محمد صفدر معاویہ..... خانپور
دنیا نے مال غنیمت سمجھ لیا ہے مجھے
جس کے ہاتھ بٹنا لگا اڑا لیا ہے مجھے

✽ اورلیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
یہی ہے آزماتا تو سنا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو
✽ حکیم سید محمد رضا شاہ..... میانوالی
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
✽ حمزہ آریان..... تلہ گنگ، سکھر
میرے گھر کی ساری روشنیاں تیرے ساتھ تھیں
دکھ کی راتیں سکھ کی گھڑیاں تیرے ساتھ تھیں
✽ عزیزین ناز..... جھنگ شہر
اگر میں آؤں گا صدیوں کی عمر لاؤں گا
کہ تیرے پاس مجھے مختصر نہیں رہتا
✽ انعم کمال..... حیدر آباد
جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے
دنیا، ارے یہ دنیا تو برباد ہو دے گی
✽ میمونہ اصغر..... گلستان جوہر کراچی
اسے دیکھوں تو بس اس کو دیکھتا جاؤں
وہ حسن خاص بڑے کردار میں رہتا ہے
تمہارے خواب مرے رنجوں میں جاگتے ہیں
تمہارا چہرہ مری چشم تر میں رہتا ہے
✽ سائرہ نواب..... پشاور
رات بھر سڑکوں پہ اب تاریکیاں چنے پھرد
سو گئے سب لوگ دروازہ کھلا کوئی نہیں
ہم سفر سے لوٹ کر آئے تو یہ عقدہ کھلا
اپنی بستی میں ہمیں پہچانتا کوئی نہیں
✽ شاہین نسیم..... ٹنڈوالیار
دیکھنا دشت نظر میں وہ بھی منظر آئے گا
شام کی دلہیز پر دن کا گداگر آئے گا
سونہ دواک دوسرے کو اپنے چہروں کے نقوش
بے کسی کا دور چل نکلا ہے مگر گھر آئے گا
✽ اسلم احمد..... سکھر
دل میں ہیں سوطر ح کے ڈر دیکھیے ہوتا ہے کیا
لے کے واں مجھ کو مری تقدیر پھر پکٹی تو ہے
✽ ممنون حسین..... چنیوٹ
شب فرقت میں جی لگتا نہ تھا اپنا کہانی میں
پڑے چپکے سر بستر سنا کرتے تو ہم بھی تھے

دکان کی مالکن نے کاؤنٹر سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی۔ دو افراد سیاہ کوٹ پہنے اور چہرے پر ماسک لگائے اسٹور میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے کندھوں پر بڑے بڑے بیگ لٹکے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے تھیلوں سے شاٹ گنیں نکالیں اور ان کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

”کیٹس رجسٹر کھولو اور ساری رقم میرے حوالے کر دو۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”جلدی کرو۔ ورنہ میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

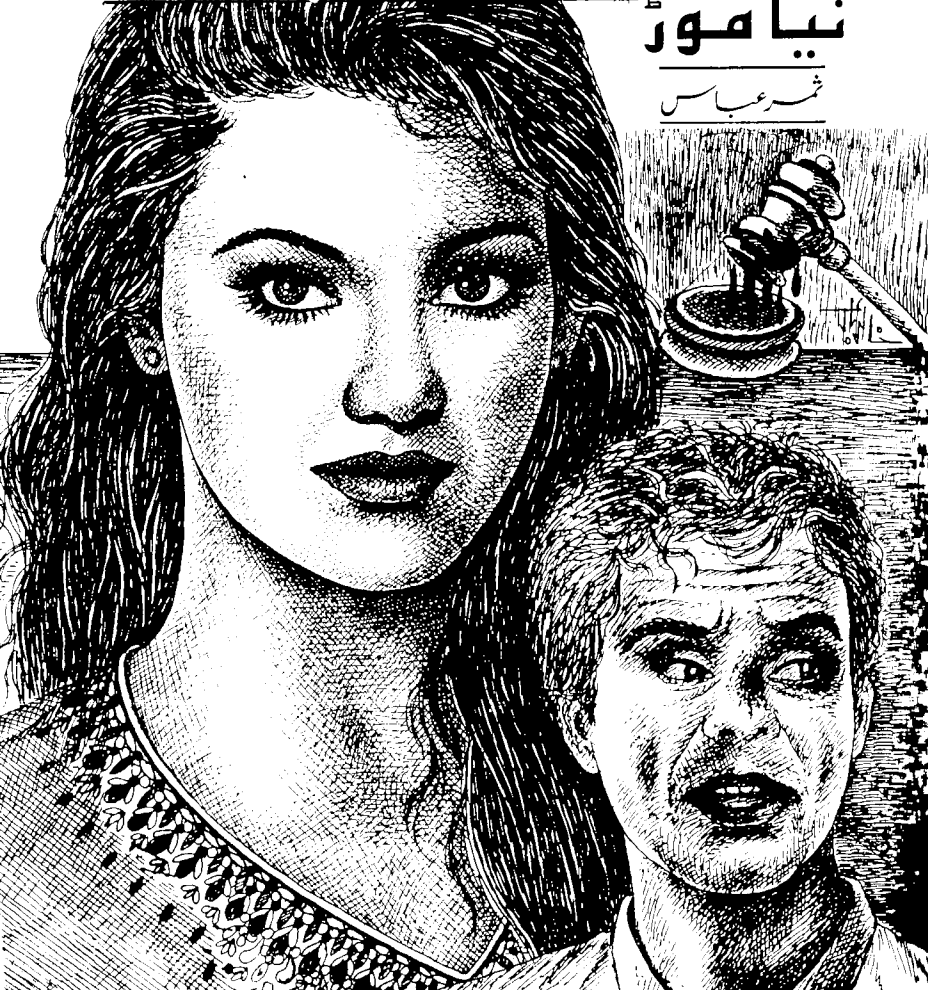
اس نے کانپتے ہوئے دراز کھولی۔ ہر روز صبح وہ بینک سے چھوٹے نوٹ اور سکے لے کر آتی تھی تاکہ نقد خریداری کرنے والوں کو بقیہ رقم واپس کر سکے۔ ویسے تو آج کل زیادہ تر لوگ کریڈٹ کارڈ ہی استعمال کرتے تھے۔ اس وقت دراز میں صرف دو سو سات ڈالر ہی تھے۔

تیزی سے گزرتے حالات کی ڈوری تھامے ایک حینہ کی وفات

جس طرح بعض اوقات بغیر منزل کے سفر کرنا ضروری ہو جاتا ہے اسی طرح بغیر اختتام کے کسی موڑ پر کہنا بھی روک دینا لازم ہوتا ہے کیونکہ... نئے موڑ کے بغیر اس کا مکمل ہونا ممکن نہیں ہوتا... اس کی زندگی میں بھی ایک ایسا ہی موڑ آنے والا تھا جس کے بارے میں خود اسے بھی ادراک نہیں تھا۔

نیا موڑ

شیر عباس



✽ خالد خان.....نو پے یک تکھ
دوست ایچھے ہو تو پورے دوستی کے ہو رہو
یا کسی کو کر رکھو تم یا کسی کے ہو رہو
✽ شاہدہ جنید.....کراچی
کسی کو دے کے دل کوئی نواخ نغاں کیوں ہو
نہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
✽ فرحانہ عاصم.....کھمر
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو
✽ جنید ملک.....کراچی
از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ
✽ اسد علی.....ملتان
صد جلوہ روبرو ہے جو مڑگاں اٹھائے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائے
✽ ذاکر خان.....لاڑکانہ
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ جہراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی
✽ اویس احمد.....حیدرآباد
ہے بزم تیاں میں سخن آزرہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
✽ ایشا طارق.....ڈیرہ اسماعیل خان
غم دنیا سے گریانی بھی فرمت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
✽ وجاہت علی.....بمکر
چلو کہ کوچہ قاتل سے ہم ہی ہو آئیں
کہ نفل دار پہ کب سے شمر نہیں آیا!
✽ تانیہ خورشید.....منڈی بہاؤ الدین
دلوں میں اور ستاروں میں اجا تک جاگ اٹھتی ہے
عجب پچل، عجب جھل مل چراغ شام سے پہلے

✽ شاہد علی.....فیصل آباد
گلی سے یار کی جاںیں کہاں ہم اے واعظ
کہے ہے تو جسے غلہ بریں یہی تو ہے
✽ خیام خان.....پشاور
جی لگے کیونکر مرا تجھ بن کہ نظروں میں مری
گھر ہے ویرانہ سا بھی اور شہر اک جنگل سا ہے
✽ فیاض احمد.....اوکاڑہ
جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
بھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور شرایاں تھے
✽ شیر اکاشاں.....کراچی
لبو میں شوق کا اک رقص تھا جو جاری تھا
پر ان کے سامنے لب بستہ ہم رہے یونہی
✽ ناہید یوسف.....اسلام آباد
کیسے سنبھال رکھی ہے تو نے یہ کائنات
ہم سے تو ایک دل بھی سنبھالا نہ جا سکا
✽ صباحر.....کراچی
سر اٹھاتی ہے خواہش تعمیر
جب بھی گرتے مکاں کو دیکھتا ہوں
✽ اسد خان.....ہامبرہ
تا امید ہے دیدنی اس کی
جس کو اپنا بھی انتظار نہ ہو
✽ مہتاب احمد.....حیدرآباد
اک دھرے کے کتنے مزاج آشنا تھے ہم
اور پھر بھی اختلاف کی راہیں نکل پڑیں
✽ امتیاز احمد.....پہاڑیہ
نکالا تو نے ہم کو تو گئے ہم تیرے کوچے سے
وگرنہ جیتے جی کب جاتے مر جاتے تو ہم جاتے
✽ محمد راجیل.....ہاڑی
تری اس بے وفا کی پرندا ہوتی ہے جان اپنی
خدا جانے اگر تجھ میں وفا ہوتی تو کیا ہوتا

مُحَفَّل شِعْر و سِخَر

کوین
برائے
شمارہ
جنوری
2018

نام: _____
پتا: _____

دسمبر 2017ء

”میں نہیں جانتی کہ تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں یا نہیں۔“ اس نے کہا۔

”پھر یہاں کیوں آئی ہو اگر میں اس طرح کا ہوں سے بات کرنے کی جگہ جاؤں تو زیادہ دیر اس کا رہا ہوں نہیں رہ سکتا۔“

وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”دراصل میں یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ ہم نے فل کرایک اسٹور میں ڈکیتی کی تھی۔“

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”کہاں بروکلین میں؟ جہاں تم رہتی ہو۔ میری بہن پارک کے علاقے میں؟“

”بروکلین میں نہیں۔ وہ اسٹور میں ہن میں ہے۔ ہم دس بجے کے قریب اس ڈریس شاپ میں داخل ہوئے۔ ہمارے ہاتھوں میں شاٹ گنیں تھیں۔ دکان اسی وقت کھلی تھی اور مالکن کے علاوہ وہاں کوئی اور نہ تھا۔ ارد گرد کا علاقہ بھی سنسان تھا۔ دراصل وہاں سفید پوش رہتے ہیں۔ مرد اپنے کام پر جا چکے تھے اور خواتین گھر کے کاموں میں مصروف تھیں۔ ہم نے وہاں سے تقریباً دو سو ڈالر زر اور دو قیمتی لباس اٹھا لیے۔“

”تم دونوں گرفتار نہیں ہوئے؟“

”ہم نے اسٹور کے عقب میں واقع ڈریسنگ روم میں فائر کیے اور مٹی نے اس عورت کو تھپہ کی کہ وہ پولیس کو اطلاع نہ کرے۔“

”مٹی تمہارا بوائے فرینڈ ہے؟“

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مٹی نے اس عورت کو خبردار کیا کہ اگر اس نے پولیس کو اطلاع دی تو ہم واپس آ کر اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیں گے۔“

”اور اس نے تمہارے جانے کے بعد بھی پولیس کو فون نہیں کیا؟“

”میرا خیال ہے کہ اس نے ایسا کیا ہوگا۔ میں نے باقاعدگی سے ٹی وی کی خبریں دیکھیں اور دو دن تک اخبارات بھی خریدی رہی لیکن ابھی اس ڈکیتی کا ذکر نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ واقعی خوفزدہ ہو گئی تھی۔“

”میں نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سنا۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”لیکن وہ ایک کامیاب ماڈل ہے پھر اسے ڈریس شاپ میں ڈاکا ڈالنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی تو اس نے تمہیں فرما کر اسٹور کے بارے میں کچھ نہیں دیا۔“

”تم وہ انگوٹھی دیکھتے ہو جو اس نے منگنی کے موقع پر میری انگلی میں پہنائی تھی۔ وہ انتہائی اعلیٰ درجے کی تھی۔“

”میں بھی کہہ رہا ہوں۔ وہ بڑے بڑے

”اتھاروں میں آ رہا ہے۔ اس نے یقیناً اچھے پیسے کما لیے۔“

”اب وہ کام کرتا ہے تو جیسے بھی اچھے پلے ہیں لیکن اس کی اتنی کمائی نہیں ہوئی جس کی توقع تم کسی سپر ماڈل سے کر لے۔“

”مٹی بھی وہ ایک دن میں پندرہ سو ڈالر زر بھی کما لیتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک دن میں ہی اس کی سو تصویریں اتار لیتے ہیں جو سارا سال مختلف اشتہاروں میں کام آتی ہیں۔ اس لیے اسے سال کے بقیہ دنوں میں کام نہیں ملتا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت زیادہ پیسے نہیں بنائے بلکہ اس کے پاس کافی وقت ہوتا ہے۔“

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ اس نے تجھے میں تمہیں فرما کوٹ، سونے کا برسلٹ اور ہیرے کی انگوٹھی دی تھی۔ یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟“

”تم بچ جانا چاہتے ہو؟ میرا خیال ہے کہ اس نے یہ چیزیں چرائی تھیں۔“

”اور تم یہ بات جانتی تھیں؟“

”پہلے میں جانتا نہیں چاہتی تھی لیکن جب اس کے قریب ہوئی تو مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی۔“

”میری مدد کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے جو کچھ بتایا ہے اسے دہراتا ہوں۔ تم اس سے محبت کرتی تھیں۔“

”ہاں۔ یقیناً اب بھی کرتی ہوں اس کے باوجود کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں ہر روز صبح اٹھ کر اس کے بارے میں سوچتی ہوں جو مجھ سے دور چلا گیا۔ بعض اوقات میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر پاتی ہوں اور کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہتھوڑے سے اس کا چہرہ پھیل دوں۔“

”یقیناً تم اس میں کشش محسوس کرتی۔۔۔ بھولی۔“

”وہ انتہائی پرکشش ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا شاندار شخص نہیں دیکھا۔“

”یہ بات تم پہلے بھی بتا چکی ہو۔ تم اس کے پیار میں اتنا ڈوب چکیں کہ اس کی ہر بات ماننے لگیں اور اس کے ساتھ مل کر ڈریس شاپ میں مسلح ڈکیتی بھی کی؟“

”وہ مجھ سے سب کچھ کر داسکتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اس لیے ہمیں کوئی انوکھے کام کرنا چاہیے۔ ہم ہیش ایسے ہی ہاگوں والے کام کیا کرتے تھے ایک دفعہ ہم مین ہن میں ایک اونچی عمارت کے پاس سے گزر رہے تھے کہ چوکیدار کی نظر بچا کر لفٹ کے ذریعے سب سے اونچی منزل پر چلے گئے اور چھت پر قہقہے کرنے لگے۔ بعض اوقات مجھے تو بھی لگتا لیکن مٹی چاہتا تھا کہ میں یہ کام کروں۔ لہذا میں اس کے ساتھ مل کر یہ سب کرتی۔ جیسا

کہ میں نے بتایا کہ اس سے محبت کرتی تھی اور جب تک اس کے ساتھ رہی، میں نے اپنے آپ کو محفوظ سمجھا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا سو اسے اس کے کہ وہ اس کے پیار میں اتنی پاگل ہو گئی تھی کہ جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کے ہمراہ چھت کے کنارے ناچتی رہی یا اس کے ہمراہ اسٹور میں ڈکیتی کرنے چلی گئی۔

”اب تمہیں کس بات کا غصہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے مجھ سے شادی کرنے کے لیے کہا تھا۔“

”اور اس پر تم ناراض ہو گئیں؟“

اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میرے دماغ کا کوئی اسکرو ڈھلا ہو۔ ”کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔ اس وقت میں اپنے آپ کو میری بہن پارک کی خوش قسمت ترین عورت سمجھ رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے ایک ہیرے کی انگوٹھی دی۔ اس کی قیمت ایک لاکھ ڈالر تھی لیکن وہ اتنی قیمتی انگوٹھی نہیں خرید سکتا تھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس کے پاس ایک لاکھ ڈالر جمع ہوئے ہوں گے ورنہ وہ ایک تہ خانے میں کرائے پر نہ رہ رہتا ہوتا۔“

”تمہارا خیال ہے کہ اس نے وہ انگوٹھی چرائی تھی؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”ظاہر ہے تم خود اس کے ساتھ ایک ڈکیتی میں شریک رہی ہو۔ اس لیے تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی؟ پھر تم اس پر کیوں ناراض ہو رہی ہو؟“

”میں بتاتی ہوں۔ منگنی کے بعد شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی اور ہم نے شادی کے کارڈ بھی تقسیم کر دیے۔ ہمارا جون میں شادی کرنے کا ارادہ تھا اور چچ سے اس کا اعلان بھی ہو گیا۔ اس طرح سب لوگ اس شادی کے بارے میں جان گئے۔ اس کے بعد تمہارا آثار شروع ہو گئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان چیزوں کی قیمت کیا ہوگی؟“

”مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں۔“

”میں نے انٹرنیٹ پر دیکھا تھا۔ نو ڈیوسیر پانچ سو ڈالر۔“ ڈیکوم کلینر ساڑھے چار سو ڈالر زر اور دوسری کئی چیزوں کے علاوہ کچھ لوگوں نے نقد رقم بھی دی۔ جب میں نے حساب لگایا تو ان کی مالیت تقریباً پچیس ہزار ڈالر زر بنی تھی۔ منگنی کی انگوٹھی اور تحائف اس کے علاوہ تھے۔ جو سب چوری ہو گئے۔“

”انہیں کس نے چرائی؟“

”مٹی۔“ وہ بولی۔ ”یہ حرکت مٹی کی ہے۔ میں ایک دن کام سے واپس آ کر اس سے ملنے گئی۔ اس کے اپارٹمنٹ کا

دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ خود اپنے سامان سمیت غائب تھا۔ کپڑے، جوتے، ٹوتھ برش، شیوہ کا سامان یہاں تک بکھٹھا بھی ساتھ لے گیا۔ تمام تجھے بھی غائب تھے۔ میں نے ایک رات پہلے اپنی انگوٹھی اتار کر بیڈ کی سائڈ پر رکھی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس انگوٹھی کا انشورنس کرانا چاہتا ہے۔ لہذا ایجنٹ کو دکھانا ہوگی۔ وہ انگوٹھی غائب ہے۔ البتہ وہاں سے یہ خط ضرور ملا۔ تم بھی پڑھ لو۔“

اس خط میں لکھا تھا۔ ”لینا! مجھے افسوس ہے کہ ہماری شادی کامیاب نہیں ہوگی۔ میری خواہش ہے کہ تم ایک اچھی زندگی گزارو۔ میں تمہیں ان سب چیزوں کی قیمت ادا کر دوں گا۔ مٹی۔“

”وہ مجھے کیا واپس کرے گا۔“ لینا اونچی آواز میں بولی۔ ”میں اسے واپس کرنا چاہتی ہوں۔ پادری نے چرچ میں اس منگنی کا اعلان کیا تھا۔ سب لوگوں کی موجودگی میں..... خدا کے سامنے۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جس سے اس کا میک اپ خراب ہو رہا تھا۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنے دوستوں کا سامنا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اگر منگنی ٹوٹ جائے تو تحائف واپس کرنا ہوتے ہیں لیکن میں کیسے وہ تحائف واپس کر سکتی ہوں، وہ تو سب چرا کر لے گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ میں یہ سب چیزیں واپس کرنے کے لیے پچیس ہزار ڈالر کہاں سے لاؤں گی۔ اگر میرے پاس وہ انگوٹھی ہی ہوتی تو اسے بیچ کر سب لوگوں کی چیزیں واپس کر دیتی۔ اب میں اپنے کسی دوست کا سامنا نہیں کر سکتی یہاں تک کہ سڑک پر لوگوں کو بھی منہ نہیں دکھا سکتی۔ پورا علاقہ یہ بات جانتا ہے میرے لیے تو یہ زندگی عذاب بن گئی ہے۔“

اگر میں اس چوڑی میز کے دوسری طرف نہ بیٹھا ہوتا تو ضرور اس کے کندھے پر ہتھکی دیتا یا اسے گلے لگا کر کہتا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس کی شرمندگی اور غصے کو محسوس کر رہا تھا لیکن مجھے اپنا کاروبار بھی دیکھنا تھا۔ لہذا خالص پیسہ ورنہ انداز میں پوچھا۔ ”مجھ سے ملنے کیوں آئی ہو؟“

”میں چاہتی ہوں کہ تم اسے تلاش کرو۔“ اس نے کہا۔ ”اور اس سے شادی کے تحائف لے کر مجھے واپس کر دو تاکہ میں انہیں دوستوں اور رشتے داروں کو لوٹا سکوں۔ اسی طرح یہ شرمندگی دور ہو سکے گی۔ اس کے بعد وہ یہاں کہیں بھی رہ رہا ہوگا میں وہاں جا کر اس کے چہرے پر ہتھوڑے سے رساؤں گی۔ اسے تو جیل میں ہونا چاہیے۔“

”کیا تم نے پولیس میں رپورٹ درج کروائی ہے؟“

میں نے پوچھا۔

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”پولیس والے نکلے ہیں۔ وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ میں پہلے ہی ان کے پاس جا چکی ہوں۔ وہاں ایک احقناہ قانون کے بارے میں معلوم ہوا کہ شادی اور منگنی کے تحائف فریقین کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی دوسرے فریق کو بتائے بغیر اپنے مصرف میں لاسکتا ہے یا فروخت کر سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی ایک فریق تمام تحائف اپنے پاس رکھے تو یہ خلاف قانون نہیں ہے۔ اس لیے میں اس کا چہرہ ہتھوڑے سے پکاتا چاہتی ہوں۔“

مجھے اس کی حالت پر آنسو ہونے لگا اور سوچنے لگا کہ اس سے اخراجات کے نام پر کچھ رقم اینٹھ لوں یا اسے بیچ بتادوں۔ میں نے اسے دھوکے میں رکھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں اپنی چیزیں یا پیسے ملنے کا کوئی امکان ہے۔“

اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اسے شدید صدمہ ہوا ہو یا یابوی ہوئی ہو۔

”کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟ تمہیں صرف وہ تحفے تلاش کرنا ہیں اور.....!“

”دیکھو۔ میں بھی پولیس والوں کی طرح ہی انہیں تلاش کرتا اگر یہ چوری ہونے والے دہساکے بجائے کسی اور نے کی ہوئی۔ میں نیو یارک میں تمام کباڑیوں، پرانے سامان کی خرید و فروخت کرنے والوں، لائیک آئی لینڈ اور نیو جرسی کی خاک چھانتا۔ تمام متعلقہ ویب سائٹ دیکھتا ایک دوسری ویب سائٹ پر اس کشیدہ سامان کی فہرست بتا کر ڈال دیتا۔ تاکن ایون کوٹون کرتا اور زیورات کی دکانوں پر جا کر معلوم کرتا کہ حالیہ دنوں میں کسی نے ڈائنمنڈ کی انگوٹھی بیچنے کی کوشش کی ہے۔ میں فقہ اور سکھ انیو کے درمیان سینا لیسویس اسٹریٹ پر جاتا۔ یہ جگہ ڈائنمنڈ ڈسٹرکٹ کہلاتی ہے۔ وہاں بے شمار جیولرز ڈائنمنڈ کا کاروبار کر رہے ہیں۔ ان سے بات کر کے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ میری فیس پندرہ سو ڈالرز فی گھنٹہ ہے۔ سو گھنٹے کے بعد میری تلاش ختم ہو جاتی، چاہے تمہارا سامان ملتا یا نہیں لیکن تمہیں پندرہ ہزار ڈالرز دینا پڑتے۔“

”کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ میں اس سامان خاص طور سے ڈائنمنڈ کی انگوٹھی کی تلاش کے لیے پولیس والوں کی خدمات حاصل کر سکوں؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ ڈائنمنڈ کی انگوٹھی مشترکہ ملکیت

تصور کی جاتی ہے یا نہیں لیکن وہ اس کے بارے میں اطلاع مستہر کر سکتے ہیں۔ شاید وہ مل جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے ہی اینٹھ ورپ بیچ دی گئی ہو۔“

”یہ کہاں پر ہے؟“

”یہ یلیم کا ایک شہر ہے۔ وہاں ہیرے کے جوہریوں کی لاتعداد دکانیں ہیں۔ جہاں تک نقد رقم کا تعلق ہے تو اسے بھول جاؤ۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ خرچ ہوگئی ہوگی۔“

”وہ میرے ساتھ یہ کیسے کر سکتا ہے۔“ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”تم پہلی عورت نہیں ہو جس نے ایک چور بوائے فرینڈ سے دھوکا کھایا ہو۔“

”یعنی تم میری مدد نہیں کر سکتے؟“

”فرض کرو میں چھ ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد پرانے سامان کی دکانوں، جیولری اسٹور اور مختلف ویب سائٹ کی خاک چھان کر کچھ چیزیں تلاش کر لیتا ہوں تب بھی تم یہ کیسے ثابت کرو گی کہ وہ تمہاری چیزیں ہیں۔ کیا تمہارے پاس فوڈ پر ویسٹر کا سیریل نمبر یا اس کی خریداری کی رسید ہے۔ اسی طرح تمہیں ہر چیز کا ثبوت دینا ہوگا کہ وہ تمہاری ہیں۔ ورنہ یہ چیزیں تمہیں بھی واپس نہیں مل سکیں گی۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے بات کرو۔ انہیں بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری بات سمجھ جائیں گے۔“

”ممکن ہے کہ تم کی تلاش کر سکو۔“ لیٹا نے کہا۔ ”اگر تم نے اسے تلاش کر لیا تو کچھ چیزیں بھی مل جائیں گی اور میں اس کو سبق بھی سکھا سکوں گی۔“

”اس میں کچھ مسائل ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں شاید شادی کے تحائف کے مقابلے میں جی کو زیادہ آسانی سے تلاش کر سکتا ہوں تب بھی میرا معاوضہ دس سے پندرہ ہزار ڈالرز کے درمیان ہوگا۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ میں اسے کہاں تلاش کرتا ہوں۔ بروکلین، برازیل یا کسی اور جگہ۔ کیا تم اتنی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہو؟“

”مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اب وہ بری طرح رو رہی تھی اور اس کے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو قصور وار محسوس کیا۔

”دیکھو دوست۔ میں بتاتا ہوں کہ کیا کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا ایک بہت اچھا دوست سراخ رساں ہے۔.....“

”یہاں میرین پارک میں؟“ اس نے کہا۔

”نہیں۔ وہ مین ہٹن کے مشرقی حصے میں ہوتا ہے لیکن

اس کے پورے نیو یارک میں تعلقات ہیں۔ وہ کئی سال پارک پوسٹ ڈیپارٹمنٹ میں رہ چکا ہے اور بہت سے لوگوں کو جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرے جو مال مسروقہ کے خریدار کو جانتا ہو یا اسے اس بارے میں معلومات ہوں۔“

”اس میں کتنا خرچ آئے گا؟“ اس نے پوچھا۔

”میں تم سے کچھ نہیں لوں گا اور اگر وہ تمہاری مدد کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ مدد کرنا چاہتا ہے۔“

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ بات کر کے دیکھ لو۔“

چنانچہ میں نے اپنے پرانے دوست اور سراخ رساں ل موریسن کو فون کیا اور اسے پورا قصہ سنایا۔ اس نے بڑے زور سے پوری بات سنی پھر بولا۔ ”میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم نے ساری رقم کو کسٹن یا جوئے میں اڑا دی یا پھر اس کی زندگی میں کوئی نئی عورت آ گئی ہے اور وہ اس پر فریج کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کون جانتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔ وہ میکسیکو یا مونا کوئیں ہو سکتا ہے۔“

”کیا میں یہ سمجھوں کہ تم ان چیزوں کے واپس ملنے کے امکانات کے بارے میں زیادہ پرامید نہیں ہو.....؟“

”بالکل بھی نہیں۔ اس سے کہو کہ وہ مگر جا کر اپنے زخم چاٹے اور اگلی بار کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کرے۔“

”دیکھو بلکہ وہ صرف سامان کے لیے پریشان نہیں ہے بلکہ وہ شرمندگی محسوس کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ مگر سے باہر نکلتی ہے تو لوگوں کا سامنا نہیں کر پاتی۔ شاید تم اسے کچھ بتا سکو۔ اسے کوئی امید دلا سکو۔ کم از کم انگوٹھی مل جائے۔“

”دوسرے لفظوں میں تم چاہتے ہو کہ میں اس سے جھوٹ بولوں۔“ موریسن نے کہا۔

”یہ جھوٹ نہیں ہوگا بلکہ تم اسے بتاؤ گے کہ اس کی چیزیں کسی پرانے سامان کی دکان سے مل سکتی ہیں یا کوئی چوری کا مال خریدنے والا پکڑا جائے۔ اس سے ان چیزوں کی تفصیل معلوم کر لو۔ اس کام میں زیادہ سے زیادہ میں منٹ لگیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔ اس سے کہو کہ مجھے فون کرے۔“

میں نے ایسا کیا اور اس کے غیر متوقع نتائج آمد ہوئے۔ تین دن بعد مجھے موریسن کی وائس میل موصول ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”رہی مجھے فون کرو۔ تم پر ایک ڈرنک

ادھار ہوگئی۔ ہو سکتا ہے کہ لچ دینا پڑ جائے۔“

میں نے اسے اسی وقت فون کیا۔ ”یعنی تمہیں وہ شخص مل گیا۔“ میں نے مل سے کہا۔ ”مبارک ہو۔ کہاں سے تلاش کیا؟“

”وہ سٹیل میں ہے۔ ہم نے اسے کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہوئے پکڑا۔ وہاں کی پولیس نے اسے تلاش کر کے گرفتار کر لیا۔ ڈسٹرکٹ انٹاری اس سلسلے میں ضروری کارروائی کر رہا ہے۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ یہ سن کر خوش ہو جائے گی۔“

”اتنا زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔“ موریسن نے کہا۔ ”اسے اصلاحی مرکز میں رہنا ہوگا جب تک وہ ضمانت نہ کر دالے یا اس کا مقدمہ شروع نہ ہو جائے۔“

”کیسا مقدمہ؟“

”اسی جرم میں جس کا سامنا ٹی کو ہے۔ مسلح و کشتی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ان دونوں نے مل کر یہ جرم کیا تھا۔ وہ لیکزنٹن اپونیو میں واقع ایک ڈریس شاپ میں گئے دونوں کے پاس شٹاں نکٹیں تھیں۔ انہوں نے اسلحے کے زور پر نقد رقم چینی۔ دو قیمتی جوڑے اپنے بیگ میں ڈالے اور بالکن کو ہراساں کرنے کے لیے ڈرینگ روم کی دیوار میں کئی فائر کیے۔“

”تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری کلائنٹ نے۔ رضا کارانہ طور پر۔“

”یہ بالکل بن ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ تمہیں کیوں بتائے گی؟“

”انتقام میرے دوست انتقام۔“ موریسن نے کہا۔

”وہ میرے پاس آئی اور ان چیزوں کی فہرست گنوانے لگی جو ٹی نے چرائی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کی قیمت بھی بتاتی جا رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس بات کی بہت کم امید ہے کہ ان میں سے کوئی چیز مل سکے کیونکہ یہ رقم دونوں کی مشترکہ ملکیت ہیں اگر ہمیں معلوم ہو جائے تب بھی اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔“

”پھر وہ کیا بولی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے کہا۔ فرض کرو کہ اس نے کوئی مسلح و کشتی کی ہو۔ تب تو تم اسے گرفتار کر سکتے ہو؟“

”ہاں۔ اس صورت میں یہ ممکن ہے۔“

میں خوفزدہ ہو گیا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔

”تب اس نے کہا کہ وہ جانتی ہے۔ اپنے لیے بھی



تلاش

بابر نعیم

انسان کے دل میں اگر جستجو کا جذبہ نہ ہوتا تو شاید آج دنیا اس طرح تسخیر نہ ہوتی اور نہ ہی دریافت کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس پر بھی نہ صرف دنیا بلکہ بالخصوص سمندر دیکھنے کا جنون کچھ اس طرح سوار تھا کہ وسائل نہ ہونے کے باوجود مسائل کے انبار کی جانب محو سفر ہو گیا۔

ایک مضطرب انسان کے عجیب سفر کی مقررہ روداد

”مجھے آج لازمی سمندر دیکھنا ہے اور میں سمندر دیکھنے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔“ اس نے اپنے آپ سے گویا عہد کیا اور صبح سویرے اپنے گھر سے نکل پڑا۔ وہ کئی دنوں سے اس مہم کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ اس نے پوری رات جاگ کر گزار دی اور وہ تمام ضروری چیزیں اپنے مگ میں ڈال لیں جن کی اسے اس طویل سفر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس سے پہلے اس نے بھی سمندر نہ دیکھا تھا۔ اس کی طبیعت کا ضدی پن، اس کے والدین کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث بنتا آیا تھا اور آج بھی خدا سے سب کچھ چھوڑ کر سمندر دیکھنے کے لیے گھر سے باہر لے جا رہی تھی۔ صبح پانچ بجے اس نے آہستگی سے اپنا بھاری بیگ کندھے پر اٹھایا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اس کے والدین ابھی سو رہے تھے اور وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں سات بجے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ جب تک یقیناً وہ بہت دور جا چکا ہوگا اور اسے تلاش نہیں کیا جاسکے گا۔ اس کا گھر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر واقع تھا۔ گھر

مشکلات پیدا کر رہی ہے لیکن اب وہ اپنے سابق مگنیر کو کسی دوسری عورت کی زندگی تباہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی پھر اس نے پورا قصہ بتایا کہ کس طرح وہ اور فی ٹیٹا ٹاٹ گٹو سمیت اس اسٹور میں گئے اور ڈکیتی کے علاوہ دیوار میں فائر بھی کئے۔ میں نے پولیس ریکارڈ چیک کیا لیکن کسی نے اس واقعے کی رپورٹ درج نہیں کروائی تھی پھر میں خود اس اسٹور میں گیا اور وہاں دیوار میں سوراخ دیکھے۔ اسٹور کی مالکن نے ان پر سیاہ پردہ ڈال دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بہت خوفزدہ تھی۔ اس لیے اس نے ڈکیتی کی رپورٹ درج نہیں کروائی کیونکہ ڈاکوؤں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اس کی کھوپڑی اڑا دیں گے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ لینا اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔“

مورین نے مزید بتایا کہ دو دن بعد سیٹل پولیس نے ٹی کو ایک مالدار مطلقہ عورت کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ اس کے لیے یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بہت تیزی سے کام کرتا ہے۔ دس روز قبل وہ میرین پارک کے ایک خانے میں رہ رہا تھا اور جب پولیس نے اسے تلاش کیا تو وہ ایک شاندار بیڈ روم میں لیٹا ہوا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا۔ جب وہ اسے مکان سے باہر لائے تو اس کے عیانی کے دن ختم ہو گئے۔ اس نے ایک قیمتی شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

مورین نے چند ماہ بعد مجھے مقدمے کی کارروائی سے آگاہ کیا۔ لینا اور فی دونوں نے اٹھائی کہ انہیں تصور وار نہ ٹھہرایا جائے۔ ٹی کے وکیل نے اعتراض کیا کہ لینا بھوٹ بول رہی ہے۔ دکان کی مالکن دونوں میں سے کسی کو بھی شناخت نہ کر سکی کیونکہ انہوں نے اپنے چہروں پر نقاب چڑھایا ہوا تھا۔ اس نے پولیس کو اپنے بیان میں کہا کہ وہ ان دونوں کو مرد سمجھ رہی تھی۔

لینا نے بھی اپنے بیان میں یہی کہا کہ ٹی نے بھی اسے یہی بتایا تھا کہ یہ واردات اس نے اپنے ایک مرد ساتھی کی مدد سے کی تھی اور اس نے مورین کے سامنے صرف اس لیے اعتراف کیا کہ وہ اپنے سابق مگنیر سے انتقام لینا چاہ رہی تھی پھر چونکہ ہی بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جب لینا سارا الزام فی پر ڈال رہی تھی۔ وہ کمرائے عدالت میں کھڑے ہو کر چلایا۔ ”یہ جھوٹی ہے۔“

لینا نے نفرت سے اسے دیکھا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جج کے سامنے جا کر اس کا ہتھوڑا اٹھایا۔ اس نے اتنی تیزی سے غیر متوقع طور پر حرکت کی کہ محافظ اسے بردقت نہ روک سکے، وہ دوڑتی ہوئی ٹی کے پاس گئی اور اس کے



سے باہر نکل کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سمندر کس سمت میں ہوسکتا ہے؟ اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی کتاب میں پڑھا تھا کہ سورج سمندر میں غروب ہوتا ہے، اس لیے اس نے مغرب کی سمت میں چلنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی بہتر تھا کہ سورج طلوع ہونے کے بعد، سورج کی طرف اس کی پشت رہتی اور وہ سورج کی براہ راست تمازت سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ لڑکے نے فیصلہ کرنے کے انداز میں ایک گہرا سانس لیا اور مغرب کی سمت میں تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔

اس کی عمر صرف آٹھ سال تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک نوجوان کا سا عزم صاف جھلک رہا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں سمندر کی صرف تصویریں دیکھی تھیں۔ ان تصویروں کے مطابق، سمندر نیلے پانی کا ایسا بڑا ذخیرہ تھا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے شفاف پانی میں دیگیں اور شارک جیسی دیوبیل چھپا ہلکھوئی تھیں۔ سمندر میں تیرتے آکٹوپس اور رنگ برنگی سمی ٹھیلوں کے غول کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ اس نے سمندر کی تہ میں موجود مورتوں اور مرجان کی خوبصورت چٹانوں اور سمندر کے اوپر اڑتے سفید رنگ کے خوبصورت پرندوں کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ ان تصویروں میں اس نے سمندر میں تیرتے ایسے بڑے بڑے بحری جہاز بھی دیکھے تھے جن پر ہزاروں افراد سوار ہوتے تھے۔ وہ سوچتا تھا کہ حدنگاہ تک پہنچا ہوا پانی ہی پانی، آنکھیاں کرتی موبیں اور ساحل پر بکھری ہوئی خوبصورت سیپیاں، کیسا خوبصورت منظر پیش کرتی ہوں گی۔ وہ اکثر خواب دیکھتا تھا کہ وہ سمندر کے ساحل پر کھڑا ہے اور سمندر کی موبیں اس کے پاؤں میں گدگد کر رہی ہیں۔ وہ اکثر یہی سوچتا تھا کہ ساحل پر کھڑے ہو کر حدنگاہ تک پہنچے ہوں سمندر کو دیکھنا کیسا دلکش احساس پیدا کرتا ہوگا۔ اس کا تھما داغ اتنے زیادہ پانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے داغ میں نیلے وسیع سمندر کا یہ تصور لیے، وہ ایک پختہ عزم کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

جب وہ قصبے کی حدود سے باہر نکلا تو اس وقت صبح کا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا لیکن ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ قصبے کے باہر اس نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا۔ یہ بوڑھا آدمی ہمیشہ سڑک کے کنارے پھرتا تھا اور ہر وقت آسمان کو تکتا رہتا تھا۔ اس بوڑھے آدمی کو دیکھتے ہی لڑکے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ شاید یہ سمجھے رہے کہ لڑکے کی کوشش کرے؟ لڑکے نے دل میں سوچا اور اپنے قصوں کی رفتار کچھ تیز کر لی لیکن اس وقت بوڑھے نے بھی اسے دیکھ لیا۔

”اے لڑکے! اتنی صبح کہاں جا رہے ہو؟“ بوڑھے نے سخت لہجے میں پوچھا۔
”سمندر دیکھنے۔“ لڑکے نے خشک لہجے میں جواب دیا لیکن اس دوران اس نے اپنی رفتار میں کمی نہ کی تھی۔
”سمندر؟“ بوڑھے آدمی نے اپنا پوچھا منہ کھولا اور ہنس پڑا۔ ”اچھا خیال ہے۔“ بوڑھے نے تیزی سے آگے بڑھ کر لڑکے کا بازو پکڑا اور اسے روک لیا۔ ”تم سمندر دیکھنے جا رہے ہو۔ ٹھیک ہے، لیکن اس کے لیے تمہیں پہلے اوپر جانا ہوگا۔“ بوڑھے آدمی نے اپنی کپکپاتی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سمندر وہاں ہے، تمہارے سر کے سین اوپر۔“

لڑکے نے اوپر دیکھا۔ صاف آسمان پر اس وقت ستارے غائب ہو چکے تھے اور سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ لڑکے نے بوڑھے آدمی کی بے معنی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک جھپٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور دوڑ لگا دی۔ ”اس بوڑھے کا داغ واقعی خراب ہو گیا ہے۔ سمندر آسمان پر کیسے ہوسکتا ہے۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ کچھ دور جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بوڑھا آدمی آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ”یہ واقعی سٹیلیا گیا ہے۔“ لڑکے نے سوچا۔

تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا اور زبان خشک ہو رہی تھی۔ اس نے رک کر بیگ میں سے پانی کی بوتل نکالی اور چند گھونٹ پانی پی لیا۔ اسے بھوک تھی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اپنا کھانا بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ نہ جانے سمندر کتنی دور ہو۔ سمجھے اپنی غذا احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا ہوگی؟ لڑکے نے سوچا۔

جلدی وہ ایک چھوٹی پہاڑی تک پہنچ گیا۔ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کسی بھی سمت میں سمندر کی موجودگی کی کوئی علامت نظر نہ آ رہی تھی۔ اب سورج خاصا بلند ہو چکا تھا اور لڑکے کو شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پشت پر لدا بیگ اتارا اور تھوڑا سا کھانا کھا لیا۔ پہاڑی سے اترنے کے بعد، اس کے سامنے ایک وسیع چھیل میدان تھا اور اس کے دوسری طرف پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جب وہ وسیع چھیل میدان عبور کر کے ان پہاڑیوں کے قریب پہنچا تو اس وقت سورج ڈھلنے لگا تھا۔ اب سورج اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ ایسا ہیان پہاڑیوں کے پیچھے سمندر ہوگا جس میں یہ سورج غائب ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔ اس خیال سے اس

کے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی اور اس نے تیزی سے یہ پہاڑی سلسلہ عبور کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ آخری پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے ہونٹ سکڑ گئے کہ سامنے ایک وسیع و عریض چھیل میدان موجود تھا۔ غروب ہوتے سورج کی سرخ روشنی میں اسے اس چھیل میدان کے دوسرے کنارے پر پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ حیران تھا کہ راستے طویل سفر کے دوران، اس کے راستے میں نہ کوئی قصبہ آیا تھا اور نہ ہی اسے کوئی آدمی نظر آیا تھا۔ حتیٰ کہ اسے کوئی جانور بھی نظر نہ آیا تھا۔ اس کی خوراک کا ذخیرہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سمندر اتنی دور کیوں ہے؟ وہ چلتا رہا اور مسلسل چلتا رہا۔ اسے یاد بھی نہیں رہا کہ وہ راستے میں کتنی بار سو یا تھا۔ سوتے جاتے اس کے نچھے ذہن میں صرف سمندر کو دیکھنے کی خواہش تھی اور اسے کبھی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اسے ایک بار بھی اپنے ماں باپ کا خیال نہ آیا تھا جو اس کے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ نکان کی وجہ سے جب بھی اسے نیند آتی، وہ خواب میں سمندر میں تیری چھیلیاں دیکھتا، خود کو سمندر کی لہروں سے کھلتا دیکھتا اور سمندر کے ٹھیلوں پانی میں خود کو تیرتا محسوس کرتا۔ اسے اپنے ارد گرد رنگ برنگی چھیلیاں گھومتی نظر آتیں جو اس کے ساتھ آنکھیاں کرتیں۔

پورے سفر کے دوران وہ یہی سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار سمندر کو دیکھے گا تو اس وقت اس کی دلی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ سوچتا کہ اس وقت سمندر کی حالت کیا ہوگی؟ کیسا اس کی لہریں پھری ہوئی ہوں گی یا سمندر کا پانی خاموش کھڑا ہوگا یا ساحل پر اسے اپنے جیسے کچھ اور لوگ بھی ملیں گے جو سمندر کو تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچے ہوں گے اور سمندر کی خوبصورتی کو دیکھ کر ہمیشہ کے لیے وہیں رہنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔؟ اس کی آنکھوں میں چلنے کی سکت ختم ہو رہی تھی لیکن وہ دانت پیچھے ہٹتا ہٹتا چلتا رہا۔ اس کا پانی اور خوراک کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سامان کا تھپلا راستے میں ہی پھینک دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے کاندھوں کا بوجھ کچھ کم ہو گیا تھا اور وہ مزید کچھ دیر چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ لیکن جلد ہی اس کی ہمت جواب دہنی کی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

یہ آدمی رات کا وقت تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر دو چاند چمک رہے تھے۔ ان کی روشنی میں وسیع و عریض چھیل میدان کی سرخ منی حدنگاہ تک پھیل ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اب اسے سانس لینے میں بھی دشواری محسوس

ہو رہی تھی کیونکہ اس کے غلائی لباس میں موجود آکسیجن کا 200 گھنٹے کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد جب لڑکے کی سانس رکی تو اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی اور اس کی نگاہ آسمان پر تھی۔ سرخ کے تاروں بھرے آسمان پر اسے ایک نیلے رنگ کا روشن ستارہ نظر آ رہا تھا۔ یہ زمین تھی جہاں سمندر موجود تھا لیکن وہ لڑکے کی وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ سرخ سے بھی کوئی انسان زمین پر واپس نہ کیا تھا۔

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے سمندر جہاں پرچہ کی معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ یک اسٹال کا نام جہاں پرچہ دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو یک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

راہ اور مزید معلومات کے لیے

شیر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ ایس کیشنز

سپینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 نیٹ ۱۱۱ سٹیشن اینٹس باؤنڈ آری میں پتی پتلی

مندرجہ ذیل فون نمبر پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

وقت بادشاہ اور کاٹناٹ کی پرشے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور

نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی

میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین

کی خاک جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا آئینہ بن جاتا ہے اور

موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی

سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور

کبھی درد کی صورت آسویں کر دلوں میں گھائو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام

نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا

نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر

اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی

طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی

مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے

وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات

میں چاہے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین

امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

قسط نمبر: 9

وقت

حسام بہت

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

دلربا طویل داستان



اس کا نام اسد علی رکھا گیا ہے ”علی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے ہارے میں ہمیشہ کھینچا جاتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود علی سلطان کی عہدداشت میں پایا۔ علی سلطان نکلیاس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو ویل چیتھرکھ محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹائیڈ ایلین سے علی کے بیٹے کی ہو چکی تھی۔ دست رخصت ریٹائیڈ ایلین کو اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ رکھ کے لیے ایک کھلے دار مدرسی ہوئی تھی اور وہیں سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد دیا برتا کر رہا تھا جو اسے اٹکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں سیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی بڑھ رہے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے سن و عمر یا اٹکل سے بچو پوچھی کہ کوئی کی تو اس پر بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا..... ”میرے بچے! انھیں انکار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔“ یہ علی کی کتنی ہی تجسس کو بادی بنی ہلڈا جیتنے کے طور پر اس کا ذہن ہے۔ وہ سوچ کے اس لیے الجھتا رہا کہ جاتا تھا کراس افسطرابی کیفیت میں بھی اس کے نزعہ کی کوئی روشنی ہو سکتی ہوگی۔ اس کا وہ کبیں اس کے ذہن کی کسی جانب میں قدم رکھے جسے اس نے نکلیاس کے ساتھ ”بے تکلفی میں واقع“ ”سرکل“ نامی ایک اسٹور پر روز پتی ملازمت کرتی تھی۔ جس سال کی عمر میں علی نے ”سرکل“ علی سے اس کا کوئی بھی منہ پھیل ڈکری حاصل کر لی تو تنہا بنے ہوئے علی کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میٹیکن لڑکے ذہنی کی نیت سے ”سرکل“ سے ”میں تم سے آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ذہنی کے ساتھ موجود سٹریٹ میں نظارہ کوٹھ کر گئے۔ پولیس نے ٹیک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں میٹیکن ذہنی کو کئی گسی (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کچھ ایک جینسن (نیکاس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے بی (نیکاس) میں تھی۔ علی ایک ہوش میں رہتا تھا اور ایک جینسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آ جانا کر رہتا تھا۔ ”وٹی لاؤنج“ نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک سپاہی وزیر وینڈر شاراد اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل نشیں۔ جینسن سے علی کے در دل پر دیکھ دی تو اس کی زنگہ میں بہا ہوا آئی۔ ایک رات وہ وٹی لاؤنج میں جب لیورٹاڈ نامی ایک میٹیکن غنڈے اور اس کے حواریوں نے شارو سے بدبختی کی کہ کوئی علی تو علی تھا۔ اس مارا ماری کو ایک امیر وکیر پیشکش لپیڈی ڈیٹلیا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا زور ٹینگ کارڈ کو کھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے..... ”مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب کسی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لیا۔“ اس واقعے کے بعد وٹی لاؤنج کے علی کا قاعدہ آغا ز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیورٹاڈ کے غنڈوں میں گاہے بگاہے مدھم مدھم ہوئی۔ یہی۔ لیورٹاڈ نے ایک تربیت کا بدلہ لینے کے لیے کئی شادو کار کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ وٹی لاؤنج۔ وٹی لاؤنج اور وٹی لاؤنج اور وٹی لاؤنج کے شادو کار ریسٹورنٹس والی جاب چھوڑا اور علی نے اٹکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں کھایا۔ جاتا تھا۔ ایک روز جب شارو اٹکل اسٹور سے گھر وری پر یہ نئی کوئی لیورٹاڈ نے اسے انوکھا کر لیا۔ علی نے شادو کی تلاش میں بہت نہ باری اور شارو کو معزز بنا رہا یا آخر ایک رات لیورٹاڈ کا ایک ترقی سامی چیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے سچ خونی سرکے ہوا سر چیلو، شارو اور لیورٹاڈ کے حوالے سے زبان کھولے کوئی تار نہیں ہوا۔ علی نے ٹینس کے عالم میں مارا مار کر چیلو کو ہوا کر دیا۔ آجندہ روز چیلو کے نکل کی جربلی جینسن اور اس کے قریب وجوہات میں گریں گریں تھی۔ ایک جینسن میں سر پر یہ قیام نظر نہ آتا۔ ہوسکتا تھا علی نے اٹکل سلطان معصورت حال سے آگیا اور اپنی سرخ ہنڈے اسے سپورٹ کا شل لپک جینسن سے پوش پہنچ گیا۔ ”سر مرچن ہنڈا اسے سپورٹس میں قاتل سے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سٹین صورت حال میں علی نے ڈیٹلیا سے دہلنے کا فیصلہ کر لیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیٹلیا نے علی کی کھانسنے کے بعد کہا کہ اگر بہتر کھنسنے کا بہرہ کی دینا ہے کٹ کر اس کے ساتھ بیٹھنے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راسی ہوئے پر ان بہتر کھنسنوں میں ہر علی پر حیرتوں کا ایک نیا دور ابھوتا رہا۔ ڈیٹلیا بہت اونچی چوٹی کی مالک ایک پر اسرار لیلی تھی۔ اس نے اپنا ڈرسوٹھ اسٹائل کے علی کو چیلو مڈر کس سے اس طرح نکال لیا کیونکہ کھنسن سے بال..... علاوہ اس کے جینسن میں علی کو موت کی دھمکی کو بتایا کہ شارو، شارو، شارو کو کھانسنے کے لیے کب اسے شہر لے گا۔ یہاں وہ شارو کو کھانسنے کے بہتیم میں جوڑ کر ادا کر دے گا۔ ڈیٹلیا نے علی کو ٹینس دلا کر آگہر و بہتر کھنسنے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خوبصورت پوری کردی۔ تو وہ شارو کو کھنسنے والیں لے آئے گی۔ شارو کے حصول کی خاطر علی ڈیٹلیا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ ریسٹرن بالو والے اس بیٹھنے میں ڈیٹلیا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلم ہوش پر بہتر کھنسنے بڑے رنگین، رنگین، رومان پر دور اور ناقابل عقین تھے۔ ڈیٹلیا کی شخصیت کسی عرصے کے نہ تھی..... اس پرستار، ڈیٹلیا نے اپنے ہی ایسی دور پر اسرار شخصیات رینی آرتزک بارون لاڈ اور ہینا جیل بام سے علی کی ملاقات بھی کرادی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد ایوروں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ”اسکل اینڈ یوز“ سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زندگی میں خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے جوان کی تلاش تھی جس کی اس مسلمان رو پر یہ سبائی تھا۔ انہیں کھٹ تھا کہ علی وہی جوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں رو پوش ہو گئے تھے۔ ڈیٹلیا کی تمام علی کی ان کی شرائط پر مصادرتے ہوئے ”اسکل اینڈ یوز“ کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیٹلیا کی خواہش کو کھٹا دیا اور یس سے بے بسی اپنے اٹکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی گروہ کی راہ دکھ رہی تھی۔ اٹکل نے نہایت ہی مختصر کج جاع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے بارے میں اور بہتر داری سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، ایک سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) کے علی پاک (امریکا) میں امریزاڈ کی حیثیت سے پاس پہنچایا گیا۔ وہاں علی جیک سلطان کا دوست تھا۔ اس کے والدین نے تمام تر اخراجات کے ادا کر دیے تھے۔ علی سلطان نے ایک کراچی میں کھیلے چند ماہ سے ایک کراچی سے رقم آنا بند ہو گئی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کی معصیت باتوں برداشت کر رہی ہیں کھیلے چند ماہ سے ایک کراچی سے رقم آنا بند ہو گئی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کی معصیت

میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو کوئی انور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامریک مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامریک نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل علی الاطلاق یہ کہہ رہا تھا کہ حکومت اس کی ماں ہے۔ علی نے جی اے اے کے سر سے تیار کی اور یونیٹس سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سر زمین پر قدم رکھتے ہی مجھے بے چاروں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ انٹرپورٹ سے ایک جیسی چکر کارپن ہوئی کی جانب روانہ ہوا تو دلکشی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے کام نہ بنا دیا۔ علی کی دوست عظیم نامی توجوان سے ہوئی عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتہ لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہوئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی کی کچھ بے پروائی تھی وہ اس اطلاع ملی کہ انکس علی سلطان کا انتقال ہو گیا ہے۔ علی سناٹے میں آ گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بعض حقائق اسے تلخ ہوتے ہیں کہ انہوں نے انیس سال تک میری عہدداشت کی، مجھے پال پوس کر جوان کیا، اعلیٰ تعلیم دلائی اور جب انہیں میری ضرورت تھی تو میں ان سے ہزاروں میل دور تھا۔ افسوس..... صد افسوس کہ میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا.....“

”یہ سب قدرت کے کھیل ہیں علی۔“ وہ میری دل جوئی کرتے ہوئے بولے۔ ”تم خود کو سنہیا کے لی کوشش کرو۔ سب کی باریاں لگی ہوئی ہیں۔ اپنی اپنی باری پر ایک

ان لمحات میں میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ مرزا عامر بیگ نے انکل سلطان کی موت کی خبر سنا کر مجھے دہلا دیا تھا۔ اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ ہر ذی روح کو ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن میں چونکہ انکل کے حوالے سے اس قسم کی صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے ان کی ذمہ داریاں کر سنانے میں آ گیا تھا۔ چند لمحات تک میں ہنگامہ مہرہ کر رہ گیا۔ بین ممکن تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے اسی کیفیت کا ہو کر رہ جاتا کہ عامر بیگ کی آواز نے مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس دلادیا۔

ہو گئے ہو۔“ وہ دھمکے ہوئے لہجہ میں بولے۔ ”قدرت کا کیا عجیب اور نازا اٹھیل ہے علی! جس ماں نے تمہیں جنم دیا، تم انیس سال تک اس سے ہزاروں کلومیٹر دور رہنے پر مجبور ہو گئے اور جس مہربان شخص نے انیس سال تک تمہیں ماں اور باپ دونوں ہستیاں کا پیارا دیا، اس کے آخری وقت میں قدرت نے تمہیں ہزاروں کلومیٹر دور پہنچا دیا۔“

”واقعی..... قدرت کی مصلحتوں کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اس مہربان شخص کے ایک ایک احسان کو زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”اوہ مائی گاڈ.....!“ میں نے دکھتے دل کے ساتھ کہا۔ ”کاش زندگی کے آخری لمحات میں، میں ان کے

تم پر جو احسان کیا ہے، اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ وہ معتدل انداز میں بولے۔

”میں سمجھا ہوں انکل۔“ میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ آپ کا اشارہ کس احسان کی طرف ہے؟“

”تم جانتے ہو نا، پچھلے انیس سال سے تمہاری والدہ ہر ماہ ایک مخصوص رقم مجھے بھیجتی رہی ہیں؟“ انہوں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

میں نے جواب دیا۔ ”جی، مجھے یہ حقیقت معلوم ہو چکی ہے۔“

”یہ مخصوص رقم میرے ذریعے علی سلطان تک پہنچ جاتی تھی۔“ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

”علی سلطان اس رقم کو تمہاری دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت پر خرچ کرتا تھا۔ اس نے تمہارا اتنا خیال رکھا جتنا سگے ماں باپ بھی اپنی اولاد کا نہیں رکھ سکتے۔ انہوں نے ایک مشفق باپ اور ایک مہربان ماں بن کر تمہاری پرورش کی لیکن تمہاری شناخت کو مخفی نہیں ہونے دیا۔ تم اپنے ڈاکیومنٹس کا جائزہ لو تو پھر پیر ولیدت کے خانے میں تمہیں اپنے اصلی والد حیدر علی کا نام لکھا نظر آئے گا اور تمہاری لائف ہسٹری ریکارڈ میں یہ بھی درج ہے کہ تمہاری پیدائش کے فوراً بعد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں تمہارے والد حیدر علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد علی سلطان نے تمہاری پرورش کا ذمہ اٹھالیا تھا۔“

”جی۔ یہ ساری باتیں مجھے معلوم ہو گئی ہیں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے انکل سلطان کی موت کے بعد کے کسی احسان کی جو بات کی ہے، ذرا اس کے بارے میں بتائیں؟“

”علی سلطان نے انیس سال تک تمہارا جو خیال رکھا، اس کے حوالے سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کام کے لیے تمہاری والدہ اسے ایک معقول معاوضہ دیا کرتی تھیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”لیکن اپنی موت کے بعد وہ تمہارے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئے ہیں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ اس مجموعی رقم سے کہیں زیادہ ہے جو پچھلے انیس سال میں تمہاری والدہ نے ان کے لیے بھیجی تھی۔“

”میں..... سمجھا نہیں.....؟“ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

”وہ اپنی تمام جائداد، بینک بیلنس، مختلف مالیاتی

اداروں میں کی گئی لاکھوں ڈالرز کی انویسٹ منٹ..... الغرض، اپنی ایک ایک چیز جس میں تمہیں فنی پرسنٹ کا وارث بنائے گئے ہیں۔ میں نے ان کے لیگل ایڈوائزر سے ملاقات کی تھی۔ ویل صاحب نے مجھے علی سلطان کی ول (وصیت) دکھائی تھی۔ میں نے ان کی وصیت کو بڑی تفصیل سے پڑھا ہے۔ اس ول کے مطابق، علی سلطان کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کے فنی پرسنٹ کے تم اور فنی پرسنٹ کی فنی وارث ہے۔ جب تم واپس امریکا آؤ گے تو اس وصیت کے مطابق، ایک لیگل پروسس کے بعد تمہیں اور فنی کو تمہارا حق مل جائے گا۔“ لکھائی تو تفت کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری واپسی کی کب تک امید رکھی جائے؟“

”میں ایک ماہ کے اندر واپس آ رہا ہوں۔“ میں نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔ ”عید الفطر ان شاء اللہ آپ کے ساتھ مناؤں گا اور میں اپنی والدہ کو بھی لے کر آ رہا ہوں۔“

”ویری گڈ.....“ وہ سر اٹھنے والے انداز میں بولے پھر کہا۔ ”ذرا اپنی والدہ سے میری بات کراؤ۔“

میں نے سیل فون ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بیگ صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

آئندہ پانچ منٹ تک ماں نے مرزا عامر بیگ سے سیل فون ملاقات کی۔ ان کی گفتگو میں انکل علی سلطان کی موت پر اظہارِ افسوس اور دیگر باتوں کے علاوہ ماں کے امریکا جانے کا ذکر بھی شامل تھا۔ جب ماں نے سیل فون مجھے واپس کیا تو انکل عامر بیگ نے کہا۔

”تمہاری والدہ نے بتایا ہے کہ تم علی سلطان کو میزبان بنا کر اپنی ماں کو مہمان کی حیثیت سے امریکا لانا چاہتے تھے؟“

”جی انکل.....“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔

”میری بہی ہاؤس تک بھی لیکن انکل علی سلطان کو مالک نے اس منصوبے کی تکمیل سے پہلے ہی اپنے پاس بلا لیا۔“

”اس لیے مجھے بھی قدرت کی کوئی منطق پوشیدہ ہوئی۔“ وہ کہہ کر ہنسی سے بولے۔ ”تم پریشان نہ ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے رفرنس سے اپنی والدہ کو اپنا کر آجائیں۔ ان ماں کا رشتہ ظاہر نہیں کرنا۔ اگر تم انہیں اپنی آئی یا لائی بی بی کی فریڈ شوکر کے تو بہ آسانی تمہاری والدہ کو مل جائے گا۔ سہمی کی بات ہے۔ تم اپنے عزیز و اقارب کو پاکستان گئے تھے اور وہیں پر تمہاری والدہ.....“

تم انہیں اپنی ذمہ داری پر امریکا لے جانا چاہتے ہو۔ دیش آل.....“ وہ لمبے بھر کو سوتف ہوئے پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

”ڈنٹ ویزا کے حصول کے لیے تمہارا رفرنس ہی کافی ہوگا۔ باقی جہاں تک اسلیم کا معاملہ ہے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں۔“

آپ کی جیب میں پیسا ہوا اور آپ کو راستہ معلوم ہوتا چاہیے، بس پھر کوئی کام کر سکتا نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”جی انکل! میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔ بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی۔“

”ان شاء اللہ.....!“ وہ مضبوط لہجے میں بولے۔

”علی سلطان والے گھر کو لاک کر دیا گیا ہے۔ گھریلو ملازمہ ایملی کو بھی فارغ کر دیا گیا ہے۔ اگر تم وہاں فون کرو گے تو تمہیں جواب نہیں ملے گا۔ تمہیں جو بھی کام ہو، ڈائریکٹ مجھ سے رابطہ کرنا۔“

”ٹھیک ہے انکل۔“ میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ”میں ایسا ہی کروں گا۔“

الوداعی کلمات کے بعد ہمارے بیچ سیل فون رابطہ موقوف ہو گیا۔

میں نے سیل فون کو ایک طرف صوفے پر رکھا اور غمگین نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی کافی افسردہ نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”علی سلطان کی موت کا مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ اس شخص کے احسانات کو ہم زندگی بھر نہیں اتار سکتے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔“

”آمین.....!“ میں نے تیز دل سے کہا پھر دل میں کہنے لگا۔ ”ماں! میں آپ کو بچ بتا رہا ہوں کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں، یہ انکل کی محنت اور کوشش کا ثمر ہے۔ ان انیس سالوں میں انہوں نے مجھے ماں کی محبت میں پیدا دی اور نہ باپ کی محرومی۔ ایسے عظیم لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی میں تو انہوں نے مجھے اپنی سچی اولاد سے بھی بڑھ کر قابل توجہ سمجھا ہی تھا، موت کے بعد تو وہ مجھ پر اتنا بڑا احسان کر گئے ہیں کہ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”موت کے بعد احسان عظیم.....“ ماں نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ماں کو

انکل بیگ سے حاصل ہونے والی ان معلومات سے آگاہ کیا جن کے مطابق، انکل سلطان نے مجھے اپنی آدمی جائداد کا وارث قرار دیا تھا اور یہ کوئی زبانی کلامی بات نہیں تھی بلکہ ایک ول (وصیت) کے ذریعے انکل نے اپنے تمام مال و جائداد کو مجھ میں اور اپنی بیٹی فنی میں برابر تقسیم کر دیا تھا۔

”واقعی..... یہ تو بڑے دل گردے اور اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے۔“ ماں نے میری بات کے جواب میں کہا۔ ”علی سلطان نے تمہیں اپنی سچی بیٹی کے برابر سمجھا یعنی تمہیں سگی اولاد کا درجہ دیا۔“

”ماں! میرا انکل سلطان کے ساتھ انیس سال کا ساتھ رہا ہے۔“ میں نے ایک طویل پوچھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”انکل نے ایک لمبے کے لیے بھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی سگی اولاد نہیں ہوں اور وہ میرے لیے ایک کینئر ٹیکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فنی ان کی سگی اولاد ہے لیکن اس کے ساتھ انکل کی وہ جذباتی وابستگی دیکھنے میں نہیں آتی جو میرے ساتھ تھی۔ ان کی موت میرے لیے ایک گہرا ذہنی اور قلبی صدمہ ہے۔“

”ایسا ہوتا بھی چاہیے میرے لعل۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”میں تو ان کے لیے مغفرت کی دعا ہی کر سکتی ہوں۔ اللہ ان کی اگلی منازل آسان فرمائے۔“

”آمین.....!“ میں نے خلوص دل سے کہا۔

ماں نے پوچھا۔ ”اپنی بیٹی فنی کے ساتھ علی سلطان کا ایسا کیا اختلاف تھا جو وہ اس لڑکی سے دور رہتے تھے؟“

”کوئی اختلاف نہیں تھا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انکل، فنی سے نہیں بلکہ فنی، انکل سے دور رہتی تھی۔“

”اس کا کوئی خاص سبب تھا؟“ ماں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

”میں سمجھتا ہوں، اس کے دو بنیادی اسباب تھے۔“ میں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں ماں کو بتایا۔ ”ایک سبب تو فنی کی ماں بھی اور دوسرا سبب خود فنی۔“

”وہ کس طرح؟“ ماں نے سوال کیا۔

”انکل علی سلطان نے امریکی ریاست اوٹاہ میں ایک عیسائی عورت رینا میکڈالین سے شادی کر لی تھی۔ یہ لوگ سالٹ لیک سٹی میں رہتے تھے۔ فنی وہیں پر پیدا ہوئی تھی۔ انکل نے اس بیٹی کا نام آئنڈرکٹا جاپا لیکن رینا کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا نام فنی رکھے۔ میاں بیوی میں زیادہ جیتی نہیں تھی لہذا ایک روز دونوں نے اپنی زندگی کے راستے الگ

ہے لیکن انسان اس وقت اللہ کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے جب دوسرے انسانی سہارے اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، وہ دنیا کی بھیڑ میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ میری زندگی کے تجربے نے مجھے بتایا اور سکھایا ہے کہ بے یار و مددگار اور تنہا انسان اللہ کے بہت زیادہ نزدیک ہوتا ہے..... اتنا قریب کہ اللہ اسے اپنے اندر محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں ایسی کیفیات سے گزری ہوں اس لیے بڑے دُشوک کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں۔“

”مجھے خود بھی مالک کے قرب کے کئی تجربات ہو چکے ہیں۔“ میں نے ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
”اس لیے میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔“

”علیٰ! بتا، میں نے ابھی ابھی کیا سوچا ہے؟“
”مجھے نہیں معلوم تھا اس لیے کہا۔“ نہیں ماں!.....“
”میں نے تھوڑی دیر پہلے ایک فیصلہ کیا ہے..... ایک حتمی فیصلہ۔“ وہ محسوس لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔
”یہ تو بات طے ہو گئی کہ میں تمہارے ساتھ امریکا جا رہی ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے میں اپنا بنگلا، گاڑی، جیولری اور تمام قیمتی اشیاء فروخت کر دوں گی۔“

”گڈ! یہ تو آپ کو کرنا ہی ہوگا کیونکہ یہاں سے جانا ہے تو پھر واپس نہیں آنا۔“ میں نے بدستور ان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے جو حتمی فیصلہ کیا ہے اس کا تعلق اس کے علاوہ کسی اور ضمن سے بھی ہے۔ آپ اتنا پیسا ساتھ لے کر تو امریکا نہیں جائیں گی۔“

”تم نے کسی حد تک میرے منصوبے کو سمجھ لیا ہے۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ ”امریکا روانہ ہوتے وقت میں اپنے پاس صرف ”شونی“ کے لیے دو تین ہزار ڈالر رکھوں گی۔“

ماں نے بات ادھوری کی تھی لہذا میں پوچھنے بنا نہ رہ سکا۔ ”اب یہ بھی بتادیں کہ باقی کے کروڑوں روپے کا آپ کیا کریں گی؟“ شونی کی رقم پر تو صرف دو تین لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔“

”میں اپنی تمام رقم سے کراچی میں ایک ٹرسٹ قائم کروں گی اور اس ٹرسٹ کا نام ہوگا..... حیدر علی ٹرسٹ۔“ انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا۔ ”مذکورہ ٹرسٹ فلاحی کام کرے گا جس سے دینی انسانیت کی مدد اور خدمت کی جائے گی۔“

کر لیے۔ اس رساکشی کے نتیجے میں بچی ماں کے حصے میں آئی۔ بعد ازاں ریٹا، بیٹی کو لے کر لاس اینجلس چلی گئی اور انکل بھی اوناٹا چھوڑ کر ٹیکساس آگئے اور رہائش کے لیے ”بے سٹی“ کا انتخاب کیا۔ بچی چونکہ ریٹا کے پاس رہی تھی اس لیے وہ بھی بھی آسنہ بن سکی۔ دنیا کے سامنے وہ لُٹنی کی شناخت کے ساتھ ابھری۔ یہ تو سب ہو گیا ریٹا کا۔ اب میں لُٹنی کی طرف آتا ہوں.....“ میں نے لُٹنی کی توقع کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لُٹنی نے باپ کے سامنے سے محروم رہ کر ماں کی معیت میں اپنی زندگی کو آگے بڑھایا۔ میں یہ بات مانتا ہوں کہ لُٹنی کو زندگی کی راہ گزر پر بڑا ٹھٹ ٹاٹ ملا تھا اور اس نے جان تو زحمت کی تھی۔ اس کا رسلسل نے اسے ایک دن ایک نمایاں مقام دلادیا۔ اس وقت وہ ایک معروف نیوز چینل ”فوکس نیوز“ میں کام کر رہی ہے۔ وہ ایک اہم عہدے پر فائز ہے اور پچیس ہزار ڈالر ماہانہ کماتی ہے۔ اس کی جانب اتنی تھکا دینے والی ہے کہ اسے کسی اور طرف دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ انکل سلطان سے زیادہ راہ و رسم اس لیے بھی نہیں رکھتی کہ ظاہر ہے، ماں نے اس کے ذہن میں باپ کا ٹیکلیو ایجنٹ بنا رکھا تھا۔ خیر، اب تو ریٹا اس دنیا میں باقی نہیں رہی۔ کچھ عرصہ پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا اور.....“

”اور کیا؟“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو ماں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔
”انکل بھی دنیا چھوڑ کر چلے گئے.....“ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”اس دنیا کا یہی دستور ہے میرے بچے۔“ ماں نے میری دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔ ذرا تصور کرو..... جب تمہارے باپ کو لُٹ کر دیا گیا تھا تو میں نے خود کو کس طرح سنبھالا ہوگا.....؟“

”میں تصور کر سکتا ہوں..... اندازہ لگا سکتا ہوں۔“ میں نے گھبرائے انداز میں کہا۔ ”میں آپ کی ہمت، جرأت اور حوصلے کو سلیوٹ کرتا ہوں ماں۔ میں تو اس دکھ کے موقع پر اس وقت اپنی ماں سے چدفٹ کی دوری پر بیٹھا ہوا ہوں اور ادھر گیارہ ہزار سات سو کلومیٹر کے فاصلے پر نیویارک میں موجود مرزا عامر بیگ بھی میری دل جوئی میں مصروف ہیں اور آپ..... آپ تو تنہا ہیں.....!“

”میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا میرے لعل۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ”اللہ تو ہر وقت انسان کے قریب ہے۔ اسے انسان کی شہرگ سے بھی زیادہ نزدیک بتایا جاتا

ماں کی موجودگی میں آگے بڑھے تھے۔ یہ خاصی اہم پیش رفت تھی۔ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے میں نے کہا۔
”انکل! ماں نے اس مذموم راستے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے اور وہ میرے ساتھ امریکا جانے کے لیے راضی ہوئی ہیں مگر ویزا پر دس مہینے میں تین سے چار ہفتے تک کے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ اس دوران میں ماں اس ہنگامے میں رہیں۔ میں انہیں کسی ایسے مقام پر شفٹ کرنا چاہتا ہوں جہاں ماضی کی کوئی یاد ان کا تعاقب نہ کر سکے، کوئی جاننے والا ان سے رابطہ نہ کر سکے۔“

”یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے میری جان۔“ وہ بڑی محبت سے بولے۔ ”اسلام آباد میں میرا ایک گھر خالی پڑا ہے، لاہور کی شادمان کالونی میں بھی کوئی کا بندوبست کیا جاسکتا ہے اور کراچی تو ہے ہی اپنا شہر یہاں بھی عارضی طور پر کرائے پر اپارٹمنٹ حاصل کر کے تمہاری والدہ کی رہائش کا انتظام کیا جاسکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا مسئلہ کا حل نہیں۔“

”پھر.....“ میں نے متذبذب نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی نظر میں اس مسئلہ کا پائدار حل کیا ہے؟“
”اگر اچانک تمہاری والدہ منظر سے غائب ہو گئیں تو ان کی دنیا میں شستی خیز افراتفری پھیل جائے گی۔ میں اس دنیا کا ذکر کر رہا ہوں جسے وہ خیر باد کہہ چکی ہیں مگر انہوں نے اس انقلابی فیصلے کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا لہذا ان سے متعلق ہر شخص کا تشویش میں مبتلا ہو جانا، اس تشویش کے نتیجے میں ادھر ادھر کرک سوئیاں لینا اور کچھ کچھ نہ آنے کے بعد ٹانگ ٹوٹیاں مارنا اور ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہونا ایک فطری عمل ہوگا۔“ انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”لہذا میں تو یہی تجویز کروں گا کہ انہیں اسی ہنگامے میں رہنے دو اور تم ان کے ویزا کے پروسس میں لگ جاؤ۔ چند روز کی بات ہے۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب انہیں امریکا کا ویزا مل جائے گا تو چپ چاپ دونوں ماں بیٹا یہاں سے پرواز کر جانا اور اگر ضرورت محسوس کرو تو اپنے دوست کو بھی ساتھ لے جانا۔“

ان کا اشارہ عظیم کی جانب تھا۔ میں نے ان کی بات پوری توجہ سے سنی اور ان کے خاموش ہونے پر کہا۔
”آپ کا مشورہ دل کو لگ رہا ہے لیکن چند ایڈیٹوز بھی ہیں.....!“

”مشکاٹوں سے ایڈیٹوز ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔
”ماں اپنا بنگلا، گاڑی اور ہر قیمتی چیز کو فروخت کر کے

اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہو سکیں گی۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کو کہاں جانا ہے انکل؟ تو انہوں نے جلدی سے سچھلے ہوئے کہا تھا..... ارے کہیں نہیں میرے بچے! میرا مطلب یہ تھا کہ تمہاری ماں کا سراغ مل گیا۔ یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس خوش خبری نے مجھے بہت سکون بخشا ہے۔ میرا اندرونِ شناخت ہو گیا ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میں کتنا خوش اور مطمئن ہوں۔ میرے اللہ نے کرم کیا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔“ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمبائی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”گویا آپ کا سراغ مل جانا ان کی نظر میں میری کامیابی تھی اور میری کامیابی ان کے لیے بے پناہ خوشی کا باعث تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ماں بیٹے کی ملاقات کے انتظار میں زندہ تھے۔ ادھر یہ کام یا یہ تکمیل کو پہنچا، ادھر انکل سلطان کی آنکھ بند ہو گئی.....“
”بعض انسانوں کے اندر بڑی نیک اور پاکیزہ روح ہوتی ہے۔“ ماں نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”علی سلطان بھی ایک ایسے ہی انسان تھے۔“
میں اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں اس وقت حفیظ کپور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہماری یہ ملاقات کپور صاحب کے بیڈروم میں جاری تھی۔ ہم دونوں کے سوا اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ عظیم ٹھیک آٹھ بجے مجھے لینے ماں کے ہنگامے پر پہنچ گیا تھا اور مجھے اپنے گھر پہنچانے کے بعد اس نے مجھے اپنے پاپا کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ خود کسی کام سے نکل گیا تھا۔

”بیٹا جی! مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔“ حفیظ کپور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم میرے بیٹوں کی طرح ہو۔ عظیم نے تمہارے ایشو کے بارے میں مجھے پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا ہے۔ میں تمہاری والدہ کے ماضی اور حال سے اچھی طرح آگاہ ہو گیا ہوں اور ان کی مشکلات کو میں نے خاطر خواہ سمجھ بھی لیا ہے۔ اب تم مجھے وہ باتیں بھی کھل کر بتا دو جو یہاں سے جانے کے بعد تمہاری والدہ سے ہوئی ہیں۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بس اہم پوائنٹس بتا دو تاکہ میں تمہیں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔“ بات کے اختتام پر انہوں نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا تو میں نے انہیں ان معاملات سے اپ ڈیٹ کر دیا جو

نے انہیں یہ خوشخبری سنائی تھی کہ مجھے آپ کی تلاش والے کام میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ جواب میں پتا ہے، انہوں نے کیا کہا تھا.....؟“
”مجھے نہیں معلوم۔ تم بتاؤ.....“ ماں گہری دلچسپی سے مجھ سے رہی تھیں۔

”انہوں نے سمجھ کر آواز میں کہا تھا.....“ میں نے بتایا۔ ”میں مطمئن ہو گیا میرے بچے! میرا مشن پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں کوئی بھی غلش باقی نہیں ہے۔ میں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہو سکیں گی۔“
”اوہ.....“ ماں نے ایک پوچھل سانس خارج کی اور کہا۔ ”علی سلطان کی رخصت ہو سکوں گا؟“ والی بات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جان گئے تھے کہ اب ان کی زندگی کا اختتام ہونے والا ہے۔“

”انکل دے کے مریض تھے۔“ میں اپنی ہی دھن میں یوں چلا گیا۔ ”ایک روڈ ایکسیڈنٹ نے ان کے جسم کے زیریں حصے کو بری طرح مفلوج کر دیا تھا۔ وہ وہیل چیئر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے لیکن میں نے بھی انہیں یا پوسی کی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ ان کی بات چیت میں بھی موت کا تذکرہ نہیں ہوا لیکن اس رات مجھ سے ہونے والی سیلوگ گفتگو میں انہوں نے اپنے مشن کی تکمیل کا ذکر کیا اور کہا کہ اب وہ بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ رخصت ہو سکیں گے۔ گویا وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ہی اب تک زندہ تھے اور ان کا مشن تھا..... مجھے آپ تک یہ حفاظت پہنچانا.....“ میں رو ہنسا ہو گیا۔ ”ماں! آپ انکل کی موت کے وقت پر تو ذرا غور کریں.....“

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا تو ماں نے اپنی زبان سے ایک لفظ انہیں کیا۔ وہ یک دم مجھے دیمتھی چلی گئیں۔ انکل سلطان کی موت نے انہیں بھی دل گرفتہ کر دیا تھا۔
”انکل عامر بیگ نے مجھے بتایا ہے کہ انکل سلطان کی موت بے سنی کے وقت کے مطابق، ہفتہ اٹھائیس جون صبح ساڑھے دس بجے واقع ہوئی تھی۔ یہ وہی لمحات تھے جب کراچی میں ہفتہ اٹھائیس جون کی رات کے ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ میں گزشتہ رات کی بات کر رہا ہوں جب عظیم کے گھر میں ہماری پہلی ملاقات جاری تھی تو انکل سلطان کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اب آپ ان کے الفاظ کی صداقت کو چیک کریں۔ انہوں نے کہا تھا..... میں مطمئن ہو گیا میرے بچے۔ میرا مشن پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں کوئی غلش باقی نہیں ہے۔ میں بڑے

”بہت ہی عمدہ اور نیک ارادہ ہے۔“ میں نے سناٹی نظر سے ماں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ تو میرے ساتھ چند روز کے بعد امریکا چلی جائیں گی۔ اس ٹرسٹ کے قیام کا کام کون کرے گا اور آگے اسے چلانے کا کون، آپ نے تو ساری زندگی امریکا میں گزارنا ہے؟“
”اس کام کے لیے میرے ذہن میں صرف ایک ہی نام ہے۔“ وہ پُرسوز انداز میں بولیں۔
”میں نے پوچھا۔“ کون ہے وہ؟“
”نادر شاہ۔“ انہوں نے بتایا۔

”اچھا..... وہی شخص جس سے آپ کل مجھے ملوانے والی ہیں؟“ میں نے چنکے ہوئے لہجے میں کہا۔
”ہاں..... بالکل وہی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نادر شاہ پر بہت زیادہ اعتماد کر رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔
انہوں نے منہ پر ہونے لگے میں کہا۔ ”یہ شخص میرے لیے قابلِ بھروسہ ہے۔ نادر شاہ نے بعض نازک مواقع پر میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے اس مشن کو بھی پایہ تکمیل تک پہنچائے گا۔“
”اگر آپ کو یقین ہے۔ تو پھر میں بھی یہی امید رکھتا ہوں ماں۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”یہ آپ کا نیک مشن ہے۔ اس ٹرسٹ کے ذریعے میرے باپ کا نام بھی زندہ رہے گا اور اس معاشرے کے پے ہوئے ضرورت مند افراد کی دادرسی بھی ہوتی رہے گی۔ میری دعا ہے کہ نادر شاہ آپ کی توقعات پر پورا اترے۔“
”آمین.....!“ وہ بڑے وثوق سے بولیں۔
”انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔“

ہمارے درمیان ایک مرتبہ پھر انکل سلطان کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ میں نے کہا۔
”مجھے لگتا ہے، انکل کو اپنی موت کی پہلی خبر ہو گئی تھی۔“
”یہ بات تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟“ ماں نے سوال کیا۔
”ان سے ہونے والی میری آخری گفتگو کی بنا پر۔“

میں نے جواب دیا۔
”اس گفتگو میں ایسی کیا خاص بات تھی؟“
”انکل سلطان سے آخری بار میں نے اٹھائیس جون کو رات ایک بجے فون پر بات کی تھی۔ بے سنی (نیکلاس) میں اس وقت ساٹھائیس جون کی سہ پہر کے تین بجے تھے۔“ میں نے مجھے ہوئے لہجے میں یوں شروع کیا۔ ”میں

معنی خیر انداز میں کہا۔

”اسد بھائی! میری یہاں کی جاب بھی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے،“ مصطفیٰ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں نے کینیڈا کی بہت تعریف سنی ہے۔ فی الحال، میں وزٹ ویزا پر وہاں جانا چاہتا ہوں۔ مہینہ بھر کینیڈا میں رک کر وہاں کی زندگی کا مشاہدہ کروں گا۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ میں وہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر سکتا ہوں تو پھر مستقل قیام کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کی سوچ بڑی مثبت اور معقول ہے۔ کینیڈا دنیا کے چھ بہترین ملکوں میں پہلے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔“

”برو! یہ چھ ملک کون کون سے ہیں؟“ عظیم نے پوچھا۔ ”نمبر ایک، کینیڈا، نمبر دو، آسٹریلیا، نمبر تین، نیوزی لینڈ، نمبر چار، امریکا، نمبر پانچ، جرمنی، نمبر چھ، سویٹزرلینڈ..... کیا آپ کینیڈا کے نمبروں ہونے کا راز جانتا چاہتے ہیں؟“

”جی..... بالکل..... ضرور.....“

”کینیڈا میں صرف کہنے کی حد تک نہیں بلکہ عملاً بھی مرد اور عورت کو زندگی کے ہر شعبے میں یکساں حقوق اور ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ اس کی بہترین مثال وہاں کی گورنمنٹ ہے۔ ان کے ہاں جتنی بھی وزارتیں ہیں ان میں آدمی خواتین کے پاس اور آدمی حضرات کے پاس ہیں اور سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہ ہر وزیر اپنے شعبے کا اسپیشلسٹ ہے۔“

”زبردست.....!“ مصطفیٰ نے پُر جوش انداز میں کہا۔ ”بس بھی، میں تو کینیڈا ہی جاؤں گا۔ بھائی، آپ یہ بتائیں کہ کینیڈا کے ویزا کے لیے سب سے ضروری چیز کیا ہے؟“

”انوی ٹیشن۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”جب تک کینیڈا کا کوئی سٹیزن آپ کو کینیڈا آنے کی دعوت نہ دے، کینیڈا کی ایجنسی آپ کو وزٹ ویزا جاری نہیں کرتی۔ دیگر چھوٹی موٹی فارملٹیٹیز اس کے علاوہ ہیں۔ امریکا کے ویزا کے لیے سب سے اہم آپ کا پولیس کونسلٹ میں لیا جانے والا انٹرویو ہے، باقی سب چیزیں ثانوی اہمیت کی حامل ہیں۔ اگر آپ نے انہیں مطمئن کر دیا تو سمجھ لیں کہ آپ کو ویزا مل گیا۔“

”کیا کینیڈا کے ویزا کے لیے بھی انٹرویو ہوتا ہے؟“ مصطفیٰ نے استفسار کیا۔

نے کہا۔

”جیسے رومیو میری جان۔“ وہ زندہ دلی سے بولے پھر کہا۔ ”میں اب آرام کروں گا۔ تم عظیم اور علی کے ساتھ تھوڑا وقت گزار کر اپنی ماں کے پاس چلے جانا پھر سلی کی صاحبہ جوبھی فیصلہ کریں، مجھے اس سے آگاہ کر دینا۔ اللہ خیر کرے گا۔“

”ان شاء اللہ!“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں عظیم، علی اور ان کے کزن مصطفیٰ کے ساتھ ہنگلے کے باہر بیٹھنا چیت کر رہا تھا۔ عظیم جو مجھے یہاں پہنچانے کے بعد ہمیں غائب ہو گیا تھا، اب حاضر تھا اور سرگرمیٹ نوشی سے دل پشوری کر رہا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ سرگرمیٹ کی تلاش میں ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ مصطفیٰ سے میرا تعارف کرایا گیا۔

مصطفیٰ، ارباب کا بھائی تھا۔ ارباب سے میری ایک مختصر سی ملاقات ہو چکی تھی جب میں نے کراچی میں قدم رکھا تھا اور نیکی ڈرائیور نے مجھے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ چند روز پہلے یہی نیکی ڈرائیور، جرمنی سے آنے والی ارباب کی بھوپتی کو لوٹ چکا تھا۔ عظیم اور ارباب کی بروقت آمد نے مجھے سسکی ڈرائیور کے ہاتھوں لٹنے سے بچالیا تھا۔ ارباب کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا اور وہ انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ عظیم کی زبانی معلوم ہوا کہ مصطفیٰ ایک تجربہ کار شیف تھا۔ وہ دیسی اور بدلی ہر قسم کے کھانے بنانے کا ماہر تھا۔ مصطفیٰ کا انداز بڑا ذھیلا ڈھالا اور وزن نارمل رینج سے متجاوز تھا۔ یہی محسوس ہوتا تھا کہ اسے کھانا پکانے سے زیادہ کھانا کھانے کا شوق تھا۔ وہ اگرچہ ایک بیوی ڈیوٹی انسان تھا تاہم وہ علی کپور سے آدھا تھا۔ مصطفیٰ کو کینیڈا جانے کا شوق چڑھا ہوا تھا۔

”برو! میں دراصل مصطفیٰ ہی کے لیے تم سے کینیڈا کی معلومات حاصل کر رہا تھا۔“ عظیم نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ، کیا شیف کے لیے وہاں کوئی اسکوپ ہے؟“

”ایک اچھے شیف کی دنیا کے ہر ملک میں بڑی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور کینیڈا میں بھی یقیناً اس پیشے کے لیے بہت اسکوپ ہے لیکن آدمی اپنے کام کا ماہر ہونا چاہیے۔“ ”آپ اس کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ یہ کراچی اور اسلام آباد کے بعض معروف ہوٹلوں میں کام کر چکا ہے۔“ عظیم نے بتایا۔ ”اس نے شیف کا کورس بھی ایک انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ سے کیا تھا اور اب اسے کینیڈا کا بخار چڑھا ہوا ہے۔“

”یہ کافی دلچسپ اور پُرکشش بخار ہے۔“ میں نے

میں ان کے ساتھ آزادانہ گھوموں پھروں گا تو میری جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس شہر میں ان کے دشمن موجود ہیں۔ انہی لوگوں نے میرے والد کو بھی قتل کیا تھا اسی لیے.....“ میں نے لہجائی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ چاہ رہا تھا کہ اپنی ماں کو چند دن کے لیے کسی ایسی جگہ پر منتقل کر دوں جہاں ان کے کسی دشمن اور کسی دوست کی رسائی نہ ہوتا کہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی معیت میں رہ سکوں۔ میں انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا اور یقیناً ان کی بھی یہی خواہش ہے۔“

”اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔“ وہ دوستانہ لہجے میں بولے۔ ”میں نے تین آپشنز تمہیں بتا دیے ہیں..... اس کے علاوہ چوتھا آپشن بھی موجود ہے۔“ انہوں نے ایک لمحے کو رک کر ڈرامائی انداز میں میری طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میرے گھر کا اوپر والا پورشن بھی خالی پڑا ہے۔ مہرالنسا کی واپسی کا کچھ پتا نہیں۔ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ ہوتی ہے تو پھر شوہر، بچے..... سب کو بھول جاتی ہے۔ مجھے نہیں امید کہ وہ عید سے پہلے واپس آئے۔ تم ماں بیٹے کے لیے میرا گھر حاضر ہے۔ امریکا کا ویزا ملنے کے بعد آپ لوگ رخصت ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں آج جا کر ماں سے مشورہ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”سارے آپشنز ان کے سامنے رکھتا ہوں۔ دیکھیں وہ کیا فیصلہ کرتی ہیں!“

”فیصلہ تو بہر حال انہی کو کرنا ہے۔“ کپور صاحب نے کہا۔ ”کیونکہ اپنے معاملات کو وہ زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ اس کے علاوہ تم نے اپنے اور اپنی والدہ کے جن دشمنوں کا ذکر کیا ہے، اگر تمہاری والدہ انہیں ٹیکل ڈالنے کے لیے مجھ سے کسی بھی قسم کی مدد چاہیں گی تو میں حاضر ہوں۔“ ”آپ کے پُر خلوص تعاون کا بہت شکریہ اٹھاتا ہوں۔“ میں نے منونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

وہ سمجھ انداز میں بولے۔ ”تم میرے احسان کا بدلہ اس طرح چکا سکتے ہو کہ زندگی میں جب بھی میری یاد آئے، میرے حق میں دعا کر دینا۔ دعا سے بڑھ کر کوئی اور ایسی چیز نہیں ہے جو ایک انسان کسی دوسرے انسان کو بے لوث دے سکتا ہے۔“

”آپ نے بڑی گہری بات کر دی ہے اٹھ!“ میں

میرے مرحوم والد کے نام سے ایک ویلیفیر ٹرسٹ قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ اپنی موجودہ دولت میں سے کچھ بھی ساتھ نہیں لے جاتا جانتیں۔ یہاں کی تمام تر کمائی کو وہ ایک نیک کام میں لگا کر سکھ کی سانس لیتا جاتی ہیں۔“

”تو اس میں ایٹھواں کون سی بات ہے بیٹا جی؟“ انہوں نے مستفانہ انداز میں کہا۔ ”اپنے شیخ صاحب رینل اسٹیٹ بزنس کے چیتا ہیں۔ آپ اپنی والدہ سے ہنگلے کے ڈاکٹریٹس کی فوٹو کاپی کی فائل لے لو۔ میں شیخ صاحب سے کہہ کر چند دنوں میں بہت اچھی قیمت میں ان کا بنگلا بکوا دوں گا۔ گاڑی کو کھانا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”آپ کی اس خالصانہ پیشکش کا شکریہ اٹھاتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جائداد کی فروخت کے لیے ماں کے پاس پلان ہے۔ وہ اپنے ایک دیرینہ خیر خواہ کے ہاتھ سے یہ کام کرنا چاہتی ہیں۔ اس شخص کا نام نادر شاہ ہے۔ میرے مرحوم والد کے نام سے قائم ہونے والا ٹرسٹ بھی نادر شاہ ہی کی زیر نگرانی چلے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ انہوں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری والدہ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انہیں ایک قابل اعتماد خیر خواہ میرے درندہ آج کل بھروسے کا آدمی ڈھونڈنے میں ملتا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اٹھ!“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں کل نادر شاہ سے ملاقات کروں گا۔ اگر وہ ماں کے لیے لائق اعتبار ہے تو یقیناً کوئی بھلا انسان ہی ہوگا۔“

”میری جان! تمہارے سارے معاملات تو ایک دم سیدھے نظر آ رہے ہیں۔“ کپور صاحب نے کہا۔ ”پھر کیوں پریشان دکھائی دیتے ہو؟“

”اصل پریشانی میری شکل و شہادت ہے اٹھ!“ میں نے ایک اہم نکتے کی جانب ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری شکل و شہادت کو کیا ہوا ہے؟“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ماشاء اللہ! اچھے خاصے تو ہو، شکل و صورت کی فکر تو مجھے جیسے انسان کو کرنا چاہیے۔“

میں نے ان کے اپنی ذات کے بارے میں خیالات پر کوئی تبصرہ نہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ماں نے بتایا ہے کہ میں قد کاٹھ، انداز و اطوار اور شکل و صورت میں اپنے والد کی کاپی ہوں۔ ماں کو اس بات کی فکر ہے کہ اگر

”نہیں۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”کینیڈا کا وزٹ ویزا حاصل کرنے کے لیے آپ کو یعنی کراچی والوں کو کینیڈین امبیسی نہیں جانا پڑتا۔“

”پھر.....“ عظیم نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ”پھر ویزا کیسے ملتا ہے؟“

”کینیڈا کی امبیسی اسلام آباد میں ہے۔ یہ سارا کام کوریئر سروسز کے ذریعے ہوتا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”ویزا کا اپلی کیشن فارم آپ آن لائن بھرتے ہیں۔ اس فارم کے نتیجے میں آپ کو چند روز الٹ کر دیے جاتے ہیں۔“

”پھر تو کوئی بہت ہی ٹکڑا کینیڈین ڈیوٹنٹا پڑے گا۔“ مصطفیٰ نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”جس کے انوی ٹیشن میں دم خیم ہو۔“

”ارے یار! تم انوی ٹیشن کی فکر نہ کرو۔“ عظیم، مصطفیٰ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”میں دو انوی ٹیشن منگوواؤں گا۔ ایک ٹورنٹو سے اور دوسرا وینکوور سے۔ ہم دونوں بھائی ایک ساتھ ہی جائیں گے۔“

”ان شاء اللہ.....!“ مصطفیٰ نے کہا۔

علی کو اگلی صبح اپنی بیوی زرتاش کے ساتھ راولپنڈی جانا تھا اس لیے وہ جلدی اٹھ گیا۔ زرتاش کی کسی کزن کی مکتفی تھی۔ اسی سلسلے میں وہ میاں بیوی صبح راولپنڈی جا رہے تھے۔ علی کو تو ایک ہفتے کے بعد واپس آ جانا تھا لیکن زرتاش کا عید کے بعد ہی واپس کا ارادہ تھا۔ اغلب امکان یہی نظر آ رہا تھا کہ مہر النساء بھی عید کے بعد ہی امریکا سے واپس آنے والی تھی۔ گویا اس گھر میں عید بہوؤں کے بغیر ہی گزرنے والی تھی.....!

راولپنڈی کے ذکر پر آپوں آپ میرا دھیان میڈم غریہ کی طرف چلا گیا۔ وہ میڈم غریہ جس کا تعلق راولپنڈی سے تھا اور جو کسی طرح برسوں پہلے امریکا پہنچ گئی تھی۔

اس نے امریکی ریاست کیل فورینا کے شہر سان ڈیاگو کو اپنے لیے چن لیا تھا۔ راولپنڈی میں اس کا تعلق ایک بیورو کریٹ فیملی سے تھا۔ اس نے سان ڈیاگو میں ایک کرچین مرد الفریڈ سے شادی کر لی تھی۔ یہ ساری باتیں پریسٹن ہالو والے بیٹے پر رنی آنرک باروخ لاؤ نے مجھے بتائی تھیں۔ اس نے امریکا میں بہت محنت کی اور پھر وہ سان ڈیاگو میں پام ایونیو پر واقع پراسٹور ”سین ایون“ کی فرنیچر بیئر بن گئی۔ اس کے بعد ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جو لگ بھگ میرا ہم عمر تھا پھر..... ایک روز اچانک یہ تینوں افراد غائب ہو گئے۔ رنی آنرک کی ٹیم نے انہیں

تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن بیس سال گزر جانے کے بعد بھی انہیں اس قصہ میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ رنی آنرک نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے بتایا تھا کہ انہیں جس نوجوان کی تلاش ہے، وہ غیر معمولی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ میں نے رنی کی باتوں سے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اسے شک ہے کہ میں غریہ اور الفریڈ کا بیٹا ہوں۔ میری حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہی رنی نے اپنی چلی ڈیفینڈا کو میرے پیچھے لگایا تھا لیکن میں ڈیفینڈا کی پیشکش کی ایسی کم تھی کہ وہ ڈیس سے ٹیکاس آ گیا تھا۔ اس کے بعد میری نہ تو رنی آنرک سے کوئی ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی ہسٹونوی دوشیزہ ڈیفینڈا سے سامنا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی طرف مکمل خاموشی تھی اور..... میں بدخوئی سمجھ رہا تھا کہ یہ خاموشی آگے چل کر میری زندگی میں کوئی خوفناک طوفان لانے والی تھی کیونکہ میں ان لوگوں کی طاقت اور اختیار کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر چکا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا وہ مجھے فراموش کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے میری واپسی کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ کسی بھی قیمت پر مجھے بھول نہیں سکتے تھے۔ تین ممکن تھا کہ وہ مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کوئی نیا چال بیٹنے میں مصروف ہوں.....!

”کہاں کھو گئے بھائی؟“ عظیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”کوئی یاد آ رہا ہے کیا.....!“

”ہاں یار.....“ میں نے صورت حال کو بڑے سلیقے سے سنبھالتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”کوئی بے طرح یاد آ رہا ہے۔“

عظیم نے ایک انگلی اپنی ناک پر رکھ کر اشارتی زبان میں پوچھا۔ ”ہوں.....؟“

”نہیں یار، وہ کوئی لڑکی نہیں ہے۔“ میں نے بوجھل انداز میں بتایا۔

”پھر کون ہے؟“

”میرے اکل سلطان۔“ میں نے کہا۔

”اوہ..... کیا ہوا اکل سلطان کو؟“ اس کے لہجے میں تشویش درآئی۔

”ان کی ذمہ دہ ہو گئی ہے.....“

میں نے عظیم کو اکل علی سلطان کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ اب ہمارے بیچ بہت ہی کم معاملات ڈھکے چھپے باقی بچے تھے۔ اکل سلطان کی موت کی خبر سن کر وہ اس طرح اچھلا جیسے اس نے بجلی کے ٹکے تار کو چھو لیا ہو۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”یہ کیسے ہوا..... کب ہوا.....؟“

”ہارٹ ایک.....“ میں نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ ”کل شام اس وقت انہیں جان لیوا دل کا دورہ پڑا جب میں اوپر تہارے کمرے میں ماں سے ملاقات کر رہا تھا۔“

”بہت افسوس ہوا یہ سن کر یار۔“ وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولا۔ ”اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔“

”آمین.....!“ میں نے پڑھوہ آواز میں کہا۔

مصطفیٰ نے بھی اپنا تہ بھرے لہجے میں اکل کی موت پر مجھ سے تعزیت کی۔ تھوڑی دیر تک ہم چپ چاپ سو گوار فضا میں بیٹھے رہے پھر میں نے عظیم سے کہا۔

”تم مجھے ڈراپ کر دو۔“ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

مصطفیٰ کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ جانے کی خواہش رکھتا تھا لیکن عظیم نے اس سے کہا۔

”مصطفیٰ! تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے بھائی۔“ مصطفیٰ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

عظیم نے وائٹ وٹر نکالی اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ واپسی کے سفر میں، میرے اور عظیم کے درمیان علی سلطان ہی موضوع گفتگو بنے رہے۔ ساڑھے دس بجے رات ہم ماں کے رومزد والے بیٹے پر پہنچ گئے۔ یہ وقت رخصت میں نے اس سے پوچھا۔

”اکل آفسٹون میں تمہاری کیا مصروفیات ہیں؟“

”کوئی خاص نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کوئی کام ہے تو بتاؤ.....!“

”تمہارے پاس کمپیوٹر کا پرنٹر ہے؟“

”ہاں ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور استفسار کیا۔ ”خیریت..... پرنٹر کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟“

”اکل میں ماں کا آن لائن ایپلی کیشن فارم بھرتا چاہتا ہوں۔ امریکا کے وزٹ ویزا کے لیے۔“ میں نے بتایا۔

”ان کی تصویر اور بعض دوسری چیزیں اسکین کرنا ہوں گی اور بعض چیزوں کے فوری طور پر پرنٹ بھی چاہیے ہوں گے جو میں اپنے اکاؤنٹ سے اٹھاؤں گا۔“

”کوئی مسئلہ نہیں۔ سب ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”ویری گڈ!“ میں نے سر اٹھانے والے انداز میں کہا۔

”مبارک ہو یار!“ وہ مڑٹھوٹ انداز میں بولا۔

”تمہاری والدہ امریکا جانے کے لیے تیار ہو گئی ہیں۔“

”میں نے انہیں بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے بدلے میں انہوں نے مجھ سے ایک وعدہ لیا ہے۔“

”کیسا وعدہ؟“ اس نے پوچھا۔

”انہوں نے کہا ہے کہ وہ میرے ساتھ ایک مرتبہ امریکا جائیں گی تو پھر کبھی پلٹ کر واپس نہیں آئیں گی۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے عظیم کو بتایا۔ ”مجھے وہاں ان کی مستقل رہائش کے حوالے سے تمام تر لیگل آرینجمنٹس کرنا ہوں گے۔“

”اور یہ کام یقیناً تمہارے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگا۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”لیکن پھر تمہارے مشن کا کیا ہوگا؟“

”کون سا مشن.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”اپنے باپ کے قاتلوں اور ماں کی عزت کے ہتھیاروں سے بھاری انتقام لینے کا مشن۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اگر تم اپنی والدہ کے ساتھ امریکا روانہ ہو جاؤ گے تو پھر تمہارے دشمنوں کو سزا دلوانے کا وہ اپنے عبرتناک انجام کو کیسے پہنچیں گے؟“

”یار! سچی بات تو یہ ہے کہ ان معاشرتی ناسوروں کو نیست و نابود کرنے کا بہت جی کرتا ہے۔“ میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ ”لیکن ماں نے اپنی قسم سے میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں۔“

وہ حیرت بھرے لہجے میں متفسر ہوا۔ ”کیسی قسم برد؟“

”ماں نے مجھے قسم دی ہے کہ میں کسی بھی برے شخص سے نہیں الجھوں گا۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”ان کی خواہش ہے کہ ہم دونوں ماں بیٹا جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ وہ کہتی ہیں، انہوں نے اپنا معاملہ مالک کے سپرد کر دیا ہے۔“

”برو! تمہاری ماں بڑی حوصلے والی عظیم عورت ہیں۔“ وہ شہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ورنہ انسان عموماً اپنی نفسیات کے زیر اثر موقع میسر آتے ہی اپنے دشمن سے انتقام لینے کے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دینا پختہ ایمان اور اعلیٰ طرفی کی روشن دلیل ہے۔ سلی آئی نے اپنا کیس اللہ کی عدالت میں لگا کر بات ہی ختم کر دی ہے ورنہ.....“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ ”ورنہ کیا؟“

”ورنہ یہ کہ.....“ وہ خاصے سنگین لہجے میں بولا۔ ”تم دونوں ماں بیٹا کے یہاں سے چلے جانے سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔“

اس کی بات نے مجھے الجھا دیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں پوچھنے بنا نہ رہا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ تم کون سا فرق نہ پڑنے کی بات کر رہے ہو؟“

”مطلب یہ کہ تم لوگ ادھر امریکا میں آرام سے بیٹھے رہتے اور یہاں تمہارے دشمنوں کی اینٹ سے اینٹ بھادی جاتی۔“ وہ بدستور سنگین انداز میں بولا۔ ”میرے لنگ میں ایسے لوگ ہیں جو میری آنکھ کے اشارے پر کسی بھی طرح خان کو اس دنیا سے اس دنیا میں پہنچا سکتے ہیں یا کم از کم ان کی ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتے ہیں۔“

”ایسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے دوست۔“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہاری جاں نثاری اور وفاداری پر کوئی شک نہیں لیکن ایک عام سا اصول ہے کہ جب کوئی معاملہ دنیاوی عدالت میں ہو تو پھر اس کیس پر اخلاقی اور احتیاطی تقاضوں کے پیش نظر رائے زنی سے اجتناب برتا جاتا ہے اور یہاں تو معاملہ مالک کی عدالت میں رکھا جا چکا ہے۔ اور تم جانتے ہو، قدرت کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلتی۔ ہمیں خاموش تماشا بنی بن کر قدرت کے کھیل کود دیکھنا ہوگا اور پھر مالک کی عدالت سے جو فیصلہ صادر ہو، اس پر تسلیم ختم کرنا ہوگا۔“

”میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں برادر۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اسی لیے تو میں نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ..... آئی سلی نے اپنا کیس اللہ کی عدالت میں لگا کر بات ہی ختم کر دی ہے۔“

میرے اور عظیم کے بیچ کیمسٹری کچھ ایسی میچ کر گئی تھی کہ جب ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے تھے تو شدت سے ملنے کودل چاہتا تھا اور جب مل جاتے تھے تو پھر جدا ہونے کو من نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ عظیم نے مجھے ماں کے بیٹکے پر پہنچا دیا تھا لیکن ابھی تک میں اس کی گاڑی کے اندر ہی تھا اور ہمارے مابین بات چیت جاری تھی۔ میں نے گاڑی سے نکلنے کے لیے دروازے کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا۔

”برو! جاتے جاتے ایک بات بتا دو۔“

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

”یار! تم نے کینیڈا کی مختلف وزارتوں کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ سب سچ ہے نا.....؟“

”ایک دم سنٹ پر سنٹ سچ۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کینیڈا کی تمام منسٹر اور ان پر کام کرنے والے سب پر فٹنلز ایک مکمل حقیقت ہیں۔ کینیڈین گورنمنٹ کو اپنے ملک اور اس ملک میں بسنے والے ہر شخص کے کامیاب حال اور خوشگوار مستقبل کی بڑی فکر ہے اسی لیے گورنمنٹ کے کسی بھی شعبے میں کسی تعلق یا تان پر فٹنل کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتقان حال کینیڈا کو ہمیشہ ارضی بھی کہتے ہیں۔“

”کاش! میرا ملک پاکستان بھی ایک جنت نظیر وطن بن جائے!“ وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ ”یہاں کے حالات اور معاملات کو دیکھ کر قسم سے دل کڑھتا ہے۔“

”میں تمہارے احساسات کو سمجھ سکتا ہوں یار۔“ میں نے ایک بار پھر اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔

”وقت کبھی ایک سانپیں رہتا میرے دوست۔“ میں نے ایک ٹھوس حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”امید کا دامن کسی بھی حال میں ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

”یار! کینیڈا پاکستان کے مقابلے میں کافی بڑا ملک ہے۔“ عظیم نے کہا۔ ”لیکن وہاں آبادی کے وہ مسائل نہیں ہیں جو یہاں پاکستان میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔“

”بالکل..... یہی ان کی کامیابی کا راز ہے عظیم صاحب۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”اس وقت کینیڈا کی آبادی تین کروڑ پچھن لاکھ ہے جبکہ پاکستان کی آبادی انیس کروڑ دس لاکھ ہے یعنی پاکستان آبادی کے لحاظ سے کینیڈا کے مقابلے میں ساڑھے پانچ گنا زیادہ آبادی والا ملک ہے۔ کینیڈا کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ٹورنٹو ہے۔ اس کے بعد اڈاوا کا نمبر آتا ہے جو کہ کینیڈا کا کیپٹل بھی ہے۔“

”یار! کراچی کے بارے میں تمہاری لیکولیشن کیا کہتی ہے؟“ عظیم نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ”اس وقت کراچی کی کل آبادی چوبیس ملین یعنی دو کروڑ چالیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور اس شہر کا رقبہ تین ہزار پانچ سو ستائیس مربع کلومیٹر ہے۔ کراچی دنیا کا چوتھا زیادہ آبادی والا شہر ہے۔ بس یا کچھ اور؟“

”یار! تم سائیکالوجی کے اسٹوڈنٹ ہو مگر تمہاری جغرافیہ کی تاج بہت زیادہ ہے۔“ وہ تعریفی انداز میں بولا۔

”یہ ٹھیک ہے، میں براؤن سپورٹ کالج میں علم نفسیات یعنی سائیکالوجی کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں مگر میں علم ارضیات میں بھی خصوصی دلچسپی رکھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اس لیے جیولوجی اور جیوگرافی کے معاملات پر مجھے کافی دسترس حاصل ہے۔“

وہ کل سہ پہر میں آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ میں بیٹکے میں داخل ہوا اور سیدھا ماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر ڈنر کیا پھر ہمارے درمیان حالات حاضرہ پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ میں نے ماں کو پورا صاحب سے ہونے والی میٹنگ کا احوال سنایا۔

انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ”پورا صاحب کا مشورہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے نہیں اور شفت ہونے کا رسک نہیں لینا چاہیے بلکہ اسی بیٹکے پر رہتے ہوئے اپنے معاملات کو بڑی احتیاط کے ساتھ ہینڈل کرتے ہوئے تمہارے ساتھ جلد از جلد امریکا روانہ ہو جانا چاہیے۔“

”جب تک آپ کو امریکا کا وٹ ویزا نہیں مل جاتا، ہم یہاں سے روانہ نہیں ہو سکتے کیونکہ مجھے برقیق پر آپ کو بھی ساتھ لے کر جانا ہے اور میں سمجھتا ہوں، اس پر اس میں ایک سے دو تینے لگ سکتے ہیں۔“ میں نے اپنے ذہن میں موجود خیالات ماں تک پہنچاتے ہوئے کہا۔

”کوئی حرج نہیں ہے۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ ”دو کے بجائے اگر تین تینے بھی لگ جائیں تو انتظار کیا جاسکتا ہے۔“

”بات انتظار کرنے کی نہیں ہے ماں.....!“ میں نے متذبذب انداز میں کہا۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئیں۔

”پھر کیا بات ہے؟“

”اصل مسئلہ میری شناخت کا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے بتایا ہے کہ میں اپنے والد کی کاٹی ہوں۔ آپ کے ساتھ میرا آزادانہ گھومنا پھرنا کوئی پرائیویٹ میٹنگ ہو سکتا ہے۔“

”یہ پوائنٹ میرے ذہن میں بھی ہے میرے لعل۔“ وہ محبت پاش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”اور اس سلسلے میں تم سے زیادہ..... فکر مند ہوں۔“

”ماں! آپ کے اس بیٹکے پر بھی تو لوگوں کی آمد ہوتی ہے۔“ میں نے دل کی بات کو زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

”یہاں میری موجودگی اگر راز میں نہیں رہے گی تو پھر بھی کسی وقت کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے.....!“

”میں تمہارا پوائنٹ سمجھ گئی علی۔“ وہ بڑی رمان سے بولیں۔ ”مجمعی بات تو یہ کہ اس بیٹکے پر لوگوں کی بھی بھیڑ نہیں

لگی اور نہ ہی تو اسے کسی کا آنا جانا رہا ہے۔ یہاں صرف وہی شخص آتا ہے جسے میں آنے کی اجازت دیتی ہوں اور میں صرف اسی شخص کو آنے کی اجازت دیتی ہوں جو میرے لیے قابل بھروسہ ہوتا ہے۔“ چند لمحات کا توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہاں تک رسائی حاصل کرنے والے افراد میں صرف ایک شخص ایسا ہے جس نے تمہارے والد کو دیکھا ہوا ہے لہذا صرف وہی نہیں دیکھ کر چونک سکتا ہے کیونکہ تمہاری صورت میں اسے حیدر علی کا چہرہ نظر آئے گا اور یہ شخص میرا سچا خیر خواہ ہے۔ میں اس پر رٹ کرتی ہوں۔“

ماں نے اس شخص کے حوالے سے جب ذکر کیا کہ وہ میرے والد کا صورت آشنا ہے تو میرا دھیان فوری طور پر جاوید واسطی کی طرف چلا گیا۔ انکل بیگ نے مجھے بتایا تھا کہ ماں نے آج سے انہی سال پہلے ایک سال کی عمر میں مجھے جاوید واسطی نامی ایک شخص کے ساتھ کراچی سے نیویارک بھیج دیا تھا۔ بیگ صاحب کے مطابق، جاوید واسطی میری والدہ کا خیر خواہ تھا اور وہ میرے خاندانی پس منظر سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ماں نے جب جاوید واسطی کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو واسطی نے ایک ریکورڈنگ ایجنٹ دوست کی مدد سے مجھے نیویارک سے نیویارک کے ساتھ ساتھ نیویارک پہنچانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ ابھی ماں نے اپنے کسی خیر خواہ کا تذکرہ کیا تو میرے ذہن میں جاوید واسطی کا نام جگ اٹھا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ وہ شخص نہیں ہوگا۔

”میں آپ کے ایک دیرینہ خیر خواہ کو جانتا ہوں۔“ میں نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ تو اب اس دنیا میں باقی نہیں۔“

”تم کسی کی بات کر رہے ہو میرے لعل؟“

”جاوید واسطی کی.....!“ میں نے کہا۔

”اوہ.....“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔ ”واسطی صاحب واقعی بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے ایک ایسے نازک موقع پر میری مدد کی تھی جب میرا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ خدا انہیں عرق رحمت کرے۔“ وہ مجھے بھرپور دیکھ کر پھر پھر سے ہونے لگے۔

”میں اس وقت کسی اور آدمی کا ذکر کر رہی تھی۔“

”تو پھر آپ خود ہی بتا دیں کہ وہ آدمی کون ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جو میرے والد کا صورت آشنا ہے۔“

”اس شخص کا نام ہے نادر شاہ۔“

”ان صاحب کا ذکر تو آپ دوپہر میں بھی کر چکی ہیں۔“ میں نے ماں کو یاد دلایا۔ ”اور کل آپ نادر شاہ صاحب سے میری ملاقات بھی کروانے والی ہیں۔“

”بالکل..... میں نے شاہ جی کو کل شام میں یہاں بلایا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔ ”ان سے مل کر یقیناً تمہیں خوشی ہوگی۔“ یہی ایک شخص ہے جو تمہیں دیکھ کر فوراً پہچان سکتا ہے کہ تم حیدر علی کی اولاد ہو۔ میں چونکہ شاہ جی پر اندھا اعتماد کرتی ہوں اس لیے میں نے خود ہی انہیں تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے تشویش بھری نظر سے ماں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا اس راز سے شاہ جی بھی واقف تھے کہ انیس سال پہلے آپ نے مجھے جاوید واسطی کے ذریعے کراچی سے نیو یارک بھجوا دیا تھا؟“

”نہیں!“ وہ لٹی میں گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔

”یہ راز صرف میں، جاوید واسطی، مرزا عامر بیگ اور علی سلطان ہی جانتے تھے۔ ان چار افراد میں سے دو یعنی جاوید واسطی اور علی سلطان عدم آباد روانہ ہو چکے ہیں۔ میں کراچی میں اور مرزا عامر بیگ نیو یارک میں موجود ہیں اور چند دنوں کے بعد میں بھی تمہارے ساتھ امریکا پہنچ جاؤں گی گویا..... یہ راز امریکا ہی میں محفوظ ہو جائے گا۔“

”جب نادر شاہ اس راز سے واقف نہیں ہیں تو پھر انہیں اس راز میں شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”میں نادر شاہ کو اس راز میں شریک کرنے کی بات نہیں کر رہی کہ میں نے آج سے انیس سال پہلے کسی طرح تمہیں نیو یارک بھجوا دیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ”وہ معاملہ تو اتنا خفیہ تھا کہ نادر شاہ کو اس کی کوئی خبر نہیں حتیٰ کہ وہ تو نہ جاوید واسطی کو جانتا ہے اور نہ ہی اس ریکورڈنگ ایجنٹ کو جس نے تمہیں نیو یارک پہنچایا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں تمہیں نادر شاہ سے کیوں ملوانا چاہتی ہوں.....!“

”جی بالکل.....“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس وقت میرے ذہن میں سب سے اہم بھی سوال ہے۔“

”نادر شاہ یہ بات جانتے ہیں کہ میں نے ایک بچے کو جنم دیا تھا پھر وہ بچہ کہیں گم ہو گیا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ”اس دوران میں کبھی کبھار میرے گمشدہ بچے کا ذکر لے آتے تھے اور میں ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش

ہو جاتی تھی۔ وقت دے پاؤں آگے بڑھتا گیا اور نادر شاہ اپنے اہنایت بھرے پُر غلوس رویے کے باعث میرے قریب آتے گئے۔ جیسا کہ میں نے نہیں بتایا ہے کہ بعض نازک مواقع پر انہوں نے میری بے لوث مدد بھی کی۔ نتیجتاً میں ان پر بھروسہ کرنے لگی لیکن میں نے بھی انہیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ان کے سامنے تمہارا جب بھی ذکر ہوا تو انہوں نے غلوس دل سے دعا کی کہ تم جہاں بھی ہو، اللہ تمہیں سلامت رکھے اور میری آنکھ بند ہونے سے پہلے اللہ تمہیں مجھ سے ملو دے۔ میں نے نادر شاہ کے غلوس کو بھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور میں نے ان سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جیسے ہی مجھے تمہارا کوئی سراغ ملا، میں تمہیں ان سے ضرور ملواؤں گی۔“

لحائی تو قف کر کے انہوں نے ایک طویل آسودہ سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے آج نادر شاہ کو بتایا ہے کہ مجھے تمہارا سراغ مل گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم مجھے کہاں سے ملے ہو اور اس وقت تم کہاں ہو؟ میں نے ان سے کہا کہ وہ کل شام میں میرے گھر آجائیں پھر میں انہیں تفصیل سے آگاہ کروں گی۔“

”گو یا شاہ جی یہ بات نہیں جانتے کہ میں اس وقت آپ کے پچھلے پر موجود ہوں؟“

”نہیں..... میں نے انہیں ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔“ وہ معتدل انداز میں بولیں۔ ”جب وہ یہاں آجائیں گے تو میں انہیں سر پر اندر دوں گی اور تمہاری طرف اشارہ کر کے ان سے کہوں گی..... پچھانیں، یہ کون ہے؟“

ماں نے آخری جملہ کسی معصوم بچے کے انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے کہا۔

”اور یقیناً شاہ جی مجھے پہچان لیں گے کیونکہ وہ میرے والد کے صورت آشا ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں شکل و شبہت میں اپنے والد کی کاپی ہوں۔“

”بالکل..... ایسا ہی ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”یہاں تک تو ٹھیک ہے۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”اس کے بعد آپ انہیں میرے بارے میں کیا کہانی سنائیں گی کہ میں نے یہ انیس سال کہاں گزارے؟ میں گم کیسے ہوا تھا؟ اب وہاں کیسے آیا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ..... کیا اس مرحلے پر آپ انہیں حقائق سے آگاہ کر دیں گی؟“

”ہرگز نہیں میرے بچے!“ وہ پوری قطعیت سے بولیں۔ ”جب تک میں امریکا نہیں پہنچ جاتی، تمہارے

بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ شاہ جی سے میں نے چونکہ وعدہ کر رکھا تھا اس لیے تمہاری بازی بائی کا انہیں بتانا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ ان کی تسلی کے لیے فوری طور پر رفیق صاحب والی کہانی مناسب رہے گی۔“

”رفیق صاحب والی کہانی.....!“ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں کچھ سمجھ نہیں ماں؟“

”میں نے تمہارے سامنے ٹھیکہ آئی سے تمہارا تعارف کراتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ تم میرے ایک عزیز ہو، تمہارا نام رفیق ہے اور تم ادھر جدہ میں رہتے ہو۔ تم نے ہی میرے لیے عمرے کا انتظام کیا ہے اور میں فرصت کے تمام ایام تمہارے پاس جدہ میں قیام کروں گی۔“ ماں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”نادر شاہ کو بھی میں یہی کہانی سناؤں گی مگر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے ٹھہریں پھر اپنی پلاننگ کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگیں۔

”نادر شاہ کو میں بتا چکی ہوں کہ تم مجھ مل گئے ہو۔ اب کل انہیں تم سے ملوانے کے بعد یہ اضافہ کرنا ہے کہ آج کل تم جدہ میں ہوتے ہو اور وہاں کوئی ریسٹورنٹ چلا رہے ہو۔ تم نے میرے لیے عمرے کا بندوبست کیا ہے اور میں تمہارے ساتھ میرے بھنے کے لیے سعودی عرب جا رہی ہوں۔“

”مگر شاہ جی سے یہ غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے ماں؟“ میں نے انہیں زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ ”ایک طرف آپ ان پر اندھا اعتماد کرتی ہیں اور دوسری جانب.....“ میں نے متذبذب انداز میں سرکوبی میں حرکت دی اور کہا۔ ”کیا وہ آپ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ میں انیس سال تک کہاں رہا؟ مجھے کس ظالم نے آپ سے چھینا تھا اور میں جدہ کیسے پہنچا؟ انیس سال تک میں نے آپ سے رابطہ کیوں نہیں کیا..... وغیرہ۔“

”یقیناً نادر شاہ مجھ سے یہ تمام سوالات پوچھیں گے اور انہیں مطمئن کرنے کے لیے میرے پاس مدلل جوابات بھی ہیں لیکن اس کی تفصیل میں تمہیں چند منٹ کے بعد بتاؤں گی۔ پہلے غلط بیانی والے معاملے کو طے کر دوں۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مجھ سے محو گفتگو تھیں۔

میں ان کے چہرے پر نگاہ جمائے ہمہ تن گوش بیٹھا تھا۔ وہ اپنے بیان کو دراز کرتے ہوئے بولیں۔ ”اگر میں نادر شاہ سے یہ کہوں گی کہ میں تمہارے ساتھ عمرے پر جا رہی ہوں اور اس عمرے کا سارا خرچ منٹ منٹ سے کیا ہے تو اس میں دروغ گوئی والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں واقعی

عمرے پر جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ برائی کی راہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کے بعد اللہ کے گھر میں حاضری ضروری ہے۔ میں اس مقدس کام کے اخراجات اٹھانے کی استطاعت رکھتی ہوں اور تم بھی حرم کی حیثیت سے میرے ساتھ حرم جاؤ گے اور عمرہ ادا کرو گے۔ کسی حرم کے بغیر ایلی عورت یہ کام نہیں کر سکتی۔ تم میری یہ خواہش پوری کر دو گے نا۔ میں اپنے نرپول ایجنٹ سے کہہ کر تمہارے لیے سعودیہ کے ویزا کا انتظام کر دوں گی۔“

”جہاں تک آپ کی خواہش کا معاملہ ہے تو..... بس! میں کسی بھی قیمت پر آپ کی خواہش کو رد نہیں کر سکتا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اللہ اللہ میں مسلمان ہوں اور اس نیک سعادت کے لیے حاضر بھی ہوں۔“

”خوش رہو۔“ اچھا سنو! میں نادر شاہ کو بتاؤں گی کہ ایک سال کی عمر میں تمہیں اغوا کر لیا گیا تھا پھر مختلف ہاتھوں سے ہوتے ہوئے تمہیں سعودی عرب پہنچا دیا گیا۔ تمہارا بچپن اور نوجوانی ایک غلام کی حیثیت سے گزری پھر کسی طرح تم اس غلامی سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تم نے سعودی عرب کے مختلف علاقوں میں قسمت آزمائی کی اور پھر جدہ کو اپنا مستقل ٹھکانا بنالیا۔ آج کل تم وہاں ایک ریسٹورنٹ چلا رہے ہو۔ میرا خیال ہے، اسے میری کہانی پر یقین آجائے گا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ہمیں تو یہاں چند دن رہنا ہے.....“

”ٹھیک ہے ماں! آپ نے جو بھی منصوبہ بنایا ہے، میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ میں نے ماں سے زیادہ جھٹ نہیں کی اور صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ شاہ جی کو جو بھی کہانی سنائیں، آپ کا اور ان کا معاملہ ہے۔“

”میرے بچے! اگر میں “حیدر علی ٹرسٹ” کے حوالے سے نادر شاہ کے ہاتھ میں کروڑوں روپے دے دے تو تیار ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس شخص پر مکمل بھروسہ کرتی ہوں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ”جب ہم دونوں یہ خیریت امریکا پہنچ جائیں گے تو پھر میں نادر شاہ کو حقائق سے آگاہ کر دوں گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”جی ماں! آپ کو وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں.....“ اس کے بعد میں ماں کے حکم پر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا اور پہنچ کر کے جب بستر پر آیا تو میرا ذہن بالکل علی سلطان کی طرف چلا گیا۔ میرا ان کے ساتھ خون کارشت نہیں تھا مگر زندگی کے تجربے نے مجھے بتایا

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یاد رکھیں کہ ہر سال اپنے پتے پر تبدیلی کی اطلاع بھیجنا ضروری ہے۔

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C، انڈسٹریل ایریا، اسلام آباد، پاکستان

فون: 021-35895313، 035802551

دسمبر 2017ء

لیکن یہ میری غلط فہمی تھی کہ میں سب کو دیکھ رہا ہوں
اور کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہے۔ اس عظیم ہال میں جمع
مردوزن میں سے ایک انسان مجھے بھی دیکھ رہا تھا اور وہ بھی
ڈیلفینیا عرف ڈیٹلی.....!
وہ مجھ سے ہم کلام ہوئی تھی۔ یہ بڑا پر معنی اور سنسنی
خیز مکالمہ تھا۔

”ہج.....! مجھ سے کہاں تک بچو گے۔ تم اس دنیا یا
اس دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاؤ، مجھے تمہارے قریب
آنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور اس کے لیے مجھے کوئی
خاص کوشش بھی نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ یہ دنیا گول ہے اور
تم ایک دائرے میں بھاگ رہے ہو۔ میں اگر کسی ایک مقام
پر ٹھہری جاؤں تو تم لا محالہ مجھ سے آکر ٹکراؤ گے۔ بھاگو.....
جتنا تیز بھاگ سکتے ہو..... مجھ سے دور ہونے کے لیے اپنے
جنم و جاں کی ساری توانائی صرف کر ڈالو..... میں کسی نہ کسی
طرح تم تک پہنچ ہی جاؤں گی.....“

اس کے انداز میں ایک ایک کھانچا تھا۔ ڈیلفینیا کے الفاظ کی
سنسنی خیزی نے مجھے ہلا دیا۔ کڑکھ دیا اور میں بڑا کراٹھ بٹھا۔
میرا پورا بدن پینا اگل رہا تھا اور دل کی دھڑکن بھی
بلند ترین سطح کو چھو رہی تھی۔ بیدروم کا انٹرکنٹینٹلر بڑی سبک
خزائی سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ کمرے کا درجہ
حرارت اتنا تھا کہ پینا آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
تھا۔ یقیناً یہ اس خواب کے اثرات تھے جو تھوڑی دیر پہلے
میں نے دیکھا تھا اور اس سنسنی خیز خواب نے میرا بلڈ پریشر
بڑھا دیا تھا۔ میری یہ کیفیت ڈیلفینیا کے اس معنی خیز پہنچنے کے
باعث ہوئی تھی جس کے مطابق، وہ مجھے چھوڑنے والی نہیں
تھی۔ اس کے مزید..... عزائم کیا تھے، ہر دست میں ان کے
بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں تو اس کے صرف ایک ہی
عزم سے واقف تھا کہ وہ مجھے اپنی سوسائٹی کا ممبر بنانا چاہتی
تھی اور میں نے ڈیلفینیا کی اس خواہش کو اپنے پاؤں تلے
روند ڈالا تھا۔ پریسٹن ہالو والے پنکھے پر میں نے اس کی
پیشکش کی یہ قول کئے، مٹی پلید کر دی تھی۔ وہ میرے فیصلے پر
زخمی شیریں کے مانند بہت تلملائی تھی۔ اس وقت ڈیلفینیا کو مجھ
پر غرانے یا مجھ پر جھپٹنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن اب مجھے اس
کے انداز میں بلا کی غراہٹ اور خوف ناک محسوس ہوئی تھی۔
میں نے تین چار گہری سانسیں لے کر اپنے حواس کو
جمع کیا پھر میری نگاہ دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھ گئی۔
کلاک ڈھائی بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میں لگ بھگ ساڑھے
بارہ بجے سویا تھا اور سونے سے پہلے میں نے اپنے دماغ کو کم

تہذیب ہوتی ہے۔ وہاں پر موجود تمام افراد نے مخصوص قسم
کے لباس پہن رکھے ہیں۔ یہ قیمتی لباس جبہ نما ہیں۔ اپنے
پہناوے اور شخصیت کے لحاظ سے وہ سب بڑے محترم اور
معتبر نظر آتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بڑے سچھے
ہوئے اور شائستہ انداز سے پیش آرہے ہیں۔ انہی لوگوں
میں مجھے ڈیلفینیا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ بڑی سچی اور سنسوری
ہوئی تھی۔ اس نے کمال کا بناؤ سنگھار کر رکھا تھا۔ یوں محسوس
ہوتا تھا جیسے یہ تقریب اسی کے نام ہو۔ پھر اس عالی شان
ہال میں، میں نے ایک ایسے شخص کو داخل ہوتے دیکھا جو
پہلے نظر آنے والے خواب میں میرے لیے ابھری تھا لیکن
اب کی بار میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ متاثر کن شخصیت
کا مالک انسان ربی آئزک باروخ لاڈ تھا۔ وہ وہاں مہمان
خصوصی کی حیثیت سے آیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہاں موجود تمام
افراد یا ادب، بالما حظ، ہوشیار ہو گئے تھے۔ ربی ڈیلفینیا کے
نزدیک پہنچ کر ٹک گیا۔ ڈیلفینیا نے جھک کر عقیدت بھرے
انداز میں ربی کے ہاتھ چومے۔ ربی نے ڈیلفینیا کی پیشانی
پر بوسہ دیا اور اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ چھیرا اور
تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ پھر ربی نے اپنے ہاتھوں
سے ڈیلفینیا کو ایک تاج پہنا دیا۔ وہاں پر موجود تمام افراد نے
ڈیلفینیا کو مبارک باد دی۔ ہونٹوں پر ملگوتی مسکراہٹ سجائے
ڈیلفینیا نے سب سے مبارک سلامت وصول کی۔ اس کے
بعد ربی آئزک نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

”یہ تاج پوشی ایک خاص مقصد کے تحت تھی۔ جیسا کہ
تم لوگوں کو معلوم ہے کہ ڈیٹلی کا ایک انتہائی اہم پروموشن
ڈیو تھا۔ آج اسے اس اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ اب یہ
سوسائٹی میں اس ڈگری تک پہنچ گئی ہے جس کی یہ مستحق ہے۔
اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اس نے بڑی محنت کی ہے۔
اس نے بڑی ہمت اور ثابت قدمی سے اپنے راستے کی سب
سے بڑی رکاوٹ کو جس طرح کھست دی ہے وہ آپ سب
کے لیے ایک روشن اور سبق آموز مثال ہے۔ جو نیز ڈیٹلی
کی کارکردگی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔“

اس کے بعد تقریب کا اختتام ہو گیا تھا۔ میں اس ہال
میں موجود تمام افراد کو بڑے واضح انداز میں دیکھ رہا تھا لیکن
مجھے اس بات کا بھی یہ خوبی احساس تھا کہ میں ان لوگوں کے
سچ حاضر نہیں ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی مجھ سے مخاطب
نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی کسی نے میری جانب توجہ دی تھی۔ یہ
بالکل ایسا ہی تھا جیسے میں مذکورہ ہال سے کہیں دور بیٹھا، اس
تقریب کو کوئی وی اسکرین پر لا ٹیوڈ دیکھ رہا ہوں۔

تھا کہ روح کا رشتہ خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط اور
پائدار ہوتا ہے۔ ہمارے سچ روحوں کا میلان پایا جاتا تھا۔
انگل سلطان کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا
وصیان ربی آئزک کی طرف چلا گیا۔ ڈیٹلی میں پریسٹن
ہالو والے پنکھے پر ربی نے مجھ سے روحانی میلان کے حوالے
سے بڑی اہم اور قابل غور باتیں کی تھیں۔ اس نے اپنی تاثر
انگیز آواز میں مجھے بتایا تھا کہ ہم سب ایک آدم کی اولاد ہیں
اور ہمارے سچ برابر ہڈ یعنی بھائی چارے کا رشتہ قائم ہے۔
تمام انسان ایک خالق کی مخلوق ہیں، ایک سمندر کے قطرے
ہیں، ایک جگر کے پتے ہیں، ایک گھڑیال کے کانٹے ہیں اور
ایک فٹیلی کے ممبرز ہیں۔ جس طرح ایک خاندان کے بعض
افراد کے سچ بہت زیادہ ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اسی
طرح ارواح کے عالم میں بھی بعض روحوں کے مابین بڑا
مضبوط تعلق پایا جاتا ہے۔ جو روضیں ایک دوسرے سے
بہت زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہیں، ان کے حامل انسان ایک
دوسرے کے سچ دوست یعنی سول میٹ ہوتے ہیں۔ وہ
چاہے زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں یا وہ زندگی
میں کبھی بھی ایک دوسرے سے نہ ملے ہوں مگر ان کی روضیں
یہ خوبی ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ ربی نے میرے اور
اپنے حوالے سے کہا تھا کہ ہم دونوں سول میٹ ہیں۔ اسی
تناظر میں اس وقت میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ انگل علی سلطان
بھی میرے سول میٹ تھے.....!

آہ..... میرا روحانی ساتھی مجھ سے کچھو گیا تھا۔ انگل
سلطان کی ابدی جدائی کا سوچ کر کبھی محسوس ہو رہا تھا جیسے
میرے جسم سے روح رخصت ہوئی ہو.....!

☆☆☆

اس رات میں نے بڑا معنی خیز خواب دیکھا۔
میں سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں اس لیے جب
بھی میرے بیان میں کوئی ایسی چیز پیش آتی ہے جہاں انسانی
نفسیات کا عمل دخل ہو تو میں بڑیاٹ میں ڈوب جاتا ہوں۔
میں نے اس رات جو عجیب و غریب خواب دیکھا، وہ
ماضی قریب کے ایک خواب کا تسلسل تھا۔ پہلے یہ خواب میں
نے ڈیٹلی میں پریسٹن ہالو والے پنکھے پر دیکھا تھا جب میں
بہتر کھنٹوں کے لیے کاغذ ادا سپلائی و ڈسٹریوٹ ڈیلفینیا کا مہمان
بنا ہوا تھا اور اس وقت میں اپنی ماں کے پنکھے پر موجود تھا۔
میں نے دیکھا کہ ایک کشادہ ہال ہے اور اس ہال
میں دو درجن سے زیادہ افراد جمع ہیں جن میں مردوزن سب
شامل ہیں۔ وہاں کا ماحول قدیم زمانے کا ہے جیسا کہ یونانی

دسمبر 2017ء

سسپنس ڈائجسٹ 186

سسپنس ڈائجسٹ 187

دسمبر 2017ء

9 سسپنس ڈائجسٹ

ایکسپریس انٹرویو: نوکرانہ کی بجائے۔ جون جولائی میں ادھر
دسمبر 2017ء

نیکاس میں بھی کم دیش ایسی ہی محض دیکھنے کو ملتی ہے۔
 دس منٹ کی ملاقات کے بعد میں مطمئن ہو کر جمشید کے کیمین میں آ گیا۔ بنگلے کی چار دیواری کے اندر ہر طرف امن اور سکون خیمہ زن تھے۔ کہیں بھی مجھے کسی ابتری کے آثار نظر نہیں آئے۔ بنگلے کے چاروں طرف سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اب ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ وقت مقررہ سے پہلے میری آنکھ کھلنے کا سبب محض وہ خواب تھا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا لہذا میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مذکورہ خواب میری زندگی میں کسی زاویے سے بے پناہ اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے اس پر خصوصی توجہ دینا چاہیے اور یہ بھی مجھے کی کوشش کرنا چاہیے کہ اس خواب میں میرے لیے کیا پیغام ہو سکتا تھا.....!

سحری کرنے کے دوران میں ہمارے چچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جمشید کی زبانی مجھے پتا چلا کہ بنگالی بابو محمد حسین پچھلے پانچ سال سے ماں کے ہاں ملازم تھا۔ اس کی فیملی نزدیک ایک ہسٹری میں رہتی تھی۔ وہ روزانہ صبح دس بجے بنگلے پر آتا اور رات کو دس بجے اس کی پھنی ہو جاتی تھی۔ وہ ہفتہ وار، اتوار کو ایک دن کی مکمل پھنی کرتا تھا۔ بنگالی بابو کی عمر پچاس سے تجاوز تھی۔

”تم کب سے میڈم کے پاس ملازم ہو؟“ میں نے جمشید سے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”مگ بھگ آٹھ سال سے ان کی خدمت میں ہوں۔“

”تم نے کچن میں بنایا تھا کہ میڈم نے تم پر ان گنت احسانات کر رکھے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم مجھے ان احسانات کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟“

”کوئی ایک احسان ہو تو بتاؤں سر۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”یہوں سمجھ لیں کہ میڈم کے سلوک نے مجھے اور میری پوری فیملی کو خیر دلایا ہے۔ اگر میڈم کو ہماری جان کی ضرورت ہو تو ہم ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔“

”تھوڑی تفصیل تو بتاؤ یار۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے بھی پتا چلتا ہے کہ میڈم نے تم لوگوں کے ساتھ ایسا کون سا سلوک کیا ہے جو تم اپنی جان ان پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہو؟“

وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کو پتا ہے نا، پاکستان میں چند سال پہلے بڑا خوف ناک زلزلہ آیا تھا..... جب آٹھ اکتوبر کو پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں قیامت مٹھ کر برپا ہوئی تھی۔“

”تمہارا تعلق کس علاقے سے ہے؟“

”آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد سے۔“ اس نے دھکی لہجے میں بتایا۔ ”میں مظفر آباد کے علاقے گوجرہ کے ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔“

”تم لوگوں کا تو بہت نقصان ہوا ہوگا؟“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... اس غریبیت نے میرے والد صاحب، میرے بڑے بھائی گل داد کی بیوی جمیلہ اور ان کے دو معصوم بچوں کو بھی نکل لیا تھا۔“

”اوہ.....!“ میں نے مغموں نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بہت دکھ ہوا تمہاری چٹاں سر۔“ مالک مرحومیں بلکہ شہداء کے درجات بلند فرمائے۔ کسی قدرتی آفت کے باعث ہونے والی ہلاکت بھی شہادت کے زمرے ہی میں آتی ہے۔“

”جب میری یہ پتا میڈم نے سنی تو انہیں بھی دکھ ہوا تھا۔“ وہ اپنی ہی کھانٹ دھن میں بولتا چلا گیا۔ ”جب میں نے میڈم کے پاس ملازمت اختیار کی تو اس سانحے کو چند ماہ گزر چکے تھے۔ پتا ہے، اس کمپری کی حالت میں میڈم نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

”تم بتاؤ.....؟“

”میڈم نے اپنی جیب سے ہمارے لیے پہلے سے بھی بڑا گھر تعمیر کروایا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میری بیوی میٹرک تک پڑھی ہوئی ہے۔ میری اور راشدہ کی کوئی اولاد نہیں۔ میڈم نے گھر کے ایک حصے میں راشدہ کو پرائمری اسکول کھول کر دیا۔ اس مصروفیت میں راشدہ اپنی محرومی یعنی بے اولادی کے غم کو بھی بھول گئی ہے۔ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس کے علاوہ میری اکلوتی بہن شائلک کی شادی کا سارا خرچہ میڈم نے اٹھایا تھا۔ گا بے بگا ہے میری تنخواہ کے علاوہ بھی اگر ادھر گاؤں میں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو میڈم نے بھی انکار نہیں کیا۔ اب آپ ہی بتائیں، میں ایسی عظیم ہستی سے کس طرح نمک حرامی یا احسان فراموشی کر سکتا ہوں؟“

اپنی بات کے اختتام پر اس نے میرے لیے ایک بڑا سوال پھوڑا تھا لیکن اسے خیر نہیں سمجھی کہ میں کون ہوں اور میں نے اسے بتانا ضروری بھی نہیں جانا۔ اس کی زبان سے ماں

کی بڑائی سن کر میرے دل و جگر میں ایک ٹھنڈکی سی اثر گئی تھی۔ میں نے جمشید کے سوال کا گول مول جواب دیتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو.....!“

سحری کا وقت ختم ہونے میں جب دس منٹ باقی تھے تو میں جمشید کے کیمین سے نکل کر اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ بستر پر لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کیں تو بند آنکھوں کے پیچھے ڈیٹفینا کا دلکش چہرہ روشن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی خواب میں کہے ہوئے اس کے الفاظ بھی ذہن میں تازہ ہو گئے۔ اس نے چپچپ کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

”بچو! تم چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاؤ، مجھے تمہارے قریب آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مجھ سے دور ہونے کے لیے جہاں تم اپنے جسم و جان کی ساری توانائی بھی صرف کر ڈالو، میں کسی نہ کسی طرح تم تک پہنچ ہی جاؤں گی۔“

اس کے چپچپ سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے پاس کراچی آنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس خیال نے مجھے بے حد چونکا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مقبول بھٹی کے کہے ہوئے الفاظ میری یادداشت میں ابھر آئے۔ یعنی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ ان لمحات میں وہ علی کپور سے مخاطب تھے۔

”سائیں! میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسد صاحب سے جن تین عورتوں کا گہرا تعلق ہے، ان میں سے دو عورتیں اس وقت پاکستان میں موجود ہیں اور تیسری ادھر امریکا میں ہے۔ پاکستان میں موجود دو عورتوں میں سے ایک سے تو اسد کی ملاقات ہوئی ہے اور دوسری سے بہت جلد ملاقات ہوگی..... یہیں کراچی میں.....!“

میں نے بھی صاحب کو جن تین عورتوں کے بارے میں بتایا تھا ان میں ایک تو میری والدہ سسلی یعنی ”ایس“ تھیں۔ دوسری شارو یعنی ”سی“ تھی اور تیسری ڈیٹفینا یعنی ”ڈی“ تھی۔ سسلی صاحبہ سے میں ملاقات کر چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ عقیب کراچی میں میری ملاقات شارو سے ہونے والی تھی یا ڈیٹفینا سے۔ شارو سے ملاقات کا امکان اس لیے صفر کے برابر تھا کہ لیونارڈو نے اسے نیکاس کے شہر ایک جنکشن سے اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا پہنچا دیا تھا اور وہ وہاں خفیہ غنڈے لیونارڈو کی کفایت میں تھی۔ اب ڈیٹفینا ہی باقی بچتی تھی۔

مقبول بھٹی کی پیش گوئی کو اگر میں آج والے خواب کے ساتھ جوڑ کر غور و خوض کرتا تو اس سوچ بچار کا ایک ہی

نتیجہ برآمد ہوتا کہ..... یا تو ڈیٹفینا کراچی پہنچ چکی ہے یا پھر عقیب پر وہ یہاں پہنچنے والی ہے!

جب پہلی مرتبہ پریسٹن ہالو والے بنگلے پر میں نے یہ خواب دیکھا تھا تو اس کے بارے میں رلی آنرک سے میں نے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ خواب بالکل سچا ہے۔ مجھے بشارت دی گئی ہے کہ ڈیٹفینا کو ایک بہت بڑے اعزاز سے نوازا جائے والا ہے۔ جب میں نے اس کی تفصیل جاننے کی کوشش کی تو رلی نے کمال مہارت سے گفتگو کا رخ میرے والدین کی جانب موڑ دیا تھا۔ بعد ازاں ایک موقع پر جب میں نے ڈیٹفینا سے اپنے اس خواب کا تذکرہ کیا تھا اور اسے یہ بھی بتایا تھا کہ رلی آنرک نے اس کی تصدیق کی ہے تو اس نے کہا تھا..... ”ہاں! تم نے اپنے خواب میں جو عالی شان قدیم طرز کا مال دیکھا، وہ عمارت بروکلم میں ہے۔ میں اپنے حالیہ بکھیروں سے نمٹ لوں تو پھر مجھے بروکلم جانا ہوگا جہاں میرے اعزاز میں اس شاندار تقریب کا انعقاد ہوگا جو تم نے اپنے خواب میں دیکھا ہے۔“

میں نے اس کا فوادا حسینہ سے سوال کیا تھا۔ ”کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ تمہاری یہ تاج پوشی کس سلسلے میں ہونے والی ہے؟“

”آئی ایم سوری۔“ اس نے مجھے لگا سا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”یو آر ناٹ اے ممبر آف آؤرسوسائٹی۔ اس لیے میں تمہارے ساتھ یہ راز شیئر نہیں کر سکتی۔“

میرے اور ڈیٹفینا کے بیچ معاملہ صرف اسی راز کے شیئر کرنے یا نہ کرنے تک محدود نہیں تھا۔ وہ بڑی چٹکاری اور موڈی عورت تھی۔ اس نے مجھے دکھایا کم اور مجھ سے چھپایا زیادہ تھا۔ وہ اکثر اپنی سوسائٹی کے بارے میں بڑے انکشاف انگیز انداز میں ادھوری بات کر کے میرے اندر تجسس کو ابھارتی تھی پھر جب میں پلٹ کر اس کی بیکرٹ سوسائٹی کے حوالے سے کوئی سوال کرتا تو وہ ایک آنکھیں ماتھے پر بلکے جوئی پر رکھ لیتی تھی اور مجھے احساس دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ جب تک میں ان کی سوسائٹی کو جان نہیں کروں گا، وہ میرے ہاتھ آنے والی نہیں۔ ڈیٹفینا کا شمار ان دلکش اور دلربا عورتوں میں ہوتا تھا جو کبھی کسی مرد کو مکمل طور پر حاصل نہیں ہوتیں، اپنی چند حشر سامان اداؤں ہی سے وہ بڑے بڑے چیتا مردوں کے غبارے کی ہوا نکال دیتی ہیں۔

وہ مجھے اپنی بیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بنانے کے لیے پریسٹن ہالو والے بنگلے پر لے کر گئی تھی اور وہاں پر اس نے

دواہم افراد ربی آنرک بام روخ لاؤ اور فلسفی کی پروفیسر ایما اپیل بام سے میری ملاقات بھی کرانی تھی۔ ان دونوں افراد میں ایک قدر مشترک بھی تھی کہ ایما اپیل بام اور ربی آنرک کا تعلق امریکی ریاست کنکٹی کٹ کے علاقے نیو یون میں واقع ہیل یونیورسٹی سے تھا۔ ہیل یونیورسٹی کی اہمیت اس حوالے سے بھی تھی کہ ”اسکل اینڈ یوز“ نامی سیکرٹ سوسائٹی کا ہیڈ کوارٹر وہیں پر تھا۔ ایما اپیل بام یہودن تھی اور اسی یونیورسٹی میں فلسفی کی پروفیسر تھی۔ اس نے مجھے ہیل یونیورسٹی میں ایڈیشن کی پیشکش بھی کی تھی مگر میں نے ڈیلفینا کی تمام تر کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا، بالفاظ دیگر اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سارے غباروں کی ہوا نکال کر چلا بنا تھا۔

ڈیلفینا نے بعض مواقع پر ”اسکل اینڈ یوز“ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مختلف ڈگریوں کا بھی ذکر کیا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ کسی بھی ممبر کے لیے سب سے بڑی ڈگری تھری تھری یعنی تینتیس ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح کی ماسٹر ڈگری کہلاتی ہے۔ جب سوسائٹی کا کوئی ممبر ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے تھری تھری ڈگری تک پہنچ جاتا ہے اور یہ ڈگری حاصل کر لیتا ہے تو پھر ایک شاندار تقریب میں اس کی تاج پوشی کر کے اسے اس اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ گویا وہ سوسائٹی سے فارغ التحصیل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سوسائٹی کے حکم پر وہ عملی میدان میں قدم رکھ دیتا ہے۔ اسے دنیا کے کسی مخصوص علاقے کا پوشیدہ حکمران بنایا جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ سکون سے بیٹھ کر ظاہرہ حکمرانوں کی لگا میں کھینچتا رہتا ہے اور انہیں اپنے اشاروں پر بچتا رہتا ہے۔

یہ سب سوچتے ہوئے ایک خطرناک خیال نے میرے ذہن میں سراٹھایا اور وہ یہ کہ..... کہیں ڈیلفینا کو تھری تھری ڈگری سے نواز کر کسی خصوصی مشن پر پاکستان تو نہیں بھیجا جا رہا.....؟

یہ سوال جتنا خطرناک اور فکر انگیز تھا، اتنا ہی ہلاکت خیز بھی تھا۔ اس کے جلو میں مجھے بہت سی وحشتیں اور دہشتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ میرے لیے باخبر، ہوشیار ہونے کا وقت تھا۔ میں ڈیلفینا کی اتنا پرکاری ضرب لگا کر پریسٹن ہالو والے ہینکے سے نکلا تھا۔ وہ مجھے اپنے سامنے جھکانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی..... کچھ بھی!

میں نے ڈیلفینا اور اس کے آئندہ مشن کو جوتے کی نوک پر مارا اور سکون کی چادر اوڑھ کر نیند کی پرفضا وادی میں اتر گیا۔

☆☆☆

اگلے روز دو پہر میں میری آنکھ کھلی۔ میں نے سات آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لی تھی اس لیے خود کو بڑا ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ میں نے پندرہ بیس منٹ واش روم میں صرف کیے اور فریش ہو کر بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔

میرا ارادہ تو سیدھا ماں کے پاس جانے کا تھا لیکن میرے قدم ڈرائنگ روم کی سمت اٹھ گئے اور اس اچانک فیصلے میں تبدیلی کا سبب وہ آوازیں تھیں جو ڈرائنگ روم کی جانب سے چل کر میری سماعت تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔ وہ بہت سی خواتین کی آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں تھیں اسی لیے میں ان آوازوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس ہینکے میں ماں کے سوا اور کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ پھر وہ سب کون تھیں اور اس وقت وہاں کیا کر رہی تھیں..... ان پر تجسس سوالات نے مجھے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں ماں کو پانچ حسین و جمیل لڑکیوں کے ساتھ جو گفتگو پایا۔ وہ پانچوں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ان لڑکیوں کو حسن و خوب صورتی کے شاہکار کہا جاسکتا تھا۔ ان کے چہرے دلکش و دلنشین تھے اور سراپا میں ایک خاص قسم کی مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی جو دیکھنے والے کی آنکھ کو ایک جگہ ٹھہرا کر مسحور و مسحور کر دیتی تھی۔ انتہائی مختصر اور جامع الفاظ میں وہ چاروں دلوں کو تر پانے اور حواس پر بجلیاں گرانے والی لڑکیاں تھیں۔

ماں نے مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو بڑے محتاط انداز میں بولیں۔ ”علی! میں تو تمہارے لیے زبردست ناشتے کا بندوبست کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن پھر مجھے پتا چلا کہ تم نے روزہ رکھ لیا ہے۔“

ماں نے مجھے ”علی“ کہہ کر مخاطب ضرور کیا تھا لیکن اپنی بات سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ ہمارے بیچ کیا رشتہ ہے لہذا میں نے بھی احتیاط کے تقاضے نبھانا ضروری جانا اور ایک خالی صوفے پر بیٹھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔

”جی آئی..... آپ کا جاسوسی کا نظام بڑا افعال اور شاندار ہے۔ یقیناً آپ کو یہ بات جوشید نے بتائی ہوگی!“

”مگ..... تمہارا اندازہ درست ہے۔“ ماں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر ان پانچوں پر دیشوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”یہ رفیق صاحب ہیں، میرے ایک عزیز و صدیق صاحب کے بیٹے۔ ان کا پورا نام رفیق علی ہے لیکن میں صرف علی کہہ کر پکارتی ہوں.....“

ان میں سے ایک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں میڈم! آئی گلیں نے ہمیں ان کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ ادھر جدہ میں ہوتے ہیں۔ آپ انہی کے ساتھ عمرہ کرنے جا رہی ہیں۔“

”بالکل..... گلیں نے تم لوگوں کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔“ ان نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”یہ سحرش، آرزو، پنا، روبی اور شیلہ ہیں۔ یہ پانچوں ادھر نزدیک ہی ایک پینکے میں رہتی ہیں۔ کل میں نے گلیں کو انہی کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔“

ماں نام لے کر ان ماہ جینوں کو مجھ سے متعارف نہ بھی کراتیں تو میں بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ کون ہیں اور ماں کے ساتھ ان کا کس قسم کا کنکشن رہا ہے۔ ”رہا ہے“ کے الفاظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ جس بزنس کے توسط سے یہ ماں کی زندگی کا حصہ ہوا کرتی تھیں، اس بزنس کو ماں نے خلوص نیت سے خیر باد کہہ دیا تھا۔ ماں کو ایک بار یہاں سے لکنا تھا تو پھر تاحیات اس زندگی اور اس سے متعلق افراد کی جانب پلٹ کر نہیں دیکھنا تھا۔ ماں نے جس لمحے مجھے اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تھا، میرے ذہن نے ماں کو اسی وقت اس ”لائف سیٹ اپ“ سے خارج کر دیا تھا لہذا آرزو، سحرش، شیلہ، روبی اور پنا میری نگاہ میں ماں کی ذات کے حوالے سے قصہ پارینہ بن چکی تھیں۔

میں جس صوفے پر بیٹھا تھا اس کے بائیں ہاتھ والے سنگل صوفے پر ماں براجمان تھیں۔ میرے سامنے والے بڑے صوفے پر آرزو، شیلہ اور روبی بیٹھی تھیں اور میرے دائیں ہاتھ والے صوفے پر پنا اور سحرش موجود تھیں۔ میرے اور پنا کے درمیان ایک، ڈیزھنٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ ہم سب کے بیچ گلاس ٹاپ والی ایک شاندار منتقل چوٹی میز تھی جس کے اوپر ہم سب کے آئی فون رکھے ہوئے تھے۔ ان پانچوں نے اپنے پرس ڈرائنگ روم کے فرش پر قائلین کے اوپر رکھ چھوڑے تھے۔ ویسے تو وہ پانچوں کی پانچوں اپنی مثال آپ تھیں لیکن میری نگاہ پنا کے چہرے سے بار بار الجھ جاتی تھی۔

اس کا سبب یہ تھا کہ وہ باقی چاروں کے کافی مختلف تھی۔ اس کے انداز میں بڑی انفرادیت پائی جاتی تھی۔ دیکھنے میں وہ ایشیا اور یورپ کا ملن نظر آتی تھی۔ میرے مختار اندازے کے مطابق، اس پورٹشمن لڑکی کے والدین میں سے ایک کا تعلق ایشیا سے اور دوسرے کا یورپ سے ہونا چاہیے تھا۔ اس خوب رولر کی کو بلاشبہ بلونڈ کہا جاسکتا تھا۔

اس کے بال شہدرنگ تھے مگر آنکھوں کا رنگ ایک دم سیاہ تھا اور وہ خاصی نمایاں بھی تھیں۔ ہونٹ ریلے اور قدرے ابھرے ہوئے جن کے لیے مقابلہ حسن کی اصطلاحات میں ”پولپس“ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ وہ متاثر کن شخصیت کی مالک، بے پناہ اہلی کی حامل لڑکی تھی۔

اس باہمی گفتگو کے دوران میں ماں نے انہیں اپنے عمرے والے پلان سے آگاہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ ماں کی غیر موجودگی میں پوری طرح آئی گلیں کو فالو کریں گی۔ انہوں نے باری باری ماں کو اپنی وفاداری اور فرماں برداری کا یقین دلایا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رخصت ہو گئیں۔

ان کے جانے کے بعد میرے اور ماں کے بیچ کافی دیر تک مستقبل کے حوالے سے منصوبہ بندی ہوتی رہی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جس دوران میں، میں سو رہا تھا، انہوں نے امریکا کے ویزے کے سلسلے میں دو اہم کام نمٹا دیے تھے یعنی انہوں نے اپنے بینک سے پچھلے چھ ماہ کا اکاؤنٹ اسٹیٹ منٹ بنوالیا تھا اور نوٹری پبلک سے مل کر اپنی جائداد اور دیگر قیمتی اشیاء کا بکے اسٹیپ پیپر پر اپنی ڈیوٹ بھی تیار کر دیا تھا۔ گویا انہوں نے اپنے حصے کا کام نمٹا دیا تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے نوٹو بھی کھنچوالیے تھے۔ لگ بھگ تین بجے عظیم میرے پاس پہنچ گیا۔ ماں نے ہمیں فری پیڈ دے دیا تاکہ ہم اطمینان سے آن لائن ان کا اپنی کیشن فارم بھر سکیں۔ ہم دونوں، میرے والے پیڈروم میں آ بیٹھے۔

کام کے دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ امریکا کا آن لائن ویزا فارم پانچ چھ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے مکمل کرنے میں اچھا خاصا وقت لگتا ہے۔ مجھے ایک ترتیب سے کام کرتے دیکھا تو عظیم نے کہا۔ ”یار! تم تو بڑی روانی سے کام کر رہے ہو۔ ایسا لگتا ہے، یہ تمہارا پروڈیشن ہو جبکہ مجھے اس پر دوس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تین چار مرتبہ ٹرائی مارنا پڑی تھی۔“

”یہ ہرگز میرا پروڈیشن نہیں ہے برو!“ میں نے... دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”میری روانی اور آسانی کا سبب یہ ہے کہ میں امریکی ہوں اس لیے امریکیوں کی ذہنیت اور امریکی گورنمنٹ کی پالیسیوں سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی کس بات سے ان کی کیا مراد ہے لہذا اس فارم کے مندرجات کو سمجھنے میں مجھے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔ بس اتنی ہی بات ہے۔“

لیے کس طرح تم لوگوں کو ملین ڈالر کی گولڈن آفر کر رکھی ہے۔ ہو سکتا ہے، تمہاری یہ ٹائبر ابھی فیک ہی ہو اور تمہارے جذبات سے کھلواؤ کر رہی ہو.....!“

”ایسا نہ کہو برو۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ”پہلے ہی فرحان نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔“

”یہ فرحان کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور یہ بندہ ہماری گفتگو کے بیچ کہاں سے ٹپک پڑا؟“

”فرحان میرا بڑا گہرا دوست ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے فرحان کو ٹائبر کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔ میں نے اسے ٹائبر کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ وہ میرا مذاق اڑاتا ہے۔ کہتا ہے، وہ مجھے بے وقوف بتا رہی ہے۔ ٹائبر اشل ہی سے ہلا کو خان کی پوتی نظر آتی ہے۔ وہ تمہارے جذبات کا ایسا حشر نشر کرے گی کہ کسی سے ذکر کرنے کے قابل بھی نہیں رہو گے لیکن میں فرحان کی بات کا یقین نہیں کرتا۔“

”دراصل تم ٹائبر کے ساتھ دل لگا چکے ہو۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس لیے تمہارا دل کسی بھی قیمت پر اس کے فیک ہونے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اس کی مخالفت میں جانے والی ہر بات کو تمہارا دل ماننے سے انکار کر دیتا ہے اسی لیے تمہیں فرحان کی..... اور میری بات کا یقین نہیں آ رہا۔ ایم آئی رائٹ؟“

”یہی! پو آریسٹو لیٹیو رائٹ۔“ وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ”یہ واقعی میرے لیے دل کا معاملہ بن چکا ہے لیکن فرحان کی بات پر یقین نہ کرنے کا ایک اور بھی سبب ہے۔“

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔ ”یار! وہ کافر ہے۔“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”تمہارا مطلب ہے، فرحان اتھیسٹ ہے؟“

”تم اسے اتھیسٹ کہو، دہریہ کہو، منکر خدا کہو، کیونسٹ کہو، کامریڈ کہو یا کافر کہو..... ایک ہی بات ہے۔“ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ کافر کیا جیں، دل کا لگانا کیا ہوتا ہے!“

”اتھیسٹ دل کا لگانا جانتے ہوں یا نہیں جانتے ہوں لیکن ایک بات مجھے معلوم ہے کہ یہ لوگ دماغ کا لگانا بیخوبی جانتے ہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو یار؟“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

”برو! اتھی ازم میں کٹ منٹ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”ہر اتھیسٹ اپنے کا

کے ساتھ بڑا کیٹیڈ ہوتا ہے۔“

”کیا تم اتھی ازم کی حمایت کر رہے ہو؟“ اس نے عجیب سی نظر سے مجھ سے دیکھا۔

”بات حمایت یا مخالفت کی نہیں میرے دوست۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں نے تو اپنے مشاہدے اور تجربے کو بیان کیا ہے۔ آج میں تمہیں اتھیسٹ افراد کے بارے میں ایک خاص الخاص بات بتاتا ہوں.....“

وہ ہمت شکن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”بتاؤ برو!“

”یہ ٹھیک ہے کہ یہ لوگ خدا کو نہیں مانتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی لوگ سب سے زیادہ خدا کی مانتے ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی یار؟“ اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

”بات یہ ہوئی یار کہ.....“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ یہ لوگ پورا تو ملتے ہیں۔ کسی چیز میں ملاوٹ نہیں کرتے حتیٰ کہ اپنی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا بھی پاس کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی خوشی، اطمینان اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ انہوں نے قدرت کے آفاقی اصولوں کو اپنی زندگی میں نافذ کر رکھا ہے۔“

”یار! تمہارے بیان میں بڑی فصاحت اور بلاغت پائی جاتی ہے۔“

”شکریہ۔“ جلیں جی ایک کام تو ہوا؟“

”کونسا کام؟“

”ٹورسٹ کے لیے امریکا کا وزٹ ویزا فارم“ ڈی ایس۔ ون سکسٹی“ مکمل ہو گیا ہے۔“ میں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ”اور ویزا فیس ون سکسٹی امریکی ڈالر ڈیپازٹ کرنے کے لیے کونسلٹ کا اکاؤنٹ نمبر بھی ای میل کے ذریعے وصول ہو گیا ہے۔“

”اوکے ویری گڈ..... مگر اب یہ کام پرسوں ہی ہوگا۔“

”پرسوں کیوں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آج یا کل کیوں نہیں.....!“

”اگر ہم بار دہاڑ کرتے ہوئے ابھی الائیڈ بینک کی کسی آن لائن برانچ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ کام ہاتھ کے ہاتھ ہو جائے گا ورنہ معاملہ پرسوں پر چلا جائے گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”اس کا سبب یہ ہے کہ بینک کا ٹائم ختم ہونے میں بس پندرہ بیس منٹ ہی باقی ہیں اور کل یکم جولائی کو بینک ہالڈی سے کی

معاملات ایک ہی روز منٹ جا گئیں۔“
”ٹھیک ہے انکل! آپ پیروز وغیرہ تیار کروالیں۔“
میں نے کہا۔ ”میں ان شاء اللہ جولائی کے آخری عشرے میں آپ کے پاس ہوں گا۔ ایک بات ذہن میں رکھیے گا انکل کہ بے بی والا پارمنٹ میں اپنے پاس رکھوں گا۔ ٹیکوڑ اسکو اڑوالے اس گھر سے میری بہت سی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ میں اپنی ماں کے ساتھ وہیں پر رہنا پسند کروں گا۔“
”میں تمہاری خواہش کا خیال رکھوں گا۔“ انہوں نے خلوص دل سے کہا۔ ”اس سلسلے میں تم بے فکر ہو جاؤ۔“

اور میں واقعی بے فکر ہو گیا۔ مزید چند منٹ کی گفتگو کے بعد ہمارے پتے پر رابطہ موقوف ہو گیا۔ میں نے سیل فون کو سائڈ ٹیبل پر رکھا اور بس پر دروازہ کھینچ بند کر لیں۔
بند آنکھوں کے پیچھے نفی کا چہرہ روشن ہو گیا۔ نفی سے میری صرف ایک ہی ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی بڑے مختصر وقت کے لیے جب میں پریسٹن ہالوالے ہنگو پریڈیغیا کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ ایما ایبل نام کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ نفی کو میں نے سنجیدہ کم گو، موڈی اور بیزار مزاج پایا تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو بہت لمبے دینے رہتے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ نفی دیر پہلے انکل بیگ نے مجھے جو کچھ بتایا تھا، اس کے مطابق بھی نفی نے اسی خشک رویے کا مظاہرہ کیا تھا جو اس کی فطرت کا حصہ بلکہ خاصہ تھا۔

نفی کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان ڈیڈیغیا کی جانب چلا گیا۔ ایسا کیسے ممکن تھا کہ پریسٹن ہالو کے ہنگو پریڈیغیا آئے اور ڈیڈیغیا کی یاد نہ آئے۔ اب اس بات کا مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس ہسپانوی دو شیزہ کا میرے ساتھ بڑا گہرا رابطہ پیدا ہو چکا ہے اور یہ تعلق مستقبل میں بہت دیر تک اور بہت دور تک چلنے والا تھا۔ پچھلی رات وہ میرے خواب میں مجھے پہنچ بھی گئی تھی کہ میں اگر لاکھ جاہوں بھی تو اس سے پچھتا نہیں چھڑا سکتا۔ میں دنیا میں جہاں نہیں بھی ہوں گا، وہ میرے تعاقب میں وہاں پہنچ جائے گی۔

اس کا یہ پہنچ خاصا تشویشناک اور فکر انگیز تھا لیکن کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ سیل فون کی کھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنے موبائل کی جانب ہاتھ بڑھایا کہ وہ ظلم ہو گا لیکن جب فون کے اسکرین پر دیکھا تو وہاں ایک اجنبی سیل فون نمبر نظر آ رہا تھا۔ بے ساختہ میری نگاہ دیوار گیر کاک کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں پورے بارہ کا وقت دکھائی دے رہا تھا۔ تیسری

ہیں۔ مطلب، زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا مکمل ہے۔“
”علی! میں انٹرویو میں پاس ہو جاؤں گی نا؟“ وہ حذب لب لہجے میں مستفسر ہوئیں۔
”کیوں نہیں ماں.....!“ میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ ”آپ ایک سو ایک فیصد کامیاب ہوں گی۔ جب میں انٹرویو کی تیاری کرواؤں تو پھر نا کامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے بس اعتماد کے ساتھ ہر سوال کا جواب دینا ہے۔ میں آپ کے کاغذات میں اپنے پاسپورٹ کی مکمل فوٹو کاپی بھی لگا دوں گا۔ آپ کو کسی بھی حوالے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

وہ مطمئن ہو گئیں۔ ہم نے دس بجے کے بعد ڈزرت کیا پھر لگ بھگ گیارہ بجے میں سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ آج دن میں ماں نے اپنے خانا ماں بیٹی بنگالی باپو محمد حسین سے بھی میری ملاقات کرا دی تھی۔ بنگالی باپو اپنی شکل صورت سے ایک خطہ انکواس پر دوسرے دکھائی دیتا تھا۔ یہ میں نے اس کے بھری تاثر کی بات کی ہے ورنہ وہ ایک ہوش مند اور تجربہ کار بارہجی تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کے بے ہوئے کھانوں کی بہت تعریف سنی تھی اور اس کے تیار کردہ کھانے کھائے بھی تھے۔ وہ بیان کردہ تعریف پر پورا اترتا تھا۔
میں سونے کے لیے لیٹا تو بھگ صاحب کا فون آ گیا۔ اس وقت کراچی میں رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور نیویارک میں دوپہر کے ڈھائی بج یعنی دو بج کر تیس منٹ۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”ہیلو انکل! آپ کیسے ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں لی۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”اور سناؤ، تمہاری طرف کیا چل رہا ہے؟“
میں نے انہیں ”ڈی ایس۔ ون سکٹی“ ویزا کے حصول کے سلسلے میں اپنی تازہ ترین کوشش سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھے سراہا اور بہت سی دعائیں دینے کے بعد کہا۔
”میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے میری نفی سے علی سلطان کی وصیت کے حوالے سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ وہ کسی لمبے چوڑے کمبیزے میں پڑنے کو تیار نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ میں اپنے طور پر علی سلطان کی مقولہ اور غیر مقولہ جائداد کو انیشیٹ کر کے اس کا جو حصہ چتا ہے وہ اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دوں۔ کسی قانونی کارروائی کے لیے اگر اس کا آنا ضروری ہوا تو وہ سٹیئر کرنے کے لیے ٹیکسا آ جائے گی۔ میں اسے اس وقت بلاؤں گا جب تم یہاں پہنچ جاؤ گے تاکہ قانونی

روانہ ہو جائیں گے۔“ ماں نے جواب دیا۔
”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ ایک اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تو آپ لوگوں کی روانگی میں کافی دن باقی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوران میں تمام کام خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔“
”ان شاء اللہ.....!“ ماں نے مضبوط لہجے میں کہا۔
نادر شاہ نے ہمارے ساتھ افطار کیا پھر ماں سے ہنگو کی فروخت کے حوالے سے چند متعلقہ دستاویزات کی فوٹو کاپی لے کر رخصت ہو گیا۔

نادر شاہ کے جانے کے بعد ماں نے مجھ سے پوچھا۔
”علی! شاہجی تمہیں کیسے لگے؟“

”ماں! آپ کو شاہجی پر اندھا اعتماد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بس، میرے لیے یہی کافی ہے۔ ظاہر ہے، آپ کسی غلط آدمی پر تو بھروسہ کر نہیں سکتیں!“
”ٹھیک کہا تم نے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔ ”آج شاہجی سے تمہاری پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ دو چار مرتبہ ملو گے تو وہ تمہاری سمجھ میں آ جائیں گے۔“
میں نے ماں کی اس بات پر کوئی تمبرہ نہیں کیا اور انہیں پوری تفصیل کے ساتھ وہ کہانی سادی جوان کے ویزا کے سلسلے میں میری کوششوں پر بتائی۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولیں۔
”واہ بھئی..... یہ تو کمال ہو گیا۔ اب آگے اور کتنے اسٹیپ ہیں؟“

”صرف ایک اسٹیپ باقی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
”میں سمجھی نہیں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے مجھ دیکھنے لگیں۔
میں نے سمجھا یا۔ ”اگر آج کوئٹہ کے آفس ٹائم میں ہم آپ کی ویزا انٹری جمع کروا دیتے تو تھوڑی دیر کے بعد انٹرویو کا اسٹیپ مکمل ہو جاتا۔ اب یہ کام مجھے امید ہے، کل دوپہر تک ہو جائے گا۔ امریکی کنسلیٹ آپ کے انٹرویو کے لیے دو تین تاریخیں اور دو تین اوقات آخر کرے گی۔ ان میں سے جو تاریخ اور وقت ہمیں موزوں لگے گا، وہ ہم کو کنسلیٹ کو نفرم کر دیں گے۔ بس پھر اس تاریخ کو آپ نے مقررہ وقت سے کم از کم ایک گھنٹا پہلے اپنے پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور دیگر ضروری کاغذات کے ساتھ انٹرویو کے لیے امریکی کنسلیٹ پہنچ جانا ہے۔“
”وہ لوگ عموماً کتنے دن میں پاسپورٹ واپس کر دیتے ہیں؟“ ماں نے پوچھا۔
”یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
”ویسے عموماً اس پروکس میں تین سے آٹھ دن لگ جاتے

کر اس کے چہرے پر بے پناہ خوشی چمک اٹھی تھی۔ وہ میری بازیابی پر بار بار ماں کو مبارک باد دے رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی مختصر گفتگو کی۔ چونکہ ماں نے خود ہی میرے بارے میں نادر شاہ کو تعیلات سے آگاہ کر دیا تھا، اس لیے اس نے مجھ سے زیادہ سوالات نہیں کیے البتہ اس نے دو تین مرتبہ مجھے یہ نصیحت ضرور کی۔

”دیکھو بیٹا! تمہاری ماں نے بہت صدمے اٹھائے ہیں۔ اللہ نے تمہیں سلیٹی بہن سے ملوایا ہے تو قدرت کی اس نوازش کی قدر کرنا۔ جب تک تم لوگ یہاں سے روانہ نہیں ہو جاتے، بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ تمہاری شکل ہو بہو حیدر علی کی صورت ہے اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ زیادہ وقت گھر کے اندر اپنی ماں کے ساتھ ہی گزارو تاکہ تمہارے دشمنوں کو کوئی اچھا وار کرنے کا موقع نہ مل سکے۔“
”جی انکل۔“ میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ”میں آپ کی ہدایات کو ذہن میں رکھوں گا۔“

”سلیٹی بہن! میں تمہارے منصوبے کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ وہ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا یہ بڑا بہن ہے کہ تم نے مجھے قابل بھروسہ سا سمجھا۔ ان شاء اللہ! میں بھی تمہارے اعتماد کو نہیں ٹھنڈے دوں گا۔ جو کام تم نے میرے ذمے لگائے ہیں، یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ آپ لوگوں کے جانے سے پہلے میں ہنگو کی فروخت کا کام نمٹا دوں گا اور اس کے بعد ٹرسٹ والے منصوبے کا آغاز کر دوں گا۔ آپ نے دینی میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ آپ وہاں کسی مقامی عربی کے ساتھ پائز شپ میں کوئی بھی بزنس شروع کر دیں گی تو وہاں آپ کو سٹیبل ہونے میں کوئی وقت نہیں ہوگی۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“

”شاہجی! آپ میرے سچے خیر خواہ ہیں اس لیے میں نے اپنا منصوبہ آپ کے سامنے کھول کر بیان کر دیا ہے۔“ ماں گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ”میرے ارادے کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنا چاہیے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں.....“

”بھن! میں آپ کی توقع سے بھی زیادہ محتاط ہوں۔“ وہ ماں کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھاؤں گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“ لٹائی تو قف کر کے شاہجی نے ہم ماں بیٹے کو یکے بعد دیگرے دیکھا پھر سوال کیا۔
”ویسے آپ لوگوں کا کب تک جانے کا پروگرام ہے؟“
”رمضان کے آخری عشرے میں ہم یہاں سے



خود کردہ

سلیم انور

”خود پہ آئی... دوسروں پہ گنواٹی“ یہ محاورہ اگرچہ پرانا ہے مگر ہر دور میں اس کی تفسیر جابجا نظر آتی ہے۔ وہ بھی خود کو اتنا ہی ذہین سمجھ رہا تھا مگر ساری ذہانت اس کی متانت کو لے ڈوبی جب نقاب ہٹانے والوں نے اس کی اصل حقیقت کو جانچ لیا۔

تفتیشی اقدامات میں ساتھ ساتھ رہنے والے خطا کار کی چالاکی

دروازے کے نیچے ایک تولیا اڑسا ہوا تھا، اسی لیے اسے دھکیل کر کھولنے کے لیے ضرورت سے کچھ زیادہ دھکیلتا ہوا بیڈروم میں داخل ہونے لگا۔ اس کے عین پیچھے ہیرامیڈکس کی ایک ٹیم تھی۔ وہ لوگ ہی کوشش کرتا پڑی۔

”ابھی سائین روکے رہو۔“ سارجنٹ ولسن نے لپک کر اس شخص کے پاس پہنچے جو گیس کے آتش دان کے

اس کے آخری جملے میں ایک نامعلوم دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ اس سیلر کشتی کے دوران میں، میں مسلسل اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسی طرح یہ جان لوں کہ آخر..... وہ بھی کون؟ لیکن ابھی تک میری یہ سعی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے اسے کریدنے کی خاطر ایک چال چلتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ بتاؤ، مجھے کہاں آتا ہے۔ ویسے میں کراچی میں بالکل انجینی ہوں۔“

”اوکے میں سمجھاتی ہوں۔ ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ اس نے کمائی سے مجھے پتا سمجھا دیا۔

”ٹھیک ہے، میں تھوڑی دیر میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ”لیکن ایک مسئلہ ہے!“

”کیسا مسئلہ؟“ اس نے پوچھا۔

”اگرچہ تمہارا دعویٰ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے تمہارے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟ کم از کم تم مجھے اپنا نام تو بتا دو۔“

”تمہارے لیے صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے صورت آشنا ہیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اگر تمہیں کچھ یاد نہیں آ رہا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان لوں گی۔ چلو تمہاری یادداشت کو واپس لانے کے لیے اتنا بتا دیتی ہوں کہ میرے نام کے آخر میں این اے آتا ہے یعنی..... نا۔“

”اوہ.....!“ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں یکبارگی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ”کیا تم ڈیٹلفینا ہو؟“ لیکن یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے۔ کیا تم دانستہ لہجہ بدل کر بات کر رہی ہو.....؟“

اس نے میرے اضطرابی سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ لائن بے جان ہو چکی ہے۔ اس نے سیلر رابطہ موقوف کر دیا تھا۔

”کیا ڈیٹلفینا کراچی پہنچ گئی ہے؟“ میں نے خودکلامی کی۔ اس تصور نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی۔

امنگوں حوصلوں اور اہوں کے بیچ دلائی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھم گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

تکھنی پر اس خیال سے میں نے فون اٹینڈ کر لیا کہ دیکھوں تو سہی کہ آدھی رات کو کسی انجینی کو میری یاد کیوں آگئی ہے!

”ہیلو.....!“ میں نے کہا۔

”علی بات کر رہے ہوتا؟“ ایک نسوانی آواز نے بڑی بے تکلفی سے استفسار کیا۔

”ہاں۔ میں علی ہی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کون.....؟“

گنجی بات تو یہ ہے کہ دوسری طرف بولنے والی کو میں پہچان نہیں سکا تھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

”میں کوئی بھی ہوں، ابھی اور اسی وقت تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”آئی ایم سوری۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کو نہیں جانتا۔ آدھی رات کو میں کسی انجینی سے ملاقات نہیں کر سکتا۔“

”ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ اس کی مدھر آواز میری سماعت سے نکل گئی۔ ”اس لیے ملاقات میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

اس کا پرسرا انداز مجھے ان گنت ٹھوک و شبہات میں ڈال رہا تھا۔ میں نے اسے گھسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اگر ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور میں کسی وجہ سے تمہاری آواز کو پہچان نہیں پا رہا تو تم تعارف کرا دو۔ اگر تم واقعی میری شاسا ہو میں تو پھر ملاقات کے بارے میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔“

”علی! تم میری بات کا یقین کرو۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولی۔ ”ہم پہلے ہی مل چکے ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس وقت ہماری ملاقات اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے، ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔“

”فائدے کی بات ہر کسی کو چھی گئی ہے اور پھر تم نے میری کوئی ضرورت پوری کرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔“ میں نے اس کے پتے جھانکنے کی کوشش کی۔ ”لیکن جب تک میں تمہارے بارے میں کچھ جان نہ لوں، میں تم سے ملاقات نہیں کر سکتا۔ آئی ایم ریلی ویری سوری۔“

”دیکھو علی! اگر تم مجھ سے ملنے نہیں آؤ گے تو پھر مجبوراً مجھے تمہارے پاس آنا پڑے گا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”کیونکہ میں تم سے ملے بغیر نلنے والی نہیں ہوں۔ میں اگر تمہارے پاس آگئی تو تمہارے لیے کبھی مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔“

انہیں اپنے عقب میں کمرے کے دروازے کی جانب سے یہ آواز سنائی دی۔

اس تمام پہلے کے دوران وہ لوگ مرنے والے کے ان دو عزیزوں کو فراموش کر بیٹھے تھے جو اس وقت مکان میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک بین ہنٹر کا بیٹا ڈوگ ہنٹر تھا جو اپنے باپ کے بے جان جسم پر نظر کر جمائے ہوئے تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ بہت زیادہ زخمی ہو گئے تھے اور انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ میں گھر پر موجود نہیں ہوں گا۔ میں نے اپنے گھر وائس میل پر کال کی تو مجھے پیغام ملا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی!“

”بین کے ساتھ کچھ صحت کے مسائل بھی تھے۔“ بین کی بیوی کارلا ہنٹر گویا ہوئی۔ ”اور وہ ڈپریشن کا شکار بھی تھا۔ کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی؟“ کارلا نے ہنٹر سے علیحدگی اختیار کی ہوئی تھی اور وہ عمر میں اس سے دس سال چھوٹی تھی۔

”یہ ظاہر تو ایسا دکھائی نہیں دے رہا۔“ سارجنٹ ولسن نے کہا۔ ”بیوی ہونے کے ناتے اس کی جاندا کی وارنٹ تم ہی ہوگی، کیا یہ درست ہے؟“

”اب بچائی گیا ہے!“ کارلا نے کہا۔ ”وہ کاروباری طور پر پچھلے سال ہی دالیا ہوا تھا۔ اگر تم لوگ جواز جاننے کے لیے کسی کو تلاش کر رہے ہو تو ڈوگ سے پوچھو۔ بین نے اپنے پیسے کا وصیت نامہ تبدیل کر کے اپنے مرنے کے بعد بیمہ کی رقم کی وصولی کا ہمارا اپنے بیٹے ڈوگ کو قرار دے دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر بین کی موت تسلیم ہونے یا تصدیق درجہ سے واقع ہوئی ہے تو بیمہ پالیسی کے مطابق رقم کی ادائیگی ہوگی۔“

”یہ سچ ہے۔“ ڈوگ نے اقرار کیا۔ ”لیکن آج میں صبح سے دن بھر اپنے کام پر تھا۔ تم میرے پلانٹ پر میرے سپرد اکر رہے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہو۔“

شرمین نے سر ہلادیا۔ وہ ایسی صورت حال میں کسی حد تک نروس ہو جاتا تھا لیکن کمرے میں بسی ہوئی گیس کی بو اسے کچھ زیادہ ہی نروس کر رہی تھی۔

”کیا تمہارے پاس وہ وائس میل پیغام موجود ہے جو تمہارے باپ نے تمہارے لیے چھوڑا تھا؟“ ڈوگ ہنٹر نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”میں اسے سننا چاہتا ہوں۔“ ”یقیناً۔“ ڈوگ ہنٹر نے کہا پھر اس نے اپنے سیل فون کا لٹریچر اٹھایا اور کئی ایک نمبروں کے بین دبانے کے

قریب پڑا ہوا تھا۔ سارجنٹ ولسن نے گیس کا والو بند کر دیا اور پھر دوڑ کر کمرے کی تمام کھڑکیاں باری باری کھول دیں۔ ان تمام مراحل کے دوران شرمین ہومز ہال وے میں اپنی سانسوں پر قابو پائے وہیں کھڑا رہا۔

پیرامیڈیکل اسٹاف کے دونوں ممبرز کئی منٹ تک اپنی سی پوری کوشش کرتے رہے پھر انہوں نے ہار مان لی۔ ”یہ مر چکا ہے!“ انہوں نے فرش پر پڑے آدمی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سارجنٹ ولسن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے ان کی بات کی تصدیق کر دی۔ ”تم اب اندر آ سکتے ہو، شرمین۔۔۔۔۔ اور معمول کے مطابق سانس بھی لے سکتے ہو۔“

شرمین اس چھوٹے سے پُر آسائش بیڈ روم میں داخل ہو گیا اور اس کا بھرپور جائزہ لینے لگا۔ لاش کے نزدیک ہی ایک بیس بال کا بلا پڑا ہوا تھا اور لمبے کے دستے پر ایک تولیا بھی لپٹا ہوا تھا تاکہ لمبے کے دستے پر انگلیوں کے نشانات پائے جانے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

کمرے میں ایک اور دروازہ بھی تھا جو ایک پرائیویٹ باتھ روم میں کھلتا تھا۔ سارجنٹ ولسن نے اس کے دروازے کا تالا کھول کر اس میں موجود کھڑکی بھی کھول دی اور ایگزاسٹ فین چلا دیا تاکہ یہاں اگر کوئی گیس ہو تو وہ بھی باہر نکل جائے۔

شرمین نے بین ہنٹر کی بائیں کتیشی پر چوٹ کے نشان کو دیکھا، پھر دم گھٹنے سے نیچے پڑ جانے والے ہونٹوں کا جائزہ لیا اور آخر میں اس کھلے ہوئے سیل فون کو دیکھا جو اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ ”اگر اس نے اپنے بیٹے کے گھرنون کرنے کے بجائے پولیس کو فون کر دیا ہوتا تو شاید اب بھی زندہ ہوتا۔“

”ہوسکتا تھا اور نہیں بھی۔“ سارجنٹ ولسن نے کہا۔

”میرا اندازہ ہے کہ قاتل نے اس کو بیس بال کے لمبے سے ضرب لگائی، پھر گیس کا والو کھول دیا اور یہاں سے نکل گیا۔ معزوب میں اتنا ہوش اور طاقت باقی تھی کہ اس نے جیب میں سے اپنا سیل فون نکال لیا اور اپنے فون کے اسپڈ ڈائل کا پہلا نمبر دبا دیا۔ اسے اپنے بیٹے کو اپنا پتہ یا کوئی اور معلومات فراہم کرنے کی ضرورت نہیں تھی جو کہ پولیس کو فون کرنے کی صورت میں فراہم کرنا پڑتی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ یہ اس کی ایک اسارٹ کوشش تھی لیکن اس کی قسمت کہ اس وقت اس کا بیٹا گھر پر موجود نہیں تھا۔“

”ہفتے کے عام دنوں میں، میں بھی گھر پر نہیں ہوتا۔“

تبادلہ

مظہر سلیم ہاشمی

بعض اوقات ایک باشعور انسان بڑے مزے سے اپنی عقل کے بل پر دوسرے انسان کو بے وقوف سمجھ کر باتوں کے جال میں قید کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر... بے بسی کی انتہا کہہ مومقابل جان بوجھ کر اس جال میں قید ہو جانے پر مجبور ہوتا ہے جیسا کہ یہاں... کیونکہ ہر خریدی ہوئی چیز واپس نہیں ہوتی البتہ تبادلہ ممکن ہو جاتا ہے مگر... بدلے میں اسے کیا ملتا ہے یہ اس کا نصیب۔

خیریداری میں خوارى اٹھانے والے
ایک سادہ انسان کا قصہ



”ہیلو سر... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“
”مجھے یہ الارم والی گھڑی واپس کرنی ہے۔“
”جی... کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟“
”اس کا الارم ہی نہیں بجتا۔“
”وہ کس طرح؟“
”مطلب الارم کی آواز ہی نہیں آتی۔“
”کیا آپ نے اس کے ساتھ دیے ہوئے کتابچے سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی؟“
”ہاں جی... کوشش تو کی تھی۔“
”تو کیا پھر بھی مسئلہ حل نہیں ہوا؟“
”نہیں۔“
”تو... کیا آپ کے پاس اس کی رسید ہے؟“
”نہیں۔ بڑا تلاش کیا لیکن نہیں ملی۔“
”اوہ... پھر تو آپ کی رقم واپس نہیں ہو سکے گی۔“
”ارے نہیں... آپ غلط سمجھے... مجھے پیسے واپس نہیں چاہئیں... مجھے تو بدلے میں ایک ایسی گھڑی درکار ہے جس کا الارم کام کرتا ہو۔“
”ٹھیک ہے کیا آپ اس کا پینکٹ والا ڈبلائے ہیں؟“
”نہیں... وہ تو میں نے پیسک دیا۔“
”مگر جناب ڈبے کے بغیر تو میں تبادلہ نہیں کر سکتا۔“

مکمل کام اپنے اس نرالے دوست کو قائل کرنا اور پھر ڈسٹرکٹ انٹرنی کو مطمئن کرنا تھا تا کہ وہ درست فرد پر مقدمہ دائر کر سکے۔ ”میں تفتیش کے لیے کسے لے کر آؤں؟“ اس نے شرمین سے پوچھا۔

”کسی کو بھی نہیں۔“ شرمین نے جواب دیا۔ ”یہ کام جس فرد نے سرانجام دیا ہے، تم اسے کبھی بھی حراست میں نہیں لے سکتے لیکن وہ ملزم ہونے سے کبھی بھی نہیں بچ سکتا۔“
”سنو، شرلاک ہومز!“ سارجنٹ ولسن چیخ پڑا۔ ”میں پہیلیاں بھجوانے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں۔“

”قتل کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، سارجنٹ۔ بس یہ انشورنس فراڈ کی ایک کوشش تھی۔“
اس سے قبل کہ سارجنٹ اپنی حیرت کا اظہار کرتا، شرمین نے اپنی بات جاری رکھی۔

”بین، منتر نے خودکشی کی ہے... لیکن غیر متوقع طور پر نہیں۔ اس کے کاروبار کی ناکامی، دو الیپن اور خرابی صحت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ قطعی ممکن بات تھی لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیہوشی رقم اس کے بیٹے ڈوگ کو مل جائے۔ اس لیے اس نے کس آن کی، بیس بال کے بلے سے خود کو ضرب لگائی اور پھر اپنے بیٹے کے گھر پر فون کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس وقت گھر میں موجود نہیں ہوگا۔ اس نے پولیس کو یا اپنے بیٹے کے سیل فون پر جان بوجھ کر فون اس لیے نہیں کیا کہ اس کے لیے مدد بہت جلدی آ جاتی۔“
”تو پھر مدد کے لیے کال کیوں کی تھی؟“

”بین نے یہ کہا تھا کہ حملہ آور باہر ہال میں نکل گیا ہے پھر بین اس کمرے کو چھوڑ کر ہال میں کس طرح گیا ہوگا؟“ شرمین نے سوال کیا۔

”دروازے کے راستے۔“ سارجنٹ ولسن نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”اس کمرے سے باہر جانے کا یہی تو ایک راستہ ہے۔“

”دوست!“ شرمین نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔
”تو پھر دروازے کے نیچے تو ایسا کس طرح چھپایا گیا تھا... وہ بھی اندر کی جانب سے؟“

سارجنٹ ولسن اس بات پر سوچ میں پڑ گیا۔
”ظاہر ہے۔“ شرمین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کام وہی کر سکتا تھا جو کمرے اندر موجود تھا۔ اور وہ بین خود تھا۔“



سورۃ یاسین قبر کے عذاب سے بچاتی ہے۔
سورۃ رحمن امیر کرتی ہے۔
سورۃ واقعہ بھوک مٹاتی ہے۔
سورۃ الملک قبر میں روشنی کرتی ہے۔
سورۃ الجاثیہ زندگی میں امن لاتی ہے۔

☆☆☆

ہاں باپ کا دل اور دامن پوری کا نبات سے زیادہ وسیع ہوتا ہے جو کبھی اولاد کی خوشیاں مانگنے کے لیے پھیلتا ہے اور کبھی ان کے دکھ سہینے کے لیے۔

☆☆☆

☆ پرانے زمانے میں شادی کی تاریخ گھر کے بڑے طے کرتے تھے۔ اب شادی ہال والے طے کرتے ہیں وہ بھی تین ماہ پہلے۔

☆ سجدوں سے رب کو اور اخلاق سے اس کے بندوں کو خوش رکھو دونوں جہان میں آسانی ہوگی۔

☆ دنیا میں سب سے مہنگا کیویڈ آنسو ہیں جس کے ایک قطرے میں 1 فیصد پانی اور 99 فیصد احساس ہوتا ہے۔

☆ کوشش کرنا کسی کے آنسو بننے کی وجہ آپ کی ذات نہ ہو۔

☆ نصیحت کسی کو شرمندہ کرنے کے لیے نہیں کرنی چاہیے اور نصیحت کا مقصد دستک دینا ہونا چاہیے۔ دروازہ توڑنا نہیں۔

مرسلہ: شتیق حسین۔ نیو کراچی، سندھی ہوٹل

بعد فون شرمین کو تھا دیا۔
فون سے ابھرنے والی آواز نجف سی تھی۔ ”کسی نے مجھے ضرب لگائی ہے۔ بیٹا روم... گیس... نہیں معلوم وہ کون تھا... میں بدستور گھر میں ہوں... ہال میں... جلدی کرو۔“

شرمین نے اس پیغام کو درود متبہ بنا پھر سیل فون ڈوگ کو واپس کر دیا۔

سارجنٹ ولسن اپنے دوست شرمین کو ایک طرف لے گیا اور ایک مکمل ہوئی گھڑی کے پاس پہنچ کر بولا۔
”تمہارے خیال میں ان میں سے کسی ایک نے کسی کی خدمات حاصل کی ہوں؟ کسی کرائے کے قاتل کی؟“

شرمین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، اصل بات اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔“

☆☆☆

سارجنٹ ولسن کو اپنا کام مکمل ہوتا محسوس ہوا تھا لیکن

اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغام حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنادی گئی... جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا پر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال بن کے بنی نوع انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جھانسی سے نکلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعائوں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

حضرت یوسف علیہ السلام

رضوانہ ساجد

آخری حصہ



انہوں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی اور جمع ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے۔ پہلے خوشامد کی اور اس مرتبہ بھی جب صاف جواب مل گیا تو وہ دمکھوں پر اتر آئے۔

”اپنے بھائی کو لے جانے کے لیے ہم سے جو بھی ہوگا وہ کریں گے۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری بے پناہ فوج کے باوجود تم حملہ کر کے اپنے بھائی کو چھڑا کر لے جاؤ گے؟“

سکتا ہے یہ آپ نے پائیں دن پہلے خریدی ہو۔ ایسی صورت حال میں آپ اگر رسید اور اصل ڈبا بھی لے آتے تو وارنٹی کلیم کر سکتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر پایا اور مزید بھی نہ کر پاؤں گا۔“

”بالکل بھی نہیں؟“

”جی بالکل... بھی نہیں...“

”تو اب یہ خراب گھڑی میں ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھوں گا؟“

”آپ اس کی خرابی کی شکایت کے ساتھ اس کو ٹیکٹری بھیج سکتے ہیں۔“

”اب میں اس کو چاہتا تو بھیجنے سے رہا...“

”پھر میں یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ اس کو کسی گھڑی ساز کے پاس لے جائیں۔“

”وہ تو اتنا ماضی طلب کر لیتے ہیں جتنے میں نئی گھڑی آجائے۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”کیا میں فیجر سے بات کر سکتا ہوں؟“

”وہ آج چھٹی پر ہیں۔“

”تو جو انچارج ہیں ان سے ہی میری بات کرا دیں۔“

”آپ پہلے سے ہی ان سے بات کر رہے ہیں۔“

”فیجر کی کل تک واپسی ہو جائے گی؟“

”نہیں۔“

”پھر کب تک آجائے گا؟“

”آج آئیں گی۔“

”اودہ... اچھا... پھر وہ کب تک آجائیں گی؟“

”پھر کو۔“

”میں پھر پیر کے روز ہی آؤں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں آپ کی کسی اور چیز کی خریداری میں مدد کر سکتا ہوں؟“

”میرا نہیں خیال۔“

”اوکے... کیا آپ اپنا اسٹور کارڈ بنوانا پسند کریں گے؟ یہ بالکل مفت ہے۔ بس اپنی تفصیلات جمع کرائیں اور آپ کو اس کے بعد ہر چیز کی خریداری پر پانچ فیصد کی یعنی پچت ملا کرے گی۔“

”نہیں... شکریہ!“

”اگر آپ اپنا کارڈ آج بنواتے ہیں تو کرسک کی خوشی میں ایک خوبصورت تحفہ بھی ساتھ میں مفت پائیں گے۔“

”تحفہ کیا ہے؟“

”الارم والی گھڑی۔“

”یہ سخت پلاسٹک والے ڈبے میں بیک تھی۔ مجھے چھری کی مدد سے کاٹ کر اسے نکالنا پڑا۔... مجھے کچھ نہیں آ رہی کہ آپ کو اس کے ڈبے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”ہماری پالیسی کے مطابق معمولات کی تہدیلی ان کے اور بیکل ڈبے کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔“

”اتنا سارا بے کار پلاسٹک تھا۔ میں اس بکھرے کو کیوں سنبھال کر رکھتا؟“

”بھئی ظاہر ہے۔ تہدیلی کے وقت کام آجاتا۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ گھڑی چند ہفتوں میں کام کرنا بند کر دے گی۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“

”مدد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ خریداری کا کوئی ثبوت پیش کر سکیں۔“

”میں خود ثبوت ہوں۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں نے اسے یہیں سے خریدا تھا۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے میرا بل بھی آپ ہی نے بنایا تھا۔“

”کیا آپ نے اس کا وارنٹی نمبر آن لائن رجسٹر کیا تھا؟“

”نہیں۔“

”آہ۔ یہ تو مسئلہ ہو گیا ہے پھر۔ آپ نے ادائیگی کیسے کی تھی۔ کارڈ یا کیس؟“

”نقد۔“

”اگر آپ نے کارڈ سے ادائیگی کی ہوتی تو آپ کے بینک سے اسٹینٹ مل جاتی کہ آپ نے کس دن خریداری کی۔“

”تو... میں نے تو نقد رقم دی تھی۔“

”دراصل مسئلہ یہ ہے کہ دوسرے اسٹور بھی یہ والی گھڑی بیچتے ہیں آپ اسے کہیں اور سے بھی خرید سکتے ہیں۔“

”بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں نے یہ گھڑی ادھر سے ہی خریدی تھی اور اب اس کی خرابی کے بعد آپ مجھے ایک نئی گھڑی دینے کے ذمے دار ہیں۔“

”آپ نے یہ خریدی کب تھی؟“

”چند ہفتے قبل۔“

”ہماری تہدیلی کی پالیسی ایسی دن کی معاوضہ رکھتی ہے۔ مجھے لگتا ہے آپ اس وارنٹی سے بھی نکل چکے ہیں۔“

”میں نے پچھلے ماہ کی کسی تاریخ کو ہی... اب صحیح دن یاد نہیں آ رہا۔“

”ہم ایسی گھڑیاں پچھلے دو سال سے بچہ رہیں۔“

”آپ کو لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“

”بالکل نہیں جناب۔ میں بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ ہو

”ہم آپ کو صرف ایک دن دیتے ہیں۔ ہمارا بھائی ہمارے پاس پہنچ جائے ورنہ پھر ہم وہ کریں گے جو ہم نے سوچا ہے۔“
”میں اب بھی نہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ جلد سے جلد اپنے ملک کو لوٹ جاؤ۔ ہمیں ایسا نہ ہو کہ تم میں سے ایک بھی واپس نہ جاسکے۔“

یہ بھائی وہاں سے ہٹ گئے لیکن محل سے کچھ دور جا کر رک گئے۔ باہم مشورے پھر شروع ہو گئے۔ آپس کے اختلافات کے باوجود یہ طے ہو گیا کہ اگر محل تک بنیامین کو ہمارے حوالے نہیں کیا گیا تو ہم حاکم مصر پر اچانک حملہ کر کے بنیامین کو ہار کر الٹیں گے۔ اپنی بہادری کے ذمہ میں وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ وہ تعداد میں صرف دس ہیں۔ مصری افواج کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ انہوں نے وہیں محل کی آخری تفصیل کے قریب پڑاؤ ڈال لیا۔
مصری جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو فوراً اطلاع کر دی کہ دس بھائی محل پر حملہ کریں گے اور بنیامین کو چھڑا لے جائیں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ہوشیار ہو کر بنیامین کو تو محل کے اندر دینی جھے میں چھپا دیا اور اپنی چالیس ہزار سپاہ کو محل کے چاروں طرف متعین کر دیا اور انہیں حکم دے دیا کہ حملہ آوروں پر کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے بلکہ انہیں کسی ترکیب سے غیر مسلح کر کے بغاوت پر قابو پایا جائے۔

صبح ہوئی تو یہ دس بھائی محل کے سامنے پہنچے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو لالکارنے لگے۔ مصر میں جو کتنا ہی موجود تھے۔ وہ بھی ان کی مدد کو آ گئے۔ بہت ممکن تھا کہ ہنگامہ مٹول پکڑ جاتا لیکن چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام پہلے ہی باخبر ہو چکے تھے اور ضروری احتیاطات کر لیے تھے اس لیے اشارہ ملتے ہی مصری سپاہ نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور ایک ایک کر کے سب کو غیر مسلح کر دیا۔

”میں چاہتا تو تم میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ جاتا۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میرا تمہیں یہی مشورہ ہے کہ کنعان واپس چلے جاؤ۔ جو اناج تمہیں ملا ہے اسے کھاؤ۔ میں تمہیں تھوڑی مہلت اور دیتا ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں کنعان واپس جانا ہے یا میری قید میں دن گزارنے ہیں؟“
تمام بھائی اپنے پرانے ٹھکانے پر چلے گئے۔ اب وہ غیر مسلح بھی تھے اور اپنی ناکامی سے دل برداشتہ بھی۔ اختلافات کی دیواریں پھر کھڑی ہو گئیں۔ اس ناکامی کا الزام ایک دوسرے پر ڈالا جا رہا تھا۔
”آپس میں لڑنے کا کیا فائدہ۔ اب تو یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے۔“

”مصری افواج سے مقابلہ کرنا آسان نہیں جبکہ مصر میں رہنے والے تمام کنعانیوں کے ہتھیار لے لیے گئے ہیں، کوئی بھی ہماری مدد کو نہیں آئے گا۔“

”ایک مرتبہ پھر حاکم مصر کو بوڑھے باپ کا واسطہ دے کر بنیامین کی رہائی پر آمادہ کیا جائے؟“

”کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نہیں مانے گا۔“

”پھر ہم سب بھی یہیں رک جائیں۔“

”چوری بنیامین نے کی ہے، ہم کیوں سزا بھگتیں۔“

”ہم باپ سے جا کر کیا کہیں گے؟“

”جوج ہے وہ کہہ دیں گے کہ تیرے بیٹے نے چوری کی تھی پکڑا گیا۔“

”وہ ہماری بات کا یقین کر لیں گے؟“

”بہت سے کنعانیوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ گواہی دیں گے ورنہ ایک سال بعد بنیامین خود آ کر بتائے گا کہ اس سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے۔“

بڑا بھائی راہین مصر چھوڑنے کا سخت مخالف تھا۔ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہہ کر آیا تھا کہ اگر میں بنیامین کو واپس نہ لاؤں تو ہمیشہ کے لیے گناہگار بن رہوں گا۔ اس لیے اب باپ کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

بھائیوں نے اس کی مخالفت کی اور بنیامین کے بغیر ہی کنعان واپس جانے کا تہیہ کر لیا۔

(بعض نے لکھا ہے راہین مصر ہی میں رک گیا تھا)

میدان خالی ہوا تو جنہوں نے فوراً اطلاع کر دی کہ کنعان سے آئے ہوئے دس بھائیوں نے مصر چھوڑ دیا اور شمالی دروازے سے نکل کر کنعان کی طرف جا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ اس رات نہایت پرسکون نیند سوئے۔ تھوڑی دیر کو انہیں محسوس ہوا کہ وہ کنعان میں اپنے گھر میں ہیں۔ بنیامین ان کے پاس ہے اور باپ بس آتے ہی ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی سوتیلے بھائی اور ان کا رویہ یاد آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بھائیوں کا یہ جملہ کانون میں گونج رہا تھا۔

”بنیامین نے چوری کی تو کیا تعجب۔ اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔“

انہوں نے مجھ پر الزام کیوں لگایا؟ انہیں بھائیوں کے ظالمانہ رویوں سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی اس الزام سے ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگے کہ بھائیوں نے جو اتنا بڑا الزام لگایا ہے اس کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں۔ بچپن کی یادوں میں سے ایک یاد ان کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی والدہ کے کہنے پر اپنے ماموں لایان کے پاس فدان آرام چلے گئے تھے۔ وہیں انہوں نے ماموں کی دو بیٹیوں لعیہ اور راحیل سے شادی کر لی تھی (اس زمانے میں دو بیٹیوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا جائز تھا) حضرت یعقوب علیہ السلام کی تمام اولادیں بنیامین کے علاوہ فدان آرام میں ہی پیدا ہوئیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ انہوں نے لایان یعنی اپنے نانا کا ایک بت چوری کر لیا تھا اور اسے توڑ دیا تھا۔ بچپن ہی سے توحید پرستی آپ کی فطرت میں داخل تھی لہذا بت کا وجود آپ کو ناگوار ہوا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اسے چوری نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ توبت پرستی کے خلاف نفرت کا اظہار تھا۔

پھر انہیں وہ واقعہ یاد آ گیا جب ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ بنیامین شیر خوار تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کے بھائی ان کے حسن و جمال کی وجہ سے حسد کرتے تھے تو ان کی چھوٹی انہیں اپنے گھر لے گئیں اور نہایت محبت سے ان کی پرورش کرنے لگیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں چھوٹی کے گھر بھیج تو دیا لیکن ان کا سکون اٹھ گیا۔ گھر میں ہر طرف انہیں ڈھونڈتے پھرتے تھے پھر انہیں دیکھتے چھوٹی کے گھر چلے جاتے۔ کچھ دیر کو سکون مل جاتا۔ گھر لوٹ کر آتے تو پھر وہی بے سکونی۔ چھوٹی کے گھر انہیں چھوڑنا ان کی مجبوری بھی تھی کیونکہ گھر میں انہیں اپنے بڑے بیٹوں سے ڈر لگا رہتا تھا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت نے پھر ایک راستہ یہ نکالا کہ یوسف ایک ہفتہ ان کے پاس رہیں گے، ایک ہفتہ چھوٹی کے پاس۔ اس ایک ہفتے کی جدائی بھی آپ کو شاق گزرنے لگی۔ اب انہوں نے اپنی بہن سے صاف کہہ دیا کہ یوسف کو وہ ان کے پاس نہیں چھوڑ سکتے۔ اب جو وہ رہنے آئیں گے مستقبل میرے ہی پاس رہیں گے۔

چھوٹی کو بھی ان سے ایسی محبت ہوئی تھی کہ وہ انہیں مل بھر کے لیے خود سے جدا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ اب وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان کے گھر مستقبل قیام پر مجبور ہو جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار اشیا میں سے ایک کمر بند تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کی چھوٹی کے پاس تھا۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو لینے آئے تو ان کی چھوٹی نے انہیں تیار کیا اور یہ یادگار کمر بند ان کے کرتے کے نیچے کمر سے باندھ دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام انہیں لے کر گھر آ گئے۔ پیچھے پیچھے ان کی بہن بھی آ گئیں۔ حضرت یعقوب انہیں دیکھ کر مسکرائے۔

”تمہیں یوسف سے ایسی محبت ہوئی ہے۔ ابھی تو میں اسے لا رہا ہوں۔ تم اسے دیکھنے چلی آئیں؟“

”اس کی محبت اپنی جگہ لیکن اس وقت میں کسی اور کام سے آئی ہوں۔ دادا ابراہیم کے زمانے کا ایک ازار بند تھا جو گھر سے غائب ہو گیا ہے۔ اسی کی تلاش میں آئی ہوں۔ وہ میرے لیے بڑا قیمتی تھا۔“

”تم کیا سمجھتی ہو، کس نے لیا ہوگا؟“

”شاید آپ کے کسی نوکر نے اڑا لیا ہو۔“

”وہ متبرک ہے اس لیے ہمارے نزدیک قیمتی ہے۔ کوئی اور کیوں لینے لگا تھا۔ پھر بھی میں نوکروں کو بلاتا ہوں، تم ان سے پوچھ کر لو۔“

نوکروں کو بلا لیا گیا۔ ایک ایک سے پوچھا۔ ہر ایک نے انکار کیا۔ اب حضرت یوسف علیہ السلام ہی رہ گئے تھے۔

”مجھے بڑی شرمندگی سے کہنا پڑ رہا ہے لیکن آپ ذرا یوسف کو بلوائیں۔ میں اس سے بھی پوچھتی ہوں۔“

ہماری تلاش کی۔ ہمارے پاس سے کچھ نہیں نکلا لیکن تمہارا چہیتا بیٹا اسے چرا کر لے آیا تھا۔ اس کے سامان سے پیالہ برآمد ہو گیا۔ ہم نے حاکم مصر کو بہت دھمکیاں دیں۔ اس سے لڑنے کو تیار ہو گئے لیکن اس نے بنیامین کو تادان کے طور پر اپنے پاس روک لیا۔ اب وہ ایک سال تک اس کی غلامی کرے گا۔

”میں پھر کہتا ہوں، تم فرضی داستان مجھے سنار ہے ہو۔ بنیامین چوری نہیں کر سکتا۔“

”ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ معصوم ہے لیکن وہ تو اپنے بڑے بھائی سے بھی زیادہ نکلا۔“

”اے میرے بیٹا! تم یوسف کے ساتھ بھی تخلص نہیں تھے اور اب بنیامین کے ذریعے مجھے تکلیف پہنچانے پر تے ہوئے ہو۔“

”مگر ہم میں سے کوئی یہ حرکت کرتا تو آپ کو پروا بھی نہیں ہوتی۔ یوسف کے لیے دن رات روتے رہتے ہیں اور اب بنیامین کا بھی ایسا ہی غم منائیں گے۔“

”تم جاؤ، اپنا کام کرو۔ مجھے تم سے کیا سروکار۔ میرے لیے اب مصر کے سوا کیا رہ گیا ہے۔ خدائے تعالیٰ سے کیا بعید کہ وہ ایک دن ان تم کشکان کو مجھ سے ملا دے۔ اچھا ہوا میری آنکھیں چلی گئیں ورنہ مجھے تمہاری صورتیں دیکھنا پڑتیں۔ اب مجھے رونے کے سوا کیا کام رہ گیا ہے۔“

ان کی بے نور آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا غم کیا کم تھا کہ اب بنیامین کا غم بھی اس میں شامل ہو گیا۔ انہیں ہرگز یقین نہیں تھا کہ بنیامین نے چوری کی ہوگی اور حاکم مصر نے انہیں روک لیا ہوگا۔ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح ان کا یہ بیٹا بھی بھائیوں کے ظلم کا نشانہ بن چکا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام دن رات دونوں بیٹوں کے فراق میں تڑپتے رہتے تھے۔ دل غم کی سوزش سے جل رہا تھا، آنکھیں سپید ہو گئی تھیں۔

ان کے بیٹے اس مرتبہ اس حد تک سچے تھے کہ بنیامین کو انہوں نے غائب نہیں کیا تھا بلکہ اس پر واقعی چوری کا الزام تھا۔ وہ بے اعتبار ہو چکے تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ اب ان ناخلف بیٹوں کو ان پر غم آنے لگا تھا لیکن اس میں بھی حسد کا جذبہ موجزن تھا یعنی ان کے رونے میں بھی یوسف اور بنیامین کی محبت ظاہر ہوئی تھی۔

ایک روز ان کے بھائیوں نے انہیں سمجھانے کے لیے یہ لب و لہجہ اختیار کیا۔

”ہم آپ کے ہر وقت کے رونے سے تنگ آ گئے ہیں۔ آپ کو یہ خوشی نہیں ہے کہ دس بیٹے موجود ہیں۔ دو کے لیے روتے رہتے ہیں۔“

”میں نے تم سے تو کچھ نہیں کہا۔ آخر انسان ہوں، بیٹے یاد آ ہی جاتے ہیں جبکہ ان دونوں کو میں نے تمہارے ہاتھوں سے کھوایا ہے۔“

”آپ کو اگر ہماری باتوں پر یقین نہیں آیا تو ہمیں ڈر ہے آپ اپنی جان گھالیں گے اور روتے روتے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔“

”اگر تمہیں میرے مرنے کی اتنی ہی فکر ہے تو ایک مرتبہ پھر مصر جاؤ اور میرے بیٹے بنیامین کو لے کر آؤ۔ حاکم سے کہنا اس کا بوڑھا باپ اندھا ہے ورنہ خود چل کر آتا۔ اگر تم سچے ہو تو ضرور جاؤ گے۔“

”حاکم مصر کے پاس جانے کا اب ہمارا من نہیں۔ ایک سال کے لیے مصر کرلو۔ وہ خود آ جائے گا۔“

”مصر ہی تو کر رہا ہوں۔ فریادیں تو اپنے اللہ سے کرو۔ وہ میری فریاد ضرور سنے گا۔“

اس وقت دل سے کوئی ایسی آہ نکلی تھی کہ عرش تک مل گیا۔ اللہ نے اپنے نیک بندے کی تسلی کے لیے حضرت جبرائیل کو بھیجا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا خاندان غم خوشیوں سے بس گیا۔

”اللہ نے پیغام بھیجا ہے کہ یعقوب غمزدہ کیوں ہوتے ہو۔ یوسف زندہ ہیں اور بڑے مرتبے پر ہیں۔ خزانے ان کی دسترس میں ہیں۔ وہ لینے والوں میں سے نہیں دیئے والوں میں سے ہیں۔ ہزاروں لونڈیاں، باندیاں ان کی خدمت پر مامور ہیں۔ اللہ نیک لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیتا ہے۔“

”یہ پیغام تو میرا دل بھی مجھے بتا رہا ہے۔“ حضرت یعقوب نے کہا۔ ”میں تو یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ میرا نور

”آپ میرے یوسف کو چور سمجھ رہی ہیں؟“

”بچہ ہے، شاید مکمل مکمل میں چھپا لیا ہو۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کو بلوایا گیا۔ ان سے پوچھا گیا تو ظاہر ہے انہوں نے عالمی کا اظہار کیا لیکن پھوٹی کو معلوم تھا۔ انہوں نے کڑتا اور کیا اور ازار بند برآمد ہو گیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو یقین تھا کہ یوسف چور نہیں۔ ان کی بہن نے انہیں اپنے پاس روکنے کے لیے چال چلی ہے۔ انہوں نے بہن سے یہ کہیں کہا کہ چوری یوسف کی نہیں، تمہاری پکڑی گئی ہے۔

”ہمارے قانون میں چوری کی سزا یہ ہے کہ یوسف کو تمہاری غلامی کرنی ہوگی۔ اب میں اسے نہیں روکوں گا۔ تم اسے لے جا سکتی ہو۔ میں بھی اسے دیکھنے آ جایا کروں گا۔“

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پھوٹی کے پاس رہنے لگے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام واپس آ گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے کل کے نرم و نازک بستر پر لیٹے سوچ رہے تھے، یہ بھی کوئی چوری تھی جو میرے بھائی مجھے چور ہونے کا طعنہ دے کر چلے گئے۔

☆☆☆

مصر کی طرف سے آنے والی شاہراہ پر گرد و غبار اڑاؤ کی نے آ کر حضرت یعقوب علیہ السلام کو خبر کی کہ تمہارے بیٹے اناج لے کر آ گئے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام جواب تک بنیامین کی طرف سے بے فکر تھے، بیٹوں کی آمد کا سن کر بے چین ہو گئے۔ خدا کرے وہ خبریت سے ہو۔ اس کے بھائی یوسف کی طرح اسے بھی کہیں چھوڑ کر نہ آ گئے ہوں۔

دروازے پر کان لگے تھے۔ بار بار اپنے پوتوں سے پوچھتے تھے، تمہارے باپ آئے؟ بیٹوں کو آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ اناج سے لدے ہوئے اونٹوں کو کارندوں کے حوالے کرنا تھا۔ اس کے بعد بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ باپ کے سامنے جائیں۔ آخر ہمت کر کے دبے قدموں باپ کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو آہٹ سے اندازہ ہوا کہ کوئی آیا ہے۔

”تم آ گئے ہو مگر بولنے کیوں نہیں؟“

”جو کچھ ہم بولنا چاہتے ہیں اس کے لیے الفاظ کہاں سے لائیں۔“

”کیا تمہیں اناج نہیں ملا؟“

”اناج تو مل گیا لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

اس کے بعد بیٹوں کی طرف سے پھر خاموشی ہو گئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے پھر پوچھا۔ اس مرتبہ ان کی آواز غصے سے بھاری ہو گئی تھی۔

”تم بولنے کیوں نہیں..... بولو کیا جرم کر کے آئے ہو؟“

”جرم ہم نے نہیں کیا۔“

”تو کیا حاکم مصر نے تمہاری شان میں گستاخی کر دی؟“

”تمہارے بیٹے نے ہمیں رسوا کر دیا۔“

”میرے تو تم سب ہی بیٹے ہو۔ کس بیٹے نے رسوا کر دیا؟“

”آپ کے بیٹے بنیامین نے چوری کر کے ہم سب کو ذلیل کر دیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ ایسی حرکت کرے گا، ورنہ ہم تم سے یہ وعدہ نہیں کرتے کہ اسے ہر حال میں لے کر آئیں گے۔“

”خبردار! اگر اس کے خلاف کوئی ایسی روایت کی۔ بنیامین اور چوری؟ یہ تمہارے دل میں گھڑی ہوئی کوئی بات ہے جو تمہاری زبان پر آ گئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تم پہلے جھوٹ بول چکے ہو کہ یوسف کو بھیڑیا لے گیا۔“

”تمہیں تو ہماری کسی بات کا یقین ہی نہیں آتا جبکہ ہم سچے ہیں اور واقعہ یہی ہے کہ حاکم مصر نے ہم سے بہت اچھا سلوک کیا تھا اور ضرورت سے زیادہ اناج دے کر رخصت کیا تھا۔ ہم اناج لے کر آ رہے تھے کہ شاہی کارندے دوڑتے ہوئے آئے اور ہمیں روک لیا۔ ایک کارندے نے کہا کہ ہم حاکم مصر کا قیمتی پیالہ چالائے ہیں۔ ہم نے انکار کیا۔ انہوں نے

نظر کب میرے سامنے ہوگا۔ میں دیکھ تو نہیں سکتا لیکن کب اس کی خوشبو سے میرے مشام جاں آباد ہوں گے۔“
”بس فراق کے ختم نہ ہونے۔ ملاقات جلد ہو جائے گی۔ اپنے اللہ کو راضی کر دو۔ دنیاوی تدبیروں کے ساتھ ساتھ اس سے بھی فریاد کرتے رہو۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ ان کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے اپنے احکام جاری کر رہا تھا۔ اللہ نے بھائیوں کے دلوں میں ڈالا کہ وہ باپ کی طرف سے ایک خطا کا حکم مصر کے لیے لے کر جائیں اور اپنی طرف سے بھی اس کی خوشامد کریں۔ شاید اس کے دل میں رزم آجائے اور وہ بنیامین کو ہمارے ساتھ آنے دے۔
یہ سب بھائی مل کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
”اے باپ! ہمیں اجازت دے کہ ہم تیری مرتبہ مصر جائیں اور بنیامین کو لانے کی کوشش کریں۔ خط بھی شدید ہے، ہمیں اتنا جی بھی ضرورت ہوگی۔“

”اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی ناامید نہیں ہوتا۔“
حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کا نام لیا تو بیٹوں کی تیوریوں پر پل پڑ گئے۔
”ہمیں تو بنیامین سے سرکار ہے کہ وہ زندہ ہے۔ آپ یوسف کا نام کیوں لیتے ہیں۔ اسے تو بھیڑیا کھا چکا۔ اس کا سراغ ہمیں کہاں ملے گا۔“

”یوسف کا نام میں نے اس لیے لیا کہ میں جو کچھ جانتا ہوں، تم اس سے بے خبر ہو۔“
”آپ کو کسی کٹائی نے بھکا دیا ہے کہ یوسف زندہ ہے۔“
”تم مصر جانے سے اسی لیے ڈرتے ہو کہ یوسف نہیں تمہارا کوئی راز وہاں دفن ہے۔ تم مصر جاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔“
حضرت یعقوب علیہ السلام کی باتوں سے بیٹوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔
”بھائیو! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والد کو یوسف کا سراغ مل گیا ہے۔ اتنے مطمئن وہ کبھی نہیں تھے جتنے آج نظر آ رہے تھے۔“

”پڑوس میں ایک بوڑھا رہتا ہے جو یہ دعویٰ کرتا رہتا ہے کہ وہ مصر میں یوسف سے مل چکا ہے۔ اسی نے ابا جان کے کان بھرے ہوں گے۔“
”ابا جان اس سے کیوں نہیں کہتے کہ جائے اور یوسف کو لے آئے۔“
”وہ کہتا ہے بہت بوڑھا ہو چکا ہوں، مصر تک جانے کی سکت نہیں۔“
”اس فضول بحث کو تو چھوڑو۔ اس وقت تو یہ کوشش کرو کہ حکم مصر کے نام خط لکھوا لیا جائے تاکہ ہم اتنا ج لاسکیں اور کوشش کریں گے کہ بنیامین بھی ہمارے ساتھ آجائے۔ ابا جان کے خط کا شاید کوئی اثر ہو۔“
حضرت یعقوب علیہ السلام نے حکم مصر کے نام خط لکھوا دیا۔

”میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرا ایک بیٹا جسے میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، غائب ہو چکا۔ میری کمرٹ گئی۔ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ بنیامین میرا سہارا تھا۔ آدھی جان اسی سے میرے جسم میں تھی۔ وہ بھی مجھ سے دور ہو گیا۔ اس کی خطائیں معاف کر کے اسے میرے پاس لوٹا دیتا کہ میں آسانی سے مر سکوں۔“
”مجھے میرے خدا نے بشارت دی ہے کہ میرا بیٹا یوسف زندہ ہے اور مصر میں ہے۔ آپ حاکم ہیں۔ اسے تلاش کر کے میری آنکھوں کی روشنی مجھے لوٹا دیں۔ اللہ آپ کا اقتدار دراز کرے۔“

تمام بھائی مصر جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہوں نے خط کھول کر پڑھا تو ان کے اندیشے سامنے آ گئے۔
”ہم نے ابا جان سے کہا تھا کہ وہ خط میں یوسف کا ذکر نہ کریں لیکن انہوں نے یہی کیا اور ہمیں پھنسانے کا پورا سامان کر لیا۔ اگر حاکم مصر نے یوسف کو تلاش کر لیا تو ساری حقیقت واضح ہو جائے گی۔ یہ کوئی نہیں جانتا لیکن ہم جانتے ہیں کہ یوسف زندہ ہے۔ اگر مل گیا تو وہ سب کچھ بتا دے گا۔“
”اس خط کو لے جانا خطرناک ہے۔“ یہوداہ نے کہا۔ ”ہم اس خط کو حاکم تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہوگا،

زبانی کہیں گے تاکہ اس کے دل میں رحم آئے اور وہ ہمیں اتنا ج دے۔ بنیامین کو چھوڑنا ہے تو چھوڑ دے ورنہ ہمیں کوئی ایسی جلدی بھی نہیں۔“
بیٹوں کے چلے جانے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔

”اے اللہ! یہ عاجز و ناتواں بندہ تجھ سے مدد کا طالب ہے۔ میرا مبرا اب میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ دیکھ میری آنکھیں چلی گئیں۔ صدموں سے میری کمرہری ہو گئی۔ میرا امتحان ختم کر۔ میرے دونوں بیٹے مجھے لوٹا دے تیری خطائیں بخش دے۔ میرا امتحان ختم کر۔ میرا یوسف مجھے لوٹا دے۔ میرا بنیامین مجھے دے دے۔ میرے بیٹے انہیں ڈھونڈنے کا حکم مصر کے دربار میں گئے ہیں۔ حاکم کے دل میں رحم ڈال۔“
اس فریاد نے سفر طے کیا۔ یہ وہی وقت تھا جب برادران یوسف، حضرت یوسف علیہ السلام کے دربار میں کھڑے فریاد کناں تھے۔

”اے عزیز! (یوسف علیہ السلام) ہم نے تجھ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ بنیامین کی جدائی نے اسے اور بھی بے حال کر دیا ہے۔ اس کی جان کا خیال کر اور بنیامین کو اس سے ملا دے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو تجھے اپنے فیصلوں پر اختیار ہے۔“

”ہم تجھ سے تیری فیاضی کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط نے سخت پریشانی اور تکلیف میں ڈال دیا ہے۔ اس مرتبہ تو ہمارے پاس پونجی بھی بہت کم ہے۔ اب معاملہ خرید و فروخت کا نہیں ہے۔ ہم سے قیمت ادا نہیں ہو سکتی اس لیے تیری خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ ازراہ کرم ہمارے قحطوں سے سرمائے کو غنیمت کو غنیمت پوری تول دیجیے اور ہمیں ضرورت مند کچھ کر اپنی جانب سے احسان فرمائے۔ اللہ صدقہ خیرات کرنے والوں کو نیک بدلہ دیتا ہے۔“
بھائیوں کی یہ درود مند تقریر سنی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی آنکھوں میں باپ کا سراپا گھوم گیا جو یہاں سے دور کنعان میں بیٹھ بیٹوں کی راہ تک رہا ہوگا کہ اتنا ج لے کر آئیں گے۔ کب سے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس امید موم میں زندہ ہوں گے کہ یوسف شاید زندہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی فریاد بھائیوں کے وہ مظالم آنکھوں کے سامنے گھوم گئے جو انہوں نے ان کے ساتھ کیے تھے۔

خدا نے ان کے دل میں ڈالی کہ اب وہ اپنا راز ظاہر کر دیں۔ انہوں نے بھائیوں سے پوچھا۔
”تم جاننے بھی ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جبکہ تم جہالت میں سرشار تھے۔“
جب بھائیوں نے یہ غیر متوقع گفتگو سنی تو چونک کر کسی اور خیال سے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف دیکھا۔ لب و لہجہ پر غور کیا صورت شکل اور گفتگو کے طرز و انداز کو دوسری نیت سے دیکھا تو حضرت یوسف علیہ السلام کی شکل نگاہ کے سامنے پھر گئی۔
بے اختیار چیخ اٹھے۔ ”کیا تم واقعی یوسف ہو؟“

حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یوسف ہوں۔ تمہارا بھائی یوسف جس کو تم نے بیچ کر مصر پہنچا دیا اور اس بات سے کہ تم نے مجھے بیچ کر یہاں پہنچا دیا، نہ تو ممکن ہو اور نہ اپنے دل میں پریشان ہو کیونکہ خدا نے جانوں کو چکانے کے لیے مجھے تم سے آگے بھیجا۔ اس لیے کہ اب دو برس سے ملک میں کال ہے اور ابھی پانچ سال اور ایسے ہیں جن میں نہ تو مل چلے گا اور نہ فصل کٹے گی اور خدا نے مجھے تمہارے آگے بھیجا تاکہ تمہیں زمین پر سلامت رکھے اور تم کو بڑی رہائی کے وسیلے سے زندہ رکھے۔ پس تم نے نہیں بلکہ خدا نے مجھے یہاں بھیجا اور اس نے مجھے فرعون کا باپ اور اس کے سارے گھر کا خداوند اور سارے ملک مصر کا حاکم بنایا۔“

اب برادران یوسف کے پاس ندامت، شرمساری اور اعتراف خطا و جرم کے سوا کیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تمام نقشہ گھوم گیا۔ جسے وہ کوئیں میں بھیج دے تھے، آج وہ مصر کے تاج و تخت کا مالک ہے۔
سر جھکا کر کہنے لگے۔ ”قسم خدا کی! اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ہم پر برتری اور بلندی بخشی، بلاشبہ ہم سرتاپا خطا کار و معصوم وار تھے۔“ (سورۃ یوسف)

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی اس خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو ان کی اخلاقی برتری اور پیغمبرانہ رحمت اس کو برداشت نہ کر سکی اور غم و درگزر سے کہنے لگے۔

”مہج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سزائیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا قصور بخش دے۔“

بھائیوں کی معافی کی نوید سنی تو بے اختیار سجدے میں گر گئے۔

بچپن کا دیکھا ہوا خواب پورا ہوا تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ وہ ستارے یہ بھائی تھے۔

بھائیوں کی خطائیں دینے پر بنیامین بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی تعظیم اور شکرگزاری کے لیے سجدے میں گر گیا تھا۔

دس وہ تھے اور گیارہواں بنیامین۔

بھائیوں کی نکتہ مٹانے اور شرمندگی و دور کرنے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں مہمان بنایا اور ہر طرح سے ان کی دیکھ بھال کی۔

حاکم مصر کا عہدہ۔ تخت دمسوں میں۔ سپاہ و معر اشارۃ ابرو پر تیار۔ دشمن سامنے۔ کوئی اور ہوتا تو بھائیوں کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرتا۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ بدستور، تمہاری وجہ سے میرا گھر بار چھوٹا بلکہ فرمایا تو یہ.....

”جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہم سب کو یہ تمام داستان فراموش کر دینی چاہیے۔ میں درگاہ الہی میں دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری غلطی کو معاف فرما دے۔ اب تم کنگان واپس جاؤ اور میرا بھی اہل بیت لیتے جاؤ۔ یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ انشاء اللہ شہیم یوسف ان کی آنکھوں کو روشن کر دے گی اور تمام خاندان کو مصر لے کر آؤ۔ میں یہاں اتنا اقتدار رکھتا ہوں کہ تمہارے لیے اچھی رہائش کا بندوبست کر سکتا ہوں۔“

ان بھائیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ملنے کی خوشی تو کپا ہوئی ہوگی لیکن انہیں یہ خوشی ضرور تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حاکم ہوتے ہوئے اور طاقت رکھتے ہوئے ان سے بدلہ نہیں لیا ورنہ وہ نہیں کے نہ رہتے۔ یہ خوشی بھی تھی کہ وہ اب باپ کے پاس سرخرو ہو کر جائیں گے یوسف نے ہمیں معاف کر دیا تو وہ بھی ہمیں ضرور معاف کر دے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں گاڑیاں دیں۔ وافر مقدار میں زاد راہ بھی دیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے دس گدھے جو عمر کی اچھی چیزوں سے ملے ہوئے تھے اور دس گدھیاں جو باپ کے راستے کے لیے روٹی اور زاد راہ سے لدی ہوئی تھیں ان کے ساتھ لیں کہ جب سب کو مصر لاگے تو ان کی ضرورت پڑے گی۔

”ابا جان کے پاس جا کر ان سے میری شان و شوکت بیان کرنا تاکہ انہیں خوشی ہو اور وہ فراق کا صدمہ بھول جائیں۔ انہیں بتانا کہ تیرے بیٹے یوسف کو جہان کے مالک نے مصر کا مالک کر دیا ہے اور اس سے کہنا دیر نہ کر میرے پاس چلا آ۔ اب ہمارا خاندان مصر میں رہے گا اور میں اس کی پرورش کروں گا۔“

”اور دیکھنا کہیں تم راستے میں جھکنا نہ کرنا۔ میں باپ کی تسلی کے لیے بنیامین کو بھی تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اسے تم بھڑکنا۔“

”ہمارے آنکھوں سے جہالت کا پردہ اٹھ گیا ہے۔ اب ہم بنیامین کو جان سے زیادہ عزیز رکھیں گے۔“ تمام بھائیوں نے عہد کیا اور ملک کنگان کی طرف چل دیے۔

واپسی کا یہ سفر بھی عجیب تھا۔ یہ شرمندگی اور خوشی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کسی بھائی کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سب پر گہرا سکوت طاری تھا۔ اگر کفر کی توبہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام انہیں معاف کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر درمیان میں کوئی اور بات کرتے بھی تھے تو یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف کرتے تھے تاکہ بنیامین خوش ہو جائے۔

اسی خاموشی اور بھیگی بھی کی گفتگو میں سفر ختم کیا اور وہ کنگان تک پہنچ گئے۔ اتنی جلدی باپ کے پاس جانے کی کبھی نہیں ہوئی تھی جیسی اب ہو رہی تھی۔

ابھی وہ گھر تک نہ پہنچے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام.... کو وحی الہی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو سے مہکا دیا۔ فرمانے لگے۔

”اے خاندان یعقوب! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں میری عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے یوسف کی مہک آ رہی ہے۔ باہر جا کر دیکھو شاید یوسف کے بھائی آگئے ہیں اور ان کے ساتھ یوسف بھی ہے۔“

خاندان کے لوگ دعا کی یہ سمجھے کہ ان کی عقل ماری گئی ہے۔

”بھڑکنا تو اپنے اسی پرانے خط میں پڑے ہو۔ یوسف کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا اور تمہیں یوسف ہی کی رٹ لگی

ہوئی ہے۔“

”میں کہہ چکا ہوں۔ کسی کو شاہراہ پر بھیجو۔ قافلہ آ رہا ہوگا۔“

کسی نے پروا بھی نہیں کی، یہاں تک کہ سارے بھائی گھر کے سامنے پہنچ گئے اور اتنے ساز و سامان کے ساتھ جیسے کسی بادشاہ کی سواری آئی ہو۔

جب یہ بھائی حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے پہنچے تو شہیم یوسف بھی بالکل قریب پہنچ گئی۔

”تم لوگ آگئے۔ مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ یوسف بھی تمہارے ساتھ ہے؟ خدا کی قسم! مجھے یوسف کی مہک آ رہی ہے۔“

”ابا جان! یوسف ہمارے ساتھ تو نہیں لیکن ہم یہ خوش خبری لائے ہیں کہ یوسف اب تک جیتا ہے اور وہی سارے ملک مصر کا حاکم ہے۔ ہم اب تک اسی کا دیا ہوا کھاتے رہے ہیں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ان بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا پیرا بہن حضرت یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا۔ اللہ کی قدرت سے آنکھیں روشن ہو گئیں۔ بینائی لوٹ آئی۔

بینائی کا لوٹ آنا نبیاء کے معجزات میں سے تھا۔

”میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

برادران یوسف کے لیے یہ وقت بہت ٹھن تھا۔ شرم و ندامت میں سر جھکائے ہوئے بولے۔

”اے باپ! آپ خدا کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیے کہ ہم نے آپ سے یہ جھوٹ بولا تھا کہ یوسف کو بھیڑیالے گیا جبکہ ہم نے اسے ایک قافلے کے ہاتھ بیچ کر مصر بچوا دیا تھا۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا۔ ”عقرب میں اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی دعا کروں گا۔“

مفسرین کہتے ہیں کہ برادران یوسف نے مصر میں اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی مغفرت کی دعا کی استدعا کی تھی اور کنگان پہنچ کر حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھی یہی درخواست کی مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے تو اسی وقت ان کی بات منظور کر لی مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں کہا بلکہ صرف توقع دلائی اور عقرب کا لفظ استعمال کیا۔ یہ اس لیے کہ برادران یوسف کی تمام خطا کاروں کا معاملہ براہ راست حضرت یوسف علیہ السلام سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بالواسطہ اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اسی وقت ان کا اطمینان کر دیا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملے کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام سے ہے اس لیے اس کی مرضی بھی معلوم کر لینا ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نوجوان تھے اس لیے ان کے کریمانہ وصف میں اعتقاد کا پھول نہ تھا۔ انہوں نے فوراً معاف کر دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام تجربہ کار اور محتاط تھے اور پھر باپ تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ پہلے بیٹوں کا امتحان کریں کہ ان کی ندامت کا اظہار واقعی اور ہنگامی ہے یا ان کی طبیعت میں واقعی شرمساری کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔

ابن مسعود فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو سحر کے وقت کی امید دلائی تھی کہ اس وقت دعا کروں گا۔

ابن جریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ مسجد میں تشریف لارہے تھے کہ کسی انسان کو یہ دعا کرتے سنا۔ ”اے اللہ! آپ نے مجھے پکارا۔ میں نے جواب دیا۔ آپ نے مجھے حکم دیا، میں نے اطاعت کی اور یہ سحر کا وقت ہے لہذا میری مغفرت کر دیجیے۔“

حضرت عمرؓ نے توجہ دی تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے گھر سے آواز آ رہی ہے تو آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے دریافت کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے عرض کیا۔ ”حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے سحر کے اوقات تک کی مہلت کی تھی کہ میں اس وقت دعا کروں گا۔“

اللہ تعالیٰ دو بھی نیک بندوں کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”اور وہ سحر کے اوقات میں مغفرت طلب کرتے ہیں۔“ (آل عمران)۔

تمام بیٹوں نے اب حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ پیغام پہنچایا کہ ہمیں یوسف کی ہدایت کے مطابق مصر پہنچنا ہے جہاں مصر کی زیر زمین اور بہت سی اچھی اچھی چیزیں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

جب دربار ختم ہوا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خلوت میں جا کر خدا کی کرشمہ ساز یوں کا شکر ادا کیا۔
 ”اے پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا۔ اے آسان اور زمین کے بنانے والے تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تو یہ بھی کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرماں برداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔“ (سورۃ یوسف)
 اب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اپنے خاندان کو کس جاگیر پر ٹھہرایا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ سب لوگ ان سے قریب ”جشن کے شہر“ ہی میں آکر ٹھہریں۔ یہ فرعون کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے بھائیوں اور والدہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اچھی طرح بھجھا دیا کہ فرعون کے سامنے پہنچ کر انہیں کیا کہنا ہے۔
 ”میں ابھی جا کر فرعون کو خبر کر دوں گا کہ میرے بھائی اور میرے باپ کے گھرانے کے لوگ جو ملک کنعان میں تھے، میرے پاس آگئے ہیں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کو یہ خوش خبری سنا دی اور اپنے بھائیوں میں سے پانچ کو فرعون کے سامنے حاضر کر دیا۔

فرعون نے پوچھا۔ ”تمہارا پیشہ کیا ہے؟“

بھائیوں نے جواب دیا۔ ”تیرے خادم چو ہیں جیسے کہ ہمارے باپ دادا تھے۔ ہم اس ملک میں مسافر اندھ طور پر رہنے آئے ہیں کیونکہ ملک کنعان میں سخت کال ہونے کی وجہ سے تیرے خادموں کے چوپایوں کی چرائی نہیں ہو رہی تھی لہذا کرم کر کے ہمیں جشن کے علاقے میں رہنے دے کہ یہ سب سے سرسبز علاقہ ہے۔“

فرعون نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا۔ ”مصر کا ملک تیرے آگے پڑا ہے۔ ان کو جشن کے علاقے میں ہی رہنے دے۔“ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا میاں بی کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو فرعون کے سامنے پیش کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرعون کو عادی اور حضرت یوسف علیہ السلام کو اچھی طرح رکھنے پر اس کا شکر ادا کیا۔

”آپ کی عمر کتنی ہو گی؟“ فرعون نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا۔

”میری مسافرت کے برس ایک سو تیس ہیں۔ میری زندگی کے ایام ٹھوڑے اور دکھ سے بھرے ہوئے رہے ہیں اور ابھی یہ اتنے بھی نہیں ہوئے جتنے میرے باپ دادا کی زندگی کے ایام ان کے دور مسافرت میں ہوئے۔“ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا اور فرعون کو عادی کے کمراس کے پاس سے ہٹ گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کے حکم کے مطابق ”رعیس“ کے علاقے کو جو ملک مصر کا نہایت زرخیز خطہ ہے، ان کی جاگیر ٹھہرایا۔

قطعا ابھی تک پوری شدت سے جاری تھا۔ سارے ملک میں کھانے کو کچھ نہ رہا۔ مصر اور کنعان دونوں تباہ ہو گئے۔ جتنا روپیہ ملک مصر اور ملک کنعان میں تھا، وہ سب حضرت یوسف علیہ السلام نے اس غلے کے بدلے جسے لوگ خریدتے تھے، لے کر جمع کر لیا اور ساری دولت فرعون کے کھل میں پہنچا دی۔

فرعون آپ کے اس حسن انتظام سے بہت خوش تھا۔ ان کے اس حسن انتظام کی بدولت ایک موت بھی بھوک سے واقع نہیں ہوئی۔

اب ایک اور سخت مشکل سامنے تھی۔ وہ سارا روپیہ جو مصر اور کنعان میں تھا، خرچ ہو گیا اور قحط ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ مصریوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ روپیہ تو اب ہمارے پاس رہا نہیں۔ ہمیں مفت میں اناج دے تاکہ ہم اپنے بچوں کو کھلائیں۔ تیرے ہوتے ہوئے ہم کیوں مریں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اگر نقدی نہیں تو اپنے چوپائے دو اور میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تم کو اناج دوں گا۔“

لوگ اپنے چوپائے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس لانے لگے اور گھوڑوں، بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کے عوض انہیں اناج ملنے لگا۔

ایک سال اور گزر گیا۔ اب مصریوں کے پاس نہ نقدی تھی نہ چوپائے باقی رہے تھے۔ یہ لوگ پھر حضرت یوسف علیہ

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا۔ ”کنعان میرے آباء کی سرزمین ہے۔ اسے چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے لیکن مرا بیٹا یوسف اب تک جیسا ہے۔ میں اپنے مرنے سے پیشتر جا کر اسے دیکھ لوں۔ میرے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی مصر سے کنعان آئے تھے اور میں کنعان سے مصر جاؤں گا۔“

توریت میں اس کی تفصیل یوں دی گئی ہے۔

”اور اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) اپنا سب کچھ لے کر چلا اور بہر سب میں آکر اپنے باپ اسحاق کے خدا کے لیے قربانیاں گزرائیں اور خدا نے رات کو رؤیا میں اسرائیل سے باتیں کیں۔ اس نے کہا میں خدا تیرے باپ کا خدا ہوں۔ مصر میں جانے سے نہ ڈر کیونکہ میں وہاں تجھ سے ایک بڑی قوم پیدا کر دوں گا۔ میں تیرے ساتھ مصر کو جاؤں گا اور پھر تجھے ضرور لوٹا بھی لاؤں گا اور یوسف اپنا ہاتھ تیری آنکھوں پر لگائے گا۔“

تب یعقوب بہر سب سے روانہ ہوا اور اسرائیل کے بیٹے اپنے باپ یعقوب کو اور اپنے بال بچوں اور اپنی بیویوں کو ان گاڑیوں پر لے گئے جو فرعون نے ان کے لانے کو بھیجی تھیں اور وہ اپنے چوپایوں اور سارے مال و اسباب کو جو انہوں نے ملک کنعان میں جمع کیا تھا، لے کر مصر میں آئے اور یعقوب کے ساتھ اس کی ساری اولاد تھی۔ وہ اپنے بیٹوں اور پوتوں پوتیوں غرض اپنی کل نسل کو اپنے ساتھ مصر میں لے آیا۔ یعقوب کے گھرانے کے جو لوگ مصر میں آئے، ستر جا میں تھیں۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اطلاع پہنچی کہ ان کے والد خاندان سمیت شہر کے قریب پہنچ گئے تو وہ استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے مدت دراز کے پھرنے ہوئے لخت جگر کو دیکھا تو سینے سے چٹا لیا۔ آنسو اس وقت بھی ان کی آنکھوں میں تھے لیکن یہ غمی کے آنسو تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی بچوں کی طرح باپ سے لپٹے ہوئے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے افرانیم اور منشی پہلی مرتبہ اپنے دادا کو دیکھ رہے تھے۔ جب سرت افزا اور رفت آمیز ملاقات ہو چکی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے نہایت احترام سے اس قافلے کو دار السلطنت ”رعیس“ میں داخل کیا جو ”جشن کا شہر“ کہلاتا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام والد ماجد اور تمام خاندان کو بڑے کدو فر کے ساتھ شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر میں لائے اور شاہی محل میں اتارا۔

جب ان تمام باتوں سے فراغت پائی اور باپ کو اچھی طرح دیکھ لیا تو دربار آراستہ کیا تاکہ عوام و خواص مصریوں کا بزرگ باپ اور خاندان سے تعارف ہو جائے کیونکہ شہر میں بھی جشن برپا تھا اور ہر شخص حاکم مصر کے خاندان کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ دربار منعقد ہوا اور تمام لوگ اپنی اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کے والدین یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت لویہ کو تخت شاہی پر جگہ دی گئی (حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا) باقی تمام خاندان نے حسب مراتب بچے جگہ پائی۔

جب یہ انتظامات مکمل ہو چکے تو حضرت یوسف علیہ السلام شاہی محل سے نکل کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔ ان کے بیٹھے ہی تمام درباری دستور کے مطابق تخت کے سامنے تعظیم کے لیے سجدے میں گر پڑے۔ موجودہ صورت حال کو دیکھ کر تمام خاندان یوسف نے بھی یہی عمل کیا۔

(تعظیم کا یہ طریقہ شاید اس وقت جائز ہوتا، ہم نبی اکرم ﷺ نے اس قسم کی تعظیم کو اپنی امت کے لیے حرام قرار دیا اور اس کو صرف ذات الہی کے لیے مخصوص بتایا) (ترمذی ابوداؤد)۔

یہ دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو رونا اپنے بچپن کا خواب یاد آ گیا۔ گیارہ ستارے سجدہ کر چکے تھے۔ اب سورج اور چاند بھی سجدہ کر رہے تھے۔ اپنے والد سے کہنے لگے۔

”اور..... یوسف علیہ السلام نے کہا اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اسے سچا ثابت کر دیا۔ یہ اسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی۔ تم سب کو میرے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا اور یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا۔ بلاشبہ میرا پروردگار ان باتوں کے لیے جو وہ کرنا چاہے، بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔“ (سورۃ یوسف)

السلام کے پاس آئے۔
 ”اے خداوند! ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ نقدی بھی ختم ہوگئی۔ ہمارے چوپایوں کا مالک بھی تو ہو گیا۔ اب تو ایک ہی صورت ہے کہ تو اناج کے بدلے ہماری زمین خرید لے۔“
 قحط سے جنگ آئے لوگوں نے اپنے کھیت بچ ڈالے۔ ساری زمین فرعون کی ہوگئی۔ تب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا۔

”میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے نام پر خرید لیا ہے۔ سو تم اپنے لیے مجھ سے بچ لو اور کھیتوں میں ڈال دو۔ فصل پر پانچواں حصہ فرعون کو دے دینا اور باقی چار تمہارے رہے تاکہ کھیتی کے لیے بچ کے بھی کام آئیں اور تمہارے اور گھر کے آدمیوں اور بال بچوں کے لیے کھانے کو بھی ہوں۔“

”خداوند! تو نے ہماری جان بچائی۔ ہم فرعون کے غلام بنے رہیں گے۔“ لوگوں نے کہا۔
 قحط کے دن گزر گئے۔ فرعون کے خواب کی تعبیر کے مطابق خوشحالی کے دن آن گئے۔ بارشوں نے زمین کا سینہ نرم کر دیا۔ کوٹلیں پھوٹنے لگیں۔ کھیت لہلہانے لگی۔ آئین کے مطابق مصری اپنی پیداوار کا پانچواں حصہ فرعون کو دیتے رہے۔
 حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کا خاندان جشن کے شہر میں بدستور آباد تھا۔ انہوں نے اپنی جائیدادیں کھری کر لیں اور وہ بڑھے اور بہت زیادہ ہو گئے۔ یہی اللہ کا ان سے وعدہ تھا۔
 خوشحالی کے ان دنوں کو سترہ سال گزر گئے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام بیمار ہوئے۔ یہ بیماری آہستہ آہستہ ان کی موت کو ان کے قریب لاتی رہی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نہایت تندی سے ان کی تیمارداری میں مشغول تھے۔ تمام دنیاوی مشاغل موجود تھے جو وہ والد کی بیماری کوٹالنے کے لیے استعمال کر رہے تھے لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے دن پورے کر لیے تھے۔
 ایک دن جب حضرت یوسف علیہ السلام ان سے ملاقات کے لیے پہنچے تو انہوں نے عہد لینے کے لیے فرمایا۔ ”اپنا ہاتھ میری ران کے نیچے رکھ۔ دیکھ اب میرا وقت آ گیا ہے۔ میں اپنے لوگوں میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوں۔ مجھ کو مصر میں دفن نہ کرنا بلکہ جب میں اپنے باپ دادا کے ساتھ سو جاؤں تو مجھے مصر سے لے جا کر کنعان میں دفن کرنا۔ اسی گورستان میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ دفن ہیں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کے بیٹوں کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔
 ”مجھے تو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ تیرا منہ دیکھوں گا لیکن خدا نے تیری اولاد بھی مجھے دکھائی۔ خدا نے قادر مطلق مجھے دکھائی دیا ہے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں تجھے برومند کروں گا اور بڑھاؤں گا اور تجھ سے قوموں کا ظہور کروں گا اور تیرے بعد یہ زمین تیری نسل کو دوں گا تاکہ یہ ان کی دائمی ملکیت ہو جائے۔“ اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے بیٹوں کے لیے یہ دعائیں الفاظ ادا کیے۔

”خدا جس کے سامنے میرے باپ ابراہیم اور اسحاق نے اپنا دور پورا کیا۔

وہ خدا جس نے ساری عمر آج کے دن تک میری پاسبانی کی۔

اور وہ فرشتہ جس نے مجھے سب بلاؤں سے بچایا۔

ان لوگوں کو برکت دے۔

اور جو میرا اور میرے باپ دادا کا نام ہے۔

اسی سے یہ تاجر ہوں۔

اور زمین پر نہایت کثرت سے بڑھ پائیں۔“

اس کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ان میں سے ایک ایک کی عادت کے مطابق انہیں

برکت دی اور انہیں بتایا کہ آئندہ زمانوں میں ان کے ساتھ کیا ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے پاؤں پھونکے پر سمیٹ لیے اور دم چھوڑ دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام اٹھے اور باپ کا منہ جو مارا طریقوں کو حکم دیا کہ لاش میں خوشبو بھریں تاکہ یہ محفوظ رہے کیونکہ

میں وصیت کے مطابق اس لاش کو کنعان لے کر جاؤں گا۔

اس عمل میں چالیس دن لگتے ہیں۔ اس دوران مصر میں ماتم ہوتا رہا۔

جب لاش میں خوشبو بھری جا چکی اور اس کے خراب ہونے کا احتمال جاتا رہا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تمام

خادموں اور مصر کے درباریوں اور اپنے تمام خاندان کو ساتھ لیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدفین کے لیے چلے۔

یہ سفر بھی عجیب تھا۔ ایک وہ دور تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام پایہ زنجیران راستوں سے گزرتے ہوئے مصر پہنچے

تھے اور اب یہ شان کہ شاندار تھیں بیٹھے ہوئے ایک بڑے قافلے کے ساتھ جارہے تھے۔ ایک ایک منظر آنکھوں کے

سامنے سے گزر رہا تھا۔ آپ اللہ کی کرم نوازی کا شکر ادا کرتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ اچانک ایک مقام پر آپ نے دھ

بان کو روکنے کا حکم دیا۔ یہ کنعان کے قریب افراٹ کا مقام تھا۔ ان کے بھائی جو ان کے دھ کے ارگرد حصار باندھے چل رہے

تھے، دھ کے قریب آئے۔

”کیا بات ہے یوسف..... یہاں کیوں رک گئے؟“

”تم شاید بھول گئے ہو لیکن مجھے یاد ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں میری ماں کی قبر ہے۔ پھر نہ جانے کب میرا یہاں آنا

ہو۔ میں اپنی ماں کو بتا دوں کہ تیرا بیٹا کس شان سے تیرے پاس آیا ہے۔“

راہین آگے بڑھا۔ ”مجھے وہ مقام معلوم ہے۔ میں بڑا ہونے کی حیثیت سے باپ کے ساتھ آیا تھا۔ مجھے

معلوم ہے۔“

”آیا تو میں بھی تھا لیکن میری عمر اس وقت محض پانچ سال تھی۔ مجھے یقین ہے میرے دل کی آنکھیں اس مقام کو پہچان

لیں گی جہاں میری ماں دفن ہے۔“

انہوں نے بنیامین کو ساتھ لیا۔ دوسرے بھائی بھی ساتھ تھے اور واقعی انہوں نے وہ جگہ پہچان لی۔ قبر کا عندلہ سانشان

باقی تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام دوزانو پیٹ گئے۔ بہت دیر تک سر جھکائے رہے۔ ماں کی بخشش کی دعا کی اور پھر اٹھ

کر کھڑے ہو گئے۔

اس کے بعد وہ سب کو لے کر اس گھر پر پہنچے جہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں ان کے بھائیوں نے ان سے بے وفائی

کی تھی، جہاں ان کے والد ان کی یاد میں روتے رہے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام ایک ایک چیز کو دیکھتے تھے اور اپنا بچپن یاد کرتے تھے۔ ان کے بھائی ان کے آگے شرمندہ

کھڑے تھے۔ سوچتے ہوں گے کہ جب سب کچھ یاد آ رہا ہے تو یہ بھی یاد آ رہا ہوگا کہ کس طرح ہم اسے بھلا بھلا کر جنگل میں

لے گئے تھے اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کہ یہ باتیں یقیناً یاد آئی ہوں لیکن ان کی اعلیٰ عزتی انہوں نے کسی بھائی سے اس کا تذکرہ

تک نہیں کیا۔

کنعان کے وہ پرانے لوگ جو اب تک زندہ تھے حضرت یوسف علیہ السلام کا دیدار کرنے آئے۔ دیکھتے تھے اور خدا

کی شان کریم کی تعصید پڑھتے تھے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے کیسا اعزاز عطا فرمایا ہے۔

جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام انتقال فرما چکے ہیں تو ان لوگوں نے سات دن تک ان کا ماتم کیا اور

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے جنازے کو اس قبرستان کی طرف لے کر چلے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خرید کر اپنی

ملکیت بنالیا تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو وہاں ان کی وصیت کے مطابق دفن کر دیا گیا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدفین کے بعد یہ قافلہ مصر کو لوٹ آیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے واپسی کا تمام راستہ خوف اور اندیشوں کے سائے میں کاٹا۔ راستے بھر یہی

باتیں کرتے چلے آئے تھے کہ باپ کے مرنے کے بعد یوسف ہم سے بدلہ ضرور لیں گے۔ کچھ نہیں تو یہی ہوگا کہ وہ ہمیں مصر

سے نکال دے اور ہمیں پھر کنعان میں آ کر آباد ہونا پڑے۔

یہی باتیں کرتے ہوئے جب وہ مصر پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور باپ کے حوالے

سے چند باتیں ان سے کہیں۔

”مرنے سے پہلے تمہارے اور ہمارے باپ نے ایک پیغام تمہارے نام دیا تھا۔ وہ یہ کہ تم یوسف سے کہنا کہ اپنے

کھیتوں میں مکئی کاشت کی جاتی اور انہی کھیتوں کی وجہ سے اسے کھیت کا نام دیا گیا تھا۔ ٹھنڈے اور ٹھیکے چشموں کا پانی ایک ڈھلوان کی جانب آکھا ہو کر نشیب کی طرف بہتا رہتا۔ گاؤں کے چاروں طرف گھٹا جنگل بھی آباد تھا جہاں مقامی لوگ اپنے مویشی چرایا کرتے۔ آبادی تقریباً پچاس گھروں پر مشتمل تھی۔ کچے کچے گھروں پر ٹین کی پتھیں تھیں۔ ایک چھوٹی سی عمارت بیک وقت پرائمری اسکول اور دواخانہ کے لیے استعمال ہوا کرتی۔ دیہاتی شریف انفس صلع جو اور تھکتے تھے۔ یہ چھوٹی سی جگہ کشمیر جنت نظیر میں تھی۔

ریاض علی بانسری بہت اچھی بجاتا تھا۔ پہاڑی کے نزدیک ہی اس کا بچی مٹی سے بنا گھر تھا جہاں وہ اپنے والدین کے ساتھ بہت خوش و خرم زندگی گزارتا تھا۔ اس کے والد کے پاس چند مویشی موجود تھے جنہیں چرانے کے لیے وہ جنگل میں لے آ کر اتار اور چنار کے درخت سے پشت لگا کر بانسری اپنے ہونٹوں سے لگا کر مدھرنغے ہوا میں بکھیرتا رہتا۔

بارش کی پھوار تھوڑی تیز ہوتی تو اسے ایک جانب سے جاذب کی آواز سنائی دی۔

”رگ جاذب ریاض علی! میرے ساتھ ہی چلنا دہیں۔“

ریاض علی نے داعیں جانب مڑ کر دیکھا تو اس کا چچا زاد بھائی اپنے گھنے پنے مویشیوں کے ساتھ اسی جانب چلا آ رہا تھا۔ جاذب گاؤں میں اس کا واحد بہترین دوست تھا۔ اس نے خوشگوار انداز میں ہاتھ ہلایا اور وہ کچھ ہی لمحوں بعد نشیب کی طرف بڑھ گئے۔

پھوار اب تیز ہو گئی تھی۔ انہوں نے غلٹ میں اپنے مویشی مخصوص جگہ پر باندھے اور گھر کے عقب میں موجود درختوں کے جھنڈ میں جا بیٹھے۔ ریاض علی کے مزاج میں آج کچھ خاموشی اور افسردگی کا عنصر غالب تھا۔

”کیا بات ہے ریاض علی! اتنے افسردہ کیوں ہو؟“ اسے اپنی داعیں جانب سے کسی کی آواز سنائی دی۔ یہ اس کی تباہ زاد بہن نوشین عرف نوشی تھی جو غیر ضابطہ طور پر جاذب کی کھیت پر بھی گئی تھی۔ وہ جنگل سے لنگریاں چلتی ہوئی ادھر چلی آئی تھی۔

”نہیں۔ افسردہ تو نہیں ہوں۔“ ریاض علی نے ٹالا۔ وہ تینوں بچپن سے اکٹھے پلے بڑھے تھے، اس لیے ایک دوسرے کے خاص مزاج آشنا بھی تھے۔

”تو پھر تمہاری بانسری کیوں خاموش ہے؟ تمہیں پتا ہے تاکہ ہمیں اس کی تان کس قدر پسند ہے۔“ جاذب نے اسے ٹھوک دیا۔

ریاض علی نے مسکراتے ہوئے اپنی بانسری ہونٹوں سے لگا لی اور ایک مقامی دھن بجاتی شروع کر دی۔ موسم کی خوبصورتی میں اس مدھرمویشی کے ملاپ نے جاذب اور نوشی کو بالکل بے خود کر دیا۔

”تم لاجواب ہو میرے دوست! کاش یہ فن میں بھی کسی طرح سکھ سکتا۔“ جاذب نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھئی اللہ بخشے ہمارے دادا جی کہا کرتے تھے کہ بانسری تو کشمیر کی شگفت ہے۔“ وہ ان دونوں سے بڑا تھا اور اپنے دادا مرحوم کے ساتھ سب سے زیادہ وقت بھی اسی سے بتایا تھا۔

”اب تو حالات بھی ویسے نہیں رہے۔ کرب اور دکھ کی لہر ہی ہر وقت اس وادی کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی ہے۔“ جاذب نے کہا۔

”ہاں! اب تو ہندوستانی فوج نے یہاں ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ کسی کی بھی جان مال اور آبرو محفوظ نہیں۔“ نوشی نے ہونٹ کھلتے ہوئے کہا۔

”حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کشمیریوں کی نسل کشی کا پورا پلان تیار ہو چکا ہے۔ ابھی پھیلے ہوئے بیجا مہر دین اور اس کا خاندان ہجرت کر کے پار آؤں گے۔“ کشمیر چلے گئے ہیں۔ ایسے ہی جانے کتنے خاندان اپنی عزتیں محفوظ رکھنے کے لیے ایسی ہجرتیں کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔“ ریاض علی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیا یہی اچھا ہوتا کہ جب ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ہوئی تھی، ریاست جموں کشمیر کی آزادی اور الگ شخص کو بھی اسی وقت تسلیم کر لیا جاتا۔ یہ صدیوں پرانی ریاست ہے لیکن اسے رائے شماری کا بھی حق نہیں دیا گیا۔“ نوشی نے کہا۔

”جب پاکستان بنا اس وقت بھی ہم نے بہت سی قربانیاں دیں ایک سال بعد ہونے والی جنگ میں بھی ہمارے آباؤ اجداد نے بہت خون بہایا لیکن عالمی نا انصافی ہر موڑ پر ہمیں بریاد کرتی رہی۔ لائن آف کنٹرول کے نام پر ہمارے درمیان ایک خونی لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ جن کے خاندان پار کی طرف ہیں وہ آج بھی اپنے عزیز واقارب کی یاد میں خون کے آنسو بہاتے ہیں اور جانے کب تک بہاتے رہیں گے۔“ ریاض نے غمناک آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

ماحول ہر مزید اداسی چھا گئی۔ جاذب اور نوشی کی آنکھیں بھی ہمر آئیں۔ ریاض نے فوراً خود کو سمجھالا اور انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

”ہر رات کے بعد ایک روشن سویرا ہوتا ہے۔ مجھے

یقین ہے کہ ہماری اس جنت نظیر وادی میں بھی وہ روشن سویرا ضرور آئے گا۔“

ان دونوں نے بھی ایک عزم سے سر ہلایا اور موسم کے تیور دیکھتے ہوئے گھر کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

کھیت میں روزمرہ کی سرگرمیاں اپنے معمول کے مطابق جاری تھیں۔ آئے روز ہونے والے واقعات ان کا عزم جوان کر دیتے تھے۔ وہ تینوں اکثر سہ پہر کے بعد مویشیوں کی دواہی کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر بات چیت ضرور کرتے تھے لیکن ایک روز ریاض علی کو وہاں موجود نہ پا کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے اور پھر اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

”پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا، ریاض! اپنے ڈھور ڈھگر یہاں لے کر نہ آئے۔ ضرور کوئی ٹڈ بڑ ہے۔“ نوشی نے کہا۔

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہو چکا ہے ورنہ اس کی بانسری کی آواز خود ہی اس کا سراغ دے دیا کرتی ہے۔“ جاذب نے تاکید کی۔

”اب کیا کریں؟ گھر پہنچ کر کسی کو اطلاع دیتے ہیں۔“

”نہیں! وہ سب بھی خوا خواہ پریشان ہو جائیں گے۔ ہم خود ہی اسے ڈھونڈ لیں گے۔“ جاذب نے ٹوکا۔

انہوں نے پہاڑی کے دامن سے جنگل میں اترنے والی میڈنڈ کی راہ لی اور زیر لب آیات کا ورد کرتے ہوئے ریاض علی کی سلامتی کی دعائیں کرنے لگے۔

کچھ دور جانے کے بعد انہیں فضا میں نا مانوس آوازوں کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ کتوں کے بھونکنے کی وحشیانہ صداؤں نے ان کے قدم وہیں ساکت کر دیے۔ جاذب نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور فوراً ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔

”خاموش رہنا بالکل۔۔۔۔۔۔ یہاں ضرور کچھ بہت بڑی مژد بڑ ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔

نوشی وہیں دیکھ گئی۔ وہ دونوں دم سادھے آوازوں کا ماحذ جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ لمحوں بعد ہوا کے دوش پر انہیں چند مژدہ فحرات سنائی دیے۔

”بچاؤ۔۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔۔۔۔ کوئی تو مدد کرو میری۔ خدا کے واسطے! کوئی تو مدد کرو۔“

اس کے فوری بعد ایک مرد کی آواز سنائی دینے لگی۔

”اب کسی نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو زبانیں گلدی سے کھینچ لوں گا۔“ وہ کافی غصے میں لگ رہا تھا۔

”لیکن ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم تو وادی سے نقل مکانی کر رہے ہیں۔ کس جرم کی سزا دے رہے ہو ہمیں؟“ ایک خاتون کی کربناک آواز آئی۔

نوشی کچھ سہمی گئی۔ اس کے منہ سے دبی دبی سسکیاں برآمد ہونے لگیں۔

”ڈرو مت! میں ہوں نا۔۔۔ تمہارے ساتھ۔ کچھ نہیں ہو گا۔۔۔۔۔۔ بس خاموشی سے یہیں بیٹھی رہو۔“ جاذب نے اسے تسلی دی۔

وہ دونوں بزدل ہرگز نہیں تھے لیکن نہتے ضرور تھے۔ ارد گرد سے آنے والی صداؤں سے جھٹکے کرب نے انہیں بہت ڈھکی کر دیا تھا۔ جاذب نے کچھ دیر بعد جھاڑی کی اوٹ سے سر نکالا اور پہاڑی کی ڈھلوان کی جانب صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں دکھائی دینے والا منظر اس کے لبو میں ابال پیدا کرنے لگا۔

”جنگل کی طرف اسے چند عورتیں بچے اور مرد دکھائی دے رہے تھے جنہیں بھارتی فوجیوں نے اپنے زرنے میں لے لیا تھا۔ فوجیوں کی پوزیشن اس طرح تھی کہ وہ بآسانی ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ جاذب بے آواز طریقے سے دوبارہ پیچھے کھسک گیا۔

”کپتین! ہمارے مخبر کے مطابق یہ وہی خاندان ہے جس کے دولہے عبادین کی ٹریننگ لے رہے ہیں۔“ ایک کرحشت آواز سنائی دی۔

”آئی سی۔۔۔۔۔۔ ان میں سے کوئی بھی بھاگنے نہ پائے۔ اگر کوئی ہلنے کی کوشش بھی کرے تو فوراً بھون دینا۔“ کپتین نے حثارت سے کہا اور ایک توقف سے پھر دھاڑا۔

”مہیش! تم کہاں مر گئے ہو؟“

”آئی ایم ہیئر سر! حکم کریں۔“ مہیش ایک اوٹ سے برآمد ہوا۔

”اس خاندان میں کتنی نوجوان لڑکیاں ہیں؟“

مہیش نے فوری طور پر خواتین کے چہروں سے چادریں اور نقاب ہٹائے اور سرعت سے بولا۔

”تین لڑکیاں ہیں سر!“

”ٹھیک ہے! انہیں کیمپ میں لے چلو۔ آج وہیں دعوت اڑاتے ہیں۔“ اس کے اشارے پر باقی اہلکاروں نے انہیں بالوں سے پکڑ کر گھینٹا شروع کر دیا۔

دیگر خواتین اور عرسیدہ افراد ان کی راہ میں حائل ہو گئے اور اپنی پوری قوت سے انہیں روکنے کی کوششیں کرنے لگے۔ ایک بوڑھی عورت ان سے اتھا کرتے ہوئے بولی۔

”تم بھلے ہماری جان لے لو لیکن انہیں چھوڑ دو۔ یہ ظلم

نہ کر دے۔“

مہیش غضب ناک ہو کر آگے بڑھا اور بندوق کا کندرا اسے مار کر پیچھے ہٹا دیا۔

”اب کوئی اور آگے بڑھا تو میں اسے ایک ہل میں نرک میں پہنچا دوں گا۔“

”ہم یہ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“ ایک اور عمر رسیدہ شخص نے بات کا آغاز کیا یہ تھا کہ مہیش نے اس کے منہ پر زور دار طمانچہ رسید کیا۔

”میری تمہارا جرم ہے بڑھے! یہاں سے جاتے ہی تمہارے یہ بچے مجاہدین کے ساتھ مل کر ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔“

بوڑھا آدمی تورا کر نیچے گرا تو مہیش نے اس کے جسم پر برست چلا دیا۔ اس نے لڑکھائی زبان سے کلمہ شہادت پڑھا اور بے نورنگاہوں سے آسمان کی دستوں میں اپنے لیے رحم کرم کی بھیک مانگنے لگا۔

بچوں کے چہرے خوف اور وحشت سے سپید پڑ گئے۔ ان میں سے کئی افراد نے ہسٹریائی انداز میں چپٹا شروع کر دیا۔ عورتوں کے بین اور آنسو دیکھ کر چنار کے درخت بھی سلگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

مہیش نے ایک برست ہوا میں چلایا اور ہاڑ کر بولا۔
”ان لڑکیوں کو کیپٹن کے کیپ میں لے چلو! آج ان کی مدد کے لیے یہاں کوئی نہیں آنے والا۔ انہیں تڑپا تڑپا کر مارتا ہے۔ ان کی آتما میں اگلے کئی جنموں تک بے کل رہیں گی۔“

کیپٹن شرما ایک جانب اپنی جیب سے چھٹی سی پوٹ نکال کر سے نوشی میں مگن تھا۔ فوجی اہلکار اہنسیں بال کھینچے ہوئے لے جا رہے تھے۔ لڑکیوں کے چہرے پر اب کی قسم کا کوئی خوف نہ تھا۔ آنے والے وقت کے تصور نے ان کے ذہن میں پھل برپا کر دی تھی۔ اہلکار ان کی بے بسی سے مکمل لطف اندوز ہوتے چنگیاں بھرنے سے باز ہی نہیں آ رہے تھے۔

”اپنے غلیظ ہاتھ مجھ سے دور رکھو ذلیل انسان!“ ایک لڑکی چلا کر بولی۔

اس اہلکار نے ایک بھیا تک قہقہہ لگا یا اور زرادیر کے لیے اس کے بال چھوڑ کر ایک زوردار ٹھوکر رسید کیا۔ اسے ٹھوکر کی زد میں دیکھ کر ایک بوڑھی عورت بے اختیار تڑپ کر بولی۔

”آمنہ! میری بچی!“

آمنہ نے ایک نظر مڑ کر اس عورت کو دیکھا اور بجلی کی سی

تیزی سے اپنے لباس سے چاقو نکال کر اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ فوجی اہلکار ہکا بکا رہ گئے۔ اس کا خون آلود جسم زمین پر جاں کنی کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ کیپٹن کے لیے یہ نظارہ اس کے منہ پر زور دار طمانچے کے مترادف تھا۔ اس کا ذہن پہلے ہی شراب کے زیر اثر تھا اور اب تو وہ بالکل ہی اپنے حواس کھو بیٹھا۔

”مہیش! اس لڑکی کو سامنے چنار کے درخت کے ساتھ باندھ دو اور اس کے تمام کپڑے اتار دو۔“ وہ چلا آیا۔

مہیش نے اسی چاقو سے آمنہ کا لباس چاک کیا اور اسے گھسیٹا ہوا درختوں کی جانب لے گیا۔ ایک جانب ساکت کھڑے اس خاندان میں پچھل ہوئی اور ایک دس سالہ بچہ بہن کو پکارتا ہوا ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر مہیش پر ہل پڑا۔ دیو قاتل مہیش نے اسے ہاتھوں سے اچھال کر دوسری جانب پھینک دیا۔

”مار دو اس سالہ کو! زندہ رہا تو یہ بھی مجاہد ہی بنے گا۔“ کیپٹن نے نفرت سے کہا۔

ایک فوجی اہلکار آگے بڑھا اور اسے دوبارہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر زوردار طریقے سے اچھال دیا۔ وہ بچہ جاذب اور نوشی سے چند قدم کی دوری پر جھانپوں کے باس آ کر گرا۔ اسی لمحے ایک خوفناک برست چلا اور بچے کا جسم کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ نوشی کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی چیخ برآمد ہوئی لیکن جاذب نے فوراً اس کے منہ پر پتھر سے ہاتھ رکھ دیا۔
”شش..... خاموش۔“

آمنہ کی والدہ ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی بچے کی جانب بڑھی لیکن ایک اور فوجی اہلکار کی بندوق سے نکلنے والے شعلوں نے اس کے سر میں کئی روشنائی بنا دی۔ فضا میں موت کا گہرا آستانہ تھا۔ چنار کے درخت بھی انسانیت کی اس تذلیل پر اٹک بھاتے محسوس ہو رہے تھے۔ باقی ماندہ افراد کے چہروں پر زور دی کھنڈی تھی۔

فوجی اہلکار ایک بار پھر آمنہ کی جانب متوجہ ہو گئے جو اس جاں کنی کے عالم میں بھی اپنا آپ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مہیش اسے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔

”اس سالی نے یہ چاقو میرے دل میں اتارا ہے۔ میں اسے اس کے کیے کی سزا تو ضرور دوں گا۔ اگر کوئی جوان اپنی بھوک مٹانا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے۔ فوج ڈالو اسے!“ کیپٹن چلا آیا۔

”بھیلے ماہان مجاہدوں نے میرے بھائی کی ہتھیاری تھی۔ اس کے شعلے میرے سینے میں اب بھی پھل رہے ہیں۔ میں اس کا وہ حال کروں گا کہ آئندہ کوئی بھی لڑکی

اپنے باپ بھائی کو اس راہ پر چلنے ہی نہ دے گی۔“ مہیش نے اپنی بندوق ایک جانب رکھتے ہوئے آمنہ کو بھونکی نظروں سے دیکھا۔

”مگلا سہرت جوان! گو اہیڈ!“ کیپٹن ایک بار پھر شراب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مہیش پر پوری طرح شیطان حاوی ہو چکا تھا۔ آمنہ کی اذیت ناک کراہیں جاذب کے دل پر تیزاب کے جھینٹے ڈال رہی تھیں۔ اس نے کچھ لمحے سوچ بیماری اور چو پاپوں کی طرح ریختا ہوا جھانپوں ہی سے چنار کے درختوں کی جانب چل دیا۔ مہیش کے اس غیر انسانی تماشے میں دیگر فوجی بھی پوری طرح منہمک ہو چکے تھے۔ جاذب نے بے آواز طریقے سے مہیش کی بندوق تھامی اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان سب پر فائر کھول دیے۔ نفس کی لذت میں غرق بھارتی فوجیوں کے سنبھلنے سے قبل ہی وہ انہیں موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

کیپٹن بھی اس ساری صورت حال پر بولھلا کر رہ گیا۔ اس نے لرزرتے ہاتھوں سے اپنے ہوسٹر سے ریوالتور نکالنے کی کوشش کی لیکن جاذب نے فوراً آگے بڑھ کر اس کی کلائی پر زور دار ٹھوکر رسید کیا اور بندوق کا کندھا اس کے چہرے پر مار کر کھما۔

”خبیث انسان! اگر ذرا سی بھی حرکت کی تو اس بندوق کا سارا سیمسہ تیرے جسم میں اتار دوں گا۔“
”تو نے میرے جوانوں کو مار کر اپنے خاندان کے لیے بڑی دردناک موت چن لی ہے لڑکے! میں تیرے خاندان کو نرک میں پہنچا دوں گا۔“

جاذب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ آمنہ کی لڑکھائی آواز میں کھینچی ادائیگی نے اسے گنگ کر دیا۔ اس کی روج پرواز کر چکی تھی۔ جاذب کے وجود میں انگارے دھنسنے لگے۔ اس کے اشارے پر ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر آمنہ کے بے جان وجود کو اپنی چادر سے ڈھانپ دیا۔ جاذب نے طیش کے عالم میں کیپٹن کے بازو کو نشانہ بنایا اور چلا کر بولا۔

”تیرے ناپاک وجود سے آج میں اس دھرتی کو پاک کر دوں گا۔ تجھے آسان موت ہرگز نہیں ملنی چاہیے۔“

یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کے دونوں بازوؤں اور دائیں ٹانگ پر فائر کھول دیے۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔

”ان سب سے معافی مانگو!“ جاذب نے اسے ٹھوکر ماری۔

”نہیں! میں معافی نہیں مانگوں گا۔“

جاذب نے اس کے بائیں کھنٹے اور دائیں شانے کی

بڈی کو نشانہ بنایا اور سرد لکھنے میں بولا۔
”معافی مانگ لے کیپٹن!“

”تم بہت پچھتاؤ گے لڑکے! تمہاری ساری بستی کو میں آگ لگا دوں گا۔“

جاذب نے اس کے بائیں شانے اور پھر رانوں پر بھی فائر کھول دیے۔ کیپٹن کی ہمت اب جواب دینے لگی تھی۔

”مم..... مجھے چھوڑ دو..... میں منہ مائی قیمت دینے کو تیار ہوں۔“ اس کا لہجہ ڈوبنے لگا۔

”ان عورتوں سے معافی مانگ۔“

کیپٹن یہ مشکل اپنا وجود گھسیٹتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور ان کے قدموں میں گر کر بولا۔

”تم لوگ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ مگر اس لڑکے سے میری جان بچنی کرنا دو۔“ وہ منہ بنایا۔

عورتوں نے نفرت اور حقارت سے اس کے منہ پر تموک دیا۔ اسے سننے میں نوشی بھی جھانپی کی اوٹ سے نکل کر وہاں پہنچ چکی تھی۔

”جس وقت تم ان معصوم اور بے گناہ لوگوں پر ظلم کر رہے تھے تب تمہاری فرعونیت عروج پر تھی۔ اب موت سامنے دیکھ کر پسینا کیوں آ گیا؟“ وہ جلال میں آ گئی۔

”ان کی بہادری صرف نیتوں کو لوں تک ہی محدود ہوتی ہے۔“ جاذب نے واحد بچے ہوئے سپاہی کو بھی نشانہ پر لیا۔

”میں اسے بالکل معاف نہیں کروں گی۔ اس معصوم لڑکی کی پکار پھول سے بچے کی لاش اور ماتا کی بے رحمی کا انتقام نہ لیا تو یہی سکون سے جی نہ سکوں گی۔“ نوشی نے کچھ دور پڑے ایک پتھر کو اٹھایا اور وحشیانہ انداز میں کیپٹن کی کھوپڑی پر تازہ توڑ حملے کر دیے۔ جاذب کا دھیان بھی وقتی طور پر اس سپاہی سے ہٹ گیا۔ اس نے اس غفلت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور جاذب کی بندوق کو ٹھوکر سے ایک طرف پھینک کر ڈھولان کی جانب چھلانگ لگا دی۔

”یہ بہت غلط عمل ہے۔ کہیں یہ ملک نہ لے آئے۔“ نوشی نے تاسف سے سر ہلایا۔

”اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔“ جاذب نے دکھ اور الم کی تصویر بنے ان افراد سے کہا۔

ان سب نے آمنہ اور دیگر دونوں افراد کی لاشیں اٹھائیں اور خاموشی سے جاذب کے ساتھ اس کے گاؤں کی طرف چل دیے۔

گاؤں والوں کو ان کی پتا کا علم ہوا تو سب کے دل دکھ

سے بھر گئے۔ بزرگوں نے فوری طور پر میچوں کو غسل دلوا کر
دھناتے کا انتظام کیا اور نہایت خلوص سے انہیں بارڈر کر اس
کرنے کا مشورہ دے کر زوردار بھی ہمراہ کر دیا۔
ان کی روانگی کے بعد جاذب نے خود پر بیٹے والے
واقعات بھی بلا کم و کاست سنا دیے۔ ان کی پیشانیوں پر
تفکرات کی گہری لکیریں ابھر آئیں۔

”بھارتی فوجی بہت شتم مزاج ہوتے ہیں بیٹا! زندہ رہ
جانے والا فوجی اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینے کے لیے ہر قسم
کا جو میں تم لوگوں کو شکاری کی طرح ڈھونڈتا پھرے
گا۔“ ایک بزرگ نے کہا۔

”اب ہمارے لیے کیا حکم ہے چچا جان؟“ جاذب
نے پوچھا۔

”حکم کیا کروں بیٹا! بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی فوری
طور پر یہ علاقہ چھوڑ دو۔“

”ہاں! اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں۔“ خاندان
کے ایک اور بزرگ نے کہا۔ ”اس فوجی نے تم دونوں کو اچھی
طرح دیکھ لیا ہے اور اب تک تمہاری تلاش بھی شروع ہو چکی
ہوگی۔“

جاذب ان کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے کچھ کہنے
کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ ایک اور بزرگ نے ہاتھ اٹھا
کر بولنے سے منع کیا اور کہنے لگے۔

”بہتر یہی ہے کہ ان دونوں کا ابھی نکاح بڑھو کر اسی
قافلے کے پیچھے روانہ کر دیا جائے۔ آزاد علاقے میں ہمارے
بہت سے رشتے دار موجود ہیں۔ یہ وہیں قیام کر سکتے ہیں۔“

جاذب ان کے الفاظ سن کر سکتے میں رہ گیا اور بے چینی
سے بولا۔

”لیکن چچا جان!“

”یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے چچا! یہاں رہنے میں بہت
سے خطرات ہیں اس لیے ایک محرم رشتے میں بندھ کر ہی اپنا سفر
جاری رکھنا ہوگا۔“

انہوں نے خاندان کے دیگر لوگوں کو نکاح کے
انتظامات کرنے کا حکم دیا۔ جاذب کے ہوش و حواس سلب ہو
چکے تھے۔ نوشی بھی اس چاک چاک صورت حال پر گنگ گئی۔

ان کے ذہنوں پر جیسے دھندلاری تھی۔ شام کے سائے
گہرے ہوتے ہی ایجاب و قبول کے تمام مراحل طے ہو
گئے۔ جاذب کو تو ہوش اس وقت آیا جب ریاض نے آگے
بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

”بہت مبارک ہو میرے دوست! اللہ پاک تمہاری

زندگی کا یہ نیا سفر کامیاب کرے۔“

”تم..... کہاں چلے گئے تھے..... ہم تمہیں ڈھونڈنے
ہوئے.....“ جاذب نے تیزی سے کہا۔

”مجھے سب علم ہو گیا ہے..... میرا ایک تیل گم گیا تھا
جسے ڈھونڈتے ہوئے میں بہت دور نکل گیا تھا۔“

”وہاں انڈین آری نے ان لوگوں کے ساتھ بہت ظلم کیا۔“

”ایک لحاظ سے تمہارا وہاں چاک چاک ہونا ان کے حق
میں بہت اچھا ثابت ہو گیا۔ یہ سب تو قدرت کی طرف سے
طے تھا۔ اب تم کوئی فکر نہ کرو اور مستقبل کی سوچو۔“ ریاض علی
نے اسے تسلی دی۔

”ہاں! ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ اگر میں وہاں نہ پہنچتا تو
جانے وہ بھیڑے اور کیا کرتے؟“

ریاض علی نے اسے ایک بار پھر گلے لگا کر خوب تسلی
دی۔ چناروں کے اس دیس میں رات اترا آئی تھی۔ خاندان
کے بزرگوں نے دعاؤں کے سائے میں جاذب اور نوشی کو کچھ
زوردار دے کر رخصت کر دیا۔

اس انوکھی رخصتی پر ہر آنکھ ٹکبار تھی۔

☆☆☆

دو دنوں بغیر کے چلتے جا رہے تھے۔

گاؤں کی سرحد پار کرنے سے نکل ایک بار انہوں نے
گرد و پیش کی ہر چیز کو کم آنکھوں سے خوب یادوں میں
اتارا۔ وہ جانتے تھے کہ یہاں زیادہ دیر نہ رہیں گے ان کے لیے

بہت بڑا خطرہ ہوگا اس لیے دل پر پتھر رکھ دے وہ اپنے نیچے
رستوں پر ہموار انداز میں قدم بڑھاتے رہے۔ رستہ اب بہت
دشوار ہونے لگا تھا لیکن وہ بچپن ہی سے ان کٹھنائیوں کے
عادی تھے اس لیے انہیں کوئی بھی مسئلہ درپیش نہ ہوا۔

رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی۔ آسمان پر چاند بھی
گہرے بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ وہ جنگل میں کافی دور نکل
آئے تھے۔ یہاں سے رستہ اتنی تھوڑا دور اب اس اندھیرے
میں مزید سفر ان کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ رستہ

بھول جانے کا اندیشہ بھی سر پر مڑلار تھا۔

”کچھ دیر آرام کر لیں جاذب؟“ نوشی نے کہا۔

”کیا تھک گئی ہو؟“

”ہاں! اب مزید چلنے کی ہمت نہیں ہے۔“ اس نے

گہری سانس لی۔

”ٹھیک ہے۔ کوئی جگہ تلاش کر لیتے ہیں۔“ جاذب کی

آنکھیں اندھیرے سے کافی مانوس ہو چکی تھیں۔ اس نے
تھوڑی ہی دیر بعد ایک غار تلاش کر لیا اور نوشی کا ہاتھ پکڑے

منبوط قدموں سے اندر چلا گیا۔

غار کا اندرونی حصہ کافی کشادہ تھا۔ جاذب نے روانگی
سے پہلے انڈین فوجیوں سے حاصل کی گئی بندوق بھی اپنے
ہمراہ لے لی تھی۔ اس نے بندوق کو احتیاط سے تھاما اور غار میں

کسی جانور کی موجودگی کا اندیشہ ذہن میں رکھتے ہوئے پھونک
پھونک کر قدم بڑھانے لگا۔ خوش قسمتی سے انہیں کسی بھی
خطرے کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

غار کا فرش بالکل ہموار تھا اور وہاں یہ آسانی لینا جا سکتا
تھا۔ جاذب نے اپنے سامان سے ایک چادر نکالی اور فرش پر
بچھا دی۔ نوشی نے بھی اپنا سامان وہیں رکھ دیا اور دیوار سے
پشت ٹکا کر بیٹھ گئی۔ کئی لمبے یونی خاموشی سے سرک گئے۔

”نوشی!“ کچھ دیر بعد جاذب نے پکارا۔

”جی؟“

”کیا تم رورہی ہو؟“

”نہیں۔“

”تو پھر اتنی اداس کیوں ہو؟ کیا میرے ساتھ آنے
کی تمہیں کوئی خوشی نہیں؟“

”مجھے تمہارے ساتھ آنے سے بہت خوشی ہے جاذب
لیکن میں سب گھر والوں کو یاد کر کے دھکی ہو رہی ہوں۔

جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟“

”ہمارے ہتھیار جب سے بھارتی فوج نے اپنے قبضے
میں لے لیے ہیں ہم بے بسی کی انتہا پہنچ چکے ہیں۔ نتیجے ان
سے لڑیں بھی تو کیسے؟“

”پروردگار! ان سب کو اپنے حفظ دامن میں رکھنا۔“

نوشی گڑ گڑائی۔

”اللہ بہتر کرے گا۔“ جاذب نے خلوص سے کہا۔

ایک بار پھر ان دونوں کے مابین گہری خاموشی حاکم ہو

گئی۔ وہ اپنی اپنی سوچوں میں کم موجودہ حالات پر غور کرنے
لگے۔ بچپن کی نسبت کے باعث ان میں ایک گہری انسیت کا
رشتہ قائم تھا جو شعور کی وادی میں قدم رکھتے ہی ایک بے عنوان
سی محبت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ انہوں نے باہمی زندگی ساتھ

گزارنے کے بہت سے خواب دیکھے تھے لیکن جن حالات
میں یہ نکاح ہوا تھا اور انہوں سے فاصلے پیدا ہوئے تھے وہ

دونوں بھول ہو گئے تھے۔

خوشی اور مسرت کا کوئی لمحہ ان کے علاقے میں کم ہی

راس آیا کرتا تھا۔ کسی بھی تہوار یا شادی بیاہ کے موقع پر بھارتی

فوجی اپنی درندگی دکھانے سے نہ چوکتے اور نوکر لڑکیوں کی کٹی
پھٹی لائیں اکثر جنگل یا پہاڑوں پر جنگلی جانوروں کی خوراک

بن جایا کرتیں۔

نوشی ان لمحات کا تصور کر کے تھڑاٹھی اور جاذب کی
زندگی و سلاستی کے لیے بھی دعا گو ہو گئی۔ کچھ ہی لمحوں میں
تھکاوٹ سے چہرہ ہو کر وہ نیند کی وادی میں کھو گئے۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ جاذب کی آنکھ کھل
گئی۔ کچھ دیر تو وہ اپنے ارد گرد ماحول کا ادراک ہی نہ کر

پایا۔ غار میں گھب اندھیرا تھا۔ دھیرے دھیرے اسے اپنی
پوزیشن کا احساس ہوا تو وہ ہڑ ہڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس طرح غفلت
کی نیند ان کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

اس نے ٹٹول کر اپنی بندوق اٹھائی۔ نوشی کی مدھم
سانسوں کی آواز بھی اس کی سماعت میں پڑ رہی تھی۔ وہ

اندازے سے چلتا ہوا غار کے دہانے پر آکر بیٹھ گیا۔

دور کہیں کوئی پرندہ کوک رہا تھا۔ جنگل کے مہیب سائے میں

جاذب کو یہ آواز بہت بھلی محسوس ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بتایا

انسئل پرندہ قدرتی طور پر فجر سے پہلے بیدار ہوا کرتا ہے

اور اپنی مخصوص آواز میں راک الاپتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں

جنگل مزید پرندوں کی آواز سے بھی گونج اٹھا۔ انہی خوشیا

آوازوں میں ہوا کے دوش پھر لہرائی ایک بھیاںک آواز بھی

اس کی سماعت سے دور نہ رہی۔ کسی شکاری کتے کی آواز اسے

بہت قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

جاذب ایک ہی لمبے میں ساری صورت حال سمجھ

گیا۔ بھارتی فوجی ضرورتوں کے ذریعے انہیں تلاش کرتے

ہوئے۔ جنگل میں پہنچ چکے تھے اور اب یہاں مزید ٹھہرنا خود کشی
کے مترادف تھا۔ وہ ایک جست میں اندر پہنچا اور نوشی کو جھنجھوڑ

کراٹھا دیا۔

”سک..... سک..... کیا ہوا؟“ وہ ہڑ بڑا گئی۔

”بھند رستانی فوجی کسی بھی لمحے یہاں پہنچنے والے

ہیں..... ان کے پاس شکاری کتے ہیں جن سے انسانی جسم کی

بو بھی نہیں رہ سکتی۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ وہ دانستہ
بلند آواز میں بولا تاکہ نوشی کے حواس جلد بحال ہو سکیں۔

نوشی نے بھی تیزی سے سامان سمیٹا اور اس کا ہاتھ

تھامے باہر آئی۔ چاند اب بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔

اس لیے راستے کے نشان اب بھی نہیں رہے۔ وہ احتیاط سے قدم

اٹھاتے مخالف سمت میں تیزی سے چلنے لگے۔ مختصر نیند نے

انہیں کافی حد تک تازہ دم کر دیا تھا اور جان بچانے کی جبلی

خواہش بھی ارادوں کو مزید کمیز کر رہی تھی۔

صبح صادق کی روشنی دھیرے دھیرے پھیلنے لگی۔ وہ

بغیر رکے چلتے جا رہے تھے۔ ایک جگہ پانی کا چشمہ نظر آئے ہی بے اختیار خشک کر رک گئے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے دھو کر کے دونوں نے نماز ادا کی اور اپنے سامان سے مٹی کی روٹی نکال کر پیٹ کے اندر گھس کر دیکھا۔ اوک سے جی بھر کر ٹھنڈا پانی پینے کے بعد انہوں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ اپنے عقب میں دھب دھب کی آوازوں کے بعد ایک اور کرخت آواز نے انہیں چونکا دیا۔

”ہینڈ زاپ! اخیر دار حرکت کی تو بھون کے رکھ دیں گے۔“ جاذب اور نوشی کے ذہنوں میں بیک وقت ایک ہی خیال سرسرایا کہ انہیں ٹریس کر لیا گیا ہے۔ وہ دو افراد تھے۔ ان کی بڑھی ہوئی شیو، آنکھوں میں سرخی اور منہ سے اٹھتے بدبو کے بھجکوں سے گراہت محسوس ہو رہی تھی۔

”کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ان میں سے ایک نے کڑھکی سے پوچھا۔ جاذب یہ سوال سن کر چونک گیا۔ یہ کوئی انجان الہکار معلوم ہوتے تھے۔ اس نے انہیں پکڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

”صاحب جی! ہم دونوں بریکی ہیں۔ ہمارے بڑے بہاؤ کے لیے نہیں مانتے تھے تو ہم گھر سے بھاگ آئے ہیں۔ غلطی ہوئی جی۔ رستہ بھول کر ادھر نکل آئے ہیں۔“ جاذب نے اپنی اداکاری میں رنگ بھرنے کے لیے کانوں کو ہاتھ لگا کر ہاتھ بھی جوڑ دیے۔

”بہت ٹھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ ادھر تھوڑی دور ہی ہمارا کیمپ ہے۔ آرام کرو پھر جہاں کہو گے پہنچا دیں گے۔“ دوسرے سپاہی نے ہوس ناک نظروں سے نوشی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

جاذب کی بھی طرح اپنے سامان کے پیچھے دلی بندوبست نکالنا چاہتا تھا لیکن ان الہکاروں کی نظر سے چٹا منٹ نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے نوشی کو بازو سے پکڑ کر آگے گھینا۔ اس کا پاؤں بے اختیار پھسلا اور وہ کراہتی ہوئی نیچے گر گئی۔ جاذب اس کی چال سمجھا۔ دونوں الہکاروں کا دھیان نوشی کی جانب ہی تھا۔ اس نے سرعت سے ایک الہکار سے بندوبست چھینی اور ان دونوں پر فائر کھول دیے۔

جنگل میں دھماکوں کی اس زوردار آواز سے پرندوں نے بھی احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں اب ہر طرف سے خطرے میں گھر چکے تھے۔ جاذب جانتا تھا کہ یہ الہکار کسی قریبی چوکی سے یہاں آئے ہوں گے اور اسے یہی علم تھا کہ ہر چوکی پر ایک افسر کے علاوہ دو ماتحت تعینات ہوتے ہیں۔ دو افراد کے جنم واصل ہونے کا سکون اپنی جگہ لیکن تیسرا

نادیدہ دشمن بھی اپنی موجودگی سے ان کے لیے شدید خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اس کے علاوہ فائرنگ کی یہ آواز تعاقب کرنے والی ٹیم کو بھی خود بخود ان کا سراغ دے دیتی۔

یہ سبھی خیالات ایک لمحے میں جاذب کے ذہن میں گردش کر گئے اور اس نے فوراً وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں فوجیوں کی بندوبست اور اضافی گولیوں پر قبضہ بھاگ کر وہ سامنے کی سمت میں نظر آتی پہاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر وہ دوسری طرف مڑ جانا چاہتے تھے جہاں ان کی معلومات کے مطابق آزاد کشمیر کا علاقہ واقع تھا۔ چڑھائی بہت دشوار تھی لیکن انہوں نے بہت نہ ہاری اور اپنے کانپتے کانپتے وہ فاصلہ طے کرتے گئے۔ کافی بلندی پر پہنچنے کے بعد نوشی نے اس کا بازو تھما اور التجا سیدہ انداز میں بولی۔

”مجھ سے اب مزید نہیں چلا جا رہا۔ تھوڑی دیر میںیں رک جاؤ۔“ ٹھیک ہے۔ تم وہاں درخت کے سائے میں چلو۔ میں ذرا اور گرد کی خبر لوں۔“ اس نے نوشی کا سر تھپتھپایا۔ ایک درخت کی شاخ پر چڑھ کر اس نے نیچے کھانچا لیا تو اس کے اندازے کے عین مطابق تیسرا الہکار ان کی راہ پر لگ چکا تھا۔ جاذب گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اب فائرنگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے دائیں جانب موجود جھاڑیوں کی اوٹ میں دیک گیا۔ اس الہکار کو یہاں سے لازمی گزرتا تھا۔

انتظار اور سسٹنی کی کیفیت میں اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے ایک سوکھی لکڑی جھننے کی آواز آئی۔ وہ فوراً چونکا ہو گیا۔ الہکار کے ذہنی جوتوں تلے کوئی شاخ ٹوٹی تھی۔ جاذب نے بندوبست کو نال سے تھا اور قریب آتے ہی اس کے سر پر پے در پے کئی وار کر دیے۔ کھوپڑی جھننے کی مخصوص آواز کے بعد وہ فوجی الہکار تیزا کر نیچے گر گیا۔

سورج اب کافی بلند ہو گیا تھا۔ ہلکی سنہری دھوپ نے اپنے پڑ پھیلالیے۔ ذرا اہل سستانے کے بعد حرکت میں آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ نوشی کسی گہری سوچ میں تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ جاذب نے محبت سے پوچھا۔ ”ہم رستہ بھٹک گئے ہیں۔ وہ قافلہ تو ہمیں کہیں بھی نہیں ملا۔“ ”شاید وہ لوگ کسی دوسرے رستے سے واقف ہوں گے۔“ ”اب کیا ہوگا جاذب؟“ وہ بے اختیار پریشان ہوئی۔ ”فکر نہ کرو۔ ہم ضرور بارڈر کراس کریں گے اور انہیں کمئیر گاؤں کے حالات سے آگاہ کر کے مدد طلب کریں

گے۔“ اس نے تسلی دی۔

وہ جانتا تھا کہ نوشی کا کبھی ایسے حالات سے واسطہ نہیں پڑا۔ وہ اسے بائیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سرحد پار کرنا بالکل بھی آسان نہیں تھا لیکن آزاد خطے کی تمنا اسے ہر خطرہ مول لینے کے لیے اکسار رہی تھی۔

انہوں نے اپنی چھاگل سے تھوڑا پانی پیا اور ایک بار پھر سفر شروع کر دیا۔ اب وہ پہاڑی کی دوسری جانب نشیب میں گامزن تھے۔ اس طرف کا علاقہ ان کے لیے مکمل اجنبی تھا۔ وہ صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ اس پار کے لوگ ’آزادی‘ جیسی عظیم دولت سے مالا مال ہیں۔ وہ مکمل عام نماز پڑھتے ہیں، نبھو سنا تے ہیں، شادیاں کرتے ہیں اور سبھی اسلامی رسوم و رواج پر آزادانہ عمل کرتے ہیں۔ اس آزادی اور ان تعینات کی وہ کھل تمنا ہی کر سکتے تھے۔

دوسری جانب نشیب میں پھر جنگل کا سامنا تھا۔ چنار کے بلند درخت انہیں حیرانی سے تیک رہے تھے۔ وہ بغیر رکے شام تک چلتے رہے لیکن اب بھی انہیں کوئی گاؤں یا رہائشی علاقہ نظر نہ آیا تھا۔ وہ ابھی تک مقبوضہ علاقے میں ہی تھے اور اس وقت تلوار کی دھار پر سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

ایک جگہ رک کر انہوں نے بانی ماندہ گہی کی روٹی سے پیٹ پوجا کی۔ کھانا اب ختم ہو چکا تھا البتہ پانی جا بجا چشموں سے اٹھیں مل جاتا تھا جسے وہ اپنی چھاگل میں بھر لیتے۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ انہیں رات گزارنے کے لیے کسی محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی جو خوش قسمتی سے کچھ دور جاتے ہی مل گیا۔

یہ ایک قدرتی کھوہ تھی۔ جاذب نے نوشی کا ہاتھ تھما اور دہانے سے چھڑیاں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ اندرونی جانب بالکل کشادگی نہیں تھی۔ دو افراد کے بیٹھنے کے لیے ہی یہ مشکل جگہ تھی۔ انہوں نے گہری سانس لے کر سامان رکھ دیا۔ ”نوشی! تم کافی تھکی ہوئی ہو اس لیے تھوڑی دیر آرام کرو۔ ہم دونوں میں سے ایک کے لیے بیداری بہت ضروری ہے۔ میں کچھ دیر بعد کہیں جگا دوں گا۔“

”مجھے نیند بالکل نہیں آئے گی۔ پہلے تم سو جاؤ۔ میں تمہیں جگا دوں گی۔“ نوشی نے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ جاذب شخص اس کی وجہ سے اپنی تھکاوٹ کا اظہار نہیں کرے گا اور اگر وہ سوئی تو اس کے آرام کی خاطر جاذب اسے بالکل نہیں چکائے گا۔

جاذب نے اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ کیا اور اپنا جسم موڑ کر ایک پتھر پر سر رکھے تھوڑی ہی دیر میں سو گیا۔ نوشی خاموشی سے اس کے نقوش اور وجود پر طاری جلد خاموشی کو

دیکھتی رہی۔ تقدیر انہیں مجب موڑ پلے آئی تھی۔

”یہ غلامی جانے کب تک اندھروں کی طرح ہمارا مقدر رہی رہے گی؟ آزادی کا سورج لیے روشن صبح کب طلوع ہوگی؟“ اس کی آنکھوں میں نمی چھلکی۔

وہ کافی دیر تک کھوہ سے باہر نظر ڈالے اندر مہرے میں امید کے جگنو تلاشتی رہی اور پھر اپنی تھکاوٹ اور نیند کے سامنے سرنگوں ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے آس پاس ایک تیز سرسراہٹ کے علاوہ جہرے پر شدید نمی محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر تو اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کہاں موجود ہے لیکن جب آنکھیں اندر مہرے سے مانوس ہوئیں تو اپنے دائیں جانب دوسرے آنکھوں کو دیکھ کر ہنسی پائی انداز میں چٹکی ماری۔

اس کے بالکل قریب ایک بھیڑیا موجود تھا جس کی تھوٹھی سے ٹپکنے والا مادہ اس کا چہرہ چھیرا رہا تھا۔

”کیا ہو نوشی؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ جاذب کی آنکھ کھل گئی۔ نوشی نے بے اختیار اس کا بازو دو بوج لیا۔ جاذب کی نظر بھی بھیڑیے پر پڑ چکی تھی۔ اس نے لپک کر اپنی بندوبست تھام لیکن بھیڑیا ایک جست لگا کر تارکی میں غائب ہو گیا۔ اب نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں کھوہ کے دہانے میں بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

بھوک ان کے معدوں کو اپنے تیز بھجوں سے بوج رہی تھی لیکن پانی کے سوا کچھ بھی میسر نہیں تھا۔ چنار اور چیر کے درختوں سے ہوا سرسراہٹ ہوئی گزرتی تو شاخوں کی آواز سے بھی ان کے دل دھڑک اٹھتے۔ وقت ست رفقاری سے ہی سہی لیکن گزرتا چلا گیا۔ پرندوں کی مخصوص آوازیں فضا میں پھیلیں تو وہ ایک بار پھر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

سورج اب سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ جانے کتنی مسافت طے کر چکے تھے۔ ایک مقام پر پرندوں کی ٹوٹی دیکھ کر وہ خشک کرک گئے۔ ان کی یہاں موجودگی کا واضح مطلب تھا کہ قریب ہی کہیں جنگلی پھل یا میوے موجود ہیں۔ جاذب نے بے تابی سے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں اور پھر کچھ ہی دور سے ایک پھل دار درخت نظر آ گیا۔ یہ ایک مقامی پھل تھا جو چھوٹے بیروں کی شکل میں دستیاب ہوتا تھا۔

”نوشی! تم یہ سامان پکڑو۔ بھوک مٹانے کا انتظام ہو گیا ہے۔“ وہ پتھر جوش ہوا۔

”یہ تمہاری ہے جاذب۔ پھل اس میں ڈال دیتا۔“ نوشی نے کپڑے کی بنی وہ پھل تھامی جس میں لمبی کی شیشی روئیاں تھیں۔

دوسری شاخ پر جمول رہے تھے۔ کیا ہم ایسا کوئی طریقہ نہیں اپنا سکتے؟“ نوشی کی تجویز سن کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
”بالکل۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔ مجھے تو خیال ہی نہ آیا۔ کمال کی تجویز دی ہے تم نے۔“ اس کے والہانہ انداز پر نوشی کے رخسار ختمتا اٹھے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس اوپر مڑتے ہوئے پنسل نارچ کی روشنی میں درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے ایک ایسا درخت مل گیا جس کے ساتھ خاردار تاریں گزر رہی تھیں۔ یہ بھی چنار ہی کا درخت تھا جس کی شاخیں قدرتی طور پر کئی میٹر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہی شاخیں انہیں اپنے مقصد میں کامیاب کر سکتی تھیں۔

وہ خوشی سے جموٹا ہوا نوشی کے پاس آیا اور اسے اپنی دریافت کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ بھی پُر جوش ہوئی۔ آزاد فضا میں سانس لینے کا تصور انہیں کسی بھی گہرائی میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک عزم سے آگے بڑھے اور درخت کے پاس پہنچ گئے۔ جائزہ نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور نوشی کو ایک شاخ پکڑ کر دوسری طرف کودنے کا اشارہ کیا۔ اس کے آگے بڑھتے ہی اس نے ایک نسبتاً اونچی شاخ تھامی اور اپنا جسم چوس کر لیا۔

اسی لمحے ہوا میں ایک زوردار برسات کی آواز گونجی اور جاذب نے نوشی کے وجود کو لہرا کر دوسری جانب گرتے ہوئے دیکھا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، اسے اپنی پشت میں بھی انگارے دھستے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسی لمحے میں وہ ساری صورت حال سمجھ گیا کہ یہ بھی ان کے صیادوں کا لگا گیا ہوا ایک پھندا تھا جس میں وہ بھی پھنس گئے تھے۔

اس کے خون آلود ہاتھوں سے شاخ پھسلتی اور وہ بھی نوشی ہی کی طرح لڑھکتا چلا گیا۔ بارودی سیسہ سنگناخ زمین سے ٹکرانے کی خراشوں کی آذیت سے بڑھ کر اس وقت وہ کسک اور تشنگی بھی جوانہوں نے لب بام محسوس کی۔

”نوشی.....“ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز سے پکارا۔ دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ اس کا دل کسی نے یک گت مٹھی میں بچھین لیا۔ اس نے تیزی سے اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے ذہن کو سنبھال کر کھلے کارور دیکھا اور آزاد زمین کی مٹی کی چمکی اٹھا کر اپنے چہرے پر لٹی۔ انہیں دردندوں سے آزادی نہیں مل سکی تھی مگر اس نوبت اپنا جوڑے نے آزادی کی خواہش صرف خواہش اور کوشش کی پوری قیمت اپنے ہوسے ادا کر دی تھی!

جاذب تیزی سے درختوں کے جمول میں گیا اور وہ اگلے نصف گھنٹے میں مٹی کے علاوہ اپنے دامن میں بھی ڈبیروں پھل بھر لایا۔ انہوں نے ہیر ہو کر پھل کھایا اور پانی پنی کر رب کا خصوصی شکر ادا کیا۔ اب ایک بار پھر وہی سفر تھا اور وہی گھٹا جنگل۔ ”مزید کتنا سفر رہ گیا ہے جاذب؟“ نوشی نے پوچھا۔

”میرے اندازے کے مطابق تو اب تک سب سہل آجانی چاہیے۔“ اس نے پیشانی مسکی۔
”کیا تمہیں اس کی کوئی نشانی یاد ہے؟“
”ہاں۔ ایک ٹالا بہتا ہے جو دوسری طرف دریائے نیلم میں جاگتا ہے۔“

”اگر آج رات بھی کسی کھوہ یا غار میں بسر کرنی پڑی تو.....“ نوشی گزشتہ رات کا منظر یاد کر کے ایک بار بھر ہڑپائی۔
”فکر کیوں کرتی ہو؟ ہم اس وقت ایک نیک مقصد کے لیے حالت سفر میں ہیں۔ قدرت ہماری مدد ضرور کرے گی۔“
شام کے سامنے تیزی سے پھیلنے لگے۔ اب وہ مایوسی کا شکار ہونے لگے تھے لیکن یکدم پانی بہنے کی ہلکی سی آواز ان کے لیے حیات نو کی نوید ثابت ہوئی۔ منزل قریب تر نظر آنے لگی تو قدرتی طور پر ان کی رفتار تیز ہوئی۔ دس منٹ کی مسافت کے بعد وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے تھے جہاں سے خاردار تاریں اور سرحدی علاقہ تو واضح نظر آنے لگا تھا۔

”اب خطرہ مزید بڑھ گیا ہے۔ ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔“ جاذب نے سرگوشی کی۔
”وہ کیوں بھلا؟ اب تو منزل پاس ہے۔“

”یہاں بھارتی فوجیوں نے ہر جانب نادیہ جال اور بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی ہیں۔ ایک قدم بھی غلط جگہ پر پڑا تو ہمارے پوتھڑے اڑ جائیں گے۔“

خاردار تاروں کو پھلانگنا ایک ناممکن امر تھا۔ اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ جاذب نے بھارتی فوجی سے حاصل کی گئی ایک پنسل نارچ نکالی جو ایسے ہی کسی موم کے لیے اس نے اب تک استعمال نہیں کی تھی۔ نارچ کی مدد روشنی میں بھی دوسری جانب جانے کے بھی امکانات صفر نظر آتے تھے بلکہ اب تو وہ دہرے خطرے کا شکار تھے۔ سرحد پار فوجی بھی انہیں دشمن سمجھ کر ہی نشانہ بنا سکتے تھے۔ اس کشمکش میں گمراہ رہ جینی سے اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

”جاذب! وہ درخت نظر آ رہے ہیں تمہیں؟“ نوشی نے اس کا کندھا ہلکا کر اشارہ کیا۔

”ہاں..... کیوں کیا ہوا؟“ وہ بے دھیانی سے بولا۔
”آج بندروں کو نہیں دیکھا تھا جو ایک شاخ سے

فلورینڈا کے ساحلی شہر ساراسوتا میں طوفان کا زور ٹوٹا تو لوگ معمولات زندگی بحال کرنے میں مصروف ہو گئے۔ بجلی کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ اس لیے لوگ دن کے مقابلے میں زیادہ تر رات کو باہر نکلے۔ پولیس آفیسر ہیکٹر جارج نے اس کا اظہار سراغ رساں یوریکا کلبرن سے کیا تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا مطلب ہے حالیہ دنوں میں؟“
دن میں پڑنے والی شدید گرمی کی وجہ سے شہر ویران ہو چکا تھا لیکن طوفان کی وجہ سے ہونے والا بلیک آؤٹ ختم

تحفہ

شاہ زین رضوان

مجرم چاہے کتنا ہی بڑا شاطر ہو مگر قانون کے آگے ایسا ہی نادان بچہ ثابت ہوتا ہے جو قدم قدم پر لڑکچہڑا ہٹ کے خوف میں مبتلا ہو۔ اس نے بھی بہت چالاکی سے بازی تو کھیلی مگر... اندھے قانون کی تیز نگاہوں سے پھر بھی بچ نہ سکی۔

جرم کو چھپانے کے لیے انوکھا انداز اختیار کرنے والی حین کی مکاری



ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سمندر کے پانی نے ٹرانسفارمر تباہ کر دیے اور تاریں زنگ آلود ہو چکی تھیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ بجلی کا نظام کب ٹھیک ہوگا۔

”تمہیں اگر میری بات پر یقین نہیں آ رہا تو خود چل کر دیکھ لو۔ تمام بار بھرے ہوئے ہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔

”بہت دلچسپ بات ہے۔“ یوریکا بولی۔

طوفان گزرنے کے دو دن بعد ہیکٹر پولیس اسٹیشن پہنچا۔ وہ بھوکا تھا اور اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اس نے پانی میں گھرے ہوئے میاں سے اپنا سفر شروع کیا اور تباہ شدہ گئے اور ٹائٹل کے کھیتوں سے گزرتا ہوا اپنی منزل تک پہنچا۔ ایک کھیت میں اس نے ٹوٹا پھوٹا احاطہ اور دوسرے میں منہدم شدہ گودام دیکھا جس میں رکھی ہوئی سیکڑوں شینجینی سیلابی پانی میں بہہ رہی تھی۔

اس خوفناک سفر کے باوجود وہ خاصا خوش لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی گرے ہوئے درخت کو سونکھوں میں کاٹا ہو۔ یوریکا نے اس کے لیے فوراً ہی خوراک اور لباس کا بندوبست کیا تاکہ وہ اپنے فرائض کو جمعے سے انجام دے سکے۔ یوریکا کو یہ جان کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کہ ہیکٹر نے رات کو کشت کرنا شروع کر دیا ہے۔

”میں مون بار میں کچھ غیر معتبر لوگوں سے ملا ہوں۔“ ہیکٹر نے کہا۔ مون بار صرف ان راتوں میں کھلتا تھا جب چاند نکلا ہوا ہوتا تھا۔ ”میری پناہ گزینوں، موسیقاروں اور بجلی کے ستارے ہوئے لوگوں سے بات ہوتی ہے۔ دن کی روشنی میں طاقتور لوگ کمزوروں کا شکار کر لیتے ہیں لیکن رات کے اندھیرے میں یہی کمزور لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ یہ طاقت چلے جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ یوریکا نے کہا۔ ”میں کسی وقت مون بار جاؤں گی۔“

”ہاں۔ وہاں کئی عورتیں آتی ہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔

یوریکا جانتی تھی کہ عورتیں ہیکٹر کو پسند کرتی ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ خوش رہتا ہے۔ وہ انہیں خوش کرنے کے لیے عمدہ لباس پہنتا تھا۔ اس نے اپنی وردی کی خاکی چٹون اور سفید قمیض بھی جدید انداز میں سلوائی تھی اور اس کے بال ہمیشہ خوب صورتی سے ترتے ہوئے ہوتے۔

”میری گزشتہ شب ایک ایسی عورت سے ملاقات ہوئی جو بہت مشکل میں ہے۔“

وہ ویسے بھی بہت زیادہ خیال رکھنے والا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب وہ چھوٹا تھا تو اس کی ماں سیلاب میں بہہ

گئی تھی۔

”کیا اسے کسی مرد کی وجہ سے پریشانی ہے؟“ یوریکا نے پوچھا۔

یوریکا کے انداز میں بے اعتنائی تھی۔ ہیکٹر نے اسے غصے سے دیکھا۔ ان دنوں ہر ایک کا ماضی مشکوک لگتا تھا چاہے وہ ہیکٹر کی طرح جوان ہی کیوں نہ ہو۔

”اس نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ اس پر ظلم کرتا ہے، بد قسمتی سے وہ اس پر احمقار کرتی ہے۔“

”اور اسے تمہاری مدد چاہیے؟“

”نہیں۔ دراصل وہ تمہاری مدد چاہتی ہے۔“

”واقعی۔“ یوریکا حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم نہیں سمجھتے کہ وہ میرے بجائے تمہاری مدد کو ترجیح دے گی اور شاید وہ میری مدد لینا پسند نہ کرے۔“

”وہ چاہتی ہے کہ آج رات میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں تاکہ وہ تم سے ملاقات کر سکے۔“

”اس سے کہو کہ پولیس اسٹیشن آج جائے۔“

”یہ اس کے لیے مشکل ہوگا۔ وہ صرف رات میں ہی باہر نکل سکتی ہے۔ اسے کچھ غیر معمولی تجربات ہوئے ہیں۔ معاشی حالات کی وجہ سے اسے کچھ قابل اعتراض معاملات پر مجبور ہونا پڑا۔“

”قابل اعتراض۔ یہ تو سننے میں ہی برا لگتا ہے۔“

”جوانی میں اسے کچھ ایسے سفر کرنا پڑے جو نہیں کرنا چاہیے تھے۔“

”مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی۔“

”بعض اوقات آپ کو کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔“ جارج نے کہا۔ ”اور آپ کوئی ایک راستہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہ کہا مشکل ہے کہ اگلے کیا ہوگا۔ یہ بات تو تم بھی سمجھتی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ یوریکا نے کہا۔ ”آج رات میں مون بار جاؤں گی۔“

”کیا تم وردی میں وہاں جاؤ گی؟“ ہیکٹر نے پوچھا۔

”اس کی ضرورت نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”وہ تمہیں وردی میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح اسے تحفظ کا احساس ہوگا۔“

سراغ رساں یوریکا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس معاملے کا وردی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ایک شہری عورت اسے کیوں وردی میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ

باس کے علاوہ کبھی کسی نے اسے وردی میں دیکھنا چاہا ہو۔

”تم اس عورت کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”اور جو جانتا ہوں اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔“

اس رات بھی بہت سے لوگ گھروں سے باہر نکلے ہوئے تھے لیکن یوریکا یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ آیا ان کی تعدادوں کی نسبت زیادہ تھی۔ شاید پورے چاند کی وجہ سے اس تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یوریکا نے اپنی اسکاؤڈ کار نکالی اور تاسیائی ٹریل پہنچ گئی جو مون بار سے ایک بلاک کے فاصلے پر تھا۔ اس نے اپنی گاڑی ایک ہوٹل کے نیون سائن کے قریب پارک کی جو سڑک پر گر پڑا تھا۔ اس کے لوہے کے ستون کھلے کار درمیان سے ٹوٹ چکے تھے اور بڑے سائز کا سائن بورڈ اسید بھری نظروں سے راہ گروں کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ بار کے ارد گرد کا علاقہ چیک کر رہی تھی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی نیند غائب ہو چکی ہے اور وہ غیر شعوری طور پر کسی خفیہ آپریشن کے پروٹوکول پر عمل کر رہی ہے۔ عام طور پر وہ کبھی کسی بار میں ڈرنک کے لیے نہیں جاتی تھی۔

اس نے ہر جگہ لوگوں کو خرید و فروخت میں مصروف دیکھا۔ ایک عمر رسیدہ عورت چھکڑے پر سبز یاں فروخت کر رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر ایک شخص کرسی پر بیٹھا اپنے بال ترشوارا تھا۔ وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے غلط انداز میں مین بار میں داخل ہو گئی۔ اس کی لمبائی کی اور چوڑائی زیادہ تھی اور سڑک کی جانب والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی شکل ڈانکنگ ہال جیسی تھی جس میں کاؤنٹر کی جگہ بار بنایا گیا تھا۔ چند تہہ طوفان بادوباراں آنے کے بعد بالک نے موسم بٹیوں کا استعمال شروع کر دیا تھا اور دوبارہ بجلی استعمال نہیں کی۔ اس کے مقابلے میں چاند کی روشنی ایک مستحکم اور قابل اعتبار روشنی کا ذریعہ تھی۔

اس کمرے میں ایک بار کاؤنٹر اور اس کے عقب میں دیوار گیر الماری میں مشروب کی بوتلیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں جبکہ بار اور بار اسٹونوں پر مختلف تصویروں پر بنی ہوئی تھیں ان کے سامنے فٹ پاتھ پر چھوٹی میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہر میز کے ساتھ ایک یادو بیدہ سی لوہے کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ چاندنی نے کچھ حصوں پر دو دیواروں کی تعمیر رکھی تھی لیکن بیشتر حصہ تار کی بیلیں ڈوبا ہوا تھا۔

یوریکا کی نظر جارج پر پڑی جو وہاں پہلے سے ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔

”تمہاری دوست نظر نہیں آ رہی؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ ابھی نہیں آئی۔“ ہیکٹر نے جواب دیا۔ اس کی میز پر مشروب کی بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں چیزوں کو اس نے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ اس نے بوتل یوریکا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے۔“

”شکریہ۔“ وہ بولی۔ اسے معلوم تھا کہ زیادہ تر مشروب کی بوتلوں پر بجلی لیبل لگے ہوئے ہیں۔ جنہیں انٹرنیٹ سے کاٹی کر کے چسپاں کیا جاتا ہے اور یہ جگہ بھی شہر کے دوسرے بار سے مختلف نہ تھی۔

”تم نے بار کے آخری سرے پر جیکٹ میں لمبوس اس شخص کو دیکھا؟“ ہیکٹر نے پوچھا۔

”میں جانتی ہوں کہ تمہارا اشارہ کس جانب ہے؟“

یوریکا نے اپنی آنکھیں گھما کر بغیر احتیاط کے کہا۔ اس نے فوراً ہی اس کا ٹوٹ لیا۔ سارا سوتا میں ہر شخص دن کے وقت سفید یا ہلکے رنگوں کا لباس پہنتا تاکہ سورج کی روشنی منعکس ہو سکے۔ مون بار میں لوگوں کی بڑی تعداد سیاہ کپڑوں میں لمبوس تھی۔ بار کے آخری کونے پر کھڑا شخص بھی سیاہ پلیزیر پہنے ہوئے تھا۔ اس کی جیکٹ ڈھکی اور اوپر سے کھلی ہوئی تھی جس میں سے اس کی دی گلی والی ٹی شرٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے شانے چوڑے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی معمولی جیکٹ اس کے لیے موزوں نہ ہوئی۔ وہ اسے نہ پہچان سکی۔ ویسے بھی چاندنی میں اتنے فاصلے سے کسی کو پہچانا مشکل تھا۔

”اس نے بار ٹینڈر سے کہہ کر یہ مشروب یہاں بھیجے تھے۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ یہ کون ہے؟“

یوریکا نے مڑ کر اس سیاہ جیکٹ والے کی طرف دیکھا۔ مشروب کی بوتل اٹھائی اور آہستہ سے سر ہلا دیا۔ جواب میں اس نے بھی اپنا سر ہلا دیا۔ تاہم اس نا کافی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات بڑھتا مشکل تھے۔

”تمہارا خیال ہے کہ یہ شخص تمہاری دوست کا شوہر ہو سکتا ہے جس سے وہ خوفزدہ ہے؟“ یوریکا نے پوچھا اس کی نظر اب بھی اس جیکٹ والے پر تھی گو کہ وہ براہ راست اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے۔ میں بھی اس کے شوہر سے نہیں ملا۔“

”یہ یقیناً قرب و جوار کا رہنے والا نہیں ہے۔“ یوریکا نے کہا۔

”اس طرح کا لباس میاں میں پہنا جاتا ہے۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”اس نے میرے لیے ڈرنک کیوں خریدی؟“

”تمہیں زہر دینے کے لیے۔“ یوریکا نے سنجیدگی سے کہا۔

راز کی باتیں

☆ مرد خواہ کتنا ہی آزاد خیال ہو ہیوی ہمیشہ بارہ اور باحیاء پسند کرے گا۔
☆ دوسروں کی مثال دینے سے پہلے سوچ لو کہ آپ کا تذکرہ کس طرح کی مثال میں دیا جاتا ہے۔
☆ جس طرح ٹھوڑے کی لگام کو چوان کے ہاتھ میں محفوظ ہے، اس طرح جوانی کی لگام والدین کے ہاتھ میں بہتر ہے۔
☆ اگر اپنے لیے محبت تلاش کرنے نکلے تو ناکام رہو گے اس لیے خود محبت دینے کی کوشش کرو۔
☆ دقت اور جوانی بڑی تیزی سے گزرتے ہیں اس لیے انہیں اچھے کاموں میں صرف کر دو۔
مرسلہ: دوزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

دے سکتی۔“ یوریکا نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
”ہر کام جرم نہیں ہوتا۔“ لولو بولی۔ ”حالانکہ میں جانتی ہوں کہ شاید پولیس والوں کو وہ جرم ہی نظر آئے۔“
”شاید۔“
لولو نے اپنی توہین محسوس کی جس کی پر چھائیں اس کے چہرے پر نظر آئے لگی۔
”مجھے یقین نہیں کہ تم یہاں کوئی بات کر سکتی گے۔“ یوریکا نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارا اور اٹھنے کی تیار کرنے لگی۔
”میں تمہاری باس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“ لولو نے ہیکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
”میں بار کے عقب میں موجود رہوں گا۔“ اس کا اشارہ اس حصے کی جانب تھا جسے مرد ٹوائٹ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔
دونوں عورتیں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔
یوریکا نے محسوس کیا کہ سیاہ جیکٹ والا بھی ہیکٹر کو دیکھ رہا تھا۔
”ہیکٹر کا کہنا ہے کہ تم اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کر رہی ہو۔“ لولو نے کہا۔
”وہ ایک اچھا افسر ہے۔“
”تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ وہ ایک مہربان اور پیارا لڑکا اور محنتی کارکن ہے۔“
”اس کا کہنا ہے کہ تم کسی شکل میں ہو۔“
”ہاں بھی اور نہیں بھی۔“ لولو نے کہا۔ اس نے اپنے بیگ میں سے ایک چھوٹی سی ٹکیلی نکالی اور اسے میز پر رکھتے

تھے، ان میں شاید کسی کے لیے یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ اگر ان میں سے کسی ایک پر کچھ گزری ہو تو یہ پرانی بات تھی۔
”تم کیسی ہو؟“ یوریکا نے پولیس آفیسر کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
وردی کا اثر مختلف لوگوں پر مختلف طریقوں سے ہوتا ہے کہ کوکے لولو نے یہ کہا تھا کہ پولیس آفیسر سے وردی میں مل کر اسے تحفظ کا احساس ہوگا لیکن اب وہ اسے بڑی ہوشیاری سے دیکھ رہی تھی جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔
”میں نے سنا ہے کہ اگر کچھ لوگ تمہارے ساتھ ہیں تو کچھ خلاف بھی ہیں۔“ لولو نے کہا۔
”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ یوریکا بولی۔ ”ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔“
”یہ بہت اہم بات ہے۔“
”میں سمجھ گئی۔“ یوریکا بولی۔ ”بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“
یہ سن کر لولو کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی۔ وہ بولی۔
”میں جانتا جا رہی ہوں کہ تم ہیکٹر کے بارے میں کیا سوچتی ہو؟“
”میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس پر بھروسہ کر سکتی ہو۔“ ہیکٹر نے کہا۔
”کیا اس بات کا تعلق اس شخص سے ہے جو بار کی دوسری جانب موجود ہے؟“ سراغ رساں یوریکا نے پوچھا۔
”میں نہیں جانتی کہ تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟“ لولو نے بلند آواز میں کہا لیکن اس جانب دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔
یوریکا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ابھی اسے دیکھا ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح گھر سے باہر گھوم رہا ہے۔“
”اس نے میرے لیے ڈرنک بھی خریدی۔“ ہیکٹر نے کہا۔
”بہت سے لوگ پولیس والوں کے لیے مشروب خریدتے ہیں۔“
ہیکٹر اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا پھر بھی اس نے یوریکا سے کہا۔ ”تم اسے بتا کیوں نہیں دیتیں کہ یہ تم پر بھروسہ کر سکتی ہے۔“
اس نے مشرب کا گلاس اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ وہ عادی بلا نوش نہیں تھا۔
”میں لوگوں کو اس شہر میں جرائم کرنے کی اجازت نہیں

آہستگی سے تاریک شہر کی جانب بڑھ رہے ہوں گے اور ان کی رفتار پچیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ سڑک کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ رفتار پر چلنا ناممکن نہ تھا۔ انہیں سڑک پر موجود گڑبڑوں سے بچنے کے لیے بار بار رکتا پڑ رہا ہوگا۔ ان میں سے کئی ایک اس میز سے بھی زیادہ بڑے تھے جس پر وہ اور ہیکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔
”میں سوچ رہی ہوں کہ ان ٹرکوں میں کیا چیز ہو سکتی ہے؟“ وہ بولی۔
”منشیات۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”بہت بڑی تعداد میں۔ ان کی مختلف اقسام اور قیمتیں ہیں۔“
”آج کل ان میں سے کئی ایک قانونی ہو چکی ہیں۔ اس لیے کوئی غیر قانونی اشیا کو نہیں پوچھتے گا۔“
”پناہ گزینوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”میں نے نہیں سنا کہ کوئی انہیں جنونی فلورڈا سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔“
”ہاں۔ میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو پھر یہ انسانی اسٹینڈنگ ہوگی۔“ لڑکیوں کی تجارت؟“
”کچھ بھی ممکن ہے۔“ یوریکا نے کہا۔ ”لیکن وہ ہمیشہ پرانی وین استعمال کرتے ہیں۔“ ہیکٹر سوچنے لگا کہ بیشتر آبادی محفوظ مقامات پر منتقل ہو چکی ہے اور ان میں سے کوئی بھی واپس لوٹ کر نہیں آیا جس کی وجہ سے وین اور ٹرکوں کے ذریعے تجارت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔
اچانک ہی ہیکٹر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ایک چھوٹے قد کی دبلی تپتی عورت سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ میں لمبوس بار میں داخل ہو رہی تھی۔ یوریکا کو معلوم نہیں تھا کہ یہی ہیکٹر کی دوست ہے جب تک کہ اس نے تعارف نہیں کروایا۔ وہ عورت ہیکٹر سے عمر میں بہت بڑی تھی اور نرم یا نرم خوردہ نہیں لگ رہی تھی۔ ہاں بے چین ضرور لگی لیکن اس کا چہرہ کسی ماسک کی طرح ہموار اور مضبوط لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھیل جھیلی گہرائی تھی اور اس نے بالوں کو پیچھے کی طرف مضبوطی سے باندھ رکھا تھا لیکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح اس سے بھی کچھ غلطیاں ہوئی ہوں لیکن وہ مصیبت میں مبتلا عورت نہیں تھی۔
سراغ رساں یوریکا نے فوراً ہی فرض کر لیا کہ اس عورت کا جیکٹ والے سے کوئی تعلق ہے گوکہ دونوں بار کی مخالف اطراف میں تھے اور ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی بھی اس جگہ ایسے نئے خوب صورت پکڑے نہیں پہنے ہوئے تھا اور شہر کے جو حالات

”ہارٹینڈر نے میرا گلاس بھرا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ شخص مجھے کیسے جانتا ہے؟“
”شاید اسے پولیس والے پسند ہیں۔“
بار میں زیادہ لوگ نہیں تھے جو انہیں وردی میں دیکھ کر حیران ہوتے۔ ممکن ہے کہ ہیکٹر کی دوست سے ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ اس نے اپنے تحفظ کا بندوبست کر لیا ہے۔
سراغ رساں یوریکا نے اپنے کور فون پر رنگ کی آواز سنی۔ اس پر ایک پرانے اور تجربہ کار آفیسر کٹ کا میوکا پیغام آرہا تھا جس کا متن کچھ یوں تھا۔
”دوبلیک باکس ٹرک وارلبرینڈ سے ٹریل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔“ ٹریل سے اس کی مراد تائیامی ٹریل تھی جو مرکزی شمال اور جنوب کو ملانے والی سڑک بھی جو درختوں اور جھاڑیوں کی بھرمار سے جنگل جیسی ہوئی تھی کیونکہ شہر کے لوگ موسم کی شدت سے گھبرا کر سارا سوتا سے شمال کی طرف جا رہے تھے۔
کٹ کا پیغام عموماً مکمل الفاظ اور مخفف کا مجموعہ ہوتا تھا۔ سراغ رساں یوریکا کے لیے یہ انداز اجنبی نہیں تھا کیونکہ وہ اسے تب سے جانتی تھی جب اس نے نو برس پہلے پولیس میں شمولیت اختیار کی تھی جبکہ دوسری جانب وہ ہیکٹر جارج کو صرف چند ہفتوں سے جانتی تھی۔
”وینچی آج رات لوگ گھروں سے باہر ہیں۔“
یوریکا نے کہا۔ ”گاڑیاں چلا رہے ہیں۔“
”اچھی بات ہے۔“ ہیکٹر بولا۔
”کاریں نہیں۔“ یوریکا نے کہا۔ ”ان دنوں کار چلانا خطرناک ہے۔ پیٹرول مہنگا ہے اور کچھ کاریں سیلاب میں بہہ گئی ہیں۔ البتہ ٹرک سڑکوں پر نظر آ رہے ہیں۔ کٹ نے دو ٹرک تائیامی والے راستے کی طرف آتے ہوئے دیکھے ہیں۔“
”لیکن کس لیے؟“ وہ بولا۔
”یہاں بھی کبھی ٹرک آتے رہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ پیٹلز یا وسطی فلورڈا سے آتے ہیں لیکن عموماً تاریکی میں سفر نہیں کرتے کیونکہ سڑکیں بہت خراب ہیں۔“
”سڑک پر اسٹریٹ لائٹس تو ہیں۔“ حالانکہ ان میں سے صرف چند ہی کام کر رہی تھیں۔ یوریکا کو حیرت ہوئی کہ ہیکٹر نے یہ بات کیسے کہہ دی لیکن فوراً ہی اس کے ذہن میں بھاری سیاہ ٹرکوں کا تصور ابھرنے لگا۔ اس نے اپنے قدم مضبوطی سے سیٹ کرفرش پر جمالیے۔ وہ جانتی تھی کہ ان ٹرکوں کا رنگ پہلے سفید تھا لیکن ان پر سیاہ رنگ کر دیا گیا تاکہ رات کی تاریکی کا حصہ بن جائیں۔ وہ یقیناً بڑی

ہوئے بولی۔
”میں تمہیں ایک اور بات بتاتی ہوں جو میں نے
یکسی ہے۔ سب سے بہترین ہتھیار انسان کی اپنی فطرت
ہے۔ تم اسے معلوم کر کے اسی کے خلاف استعمال کر سکتی ہو۔
میں ہینٹر کو بہت کچھ سکھا سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں چاہا۔
وہ دوسروں سے بہت مختلف، اسرار اور بہتر ہے۔ اس کے
علاوہ ہمیشہ بہت زیادہ پریشان رہتا ہے۔“
”ممکن ہے کہ پریشانی کی کوئی وجہ ہو۔“ یوریکا نے کہا۔
”ہاں۔“ اس نے طنز یہ انداز میں کہا۔
”تم کون ہو؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ یہ کہہ کر اس نے
تھیلی الٹ دی اور اس میں سے نصف درجن نوٹوں کی
گلدیاں باہر آ گئیں جنہیں پیپر بینڈ سے باندھا گیا تھا۔ یہ
کسی اسٹور کا کیش نہیں تھا جس میں ایک اور پانچ کے نوٹ
ہوتے ہیں بلکہ یہ بالکل نئے تیس تیس کے نوٹ تھے جو
بینکوں سے ملے ہیں تو کہ اب سارا سوتا میں کوئی بینک باقی
نہیں بچا تھا لیکن پہلے وہاں کئی بینک تھے۔
”کیا تم جانتی ہو کہ سب لوگ انہیں دیکھیں؟“ یوریکا
نے کہا۔ برابر والی میز پر بیٹھا ہو جاؤ انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ
ڈپٹ پر آئے تھے۔ مرد نے بھی سیاہ جیکٹ پہنی رہی تھی اور
اس کی نظر اس کی جانب تھیں۔
”یہ رقم ہینٹر کے لیے ہے۔“ لولو نے کہا۔ ”اسے
بتا دینا کہ یہ محفوظ ہے۔“

”محفوظ؟“ یوریکا نے پوچھا۔ ”تمہارا مطلب ہے
کہ جائز طریقے سے چھٹی جاری ہے؟“
”یقیناً تب تم سمجھ جاؤ کہ میں اس کے لیے کبھی ایسا
کام نہیں کروں گی جس سے وہ مشکل میں پڑ جائے۔“
”کم از کم تمہیں اس کو وضاحت تو کرنا ہوگی کہ یہ رقم
کس لیے دی جا رہی ہے۔“

”وہ جان جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کا
لبہ بتا رہا تھا کہ وہ پہلے جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ یوریکا
اسے پکڑنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن اسے اس کی کوئی وجہ سمجھ
میں نہیں آئی۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ رقم کی حفاظت کرنی۔
لولو اس سڑک پر چل دی جو ہینٹر کی مخالف سمت میں
تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مدھم مدھم روشنی میں گم ہو گئی۔ ہینٹر تقریباً
اسی وقت آ گیا اور میز پر بڑی ہونٹیں دیکھتے ہوئے بولا۔
”یہ کیا ہے؟“

”اس نے کہا ہے کہ وہ تم سے دوبارہ ملے گی۔“

”لیکن یہ رقم؟“
”یہ تمہارے لیے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ محفوظ ہے۔“
”محفوظ؟“ ہینٹر نے اپنے آپ سے کہا۔
”تم دیکھ رہے تھے؟“
”بالکل۔“

یوریکا نے وہ رقم دوبارہ بیگ میں رکھی اور اس دوران
میں اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے ہارٹنڈر کی طرف
دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ سیاہ جیکٹ والا شخص چاچکا تھا۔
جب وہ بھاری قدموں سے چلتی ہوئی اسکوڈا کار کی
طرف واپس آئی تو اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن اسے
سیاہ جیکٹ والے شخص، لولو یا ہینٹر کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔
اس نے رقم ثبوت والے شیف میں متقل کی اور ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھ کر پھر ہینٹر کو پیغام بھیج کر اس کا انتظار کرنے
لگی۔ اگر ہینٹر نہ آتا تب بھی وہ ان ٹرکوں کو دیکھنے
ضرور جاتی۔

وہ ٹرک دور سے ہی بڑے دکھائی دے رہے تھے اور وہ
محسوس کر سکتی تھی کہ ان میں کوئی غیر معمولی چیز ہے۔ اس خفیہ
سامان کا تصور کرتے ہی اس کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

اس نے اپنی گاڑی سڑک کے دائیں جانب کھڑی
کی۔ موٹر کے گردے ہوئے سائٹ بورڈ کی وجہ سے وہ کسی
حد تک نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے لیے آسان تھا
کہ وہ سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے ٹرکوں کے کسی قافلے کا
تغاقب کرنی لیکن لگتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔ سڑک پر
چند گاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے
انہیں نظر آ جاتی۔ شاید وہ ٹرکوں کا تغاقب کرنے کے بجائے
انہیں کسی جگہ روک لیتی لیکن اس کے پاس وارنٹ نہیں تھا
بلکہ جائز یا ناجائز شک بھی نہیں۔ یہ بڑی دلچسپ بات تھی کہ
اس کے ذہن میں ان ٹرکوں کی ایسی تصویر بن رہی تھی جو اس
نے بھی نہیں دیکھے۔

پھر اسے ہینٹر جارج اور لولو کی طرف سے دیے گئے
ناقابل فہم تحفے کا خیال آیا جو وہ اس کے لیے لائی تھی۔ اس
کے ذہن میں اور بھی کئی باتیں گھوم رہی تھیں اور یہ تاثر پختہ
ہو رہا تھا کہ اس رات میں ہونے والے واقعات اور ٹرکوں
کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ اگر ہینٹر کسی جائز کاروبار میں
حصہ دار ہوتا تو وہ یوریکا کو ضرور بتاتا۔..... تو کیا وہ کوئی غلط کام
کر رہا تھا یا یہ تصویر ہی مضحکہ خیز تھا لیکن اسے مسترد کرنا ممکن
نہیں تھا۔

وہ ٹرک اس کی چھاتی پر ایک بوجھ کے مانند تھے۔

اس نے اپنا کورفون نکالا، وہ جانتا چاہتی تھی کہ انہیں جینٹے میں
کتنا وقت لگے گا۔ کٹ نے پیغام کا جواب دیتے ہوئے کہا
کہ وہ جلد آنے والے ہیں۔
اسے یقین نہیں تھا کہ ہینٹر ان ٹرکوں پر دل دے ہوئے
سامان کے بارے میں جانتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ان میں
منشیات، پناہ گزین یا لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔ یہ بات اس نے
اپنے اندازے کی بنیاد پر ہی نہیں کی تھی شاید۔ اس میں اس کے
تجربے کا کوئی دخل نہیں تھا۔
”جی ہینٹر اس کے برابر والی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔
وہ جانتا تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہوتا ہے کس طرح کھولا
جاتا ہے۔“

”کچھ معلوم ہوا؟“ یوریکا نے پوچھا تو اس نے نفی
میں سر ہلادیا۔

”وہ عورت کون ہے؟“
”میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔“
”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ تم اس سے
گزشتہ شب نہیں ملے تھے بلکہ ایک طویل عرصے سے اسے
جانتے ہو۔ ممکن ہے کہ کوئی ایسی عورت ہے جس نے ماں
کے مرنے کے بعد تمہاری دیکھ بھال کی ہو۔ بہن، آنٹی،
کزن یا فیملی فرینڈ کے طور پر۔“

اب وہ کار کے دروازے پر اٹھوں سے ڈرم بجا رہا
تھا پھر اس نے کہا۔ ”میں اس کا ہر احسان مانتا ہوں۔ ہاں وہ
میری بہن ہے۔ وہ کبھی ایک عام لڑکی ہوا کرتی تھی، کیک
بناتی اور کٹار پر لوگ دھنیں سناتی تھی۔ وہ مجھ سے عمر میں
بہت زیادہ ہونے کے باوجود کسی بھی دوسری لڑکی کی طرح
احق تھی پھر اچانک ہماری ماں کا انتقال ہو گیا اور لولو نے ہی
ہر بات کا خیال رکھا۔ اس سے بڑھ کر اسے ہماری حفاظت
کرنا تھی، ورنہ ہم زندہ نہ رہتے۔ یہ بھی نہیں اس نے کوشش
..... کی بلکہ اس نے اپنا ذہن بنایا کہ اسے ہر قیمت پر یہ کرنا
ہے۔ چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے اور اس نے ایسا
ہی کر کے دکھایا۔ حالات واقعی بہت سخت تھے لیکن اس نے
ان کا مقابلہ کیا اور اس کے لیے اسے کچھ خطرناک کام بھی
کرنا پڑے۔“

”کیا وہ گزشتہ رات ہی مولن بار پر آئی تھی؟“
”میں نے ہی اس سے وہاں ملنے کے لیے کہا تھا۔“

اس نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ وہ شہر میں ہے۔
”وہ رقم کہاں سے آئی؟“

”کیا وہ اب بھی تمہارے پاس ہے؟“

”ہاں۔“
”کیا میں اسے دوبارہ دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے اس
سے پہلے کبھی اتنی رقم نہیں دیکھی۔“
”اس کا کہنا ہے کہ تم اس رقم کے بارے میں جانتے ہو۔“
”اس نے ہمیشہ مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے
کچھ کرے گی لیکن اسے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ میں سمجھتا ہوں
کہ وہ اسی بارے میں بات کر رہی تھی لیکن اس کا خیال تھا
کہ میرا پولیس آفیسر بیٹا بڑی بات ہے۔ وہ اس میں بہت
دلچسپی لے رہی تھی اور اس نے اس بارے میں بہت سے
سوالات بھی کیے۔ وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”وہ عام
فوجیت کے سوالات تھے، میں نے اسے کوئی ایسی بات نہیں
بتائی جو نہیں بتانی چاہیے تھی۔“
یوریکا نے ناگواری سے سر ہلایا۔

”اس طرح کی ملازمت حاصل کرنا ایک معجزہ ہے
اور وہ یہ بات جانتی ہے۔“ ہینٹر نے وضاحت کی۔ ”اب تو
معمولی ملازمت بھی نہیں ملتی۔“
”کیا واقعی اس نے تم سے یہ کہا تھا کہ وہ کسی مشکل
میں ہے؟“ یوریکا نے پوچھا۔

”ہاں۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کیا مسئلہ ہے لیکن میرا
اندازہ ہے کہ اس کا تعلق اس کے نئے دوست سے ہے۔
اس کا نام البرٹ ہے اور میرے میاں چھوڑنے کی یہی وجہ
ہے۔ طوفان کی وجہ سے مجھے نکلنے کا ہانا مل گیا۔“

”تمہیں اس سے کیا شکایت تھی؟“ یوریکا نے پوچھا۔
”وہ ایک کاروباری شخص ہے۔ لولو نے قسم کھا کر بتایا
کہ اس کا کاروبار قانونی ہے۔ آہستہ آہستہ باتیں کھلنے
لگیں۔ بالآخر اس نے مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ
بتادیا۔ وہ لوگوں سے غیر قانونی کام کروانا اور انہیں کم
معاوضہ دیتا۔ انہیں ناقص خوراک دی جاتی اور اس کے پیسے
بھی ان کی تنخواہ سے کاٹ لیتا۔“

”کیا وہ میاں میں رہتا ہے؟“
”ہاں لیکن تم جانتے ہو کہ اس کا وہاں رہنا کتنا برا
ہے۔ اس نے سب کو خرید لیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیسا
کاروبار ہے جس میں اپنے کارکنوں کو اچھی تنخواہ دینے کے
بجائے سیاست دانوں کے ایک گروہ کو خرید لیا جائے۔“
”تم سمجھتے ہو کہ بار کے سرے پر سیاہ جیکٹ میں
ملبوس شخص وہی ہو سکتا ہے؟“

”میرا یہی خیال ہے۔“ ہینٹر نے کہا۔ ”غالباً میں
نے کبھی میاں میں اس کی شکل غور سے نہیں دیکھی۔ شروع

میں لولو اس سے ڈینگ کر کے بہت پرجوش تھی۔ اس نے بتایا کہ مجھے اس سے کتنا فائدہ ہوگا۔ اس کے پاس اتنا پیسا ہے کہ وہ مجھے کالج بھیج سکتا ہے جب اسے اس کے بارے میں مزید معلوم ہوا تو وہ مجھے اس سے دور رکھنے کے بہانے تلاش کرنے لگی لیکن اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اسے اس کی دولت کا مزہ لگ گیا تھا۔

”جہیں کوئی اندازہ نہیں کہ یہ پیسا کہاں سے آیا؟“
”یہ لولو کا پیسا نہیں ہے۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”اس کے پاس کچھ نہیں۔ یہ البرٹ کی رقم ہے۔“

”یقیناً ایسا ہی لگتا ہے۔“ یوریکا نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن لولو جانتی تھی کہ وہ بار میں موجود ہے، ورنہ وہ اس سمت میں ضرور پہنچتی جب میں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے رقم دیتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ لگتا جیسا ہے کہ اس نے یہ سب ایک منصوبے کے تحت کیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟“

”میں نہیں جانتا لیکن مجھے سمجھ لیتا چاہیے کہ لولو بری عورت نہیں ہے۔ اس نے یہ رقم ہمیں سے نہیں چرائی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ کام کرنے کے لیے کوئی خوفناک حرکت نہیں کی ہوگی۔“

یوریکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”اور میں نے بھی کچھ نہیں کیا۔“ ہیکٹر مشتعل ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں تو کبھی اس شخص سے ملا بھی نہیں۔ وہ ایک بار گھر آیا تھا لیکن لولو نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔“

”گویا وہ جہیں نہیں پہچان سکتا؟“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں نے اس کی جھک دیکھی ہے لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، اس نے کبھی مجھے نہیں دیکھا۔“

”گویا ہم اس کے لیے صرف پولیس والے ہیں۔“

”ہاں بالکل۔ صرف پولیس والے۔“ اس نے دہراتے ہوئے کہا۔

اس کی کار کے عقبی شیشے میں ایک ٹرک نمودار ہوا جو اس کے تصور سے بھی بڑا تھا۔ اس کی ہیڈلائٹس روشن تھیں۔

”ٹرک یہاں پہنچ گئے۔“ یوریکا نے کہا۔

”ٹرک۔“ ہیکٹر چونکتے ہوئے بولا جیسے وہ انہیں بھول چکا ہو۔ اس نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے گردن گھما کر پیچھے آنے والے ٹرک کو دیکھا جو کچھ فاصلے پر تھا۔

”لولو جتنی ہے کہ کسی سے لڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی فطرت کو اس کے خلاف استعمال کرو۔“ یوریکا نے کہا۔

”اس نے مجھے بتایا تھا کہ کسی لالچی شخص کو بے وقوف بنانا آسان ہے لیکن میں ذاتی طور پر کسی لالچی انسان کو نہیں جانتا۔“ یوریکا نے کئی برسوں میں پہلی بار اپنی اسکوڈا کار کا سائزن اور چھت پر لگی ہوئی لائٹ آن کی اور بولی۔ ”اب ہم انہیں ہائے، کہنے والے ہیں۔“

پہلا ٹرک ابھی اتنے فاصلے پر تھا کہ وہ اس کا راستہ روکنے کے لیے آسانی سے اپنی کار کو نوے درجے کے زاویے پر گھما سکتی تھی۔ وہ اور ہیکٹر جلدی سے اترے اور کار کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ ٹرک ڈرائیور شاید کار کے قریب آ کر رک جاتا لیکن وہ بھی سڑک سے نیچے نہ اترتا جو کافی خطرناک تھا۔

جیسے ہی ٹرک قریب آیا تو یوریکا نے بریکوں کی آواز سنی۔ دونوں پولیس والے پیچھے کی طرف بڑھے لیکن ٹرک ان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر وہ اسکوڈا کار سے چند گز کے فاصلے پر رک گیا۔ وہ خطرناک حد تک قریب آ چکا تھا اور اگر ڈرائیور سے تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو اس کا کار سے ٹکرانا یقینی تھا۔

”دوسرے ٹرک پر بھی نظر رکھو۔“ اس نے ہیکٹر سے کہا حالانکہ وہ ابھی تک نظر نہیں آتا تھا۔

ٹرک ڈرائیور سے تھوڑا سا دروازہ کھولا جیسے وہ کسی ٹریفک سگنل پر رکا ہو۔ اس نے ڈرائیور سے لائنس مانگا اور دیکھ کر واپس کر دیا۔

”ہم صرف تمہاری حفاظت کے لیے چیکنگ کر رہے ہیں۔“ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”میں پچھلا حصہ بھی دیکھنا چاہوں گی۔“

ڈرائیور نے نیچے اترتے وقت انجن بند نہیں کیا۔ شاید اسے احساس تھا کہ وہ اسے دوبارہ اسٹارٹ نہیں کر سکے گا۔ سیلاب سے ٹرک کو بھی نقصان پہنچا تھا اور اس کے کچھ حصے زنگ آلود ہو چکے تھے۔

ڈرائیور نے کچھ کہے بغیر پیچھے کا دروازہ کھول دیا لیکن اندر کی لائٹس خود کار طریقے سے آن نہ ہو سکیں۔ شاید وہ خراب ہو چکی تھیں۔ یوریکا نے نارنج کی مدد سے ایک آلہ دریافت کیا جو چینی صاف کرنے کے کام آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑی مشین رکھی ہوئی تھی جسے چار کہا جاتا ہے اور یہ گتے کے کیمپوں میں کنکائی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ وہاں اور بھی کئی دھاتی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ پچھلے حصے میں بڑی جگہ میں سامان رکھا گیا تھا۔ تمام آلات کو تیل لگانے اور صفائی کی ضرورت تھی، ورنہ نمک کی وجہ سے سب خراب

ہو جاتے۔ جارج..... دوسرے ٹرک کا محاصرہ کر رہا تھا۔ اس میں نہایت زیادہ سامان اور چینی کے ڈبوں کا ڈھیر تھا جو خراب ہونے سے بچ گیا تھا۔ ان ڈبوں کا کسٹا خراب ہونے کے باوجود خشک تھا۔

”ہم اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ تم شہر سے... یہ حفاظت گزر جاؤ۔“ سرخ رساں یوریکا نے کہا۔

جب وہ واپس اپنی کار میں آئے تو ہیکٹر نے سکون کا سانس لیا۔ یوریکا اس سے متعلق نہیں تھی۔ اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی تھی اور اس کے ذہن میں شک سر ابھار رہا تھا۔ نہ جانے اس کے دماغ میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ گتے کے ڈبوں میں چینی کے علاوہ بھی کچھ تھا۔

”وہ روانہ ہو رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ساری چینی خراب ہو چکی ہے۔ اسے خشک کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ یلا پی پانی میں موجود نمک نے اسے زہریلا کر دیا ہے۔“

”البرٹ یقیناً شمال کی طرف جا رہا ہوگا۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ٹرک اسٹارٹ ہو چکے تھے۔ یوریکا نے اپنی کار ایک طرف کر کے انہیں راستہ دے دیا اور ان کے پیچھے چل پڑی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لولو نے البرٹ میں کیا خوبی دیکھی کہ ایک بار پھر اس کے لیے کام کرنے پر تیار ہو گئی۔“ یوریکا نے پوچھا۔

”لاؤج..... لیکن البرٹ جیسے آدمی کو کسی جہلی سودے کے ذریعے بے وقوف بنایا جاسکتا۔“

”لاؤج کی بھوک بھی ختم نہیں ہوتی اور لالچی شخص دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم بھی لالچی ہیں۔“

”کیا لطیفہ ہے۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”لیکن میں تمہاری بات سمجھ گیا۔ اس نے البرٹ کو بتایا ہوگا کہ وہ ہمیں رشوت دے رہی ہے۔“

”وہ ضرور یہی سوچ کر گزشتہ شب آئی تھی اور اس نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بنایا۔ شاید تم رقم لینے سے انکار کر دیتے۔ اس کے لیے اس نے مجھے استعمال کیا۔ اسے احساس تھا کہ البرٹ اس رقم کو بطور تحفہ دینے پر رضامند نہیں ہوگا لیکن کاروباری قیمت ادا کرنے پر تیار ہو گیا۔“

آگے جانے والے ٹرکوں کی رفتار کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ”لولو نے مجھ سے ٹریفک کے بارے میں کچھ سوالات کیے تھے۔“ ہیکٹر نے کہا۔ ”مجھے جان لینا چاہیے تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔“

”اس نے ضرور البرٹ سے کہا ہوگا کہ ان ٹرکوں کو شہر سے گزرنے کا محفوظ راستہ دینے کے لیے اسے کچھ دینا ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ ہم انہیں ہر اسان نہیں کریں گے۔ اسے امید تھی کہ ٹرک بہ حفاظت گزر جائے گا لیکن پھر مجھے جس ہوا۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میں انہیں شہر سے گزرنے کا محفوظ راستہ دے رہی تھی کیونکہ انہوں نے اسی مقصد کے لیے ادائیگی کی تھی۔“

آگے جانے والے دونوں ٹرک ویران ائربورٹ کے موڑ پر رک گئے۔ تاریکی میں سے دوسرے نمودار ہوئے۔ ان میں ایک ہماری جسامت اور دوسرا بڑا جیٹا تھا۔ چاند کی روشنی میں دونوں کی سفید قمیصیں نظر آرہی تھیں۔ ہماری جسامت والے نے جیکٹ پہن رکھی تھی۔

ہیکٹر نے سوالیہ نظروں سے یوریکا کو دیکھا تو جواب میں اس نے سر ہلا دیا۔ انہوں نے چھوٹے سائے کو ٹرک کے اگلے حصے میں سوار ہوتے دیکھا۔ دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی۔ یوریکا نہیں جانتی تھی کہ اس نے ذرا دیر پہلے جو فیصلہ کیا تھا وہ صحیح تھا یا غلط اور کیا آگے چل کر وہ اس کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔ لولو شاید سوچ رہی ہوگی کہ اس نے اپنے بوائے فرینڈ پر احسان کیا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ہیکٹر کے لیے رقم وصول کر کے غلطی کی۔ کئی لوگوں نے اسے دیکھا ہوگا۔ اس کی ساکھ متاثر ہو سکتی تھی۔

ٹرک دوبارہ اسٹارٹ ہوئے اور انہوں نے ائربورٹ کا موڑ کاٹ کر شمال کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یوریکا وہیں کھڑی رہی۔

”تم اس رقم کا کیا کر دو گی؟“ ہیکٹر نے پوچھا۔

”وہ رقم میری نہیں تمہاری ہے۔“ یوریکا نے کہا۔

”اے پولیس اسٹیشن پر رکھنا، جہاں وہ محفوظ رہے گی۔ وقت آنے پر تم جان جاؤ گے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔“

ہیکٹر نے اپنا سرشت کی پشت سے ٹکا دیا اور جھکے ہوئے انداز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں نے لولو کو ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھا تھا۔“

یوریکا نے تائیدی کی۔ ”میں نے بھی۔“ لیکن اس نے ہیکٹر کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے صرف شہر سے گزرنے کا محفوظ راستہ دیا تھا۔ اس سے آگے کی ذمہ داری اس کی نہیں تھی۔

آگے کٹ ان ٹرکوں کے استقبال کے لیے موجود ہوگا جسے وہ ہیکٹر کی نظر بچا کر ٹیلی فون پر اطلاع دے چکی تھی۔ چینی کی آڑ میں نشیات کی اسگنگ کوئی معمولی جرم تو نہیں تھا۔

قدم قدم پر شکست کمانے والی دو شیرہ کی حیران کن فتح..... ٹوٹے ہوئے

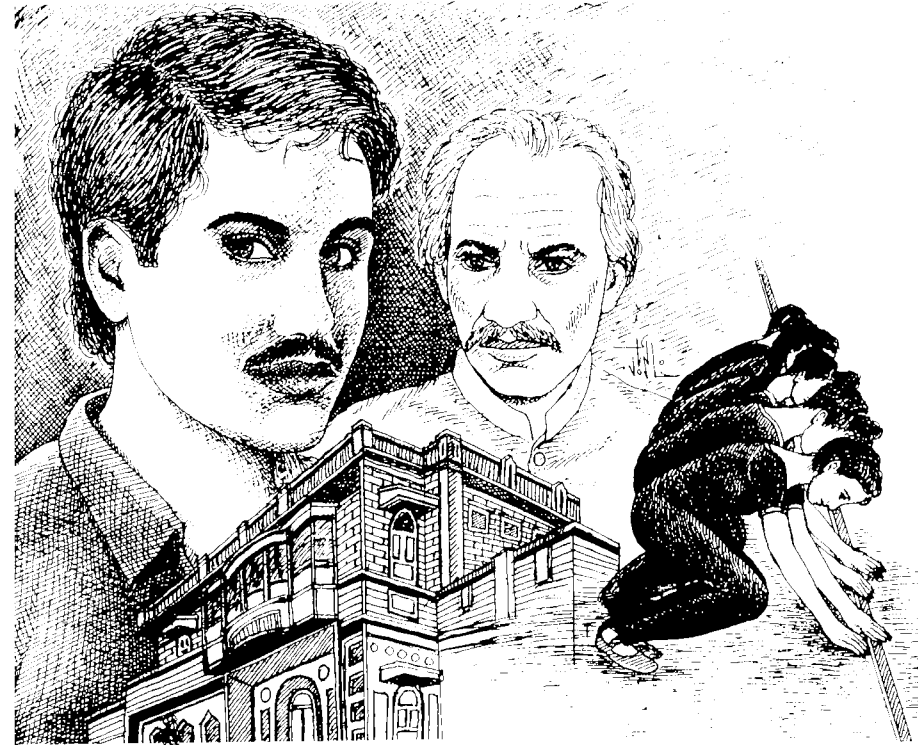
دل سے بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑنے والی حید کی پرگرد استان

شکست کی فتح

طاہر جاوید معضل

دوہرا اور آخری حصہ

زندگی کی بساط پر ایک ایسا اسرار چھپا ہے جسے کوئی چاہے یا نہ چاہے... کھیلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کھلاڑی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اناڑی بازی مات کر لیتے ہیں... یہ بھی ایک ایسی اسرار بھری گرہ ہے جسے شاید کھولنا آسان نہیں۔ جو جتنا بڑا ہے ایمان... اتنا ہی بڑا فنکار۔ وہ بھی اپنے پرائیوٹ کے درمیان دوڑتے دوڑتے ہار گئی... اگرچہ انسان کے تصورات اور بلند خیالات کی کوئی انتہا نہیں ہوتی مگر... معاشرے میں رہنے اور ماحول سے مطابقت رکھنے کے لیے کچھ حدود و قیود کا نفاذ از حد ضروری ہوتا ہے البتہ... حدود اور قید میں کچھ فرق بھی ہونا ضروری ہے ورنہ انسان پنجرے میں قید طائر کے مانند بے بسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس نے بھی اپنے ماحول سے بغاوت کی جسارت کر ڈالی اور بلند پرواز کی خواہش میں اپنے مسکن سے جدا ہو گئی... لیکن یہ عارضی جدائی نہ صرف اسے بلکہ اس کے خون کے رشتوں کو بھی زندگی کی باریکیاں سمجھا گئی کہ ہر ایک کی زندگی کا مقصد جدا اور انفرادی ہوتا ہے جسے ہر حال میں اسے پورا کرنا ہوتا ہے... چاہے کوئی مانے نہ مانے اسے حق دینا پڑتا ہے اور جب کوئی نہ دے تو چھین لینے کی جسارت بھی ضروری ہے کیونکہ حق کے لیے اڑ جانا بغاوت نہیں سعادت ہے۔



پاس بیٹھنا نہیں چاہتی۔ نور کی یہ بے رحمی محسوس کرنے کے باوجود خدیجہ کی خندہ پیشانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ کو چھو پھینچا۔ ”تم آنکھوں کے ساتھ اس کے سر کو چومو اور اٹھ کھڑی ہوئی۔“ اچھا تم آرام کرو۔ اگر موڈ اچھا ہو اور کسی وقت بات کرنے کو دل چاہے تو نون ضرور کرنا۔“

☆☆☆

وہ کسی صورت اس کے ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت اس کا خیال تھا۔ شادی کی تقریب کا وہ منظر جیسے ذوالقرنین کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنا ڈھیلا اسکارف کھول کر پھر باندھا تھا۔ ستاروں کے درمیان جیسے ایک چاند چمکا تھا اور پھر او جھل ہو گیا تھا۔ کئی گھنٹا ایسی ہی کا پالٹ ہوتی ہیں۔ وہ پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہیں۔ کہتے کو تو بس چند سیکنڈ لیکن جھیلنے کو ساری زندگی۔

تین دن پہلے اسے پتا چلا تھا کہ نور ایک بار پھر نائل جیتے میں ناکام رہی ہے اور بری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ آدھے راستے کے فوراً بعد ٹریک پر گر کر کئی کئی اور دور تک لوٹتی تھی۔ اس کی یہ تصویر کی اخباروں میں بھیجی تھی اور بی بی وی پر بھی یہ منظر دکھایا گیا تھا۔

ذوالقرنین کا دل غم سے بھر ا ہوا تھا، اتنے میں اس کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ذوالقرنین کے کہنے پر ہی وہ نور سے ملنے گئی تھی۔ خدیجہ بالکل گم سم تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ وہ بہت خاموش ہے۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ میں سوچتی ہوں ذوالقرنین..... دانشوروں نے شاید درست ہی کہا ہے کہ ظلم کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے مگر نا انصافی کی نہیں۔ یہاں دو طرح کا انصاف ہے۔ ایک غریب اور بے وسیلہ لوگوں کے لیے، دوسرا امیر اور اثر رسوخ والوں کے لیے۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”نور کی ناکامی کی وجہ وہی چوت ہے جو اس کمین نشو نے اسے کالج والے ایونٹ میں گواہی تھی۔ اس کا گھنا پوری طرح فٹ نہیں تھا پھر بھی اس نے ریس میں حصہ لیا اور شکست کھائی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ وہ نشو کہیں میرے سامنے آئے اور میں اسے گولی مار دوں۔ سنا ہے آج کل وہ لاہور آئی ہوئی ہے، اس کے اعزاز میں تقریبات ہو رہی ہیں۔“

”اب کیا کہتی ہے نور..... کیا اب بھی اپنی ضد پر

رہے گی؟“

”نہیں، اس بارے میں تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یقین کرو ذوالقرنین! آج اسے دیکھ کر بڑا ترس آیا ہے مجھے۔ اپنے تاپا اور والد کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے بڑی جان ماری تھی اس نے مگر.....“

ذوالقرنین ذرا توقف سے بولا۔ ”چلو تم اس سے ملتی رہو۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرو کہ زندگی میں ایک ہی جیت نہیں ہے اور ایک ہی میدان نہیں ہے۔ بندہ ایک جگہ کامیابی حاصل نہ کر سکے تو کسی اور شعبے میں نام کما سکتا ہے۔“

”تمہیں کہا تھا ذوالقرنین! یہ جو کھلاڑی اور آرٹسٹ ہوتے ہیں نا، یہ دھن کے بڑے بچے ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں یقین سے کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔“

خدیجہ نے بھائی سے یہ بات چھپائی کہ نور اس سے بڑی سردہری سے ملی ہے۔

اگلے روز ذوالقرنین عصر کی نماز پڑھ کر دکان پر پہنچا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسپونڈ کر دیا۔ دوسری طرف خدیجہ کی ایک دوست تبسم مسمی۔ وہ بیجانی لہجے میں بولی۔

”ذوالقرنین بھائی! خدیجہ زخمی ہو گئی ہے۔ فتح زید اسپتال میں ہے۔ آپ جلدی آئیں۔“

”ہوا کیا ہے؟“ ذوالقرنین چلا کر بولا۔

”فیڈریشن کے آفس میں لڑائی ہوئی ہے۔ نشو اور اس کی دوستوں نے خدیجہ کو بری طرح مارا ہے۔ اس کی..... کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور ابھی کی زخم ہیں۔“

ذوالقرنین اپنی الفیہ ایکس پرائمری کی رفتار سے شیخ زید اسپتال پہنچا۔ خدیجہ ابھی ایمر جیسی میں تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کلائی پر عارضی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ اس کے سر، کندھے اور پاؤں کی انگیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ تنظیم کی کئی نمبران بھی وہاں موجود تھیں۔ زخمی ہونے کے باوجود خدیجہ پریشان نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آگ کی روشنی تھی۔ ذوالقرنین نے اسے گلے سے لگا کر کئی دی۔ پھر تبسم سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟

اس نے بتایا کہ فیڈریشن کے آفس میں نشو کے اعزاز میں ایک فنکشن تھا۔ خدیجہ اکیلی وہاں پہنچ گئی۔ وہاں اس نے اسٹیج پر آ کر اور ڈانس کے سامنے نشو کے خوب لٹے لیے۔ اسی پر لڑائی ہوئی۔

ایک دوسری لڑکی بولی۔ ”خدیجہ باجی نے غلطی کی، اگر ایسا کچھ کرنا تھا تو کم از کم ہم میں سے دو چار کو انعام کر دیتیں۔“

شکست کی فتح

واقعی کی جو تفصیل معلوم ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔ خدیجہ کے اندر نشو کے لیے مسلسل غصہ بھرا رہا تھا۔ آج اس سے برداشت نہیں ہو پایا۔ وہ فیڈریشن کے آفس پہنچ گئی۔ وہاں نشو اور اپنی سہیلی کا جگہ کا جگہ ایوانت دے دیے جانے والے تھے۔ جب نشو ڈانس پر آئی تو خدیجہ نے وہاں پہنچ کر مایک کے سامنے بولنا شروع کر دیا۔ نشو کی چیمپئن شپ کوفر اڈا قرار دیا۔ اور بتایا کہ اس نے کس طرح ”پری پارتنگ“ اصل حق دار نور کو ایوانت سے باہر کیا ہے۔ وہاں اتفاقاً وہ بی بی ٹی کی لڑکی بھی موجود تھی جس نے نور کی ٹانگ پر کمر کی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے ضربیں لگائی تھیں۔ وہ حاضرین میں سے نکل کر خدیجہ پر جھپٹ پڑی۔ خدیجہ نے اس کی بھی ٹھکانی کر دی۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ نشو بجلی پہلے تو سکتے زوہ کھڑی رہی مگر پھر خدیجہ پر جھپٹیں۔ خدیجہ نے اسے ایک یا دو گراٹھا ہی رسید کیا۔ بعد میں تقریباً اسے بھی طمانچے پڑے اور وہ زرد گوب بھی ہوئی مگر وہ پہلا طمانچہ درجنوی میسر میں ریکارڈ ہو گیا۔

☆☆☆

مہرین نے نور کو زبردستی بیڈ پر نیم دراز کر رکھا تھا اور اس کو کھٹنے کی مختلف ورزشیں کر رہی تھی۔ اسی دوران میں بی بی ٹی ایل فون کی گھنٹی بجی۔ مہرین نے کال ریسپونڈ کر دی۔ اس کے تاثرات میں پھل پھل گئی۔ دوسری طرف سے کسی جھگڑے کی بات ہو رہی تھی۔ فون سننے کے بعد مہرین نے نور سے کہا۔

”اچھی خبر نہیں، خدیجہ اور نشو کی لڑائی ہوئی ہے۔ خدیجہ کا بازو فریکچر ہو گیا ہے، اسپتال میں اس کا آپریشن ہوگا۔“

”اوہ گاڈ!“ نور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”کس نے بتایا ہے؟“

”میری کو لیک ہے..... وہ بھی شیخ زید کے فزیو تھراپی ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔“

”لیکن معاملہ کیا تھا..... کوئی اپنی بھی دھمپی ہے ان کی؟“

”نہیں بھئی، تمہاری والی دھمپی ہی ہے۔ ایک فنکشن میں خدیجہ ڈانس پر پہنچ گئیں اور خطاب فرمائی ہوئی نشو کا اچھا خاصا ریمانڈ لیا۔ کانی ہنگامہ ہوا ہے۔“

آدھ پون گھنٹے میں نور اور مہرین کو اس واقعے کی ساری تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ چند دن پہلے نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی سلطانہ اس لڑائی میں اسٹیج سے گر کر تعویذ دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ ممکن تھا کہ نشو کے درمیان پرچہ وغیرہ بھی درج کر دیتے مگر چونکہ خدیجہ کو بھی سخت چوٹ لگی تھی اس لیے ابھی تک پولیس کو انعام نہیں کیا گیا تھا اور معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی

جاری تھی۔

”خدیجہ اچھی بجلی سمجھ دار ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ کیوں میرے لیے لڑائی مول لے رہی ہیں۔“

”بھئی بھی اس طرح کی بات اپنے بس میں نہیں رہتی نور! مگر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تو پھر زیادہ ہی چمک جاتا ہے۔ میں نے اس دن نوٹ کر لیا تھا کہ تمہیں دیکھ کر خدیجہ بہت پریشان ہو گئی ہیں۔“

تین دن بعد کی بات ہے، نور اور مہرین نے خدیجہ کی مزاح پر سی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔ خدیجہ کا آپریشن کامیابی سے ہو چکا تھا۔ نور چاہتی تھی کہ وہ اس وقت اسپتال پہنچیں جب خدیجہ کا بھائی ذوالقرنین آس پاس موجود نہ ہو۔

خدیجہ پرائیویٹ روم میں تھی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں تو وہ روم میں ایلی بی بی تھی۔ وہ دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں، ایک خوبصورت ”مکے“ اس کے سر ہانے رکھ دیا۔ رسی کھات کے بعد نور نے کہا۔ ”آپ نے ایسا کیوں کیا خدیجہ..... خواہ وہ لڑائی مول لی۔ آپ تو مجھے سمجھاتی تھیں کہ ان باتوں میں بڑے سے کوئی فائدہ نہیں۔“

”پتا نہیں نور کہ کیسے ہو گیا۔ جب میں تم سے مل کر آئی تو میرے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں وہاں پہنچ گئی۔ آئی ایم سوری لیکن ایسا لگتا تھا کہ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔“

”آپ جانتی ہیں خدیجہ! یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ یہ آپ کے لیے پریشانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔“

”نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہوگی انشاء اللہ! انہیں پتا تھا کہ اگر وہ پولیس تک گئے تو پھر بات آگے تک جائے گی۔ کل صبح صفائی کی بات ہو گئی ہے۔ میں نے انہیں صاف بتایا ہے کہ وہاں فیڈریشن کے دفتر میں جو کچھ بھی ہوا، اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہے۔“

”مگر اس سے فائدہ کیا ہوا خدیجہ؟“ نور نے جربز ہو کر کہا۔

”بہت فائدہ ہوا ہے نور! کم از کم ان لوگوں کو ایک جواب تو ملا ہے۔ اب آئندہ کوئی حرکت کرنے سے پہلے وہ کئی بار سوچیں گے۔ تمہیں پتا چلا ہی ہوگا، وہ مارن غنڈی تو اسٹیج سے گر کر کچھ دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔“

مہرین بولی۔ ”مگر آپ کو بھی تو قیمت چکانا پڑی خدیجہ آئی! آپ اسپتال میں بڑی ہیں۔“

”کوئی قیمت نہیں۔“ وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔



پرائیویٹ ریڈیو سے سب سے 2017 کا پرفارمنس شمارہ

پاکیزہ

ماہنامہ

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قلم کے جوہر... قسط وار ناول کی صورت

سیمما رضا ردا کا خوب صورت نئی ناول... ہم کو عبث بدنام کیا کا منطقی انجام

رفاعت جاوید نے کھلائے محبت کے رنگ... فصل محبت میں

بچوں اور ان کی پرورش کے حوالے سے

ماؤں کی ذمہ داریاں شائستہ زریں

کے تحقیقی سروے میں

اختر شجاعت اور ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے ایمان افروز مضامین

رائزنگ کیلکشاں... رخ چوہدری کے شوخ قلم سے احوال تقریب

سمیرا یونس ہارون کا ہلکا سا ناول... کوئی تعویذ ہو رہا بلا کا

دردانہ نوشین خان کی حیرت انگیز تحریر... خواب گزیدہ

شہناز وسیم، صابخاری اور نصرت یوسف کی مونٹر کاوشیں

(کئی کئی بار)

امہ ایمان، شگفتہ شاہ، ساجدہ ریحان، سیمما بنت عاصم، شمیم فضل

خالق، ناہید چوہدری، ریحانہ آفتاب، دیگر مشاق تحریر نگاروں کی دلکش کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ معلوماتی تراشے، متاثر کن مستقل سلسلے اور دل پر پڑنے والی شاعری اور بہت کچھ آپ کی اہلی ذوق کی ہند

دوست واپس آ گئیں۔ گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ نور اب جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ خدیجہ سے رخصت ہو کر وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئیں۔ جب وہ بیڑھیاں اتر رہی تھیں تو ان کی ملاقات پھر ذوالقرنین سے ہوئی۔ وہ کولڈڈرنکس اور اسٹیکس وغیرہ لے کر دپر آ رہا تھا۔

”آپ جا رہی ہیں؟“ وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

”جی ہاں۔ مگر میں انتظار ہو رہا ہوگا۔“ مہرین نے جواب دیا۔

”آپ پانی تو پی لیتیں۔“

”شکریہ۔ دیر ہو رہی ہے۔“ مہرین نے کہا۔

وہ دونوں سلام لیتے ہوئے نیچے اتر آئیں۔

راستے میں مہرین نے گہری نظروں سے نور کو دیکھا اور جیسی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”ویسے تو! بندہ اتنا برا بھی نہیں لگتا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”سیانے کہتے ہیں تاکہ شکلوں پر نہیں جانا چاہیے۔ شکل صورت سے یہ ذرا سخت مزاج اور تم گم مسم سا ہے مگر جب بات کرتا ہے تو اور طرح کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔“

”اچھا، تم زیادہ مردم شناس نہ بنو۔“ نور نے چڑ کر کہا۔

”یار! میں تو نیک عام سی بات کر رہی ہوں۔“

”لیکن میرے لیے یہ عام نہیں ہے مہرین! میں اس طرح کے کسی بندے کو اپنی زندگی میں لانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”کوئی آئیڈیل؟“ مہرین دہلی دہلی شوفی سے بولی۔

”نہیں۔ کوئی آئیڈیل نہیں مگر یہ قاری ذوالقرنین بھی نہیں۔“

نور کا موڈ دیکھتے ہوئے مہرین نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

..... پندرہ بیس روز گزر گئے۔ انہوں نے دوبارہ خدیجہ کی خیر خیریت دریافت نہیں کی حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ کم از کم ایک بار تو اسے فون کر لیں۔ (نور نے مہرین کو بتا دیا تھا کہ خدیجہ اور اس کے درمیان ذوالقرنین والی بات مکمل چکی ہے) آخر ایک روز مہرین نے خدیجہ کو فون کر ہی دیا۔ حال احوال پوچھا۔ نور نے بھی ٹھوڑی سی بات کی۔ گفتگو کے آخر میں خدیجہ نے نور سے کہا۔ ”نور! تمہارے پاس اور کون ہے؟“

”کوئی نہیں۔ مہرین تھی، باہر چلی گئی ہے۔“

خدیجہ بولی۔ ”تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو رہی؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آپ سے کبھی خفا

”بھلی چٹکی ہو گئی ہوں، کل تک شاید چٹکی بھی مل جائے۔“

ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ دانش مردم کا دروازہ کھلا اور ذوالقرنین تو لیے سے بازو صاف کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ہموار ڈانسی میں پانی کے قطرے پک رہے تھے۔ ذوالقرنین کو دیکھ کر نور کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھی ذرا ٹھنکا پھر اس نے شائستگی سے ”السلام علیکم“ کہا۔ نگاہیں حسب معمول جھکی ہوئی تھیں۔ نور اور مہرین نے جواب دیا۔ وہ شاید وضو کر کے نکلا تھا۔ بولا۔ ”خدیجہ! نماز کا ٹائم ہو رہا ہے۔ میں بس ابھی آتا ہوں۔“

وہ چلا گیا۔ مہرین نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کون تھے خدیجہ آپ؟“

”میرا بھائی ذوالقرنین۔“

”اچھا، آپ انہی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھیں؟“

خدیجہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بہت زیادہ خیال رکھتا ہے میرا۔ چار دن سے مسلسل یہاں میرے پاس ہے۔“

اسی دوران میں مہرین کی وہ دوست آگئی جو اسی اسپتال میں فزیو تھراپسٹ تھی۔ مہرین اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں ایک یو جھل خاموشی طاری ہو گئی۔ نور کے علاوہ جیسے خدیجہ بھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پارتی تھی۔ آخر نور نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ آپ پہلے سے جانتی ہیں؟“

”کیا؟“ خدیجہ نے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ”جی نہیں وہی ہوں جس کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے آپ کے بھائی کے رشتے کی بات چلی تھی؟“

خدیجہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور سیکے سے ٹپک لگائی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہاں نور..... میں جانتی تھی..... مگر میں نے تمہیں بتایا نہیں..... مجھے ڈر تھا کہ تمہیں پتا چل گیا تو ہماری دوستی شروع ہی ختم ہو جائے گی لیکن یہ نہ بھٹکا کہ میرے اور تمہارے ملنے میں کوئی پلاننگ تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک ہی کالج میں تھیں، جو کچھ ہوتا باخود بخود ہوتا رہا۔“

”..... آپ میرے لیے صرف خدیجہ ہی رہیں تو بہت اچھا ہوتا۔“ نور کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ہمارے درمیان اور کوئی تعلق بھی نہیں آئے گا۔“

اس سے پہلے کہ خدیجہ مزید کچھ کہتی، مہرین اور اس کی

لیکن نور! جہاں تک کھیل والی بات ہے..... شاید اب تم بھی محسوس کرتی ہوگی کہ..... یہ سب کچھ کافی لمبا ہو گیا ہے۔ تم نے ماشاء اللہ کافی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں مگر انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم اس معاملے پر غور کرو۔“

نور نے ذرا بے رخی سے کہا۔ ”چھوٹی ای! اگر آپ مجھے یہی سب کچھ سمجھانے آئی ہیں تو پلیز..... نہ سمجھائیں۔ آخر ایک دن تو مجھے کھیل چھوڑنا ہی ہے لیکن کب چھوڑوں گی، اس کا فیصلہ میں نے خود کرتا ہے۔“

”اچھا..... تم اپنے اندازے کے مطابق کوئی ٹائم بتا دو کہ کب تک یہ سلسلہ تم ہو جائے گا؟ میں تمہارے ابو کو مطمئن کر لوں گی۔“

”اگر انہوں نے اس شرط پر مطمئن ہوتا ہے تو بے شک نہ ہوں۔“ وہ جھلا کر بولی۔ شاید اٹھ ہی کھڑی ہوئی مگر چھوٹی ای نے اس کا ہاتھ تمام لایا اور پکھارنے لگیں پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور سر چوما، بولیں۔

”میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ تمہیں بھی اسی طرح تمہارے ابا جان سے باتیں کرتے دیکھوں جس طرح بتول اور بسہہ کرتی ہیں۔ اللہ وہ دن جلدی لائے۔“

وہ اس سے بڑی بہن بتول اور اس کے شوہر کی باتیں کرنے لگیں اور بتانے لگیں کہ کس طرح وہ بتول کے شوہر غیاث کو براہ راست پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انہوں نے نور کی دادی کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ ذرا سخت مزاج تو ہیں لیکن دل کی بہت اچھی ہیں اور وہ بھی نور کو پھر سے اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ نور اور مہرین بازار گئیں۔ کچھ شاپنگ کرتی تھیں، سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ شاہراہ قائد اعظم کے ایک ریسٹوران میں جا کر سوپ پینے لگیں۔ دو عمر لڑکیوں نے نور کو پہچان لیا اور اس سے ایجنڈا کشمیر کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ اسی دوران میں نور کی نگاہ کھڑکی سے باہر تھی۔ افراد کی ایک ریلی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ دھڑے لگا رہے تھے اور کتے لہرا رہے تھے۔ نور دیکھ کر چونکی، ربی میں سب سے آگے دو افریقین نظر آ رہا تھا۔ اس کی سیاہ ڈائری وھول میں اٹی ہوئی تھی اور بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

وہ بلند بھاری آواز میں پکارا۔ ”پاکستان کا مطلب کیا؟“

نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

بیز غائب! اسی تنظیم اصلاح معاشرے کی ریلی تھی۔ کتے اور سیزر کچھ اس قسم کے تھے..... فحاشی دعویاتی نامنظور۔

امریکیوں، یہودیوں کے ایجنڈے نہیں چلیں گے۔

تیس چالیس سینڈ کے اندر ربی کھڑکی کے سامنے سے گزر گئی اور اس کے عقب میں ریٹینی ہوئی ٹریک دکھائی دینے لگی۔ مہرین نے کہا۔ ”بھئی! یہ تو وہی ہے خدیجہ کا بھائی..... اس وقت تو پورا پورا ایڈرلر لگ رہا تھا۔“

”چلو پورا پورا ایڈرلر ہو یا آدھا آدھا، ہمیں کیا۔“ وہ سوپ کا پیچ لیتے ہوئے بولی۔

”ہمیں ہے نا بھئی۔ ربی تو گزرتی مگر ٹریک بھنس گئی۔ ابھی ہم ٹریکس کے تو پچھنہ کچھ جھگڑتا بڑے گا۔“

”جھگڑتیں گے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ پھر چند لمحوں توقف کر کے کہا۔ ”خدیجہ سے تو بات نہیں ہوئی دوبارہ؟“

”تم نے ہی روک دیا تھا، میرا تو دل چاہ رہا تھا۔“

”دراصل دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔ ایک عجیب سی انیٹ محسوس ہوتی ہے ان سے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ گلاب کے ساتھ کاٹنا بھی ہو تو گلاب کے قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“

”لیکن کاٹنا بھی تو گلاب کا بھائی ہی ہے نا۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ وہ اتنا کاٹنا بھی نہ ہو۔ جب تک بندے کو پرکھا نہ جائے اس کے بارے میں حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اب دیکھو نا..... وہ جو اسپورٹس مانی فرما دھتا شکل سے کیسا لگتا تھا، مگر کھلا کیا؟“

اس موضوع نے نور کو بد مزہ کر دیا۔ اس نے برا سامنہ بنایا۔

مہرین بولی۔ ”لگتا ہے کہ فرہاد کے ذکر نے تمہارا منہ کڑوا کر دیا ہے۔ کوئی میٹھی چیز منگواتے ہیں۔“ اس نے ویز کو بلا دیا۔

نور نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں ٹریک رینگ رینگ کر گزر رہی تھی۔ جن دو کم سن لڑکیوں نے نور سے آنوگراف لیے تھے، وہ دو ایک کرسی پر بیٹھی اشتیاق سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان دونوں کے لیے بڑی اہم تھی۔ شاید ایک اسٹار کی حیثیت رکھتی ہو لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اسٹار کن کالے بادلوں کی زد میں ہے۔ پتا نہیں کیوں اب بھی کبھی باپوی بھی اس پر طاری ہونے لگتی تھی۔ محنت اور مسلسل محنت مگر وہ صلہ کہیں نہیں تھا جس کی وہ آرزو مند تھی۔ پھر تاپا یا آ کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔ نور کی ایک پار کے موقع پر انہوں نے کہا تھا..... خدا کے گھر میں دیر ہوتی ہے اندھیر نہیں۔

اس شام جب وہ بازار سے گھر پہنچیں تو بی بی آئن تھا۔ ان دونوں بی بی کی وی کے علاوہ بس دو چار چھٹو بھی اور ہوتے تھے جن میں سی ای این اور این بی ایم وغیرہ کے

شکست کی فتح

ایک بار پھر تاپا یا ابا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے..... اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ہاں یہاں بھی شاید دیر تو ہوتی تھی مگر مکافات کا قانون حرکت میں آیا تھا۔ اس نے نیم دراز ہو کر ٹیکے سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگی..... کیا اس کی مسلسل محنت، جانفشانی اور غیر مشروط کٹ منٹ کے حوالے سے بھی کوئی قانون قدرت حرکت میں آئے گا؟ اس کے تاپا ابا کو کوئی صلہ ملے گا؟

اگلے روز تاپا یا ابا سے بھی اس بارے میں بات ہوئی۔ انہوں نے کہیں اخبار میں یہ خبر دیکھی تھی۔ بولے۔ ”نور! تمہیں پتا چلا ہے اس فرہاد کے بارے میں؟“

نور نے اثبات میں جواب دیا اور بی بی کی نیوز کا ذکر کیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ”بندے کی اصلیت کا پتا اس وقت چلتا ہے جب اس کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ اس لڑکے نے ٹیکنک کے سلسلے میں مجھے بہت دھوکا دیا۔ پچیس تیس ہزار روپیہ بھی لے لیا مگر زیادہ تکلیف اس ذہنی پریشانی کی ہے جو اس کی وجہ سے ہوئی۔“

نور اب تاپا ابا کو کیا بتاتی کہ وہ جس دھوکے کا ذکر کر رہے ہیں وہ اس کا مضمر شیز بھی نہیں جو اس شخص نے خود اسے دیا تھا، اپنے مطلب کے لیے اسے کھلونا بنا ڈالا تھا۔ تاپا ابا نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر موضوع بدلا۔ ”تمہیں پتا ہے، امنا لے کا میلا آنے والا ہے؟“

”کب؟“ وہ بے ساختہ بولی۔

انہوں نے کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی اور حساب لگا کر بولے۔ ”بیس تین ہفتے رہ گئے ہیں تقریباً۔ میں تو کہتا ہوں پروگرام بنالو۔ پچھلی دفعہ بھی اچھا وقت گزرا تھا تم لوگوں کا۔“

امنا لے کا ذکر ہی ایسا تھا کہ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری یادوں کو ہانک کر دل و دماغ کے باڑے میں لے آتا تھا۔ یادوں کے اس احاطے میں سربا کی سنہری دھوپ ہوتی تھی، ڈھول کی تھاپ، گھوڑوں کے نغصے، جھولے، تماشے، پکوانوں کی مہک، کشٹیاں، کڈیاں، رنگین آچل، دلنشین گیت..... اور پتا نہیں کیا کچھ۔

نور تپا اور پڑھنے کے عجیب دور سے گزر رہی تھی (اس کی نوکری کی بنیاد اچھلیٹس پر تھی اور کسی وقت یہ نوکری بھی خطرے میں محسوس ہوتی تھی)۔ امنا لے کے نام پر اس کا دل دھوکا اور سینے میں استگ سی جاگی۔ اس نے کہا۔ ”تاپا ابا! دل تو چاہتا ہے لیکن.....“

”بچپن و مکن کچھ نہیں۔ بس تم پروگرام بناؤ، سب حوصلہ شکن شکست سے دو چار کیا تھا۔“

علاوہ ایک اسپورٹس چیلنج بھی تھا۔ وہاں ایک نیوز چل رہی تھی۔ نیوز کا سرکہ رہا تھا..... ”مسٹر فرہاد کا تعلق اسپورٹس نیوز کے شعبے سے ہے۔ وہ ایک بڑے سیکڑین کے اسپورٹس انچارج ہیں۔ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔“

اس کے ساتھ ہی ایک ویڈیو کلپ چلا گیا جس میں ایک اسٹریچر کو تیزی سے کسی اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل کیا جا رہا تھا۔ نیم بے ہوش فرہاد صاف پچھتا جا رہا تھا۔ اس کے سر، دونوں بازوؤں اور ایک پاؤں پر پٹیاں تھیں۔ نیوز کا سرکہ رہا تھا۔ ”میاں بیوی کے درمیان خلع کے کیس کی خبر دو دن پہلے آئی تھی۔ ایجنٹیلٹ شاپینہ کے والد کی طرف سے فرہاد پر پٹیس کیے جانے کا ذکر بھی آیا تھا لیکن آج جو واقعہ ہوا وہ زیادہ غیر متوقع ہے۔ شاپینہ کے بھائیوں کی طرف سے فرہاد کو زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ گاڑی پر سوار تھیں رڈ سے گزر رہا تھا۔ گاڑی روک کر اسے اور اس کے وکیل دوست کو باہر گھسیٹا گیا اور فرہاد کو سڑک پر لٹا کر بے درنگ لے آ گیا۔ اس کے دونوں بازوؤں گئے ہیں۔ اس سے گاڑی بھی پھینک دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہینڈ اکاڑی بھی اسے سسرال کی طرف سے ہی ملی ہوئی تھی اور بیوی کے نام رجسٹر تھی۔“

نور اور مہرین حیرت میں گم یہ سب کچھ سنتی رہیں۔ آج ہی ان کی گفتگو میں فرہاد کا ذکر آیا تھا اور آج ہی یہ خبر سننے میں آ گئی تھی۔ رات تک اس بارے میں مزید تفصیل کا پتا بھی مختلف ذریعوں سے چلا۔ معلوم ہوا کہ شادی کے دو تین ماہ بعد ہی شاپینہ اور فرہاد میں اختلافات شروع ہو گئے تھے۔ فرہاد کی نگاہ سراسر شاپینہ کے والد کے روپے پیسے پر تھی۔ اس کے علاوہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ کئی بار کی تنبیہ اور وارننگ کے باوجود اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ بالآخر تنبیہ خلع کے مطالبے، دیگر کیمرز اور فرہاد کی شدید درگت کی صورت میں لگلا۔

کمرے میں بند نور دیر تک سوچتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے کافی عرصے بعد بالآخر اس کے نہایت شدید اور توہین آمیز دکھ کا مداوا ہو گیا ہے۔ فرہاد نے جس طرح اسے اپنے کھیل کا حصہ بنایا اور مطلب لطفے کے بعد منہ پھیرا، وہ سب نور کے لیے ایک کربناک تجربہ تھا اور یہی کربناک تھی جس نے اسے اپنے کیریئر کے نہایت اہم دور میں ایک حوصلہ شکن شکست سے دو چار کیا تھا۔

ٹھیک ہو جائے گا۔“

”دادی اماں بھی کچھ بیمار ہیں۔“ نور نے کہا۔

”تو ان کے علاج کی بات ہی تو کر رہا ہوں میں..... دیکھنا میلے پر جانے کے لیے وہ کیسے بستر سے اٹھتی ہیں اور تیاری کرتی ہیں۔“

پتا نہیں کیوں نومبر دسمبر کے مہینے ہمیشہ سے نور کے لیے کچھ ادا سی لے کر آتے تھے۔ سردی بڑھ جاتی تھی۔ شا میں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ لوگ دیر تک کمروں میں بند رہتے تھے، کمرہ نماظر کوڈھانپتا تھا اور درخت بے لباس نظر آتے تھے۔ آج کل بھی وہ کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ کئی دن سے آسمان پر بن بارش کے بادل تھے۔ سورج شکل نہیں دکھارہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ آج اسے پریکٹس کے لیے جانا تھا مگر دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ مکمل اوڑھ کر کرسی پر بیٹھی رہی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا دایا۔ باہر باغیچے میں حسین۔ بدوے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کیار یوں میں گیندے اور چائنا روز کے پھول بھی جیسے سردی سے سکرے سٹے تھے۔ اسے وہ منظر یاد آ گیا جو دو دن پہلے اس نے اور مہرین نے شاہراہ قائد اعظم کے ریسٹوران میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ چھوٹا سا جلیوس جو نعرے لگاتا اور کہتے لہراتا کھڑکی کے سامنے سے گزرتا تھا۔ اس میں سے سب آگے وہ تھا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش سے تھمنا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا منہ کاٹنا میں لہراتا اور نعرہ بلند کرتا تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ آواز میں ٹھہراؤ تھا اور وہ سچائی تھی جو اپنے موقف کے حوالے سے اس کے اندر موجود تھی۔ اپنی تمام تر سخت گیری کے باوجود وہ کھرا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اور اس کی بہن خدیجہ نے کہا تھا کہ وہ اندر سے اخروٹ کے مغز کی طرح نرم ہے۔ یہ ایک بہن کے تاثرات ایک بھائی کے بارے میں تھے اور ابھی تا یا ابا نے کہا تھا..... حقیقت کا پتا تو اسی وقت چلتا ہے جب کسی انسان سے مستقل طور پر واسطہ پڑتا ہے۔

خدیجہ کی بھی ہوئی باتیں نور کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلی اور آخری بار کہے گی اور واقعی تب سے اب تک اس نے دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کی تھی بلکہ اتفاق یہ ہوا تھا کہ اب تک ان کی بات ہی نہیں ہو پائی تھی۔ خدیجہ نے کہا تھا..... نور، وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ کوئی عارضی یا سطحی جذبہ نہیں ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ دن رات تمہیں

سوچتا ہے..... تمہارے حوالے سے کسی اچھے وقت کا انتظار کرتا ہے۔

نور نے ایک آہ بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ خدیجہ کی باتوں کے حوالے سے وہ بھی سچی بے چین سی ہو جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی واقعی اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کی آس لگائے بیٹھا ہے، اس کی نسبت سے کسی انہونی کی راہ دیکھ رہا ہے۔

وہ کیوں کر رہا تھا ایسا؟ کیوں سراب کے پیچھے دوڑ رہا تھا؟ نور کو اپنے دل پر بہت بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہ جیسے اندر سے بھجھکیا سی تھی۔ وہ کیوں یہ بات سمجھ نہیں جاتا کہ نور کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ دو مختلف مزاجوں اور مختلف سوچوں کے انسان ہیں۔ وہ نہیں مل سکتے۔ اور انہیں ملنا بھی نہیں چاہیے۔

پتا نہیں کیوں نور کا دل چاہا کہ وہ ایک بار اس سے بات کرے..... ٹیلی فون پر ہی سہی مگر اس سے رابطہ کرے۔ اسے سمجھائے کہ وہ کسی انہونی کی آس نہ لگائے۔ جو وہ سوچ رہا ہے کبھی نہیں ہوگا۔ اس کے والدین اور اس کی بہن جلد از جلد اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے ہیں، وہ ان کا دل نہ دکھائے۔

یہ عصر کا وقت تھا۔ وہ کافی دیر سوچتی رہی۔ اس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور پھر اچھ کھڑی ہوئی۔ اسٹالے کے میلے پر جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسے بھی اپنے لیے کچھ چیزیں خریدنے اپنی کالونی کی مارکیٹ تک جانا تھا۔ اس نے گرم شال لی۔ اونٹنی ٹوپی اپنی اور شوذر بیگ لے کر قریبی مارکیٹ کو چل پڑی۔ اس کے پاس ذوالقرنین کی دکان کا نمبر موجود تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس وقت وہ دکان پر ہی ہوگا۔

وہ ایک پی سی او پاس کے اندر چلی گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ محسوس بے لکچ میں وہ سب کچھ کہہ دے گی جو اس نے سوچ رکھا ہے اور بات کو مزید طول دے دیے بغیر فوراً بند کر دے گی۔

اس نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف ٹھنکی بچتا شروع ہوئی پھر فون اٹھایا گیا۔ اردو بازار کا شور کانوں میں گونجا، تب ذوالقرنین کی بھاری مگر ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔ ”ہیلو..... کون؟“

پتا نہیں یہ کیسے لمحے تھے۔ نور کو کوشش کے باوجود بول نہیں سکی۔ وہ جو نہایت روکے چھپکے لہجے میں ذوالقرنین کی مکمل حوصلہ شکنی کا ارادہ رکھتی تھی، ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ چند سیکنڈز توقف کے بعد آواز دوبارہ ابھری۔

شکست کی فتح

”ہیلو، کون بول رہا ہے؟ کس سے بات کرنی ہے؟“ نور نے ایک بار پھر کوشش کی مگر گلے میں پھنسا سا تھا۔ کبھی نہ گھبرانے والی اور شدید ترین تناؤ میں بھی خود کو کیسو رکھنے والی نور منتحری ہو گئی تھی۔ اس نے ریسپور کو مضبوطی سے تھاما۔ کچھ کہنے کے لیے اس کی زبان علی الحان مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک دم ریسپور ہٹا لیا۔

وہ قریب ایک منٹ تک وہاں گم صدم کھڑی رہی پھر باہر نکل آئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے اس کے ذہن میں ابھی تک پھل تھی۔ وہ یونہی گارٹمنش کی ایک دکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور شوٹیں میں جھانکنے لگی۔ اس نے اپنے دل کو سخت کرنا چاہا۔ شعوری طور پر ذوالقرنین کی وہ ساری باتیں یاد کیں جو اسے بری لگتی تھیں۔ اس کا Typical لباس، اس کا بے لکچ لب دلچیز، اس کی ٹھنکی بھوری جھنپیں وہ غصے کے وقت اچکا تھا اور اس کا وہ رویہ جو خواتین کو کھیل کے میدان اور اس طرح کی دیگر مصروفیات سے دور رکھنے کے حوالے سے تھا۔

وہ ایک بار پھر پی سی او کے کیمین کی طرف بڑھی۔ ایک خاتون اپنی بات ختم کر کے باہر نکل رہی تھی۔ نور اندر چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا، اس نے ریسپور اٹھایا۔ اچھی طرح ٹھنکھا کر گلا صاف کیا۔ دل ایک بار پھر شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے ہمت کر کے ڈائل پر انگلی رکھی..... لیکن..... آواہمیر ڈائل کرنے کے بعد ہی ایک بار پھر اس نے ریسپور کرڈیل پر پتچ دیا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ وہ بے خوف لڑکی تھی اور دل کی بات کہہ دیا کرتی تھی لیکن آج پتا نہیں کسے کیا ہوا تھا؟

☆☆☆

ذوالقرنین اپنی شاپ پر گم صدم بیٹھا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اسے ایک فون کال آئی تھی۔ اس نے ریسپور اٹھا کر کئی بار ہیلو کہا تھا مگر جواب نہ دار تھا۔ اس نے فون کی آواز آنی رہی تھی۔ تب اس نے دوبارہ پوچھا تھا کہ کون بول رہا ہے۔ آواز اس مرتبہ بھی نہیں آئی تھی۔ ہاں کسی کلائی کے بیگلنگ ٹکرائے کی مدد صدم اندر ورا بھری تھی اور فون بند کر دیا گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ فون کسی اور کی طرف سے نہیں، نور یا اس کی تایا زاد بہن مہرین کی طرف سے تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ نور کی طرف سے ہوگا لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ اگر وہ نور ہی تو کیا کہنا چاہتی تھی؟ ذوالقرنین کے ذہن میں الجھن سی پچی ہو گئی تھی۔

سپینس ڈائجسٹ

اسے یاد آیا کہ خدیجہ کالج گئی ہوئی ہے۔ وہاں فیزکس کی ایک تقریب تھی۔ وہ جب بھی کسی ایسی تقریب میں جاتی تھی، ذوالقرنین کو تشویش ہونے لگتی تھی۔ چند مہینے پہلے ایک ایسی تقریب میں ہی خود بخود باڈوٹا تھا اور جوش ملی تھیں۔ خدا کا شکر تھا کہ اب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ٹھنکی یا اس کے گروپ کی طرف سے کم از کم اب تک تو کوئی ہمتا خانی نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی ذوالقرنین کو ایسے موقعوں پر ہمتا ملتا تھا۔ اس نے گھر فون کیا۔ والدہ نے بتایا کہ ذوالقرنین آج کل اچھی ہے۔ وہ ڈرائیو میں بیٹھی سے دکان کے اندر ہی کھانے کا کال کر لیا۔ اس نے فون کی ٹھنکی بچ گئی۔ دوسری طرف خدیجہ نے بھی کال کر لیا۔ اس نے فون کی ٹھنکی بچ گئی۔ ”واپسی میں دیر لگائی ہو تو کسی طرح انداز میں آ جا۔“ تمہیں معلوم ہے تمہارا بھائی بیٹوں پر کھڑا ہو کر ہنسا رہا ہے۔ دیکھتا رہتا ہے۔“

”سوری۔ بس رش کی وجہ سے تھوڑا ٹائم لگ گیا۔ تم نے فون کیا تھا؟“

”ہاں، تمہاری واپسی کا پوچھنا تھا..... اور ایک دوسری بات بھی کرنا تھی۔“

”دوسری بات؟ کوئی لڑکی تو نہیں دیکھی؟“ اس نے حسب عادت پھینکا۔

”کبھی تو نہیں سنی ہے..... اور مجھے لگتا ہے کہ وہ نور ہی تھی۔“ وہ چونک کر بولی۔ ”کیا مطلب..... کوئی..... فون آیا تھا؟“

”ہاں، آتا تو فون ہی تھا مگر دوسری طرف سے صرف سانسوں کی آواز ہی آتی رہی۔“

”اور سانسوں کی آواز سے جناب کو پتا چل گیا کہ وہ نور تھی؟“

”ہاں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ فون اس مارکیٹ سے کیا گیا تھا جس کے پاس انکل اشفاق کی رہائش ہے۔ اب تم پوچھو گی کہ یہ نتیجہ میں سے کیسے نکلا؟“

”بالکل۔ بات تو پوچھنے والی ہے۔“

”مارکیٹ کی جامع مسجد میں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں وہاں کے مؤذن عبید اللہ صاحب کو اور ان کی اذان کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہاں کئی بار جمعہ بھی پڑھا ہے کیا سمجھیں؟“ ذوالقرنین حتیٰ فیئر لہجے میں بولا۔

”تمہیں تو سی آئی ڈی میں بھرتی ہونا چاہیے تھا۔“ خدیجہ نے ہلکے ہلکے انداز میں کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔

”لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ نور ہی ہو۔“

”میرا قیاد تو یہی ہے کہ وہ نور یا مہرین میں سے کوئی

ایک تھی۔ باقی والد عظم بالصواب۔“ تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ ”خدیجہ، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ایک بار اور اس سے مل لو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہ پاری ہو۔“

”نہیں ذوالقرنین، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس حوالے سے پہلی اور آخری بار اس سے بات کر رہی ہوں۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتی ہوں۔ اور..... ویسے بھی ذوالقرنین! سامنے کہتے ہیں کہ محبت کو آزار دہانہ دینا چاہیے، بغیر شرط کے..... بغیر کسی بندھن کے..... اگر وہ واقعی محبت ہو تو کسی نہ کسی طور آپ کی طرف پلٹ آئے گی۔ ہم نے اس سے جو بھی کہنا ہے کہہ دیا ہے۔ اب اگر بڑی کے محاورے کے مطابق کینداس کی کورٹ میں ہے۔“

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر فون پر اس نوع کی مزید گفتگو مناسب نہیں تھی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے خدیجہ نے کہا۔ ”آج کیا تاریخ ہے؟“ ذوالقرنین نے بتایا کہ گیارہ ہے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”کچھ یاد آیا تمہیں؟ آٹھ دن بعد امانت لے کے ملا آنے والا ہے۔ پچھلے سال نور کے ابا جی نے تمہیں میلا دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ میں تو کہتی ہوں اس بار ہوا ڈوہا سے..... ہو سکتا ہے کہ کوئی اچھی بات ہو جائے۔“

”میرے خیال میں تو یہ بے کار کی باتیں ہیں.....“ شاید وہ اور بھی کچھ کہتا مگر لائن میں شور اور کھڑکھڑاہٹ شروع ہوئی۔

اس نے فون بند کر دیا۔ دل میں ایک بے قراری سی تھی۔ اگر وہ واقعی نور یا مہرین کی کال تھی تو ہو سکتا تھا کہ دوبارہ کال آئی کل یا پرسوں..... یا ممکن ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد۔ اس نے سیاہ رنگ کے فون سیٹ کا ریسیور اچھی طرح کرڈل پر جمایا اور جیسے خنجر لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کیوں اسے بھول نہیں پاتا؟ کیوں ہر گھڑی اس کا انتظار رہتا ہے؟ وہ کوئی عاشق حزان کا ٹیٹ لڑکا نہیں تھا..... وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ اس کی ایک پہچان تھی۔ اس کے گھرانے کی پہچان تھی۔ لوگ ان کی عجمیت کی مثالیں دیتے تھے اور جو کچھ ہوا اس میں ذوالقرنین کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ نور اس کی سوچوں اور نظروں میں آنے والی پہلی لڑکی تھی اور وہ بھی صرف اس لیے آئی تھی کہ اس کے والدین نے اسے ذوالقرنین کے لیے پسند کیا تھا۔ نور اس کو دکھائی گئی تھی۔ اس کی باتیں اسے بتاتی گئی تھیں۔

ذوالقرنین کے دل میں اس کے لیے جگہ بنائی گئی اور جب جبکی جھکی نگاہوں والے خاموش طبع ذوالقرنین کے دل میں اس کی جگہ بن گئی تھی تو سب الٹ ہو گیا تھا اور اب وہ بے پناہ کوشش کے باوجود اس کی سوچوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ بے شک وہ اس کے حزان کی نہیں تھی، بے شک اس کی مصروفیات ذوالقرنین کو پسند نہیں تھیں لیکن وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت ایسی ہی ہے دلیل اور منہ زور ہوتی ہے۔ وہ اپنے راستے اور اپنے اصول ضابطے خود مقرر کرتی ہے۔

ایک گاہک کی آواز نے اسے خیالوں سے جھٹکایا۔ ”بیٹا ذوالقرنین! سیرت امام زین العابدین ہوگی آپ کے پاس؟“ یہ ایک قریبی مدرسے کے استاد تھے اور ذوالقرنین کے پرانے کسٹمر۔

”جی سر! ایک کاپی موجود ہے۔ اوپر پڑی ہے، میں دیکھتا ہوں۔“ ذوالقرنین نے کہا اور بیڑھی چڑھ کر دکان کے بالائی حصے کی طرف گیا۔ ابھی وہ پانچویں بیڑھیوں ہی چڑھا تھا کہ فون کی گھنٹی بھرنے لگی۔ وہ بڑا باخبر نوجوان تھا مگر گھنٹی کا بجنا اور نور کا خیال ذہن میں آنا اتنا ہی بیجان خیز تھا کہ وہ جلدی سے پلٹا۔ شور کے پانچے میں اس کا پاؤں الجھا اور وہ جار پانچ زینوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ اس کے سر پر ٹھیک ٹھاک چوٹ لگی اور ناک سے خون رسنے لگا۔ کہنیوں پر بھی گہری خراشیں آئی تھیں۔ اسے قریبی کلینک میں پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور سلی دی۔ اس کی ایک آنکھ خون کی طرح سرخ ہوئی تھی۔ پیشانی پر پٹی بندھوا کر اور انجکشن وغیرہ لگوا کر وہ دوبارہ دکان پر آ گیا۔

ارد گرد کے دکاندار حال احوال پوچھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ایک نے کہا۔ ”یار! تم تو ہمارے بازار کے سب سے رکھ رکھاؤ والے دکاندار ہو، دکان میں دو سیکڑا موجود تھے پھر خود کیوں بیڑھی چڑھ گئے اور اگر چڑھ ہی گئے تھے تو پھر جھلا تک کیوں لگا دی؟“

دوسرے نے کہا۔ ”کوئی ضروری فون آ گیا تھا۔ جناب پلٹے تو گر گئے۔“

ایک بے تکلف ہمسائے نے کہا۔ ”کوئی اور ہوتا تو اس بات کا بھی بھٹو بٹا کہ ایسا کون سا ضروری فون تھا مگر بھی تم پر شک کرتا تو ایسے ہی ہے جیسے کسی میاں مٹھو پر شک کیا جائے کہ وہ رات کو سرخ کی طرح اذان دیتا ہے۔“ دوست ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے اور وہ اپنے اندر ہی اندر بے پناہ جھل ہو رہا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں بتایا گیا

تھا۔ اس کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو اس نے ایک پڑوسی دکاندار کو ساتھ لیا اور اپنی ایف ایکس خود ہی ڈرائیو کر کے گھر چلا گیا۔

..... اگلے روز رات کو اسے خاصا تیز بخار ہو گیا۔ تسلی کے لیے سی ٹی اسکین وغیرہ بھی کرا لیا گیا۔ اوکے رپورٹ ملی۔ ڈاکٹر نے کہا دو تین دن تک بخار چلے گا..... اگلے روز بخار سنبھلے گا مگر غنودگی بدستور تھی۔ رات کو ذوالقرنین کے کمرے میں خدیجہ بیمار داری کے لیے موجود تھی۔ رات گئے بخار کی مہوشی میں ذوالقرنین نے دو تین بار کچھ کہا۔ خدیجہ نے اٹھ کر سنا۔ اس کا بھائی بہت دمدم آواز میں دلفغا رہا۔ ”نور“ کا نام لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس نے نور سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اب بھی اس سے اپنے بھائی کے حوالے سے بات نہیں کرے گی اور وعدہ ایفا کرنا خدیجہ کی خوشی لیکن وہ کم از کم یہ تو کر سکتی تھی کہ مہرین کو فون کرتی اور اسے ذوالقرنین کی چوٹ کے بارے میں بتاتی۔ وہ جانتی تھی کہ مہرین رات کو دیر تک جاگتی ہے۔ اس کو فون کرنے کے لیے وہ فون سیٹ کے پاس آن بیٹھی۔ دل و دماغ میں کشمکش سی تھی۔ کافی دیر تک فون کے پاس بیٹھنے اور سوچنے کے بعد وہ فنی میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ کچھ باتوں کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا جائے۔

☆☆☆

نور کمرے میں گم سر سی بیٹھی تھی۔ نئی ملازمہ ابھی ابھی کمرے میں صفائی کر کے گئی تھی۔ چاندی نام تھا۔ یہ مشکل پچیس پچیس سال کی رہی ہوگی۔ قبول صورت تھی لیکن بڑی عجیبی بھی اور ڈری ڈری سی۔ ماتھے پر چوٹ کا پرانا نشان تھا، تھوڑا سا لنگڑائی بھی تھی۔ کل تاکی اسی نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر پچیس سال سے زیادہ عمر کا ہے اور اس کو بہت مارتا پیتا ہے۔

تاکی اسی کمرے میں آئیں تو نور نے پوچھا کہ یہ کیوں اس کی مار کھاتی ہے؟ تاکی بولیں۔ ”دور دراز علاقے کے رہنے والے ہیں۔ راجن پور کے آس پاس۔ اس کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔“

”وہ کیوں؟“ ”کوئی لبا چھتا تھا۔ اس کے پیچھے نے کسی لڑکی کو بھگایا تھا۔ لڑکی والوں نے پنجابیت بلائی۔ ایسی پنجابیوں میں بڑے بڑے منوس فیصلے ہوتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ملزم لڑکے کی بہن کی شادی لڑکی کے باپ سے کر دی جائے لیکن

دوسری پارٹی نہیں مانی۔ وہ لڑکی بہت چھوٹی تھی مشکل سے چودہ پندرہ سال کی۔“

”تو پھر؟“ ”پھر ملزم پارٹی نے آفر کی کہ ہم لڑکے کی چھوٹی چھوٹی چاندی کا رشتہ دے دیتے ہیں۔ چاندی بھی اچھی شکل کی تھی مگر اس کو پہلے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی، پھر دغیرہ کوئی نہیں تھا۔ اس بار مدھی پارٹی نہیں مانی۔ انہوں نے کہا ہمیں کنواری کے بدلے کنواری چاہیے۔ اندازہ لگاؤ ان لوگوں کی جاہلیت کا۔ مرد عورت کا رشتہ کتنا خوبصورت اور خوشبودار ہوتا ہے لیکن ایسے لوگ اسے بدلے کی آگ سے گھٹاؤ ڈالنا کر رہے بنا دیتے ہیں۔“

”پھر کیا ہوا؟“ ”نور نے پوچھا۔ ”دہی سودے بازی۔ معتبر لوگوں کے بیچ میں پڑنے سے مدھی پارٹی چاندی کے رشتے پر مان تو گئی مگر ساتھ میں دو بھینسوں اور نقد رقم کی صورت میں بہت سا جمانہ بھی وصول کیا۔ اب یہ بے چاری اپنے سے دو گنا مگر کے شوہر کے ساتھ بسر کر رہی ہے۔ وہ پکا جواہر ہے، بہت کچھ ہار چکا ہے۔ اب گھر میں بڑا اناجھٹا ہے۔ یہ بے چاری گھروں میں کام کرتی ہے۔“

”یعنی اپنے پیچھے کے کیے کی سزا بھگت رہی ہے؟“ ”بالکل۔ ایسی کہانیاں ہمارے دیہاتوں اور گروہوں میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں نور..... کنواری کے بدلے کنواری۔ بیاتہا کے بدلے بیاتہا۔ یا ایک کنواری کے بدلے دو بیاتہا..... کن کو اردو کچھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم پتھر کے زمانے میں بستے ہیں اور ہم پر جنگل کے قانون لاگو ہوتے ہیں۔“

”ایسا قانون جس میں مردوں کے کیے ہوئے کی سزا میں بھی صرف عورتوں کو ہی ملتی ہیں۔“ نور نے تائیدی انداز میں کہا۔

”بالکل..... اب یہی چاندی والا معاملہ ہی دیکھو۔ اس کا کیا قصور تھا؟ یہ بیٹھی بٹھائی اس گھر سے میں آ گئی۔ لڑکے کی بچھو کی حیثیت سے اسے قربانی دینا پڑی۔ اچھی صورت کی تھی، جوان تھی، بھگائے جانے والی لڑکی کا کوئی جوان بھائی یا چچا وغیرہ ہوتا تو اس کے لیے باندھ دی جاتی۔ کوئی ایسا نہیں تھا اس لیے لڑکی کے کھوسٹ باپ نے یہ جرمانہ وصول کیا اور اسے اپنے گھر ڈال لیا۔“

نور آہ بھر کر رہ گئی۔ اسی دوران میں پی ٹی وی ایل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

نور نے دیکھا، یہ فون انہی چھوٹی لڑکیوں کی طرف سے تھا جن سے ایک دن ریستوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ ظاہر تھا کہ انہوں نے ایٹھلیٹکس کے حوالے سے بات کرنا تھی۔ آج کل نور کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس موضوع پر بات کرے یا اس بارے میں سوچے۔

اس نے فون نہیں اٹھایا۔ کچھ دیر بعد پھر بیل ہونے لگی۔ تیسری بار بیل ہوئی تو نور نے کال ریسیور کر لی۔ بچیوں کی والدہ بول رہی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کو دباتے ہوئے نور نے خوش غلطی سے بات کی۔

بچیوں کی والدہ صبا بتا رہی تھی۔ ”نور! تم میری بچیوں کی آئیڈیل ہو۔ وہ دونوں بڑی دلچسپی لے رہی ہیں رنگ میں۔ اس حوالے سے میں تم سے دو منٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں ایک بڑی بہن کی طرح تم سے آزادانہ بات کر سکتی ہوں۔ تمہاری طرح ہم بھی ایک دینی رحمان والے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے نور کہ بچیاں پروڈاکٹر طریقے سے اور اپنے حجاب کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی محنت مند تقریبات میں حصہ لے سکیں؟“

”یہ تو بڑا لمبا موضوع ہے صبا صاحبہ لیکن جو کچھ میری ادنیٰ سمجھ میں آتا تھا، وہ میں نے ایک اخباری انٹرویو میں بھی تفصیل سے بیان کیا تھا۔ آپ.....“

”ہاں۔ وہ انٹرویو میں نے بھی پڑھا تھا۔“ صبا بتانے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تمہاری کچھ باتیں ابھی تک میرے ذہن میں ہیں۔ اس میں تم نے ایک لباس کا آئیڈیا بھی پیش کیا تھا جو لڑکیاں اور خواتین رنگ کے وقت پہن سکتی ہیں۔ ظاہر ہے نور، خواتین کے جسم کے کچھ حصے ایسے ہیں جنہیں کسی بھی طرح نمایاں نہیں ہونا چاہیے اور مردوں کے سامنے تو بالکل نہیں۔“

”جی ہاں۔ اس لباس میں، میں نے یہی چیز مد نظر رکھی تھی۔ بہت سی لڑکیوں نے اسے اپنا یا ہے اور منفید پایا ہے۔“

”نیکر کے بجائے غالباً ٹراؤزرقسم کی چیز کی۔“

صبا بتانے کہا۔ ”ہاں لیکن زیادہ کھلا ٹراؤز نہیں اور کپڑا بھی ہلکا چمکا چمکدار اور ملائم ہو۔ جو سامنے سے ہوا کی مزاحمت نہ کرے۔ لباس کا اپر کلوں سے نیچے تک جاتا ہے اور بھاگتے ہوئے بھی آپ کے جسم کے ساتھ رہتا ہے، سامنے کی طرف دو ایک جگہ ہلکی پٹیک ہے جو باڈی کی شپ کو نمایاں نہیں ہونے دیتی۔ آپ کہیں گئی تو میں آپ کو

انٹرویو کی فوٹو اسٹیٹ بھجوا دوں گی۔ تفصیل سے دیکھ لیجے گا.....“ آپ وہ پچھا چمکانے کے سوز میں تھی۔ بہتر ہوا کہ دوسری طرف کوئی پچھوے چلانے لگا اور صبا بتانے کہا۔ ”اچھا نور! چھوٹا بیٹا رو رہا ہے، پھر بات کریں گے۔“

نور کو یہ ساری گفتگو پوچھ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا، عجیب کیفیت تھی اس کی۔ یہ دوسرے روز کی بات ہے، مہر پھر اور شام کے درمیان ایک کمزوری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

نور کمرے میں بیٹھی تھی۔ مہرین لپکتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ”مبارک ہو بھیجی۔ کوئی مٹھا یا وغیرہ ہونی چاہیے۔“ نور کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے لگا جیسے شاید اس کے حوالے سے کوئی اچھی خبر ہے۔ واڈا دوا لی نور کی خطرے میں دیکھ کر اس نے دو دین اور جکھوں پر ٹرائل دے رکھے تھے۔ اس نے سمجھا شاید کہیں سے کوئی لیٹر آیا ہے مگر مہرین کی مبارک دوسرے حوالے سے تھی، اس نے کہا۔ ”آل پنچاب تقریری مقابلے میں گولڈ میڈل جیتا ہے بسمہ نے..... تمہیں ابھی تک خبر نہیں ہوئی؟“

بسمہ کی کامیابی کا سن کر نور کا دل ہلکا ہوا، مہرین کہہ رہی تھی۔ ”مجھے تو دوپہر ایک بجے ہی پتا چل گیا تھا، میں نے سمجھا تم تک بھی خبر پہنچ چکی ہوگی۔“

خوشی کے اس موقع پر نور کو اپنے سینے میں کچوکا سا محسوس ہوا۔ شام ہونے کو آتی تھی اور وہ ابھی تک اپنی بہن کی اتنی اہم کامیابی سے بے خبر تھی۔ جب صاف ظاہر تھی، ابا جان نے جو پابندیاں لگا رکھی تھیں، ان کے سبب دونوں گھروں میں اطلاعات کا تبادلہ کم ہی ہوتا تھا۔ ابا جان نے ابھی تک نیلی فون بھی نہیں لگوایا تھا۔

ابھی نور اور مہرین باتیں ہی کر رہی تھیں کہ فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف بسمہ بھی، کسی بی بی او سے بات کر رہی تھی۔ ”نور! میں نے گولڈ میڈل جیت لیا۔“ وہ چھوٹے ہی بولی۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

”ہاں..... مجھے اچھی پتا چلا ہے مہرین سے۔ بہت بہت مبارک ہو۔“ وہ بولی۔ نور کے لیے میں ادا کی جھلک کو بسمہ نے فوراً نوٹ کیا۔ بولی۔ ”ویری سوری نور! میں تمہیں دوپہر کو ہی اطلاع دینا چاہ رہی تھی مگر ابا جان اور چھوٹی اسی ساتھ تھیں۔ موقع ہی نہیں ملا۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔ دوپہر کو تمہارا فون نہیں آیا تو میں نے بھی سمجھا کہ فائل آج نہیں ہوگا۔“

”بس اب جلدی سے گھر آ جاؤ۔“ اسٹیلر بیٹ“ کریں گے، آپ بی بی بول بھی آتی ہوئی ہے۔“

”ابا جان کا موڈ کیسا ہے؟“ نور نے پوچھا۔ ”بالکل ٹھیک ہے۔ نہ بھی ہو تو چھوٹی ای بی بی ناموڈ ٹھیک کرنے کے لیے۔ وہ بھی کہہ رہی تھیں کہ نور اور مہرین کو بلا لو۔“

اسی دوران میں رابطہ منقطع ہو گیا۔ بہر حال ضروری بات ہو گئی تھی۔ نور کو امید تھی کہ ابھی پچھو یا چھوٹی ای میں سے کوئی آئے گا اور نور کو اپنے ساتھ لے جائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ رات گزر گئی، اگلا روز بھی گزر گیا۔ اگلے روز شام کو تاپا ابا گھر آئے تو انہوں نے نور کو بتایا۔ ”بھئی آج دعوت پر چلنا ہے۔“

”کہاں؟“ نور نے پوچھا۔ ”تمہارے گھر اور کہاں؟ بسمہ کی کامیابی پر تمہارے ابا جان نے کافی بڑا فنکشن کر ڈالا ہے۔ پاس کے سارے رشتے دار آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے جہاں بسمہ کے رشتے کی بات ہوئی ہے، وہ لوگ بھی آئیں گے۔“

”مہرین تو کسی نے نہیں بتایا۔“ مہرین نے کہا۔ ”چلو اب میں جو بتا رہا ہوں، تیار ہو جاؤ۔ نو بجے تک پہنچنا ہے۔“

نور کو سینے میں جپن سی محسوس ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یوں لگا کہ ابا جان کی طرف سے بسمہ کی کامیابی پر خوشی کا یہ غیر معمولی اظہار اسے دکھانے کے لیے بھی ہے۔ جیسے وہ اسے بتانا چاہتے ہوں اور تاپا ابا کو بھی بتانا چاہتے ہوں کہ یہ ہوتی ہے کامیابی اور یوں ملتا ہے والدین کی فرمانبرداری کا صلہ۔ یہ بات نہیں تھی کہ نور اپنی بہن کی کامیابی پر خوش نہیں تھی۔ اس کی کامیابی کا سن کر اس کے دل کی اتھاہ گہرائی سے خوشی کے سوتے پھوٹے تھے مگر ابا جان اور دیگر اہل خانہ کے رویے نے اسے تھوڑا سا افسردہ کیا تھا۔

تقریب میں کافی مہمان تھے۔ بسمہ کے ہونے والے سرالہ بھی آئے تھے۔ باقاعدہ ٹیک کا گیا اور بسمہ کی کامیابی کو سلیپر بیٹ کیا گیا۔ بسمہ کے متوقع سرالہوں سے ابھی تک نور کی باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک انگل نے نور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بیٹی کون ہے؟“

داوی نے کہا۔ ”چھوٹی پوتی ہے میری۔ پچھلی دفعہ کہیں گئی ہوئی تھی، آپ سے نہیں ملی ہوئی۔“

شکست کی فتح

”اچھا یہ وہی ہیں جو ریس وغیرہ میں بھی حصہ لیتی ہیں۔“ انکل نے اپنی نیم سفید ریش میں انگلیاں چلا کر ذرا چبھتے لہجے میں کہا۔

”ایک مرتبہ..... شاید مگر بھی گئی تھیں، تصویریں وغیرہ آئی تھیں۔“ ایک لڑکی بے ساختہ بول اٹھی۔

تاپا ابا نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کو بس گھر لانا یاد رہ گیا، کچھ اور یاد نہیں آیا۔ یہ صوبائی اور قومی سطح کے مقابلوں میں کئی بار وکٹری اسٹینڈنگ پہنچ چکی ہے۔ اس کا کرا ایاورڈز اور ٹرائفوں سے بھرا ہوا ہے۔“

بسمہ کے ہونے والے دیور نے کہا۔ ”دراصل انکل! کرکٹ کا کھیل باقی سب کھیلوں کو کھاتا گیا ہے، ان بے چارے ہاکی والوں کو ہی دیکھ لیں۔ قومی ٹیم میں آ کر ریٹائرڈ بھی ہو جاتے ہیں لیکن ہم انہیں شکلوں سے نہیں پہچانتے۔ کچھ تو نام بھی معلوم نہیں ہوتے اور جب ہاکی جیسے قومی کھیل کا یہ حال ہے تو باقیوں کا کیا پوچھنا۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ تاپا ابا نے دفاع کیا۔ ”بے شک کرکٹ بہت حادی ہو چکی ہے مگر دیگر کھیلوں کے پرستار بھی موجود ہیں۔“

”چلیں جی۔ آپ کہتے ہیں تو ہم مان لیتے ہیں۔ دیے بھی لڑکی والوں سے ہمارا بحث کرنا تو جتنا ہی نہیں ہے۔“ بسمہ کے ہونے والے سر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

نور کو یہاں بہت بے چینی محسوس ہو رہی تھی، وہ اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید اس کا اٹھنا ہی بہتر تھا کیونکہ ابا جان کو بھی اس کی موجودگی زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے نئے رشتے داروں سے اسے اور اس کے شوق کو چھپانا چاہتے ہیں۔

وہ دیر تک بسمہ کے پاس رہتا جا رہی تھی لیکن پتا نہیں کیوں کھانا کھائے بغیر ہی واپس تاپا ابا کے گھر آ گئی۔

تاپا ابا کو ساری صورت حال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ بے شک بسمہ نے اہم کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کامیابی کو جس طرح سلیپر بیٹ کیا گیا تھا، اس میں ایک طرح کی مسابقت بھی شامل تھی۔ تاپا ابا کو اس بات پر بھی رنج تھا کہ اشفاق نے اس گیت ٹوکیدر کے سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا تھا اور ان لوگوں کو بالکل آخر وقت میں اطلاع دی تھی۔ اس کا جواب دینے کا موقع بھی تاپا ابا کو جلد ہی مل گیا۔

مہرین فریو تھرائی کے دوسرے سال میں تھی، اس نے فریو تھرائی میں نئے رجحانات اور اسپورٹس میں ان کے

اطلاق کے موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون نہ صرف پاکستان میں بلکہ انگلینڈ کے ایک اچھے میڈیکل میگزین میں بھی شائع ہوا اور اسے طبی حلقوں میں پذیرائی ملی۔ انگلش جریڈے کی طرف سے مہرین کو معقول معاوضہ اور تعریفی سرٹیفکیٹ بھی موصول ہوا۔ تاہم اس نے بھی نامعقول اشفاق کو جواب دینے کے لیے فوراً ایک تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ یہ تقریب بھی گھر میں ہوئی اور اس میں کافی مہمان شریک ہوئے۔ اپنی دونوں بہنوں کی کامیابی پر نور دل کی گہرائی سے خوش تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ دونوں تقاریب اس کے لیے بوجھل ثابت ہوئیں۔ اس نے خود کو بالکل سائنڈ لائن پر محسوس کیا۔ اب بھی ابھی اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید اس نے واقعی اپنے لیے ایک غلط لائن منتخب کر لی تھی۔ یہ اس کا میدان ہی نہیں تھا بلکہ پھر میدان انہی تھا لیکن وہ درست طور پر اس میں داخل نہیں ہوئی تھی، جب وہ داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ایک بدعا بھی اور یہ بدعا کسی اور نے نہیں اس کے والد نے دی تھی۔

دو تین روز بعد جب نور ایف اے ایس میں پریکٹس کے بعد گھر واپس آئی تو اسے ایک اور دھچکا لگا، ایک لیٹر اس کا منتظر تھا۔ اس شکایتی لیٹر میں بڑے محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے نور کو نوکری سے جواب دے دیا گیا تھا۔ اسے ہمت نہیں ہوئی کہ تاپا با کو بتاتی تاہم اس نے مہرین کو بتا دیا۔ ”یہ سراسر نا انصافی ہے۔“ مہرین نے تڑخ کر کہا۔ ”مجھے شک ہے کہ اس سلسلے میں بھی فساد کی کارروائی ہو رہی ہے۔“

”نہیں بھئی، ہمیں ہر معاملے میں ان کا ہاتھ نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔“

”تو پھر اور کیا وجہ ہو سکتی ہے نور! تم اب فٹ ہو، باقاعدگی سے رنگ بھی کر رہی ہو۔ میڈم فرحانہ کبھی نہیں کہتمہاری یہی روئیں رہے تو ہم دو تین ماہ میں پہلے والی فارم حاصل کر سکتی ہو۔“

وہ بے دم کی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی اور جوتے اتار کر دور پھینک دیے۔ بال سینے ہوئے بولی۔ ”بھئی مجھے تو لگتا ہے کہ میں کسی اور سے نہیں اپنی قسمت سے لڑ رہی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ مہرین جواب میں کچھ کہتی تاپا با کی آواز آئی۔ ”کہاں ہو لڑکیو! میں ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔“

نور نے جلدی سے کہا۔ ”تاپا با کو جواب کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔“

مہرین نے اثبات میں سر ہلایا۔

تاپا با کے ہاتھوں میں کچھ کپڑے تھے جو وہ درزی سے لے کر آئے تھے۔ یہ نور اور مہرین کے دودھ سوٹ تھے جو انہوں نے امانالے کے میلے پر لے کر جانے تھے۔ ایک زرق برق سوٹ تائی ای کا بھی تھا۔ وہ ہمیشہ سے خوش لباس تھیں اور دادی اماں کے طعنے ان کی خوش لباسی پر بھی کوئی منفی اثر نہیں ڈال سکے تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی (پڑھی لکھی ہونے کے باوجود) امانالے کے میلے کا شدت سے انتظار کرتی تھیں۔

تاپا با نے کہا۔ ”پرسوں صبح سویرے رونا لگی ہے، جو کام نمٹائے ہیں آج ٹنٹالو۔ میں ذرا گاڑی کا تیل فلٹر بدلوانے جا رہا ہوں۔“

وہ چلے گئے۔ نور ای طرح خاموش بیٹھی رہی۔ مہرین نے بے لکھی سے اس کی گود میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”باجی جان! موڈ ٹھیک کریں اپنا زندگی میں اونچ نیچ چلتی رہتی ہے کبھی کے دن بڑے بھی کی راتیں۔ سب اچھا ہو جائے گا، آپ بس تیاری فرمائیں۔“

”پتا نہیں کیوں دل بچھ سا گیا ہے مہرین۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تیاری فرمائیں۔ چند دن کے لیے آب و ہوا تبدیل ہوگی، ماحول تبدیل ہوگا تو جناب کے دماغ میں جھاڑ پھڑے گا اور کافی کچرا اٹھانکل جائے گا۔“

وہ دیر تک نور کو قائل کرتی رہی اور آخر کافی حد تک کامیاب ہوئی، یقیناً ابا جان بھی چارہ تھے اور یہ آس ہمیشہ نور کے دل میں موجود رہتی تھی کہ شاید ابا جان کے قریب رہنے سے کسی وقت کوئی ایسا موقع بھی مل جائے جو ان کی دوریاں ختم کر دے۔ انا اور بیگم کی وہ بلند دیوار گر جائے جو ان دونوں کے درمیان جامل ہو چکی تھی۔

اگلے روز نور اور مہرین بھی دیگر لڑکیوں کے ساتھ ریوگی کی تیاری میں لگ گئیں۔ نور اور مہرین نہیں جانتی تھیں..... بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس مرتبہ ان کا یہ سفر کتنا تھلکہ خیز ثابت ہونے والا ہے۔ کچھ حالات ”ماحول کے ہم رنگ سانپوں“ کی طرح ہوتے ہیں، مدتوں گھات لگائے خاموش پڑے رہتے ہیں۔ ان کے اندر ہر پتہ تار ہوتا ہے۔ وہ اپنے شکار کا انتظار کرتے رہتے ہیں..... اور آخر جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ سانپ موجود تھے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔

☆☆☆

امانالے کا میلا تو خوشی کا باعث ہوتا ہی تھا۔ اس کی

شکست کی فتح

بہت سے شامانے لگ چکے تھے۔ کچھ لگائے جا رہے تھے۔ جھولوں کی تعصیب ہو چکی تھی۔ سرس اور تھیر کی تڑپیں وائرلش کا کام تیزی سے جاری تھا۔ مٹائیوں سموسوں اور کھانوں کی جالی پچانی خوشبودار سی ان سب کے نکتوں میں مٹھنے لگی۔ گاؤں میں بھی سب کو معلوم ہو گیا کہ مہرا گھرانے کے لوگ بھی پہنچ چکے ہیں۔ اہل دیہہ کے جوش و خروش میں اضافہ ہوا۔

گاؤں والی رہائش گاہ تو اب مکمل طور پر فروخت ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کا قیام اس پرانی حویلی میں تھا جو گاؤں سے کچھ فاصلے پر بارشی نالے کے کنارے واقع تھی۔ دریا بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ حویلی تک جانے کے لیے ایک نیم پنڈر رست بنانا پڑا تھا۔ اشفاق مہرا اور خلیل مہرا کی آمد سے پہلے ہی اس حویلی کو بالکل تیار کر دیا گیا تھا۔ رنگ و روغن وہاں تھا۔ لائن اور درختوں کی تراش خراش کی گئی تھی۔ کچن کا سامان بھر گیا تھا اور دیگر ضروریات فراہم کی گئی تھیں۔ موراں والی سے آگے ایک زمیندار کے ڈیرے تک ٹیلیفون کی لائن آ چکی تھی۔ وہاں سے آگے قریب ایک کلویٹر تک خلیل مہرا نے اپنے خرچے پر فون لائن کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس مرتبہ حویلی میں جزیئر کی سہولت بھی مہیا تھی۔ مہرا فیملی کے پرانے ملازم اور ملازمین بھی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے حویلی میں موجود تھے اور خدمت کے لیے کمر بستہ نظر آتے تھے۔

نور کے تاپا ابا خلیل مہرا نے پرانے ملازم فدا حسین سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے اس دفعہ چودھری طفرل سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

فدا حسین بولا۔ ”شاید آپ کو پتا نہیں چلا، پچھلی جمعرات چودھری صاحب کی والدہ فوت ہو گئی ہے۔“

”انا اللہ وانا الیہ راجعون۔“ خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے ایک ساتھ کہا۔ پھر خلیل مہرا ڈرا برہی سے بولے۔ ”فدا حسین! آخر لوگوں کو کسی طرح اطلاع تو کرنی چاہیے تھی۔“

”جی میں نے اپنے پتر کو پھیلایا تھا تا کہ آپ کو فون کر سکے مگر آپ کا فون ملا ہی نہیں۔ وہ خود لاہور جا کر آپ کو بتا دیتا پھر ہڑتال تھی۔ پھیا جام تھا۔ صبح چار بجے وہ فوت ہوئی۔ پٹکی (ظہر) کے بعد جنازہ بھی ہو گیا۔“

”اوہو۔ ہمیں افسوس کے لیے جانا چاہیے۔“ نور کے ابا اشفاق مہرا نے کہا اور تھکاوٹ کے باوجود دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔

..... کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ٹویونا کار پر سوار تین

تیاریاں بھی خوشی و شادمانی کے زمرے میں آتی تھیں..... تیاری مکمل تھی اور اب سفر پریش تھا۔ ایک اسٹیشن وین اور تین گاڑیاں لاہور سے کمرات کی طرف روانہ ہو رہی تھیں۔ شریفل، عثمان، مہرین اور نور اسٹیشن وین میں تھے۔ ابا جان کو یہ بات اچھی تو نہیں لگی تھی مگر مہرین، بسم کو کھینچ کر اسٹیشن وین میں لے آئی تھی۔ اس نے آپی بتول کو بھی آنے کا کہا تھا مگر وہ ابا جان اور چھوٹی ابی زلفت کے ساتھ ٹویونا گاڑی میں رہی تھیں۔ خوشی کے موقع پر نور بھی سب میں مکمل مل جایا کرتی تھی مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود خود کو دوسروں میں کس نہیں کر پاری تھی۔ پتا نہیں کیوں بار بار اس کا دھیان چار پانچ درجہ پہلے دلے دھننے کی طرف چلا جاتا تھا۔ آخر وہ ذوالقرنین سے بات کیوں نہیں کر پاتی تھی؟ کیوں اس کی غلط فہمیاں دور کرنے میں ناکام رہی تھی؟ کیا وہ واقعی غلط فہمیاں ہی تھیں؟ یہ سوال اسے اندر سے لرزاتا تھا۔ وہ جس شخص کو پسند ہی نہیں کرتی تھی اس سے دو ٹوک بات کرنے میں کیا چیز مانع آتی تھی؟ اسے جیسے اپنی ہی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

اس کی پڑمردگی کی دوسری وجہ یقیناً یہ بھی تھی کہ اس کی ڈیپارٹمنٹل جاب ختم ہو گئی تھی اور اپنی پریکٹس وغیرہ جاری رکھنے کے لیے اس پر اضانی پڑ بھڑنے والا تھا۔ یہی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے شاید وہ مستقبل میں پوری تبدیلی کے ساتھ رنگ پریکٹس جاری ہی نہ رکھ سکے۔ ان باتوں کے علاوہ ابا جان کا رد بھی اسے مسلسل پھینچا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں معافی یا رحم کی کوئی رفق اسے نظر نہیں آتی تھی۔

دادی اماں علیحدہ گاڑی میں پچھو جا رہے اور خالدہ عرفیہ کے ساتھ موجود تھیں۔ یہ گاڑی ماموں مراد ڈرائیو کر رہے تھے۔ دادی اماں پچھلی نشست پر نیچے کے سہارے نیم دروازے میں۔ ان کی وادوں والا شا پر بھی ان کے سر ہانے رکھا تھا اور پچھو اس شا پر کی حفاظت پر مامور تھیں۔

سفر فی خوشی کننا۔ گجرات سے آگے پھالہ کے نواح میں دو پہر کا کھانا ایک آب جو کے کنارے کھایا گیا۔ سردیوں کی سنہری دھوپ، ہلکی ہوا میں دور تک جھومتی ہوئی فصلیں اور درختوں کے تالیاں بجاتے ہوئے چتے۔ یہ ان لوگوں کا پچھڑا ہوا ماحول تھا اور اس ماحول میں آکر وہ سب عجیب سی آسودگی محسوس کرتے تھے۔

موراں والی گاؤں پہنچتے پہنچتے انہیں شام ہو گئی۔ میلے کے آثار گاؤں کے نواح سے ہی شروع ہو جاتے تھے۔

لوڈ شیڈنگ

ایک انگریز نے پاکستان آکر اردو سیکھی۔ جب واپس گیا تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا بولنا سیکھا تو اس نے کہا۔ ”لائٹ چلی گئی ہے۔ لائٹ آگئی ہے۔ لائٹ جانے والی ہے۔ لائٹ آنے والی ہے۔ لائٹ نہیں آئی۔ لائٹ نہیں گئی۔ لائٹ جا بھی سکتی ہے۔ لائٹ آ بھی سکتی ہے۔ لائٹ ڈم آ رہی ہے۔ لائٹ تیز آ رہی ہے۔ لائٹ آ کیوں نہیں رہی۔ لائٹ جا کیوں نہیں رہی۔ لائٹ ابھی تو آئی تھی لو پھر چلی گئی۔“

مرسلہ: کاشف قیوم، کراچی

طریقہ ہے۔ جس طرح مردوں کی کبڑی ہوتی ہے، اسی طرح ہم عورتوں کی بھی کبڑی رکھ لیں۔“

سب ہنسنے لگیں۔۔۔۔۔ نور کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر اپنی ماں کی عمر کی عورت کو جواب دینا اس نے مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کر اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔۔۔۔۔ اور بات صرف اس ایک عورت کی ہی نہیں تھی۔ یہاں بیشتر عورتیں اسے تنقیدی نظر سے ہی دیکھتی تھیں۔ خاص طور سے بڑی عمر کی عورتوں کی نگاہوں میں تو اس کے لیے واضح بیگانگی اور نفرت نظر آتی تھی۔ یہ بات ان کے لیے کسی طور پسندیدہ نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک لڑکی مردوں کی طرح بھاگ دوڑ کرے اور مقابلوں میں حصہ لے۔۔۔۔۔ اور لڑکی بھی کوئی عام نہیں، مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی۔۔۔۔۔ گھر کے وسیع محن میں موجودہ مالک مکان حاجی اکرام صاحب کے بچے جھنڈیاں وغیرہ تیار کر رہے تھے۔ وہ برآمدے میں سے ٹھڑی۔ ایک کمرے سے ابا جان کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ کمرے میں اکرام صاحب کے اہل خانہ موجود تھے اور وہ ان میں بیٹھے ہنسہ کی باتیں کر رہے تھے۔ اس کا سیاہی کا ذکر ہو رہا تھا جو ہنسہ کو چند دن پہلے تقریری مقابلوں میں حاصل ہوئی تھی۔ اس بارے میں بات کرتے ہوئے ابا جان کے لب و لہجے میں ایک سرشاری سی بھر جاتی تھی۔

نور ایک طویل سانس لیتی ہوئی صحن کی طرف بڑھی اور اسے عبور کر کے ڈیوڑھی کی طرف آ گئی۔ یہ سب وہی درو دیار تھے جن میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ چپے چپے پر

میں مکمل امن و امان کی فضا قائم ہو جاتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں اور بچے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر یہ منظر دیکھتے تھے۔ مہرا گھرانے کی عورتیں بھی یہ رسم دیکھنے کے لیے، تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اپنی پرانی حویلی سے گاؤں میں آ گئی تھیں۔ وہ اپنے فروخت شدہ مہر کی بچت پر موجود تھیں اور مزار کے سامنے اہل دیہہ کی طویل قطار دیکھ رہی تھیں۔ جہازی ساز کی سات بڑی بڑی چار پائیاں تھیں جن پر ہر طرح کا لائسنس اسلحہ ڈھیر کیا جا رہا تھا۔ باوردی پولیس اہلکار موجود تھے اور اسلحہ جمع کرانے والوں کو ریدنا کو پین دے رہے تھے۔ اسلحے سے بھی کوپن منسلک کیے جا رہے تھے۔ قطار میں سے ایک شخص آگے بڑھتا، اپنا ہتھیار جمع کراتا، کوپن حاصل کرتا اور پھر مزار کی طرف رخ کر کے ادب سے سلام کرتا۔ اس کے بعد اگلے قدموں پیچھے پلٹ جاتا۔ اس عمل کے مکمل ہونے تک قریباً ساتوں چار پائیاں مختلف اقسام کے پھولے بڑے آتشیں اسلحے سے لدی گئیں۔ دوسرا مرحلہ رات کو تھا۔ اس میں نا جائز اسلحہ بھی اس قدیم کھڑی میں جمع ہو جاتا تھا جہاں تا تک چنڈی اینٹوں کی دیواروں میں بے شمار خانے بنے ہوئے تھے اور تالے لگے ہوئے تھے۔

یہ رسم اور اس طرح کی ساری رسمیں اہل علاقہ کے دلوں میں گھر گھر چکی تھیں۔ مثلاً آج ہی کے روز شام کے بعد گھروں میں ڈھولک بجانے اور گیت گانے کی رسم بھی ادا ہوتی تھی۔ یہ ترجیح سے ملتی چلتی تقریب تھی۔ آنگلیٹیاں دھکا کی جاتی تھیں، لڑ اور باداموں والا حلوا بنا یا جاتا تھا۔ علاقائی طور پر ایک آدھ رنگین چرخا بھی پاس رکھ لیا جاتا تھا اور سہائیں اور کنواریاں ملن اور جدائی کے گیت گاتی تھیں۔

بتول نے کہا۔ ”نور! آج رات تو یہیں رہیں گے۔

مزہ آنے گا۔“

نور بولی۔ ”آبی۔۔۔۔۔ آپ کو پتا بھی ہے، مجھے یہ ڈھولک شوک اچھی نہیں لگتی۔“

جھوٹی امی زلفت نے کہا۔ ”تو مت ڈھولک بجانا تم۔ سن تو سکتی ہوتا۔“

”نہیں جھوٹی امی! میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ میں ابا جان کے ساتھ حویلی چلی جاؤں گی۔ صبح پھر آ جاؤں گی۔“ ایک عورت نے ہنسہ سے مخاطب ہو کر رات کیسے لہجے میں کہا۔ ”ہنسہ! تمہاری یہ بہن شروع سے ہی دکھ رہے تھیں۔ اس کو تو اپنے ساتھ شامل کرنے کا ایک ہی

تو لوگوں کو پتا ہے اور کچھ کا پتا بھی نہیں۔ بہر حال اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔“

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے کھنکھارنے اور بولنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے پہچان لیا۔ یہ چودھری طنزل کے بڑے بیٹے ابدال ہی کی آواز تھی۔ وہ شاید کسی ملازم سے بات کر رہا تھا اور طنزل نے کہا تھا کہ ابدال اور وارث گھر میں نہیں ہیں۔

شاید ابدال وغیرہ ان سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ چودھری طنزل کا رویہ بھی واضح طور پر بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس رویت کی وجہ کچھ میں نہیں آئی۔ شاید اس میں والدہ کی موت کا دکھ بھی شامل تھا۔ یا پھر یہ بات کہ وہ لوگ آخری رسومات میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

حویلی واپس آ کر خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے اپنی بیمار والدہ کو ان کی پرانی سینیکی وڈی اماں کی رحلت کی خبر سنائی۔ وہ کافی دیر کم مہر پھر اپنی اڈھمی سے غم آگئیں صاف کرنے لگیں۔ وہ خود ان کے گھر جانا چاہتی تھیں مگر مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ”ماں جی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سفر کی تھکاوٹ بھی ہے۔ کل یا پرسوں کسی وقت چلے جائیں گے۔“

دو دن بعد وڈی اماں کا دسواں تھا۔ دسویں تک تو میلے کی تیاری کچھ ست رہی مگر پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ مہرا نہیں جاتا اور اکثر اوقات سوگ کی کیفیت میں بھی لوگ خوشی کے مواقع عمل طور پر ضائع نہیں ہونے دیتے اور پھر وڈی اماں تو ویسے بھی چنانچہ سال سے اوپر کی ہو کر گزری تھی۔ اس کے جنازے پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ پنجابی میں اسے وڈا کرنا کہتے ہیں۔ بعض برادر یوں میں تو ایسے موقعوں پر باجے تک بجائے جاتے ہیں اور خیر خیرات کے علاوہ شیری وغیرہ بھی پائی جاتی ہے۔ خیر یہاں باجے تو نہیں بجائے گئے تھے مگر ٹیٹھے چاول کی دیکھیں ہلکی تھیں اور کچھ دیگر رسومات بھی ادا ہوئی تھیں۔

دسویں کے بعد امان والے کا میلہ پورے جو بن پر آ گیا۔ وہ ساری مصروفیات اور تقریبات شروع ہو گئیں جو اس میلے کا خاصہ تھیں۔ بارشی تالے کے ساتھ ساتھ موسیقیوں کی منڈی لگ گئی۔ میلے کی دکانیں بچے سنورنے لگیں۔ سرکس اور تھیمز کی رونقوں میں اضافہ ہو گیا۔ جھولوں کی گردش بڑھ گئی۔ اور پھر وہ دن آیا جب قدیم رسم کے مطابق علاقے کے لوگ اپنے اپنے ہتھیار رضا کارانہ طور پر مزار کے سامنے جمع کر دیتے تھے۔ اور سات دن کے لیے قرب و جوار

کلومیٹر دور گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ سیدھے چودھری طنزل کی حویلی میں پہنچے۔ میلے کے دنوں میں چودھری طنزل کی حویلی میں مسلسل چراغاں کیا جاتا تھا مگر اس بار صورت حال مختلف تھی۔

چودھری طنزل کے ملازموں نے خلیل مہرا اور مولوی اشفاق مہرا کو حویلی کی وسیع بیٹھک میں بٹھا دیا۔ قریباً دس منٹ بعد چودھری طنزل اندر داخل ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کلف لگے۔ کھڑکھڑاتے ہوئے بادای رنگ کے شلوار قمیض میں تھا۔ سر پر ای رنگ کی طرے دار کپڑی تھی۔

خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے گلے مل کر انفس کا اظہار کیا اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ خلیل مہرا بولے۔ ”اس بات کا بھی بہت انفس ہے کہ ہمیں بروقت اطلاع نہ مل سکے، ورنہ ہر صورت جنازے میں شریک ہوتے۔“

اشفاق مہرا نے کہا۔ ”آپ ہی ہمیں اطلاع کر دیتے۔ چھ سات گھنٹے کا راستہ تھا، ہم پہنچ ہی جاتے۔ ہمیں یہاں پہنچ کر اطلاع ملی ہے۔ ابھی ہم نے ماں جی کو نہیں بتایا۔ ان کو بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ وہ تو یہاں آئی ہی وڈی اماں جی سے ملنے کے لیے تھیں۔“

”چلو جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔ اب تو دعا ہی کی جاسکتی ہے۔“ چودھری طنزل نے قدرے روکے لہجے میں کہا۔

مولوی اشفاق مہرا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ چودھری طنزل اور خلیل مہرا نے بھی اٹھائے۔ دعا کے بعد خلیل مہرا نے چودھری طنزل سے اس کے بیٹوں کے بارے میں پوچھا۔ ”ابدال اور وارث کہاں ہیں؟“

”کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ شاید ڈیرے پر گئے ہیں۔“ چودھری نے مختصر جواب دیا۔

مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ وڈی اماں کی بخشش کرے اور ان کے درجے بلند کرے۔ ہماری والدہ سے ان کی دوستی بڑی گہری تھی اور کوئی طرح کی اونچ نیچ دیکھنے کے باوجود یہ برقرار رہی رہی۔“

چودھری طنزل نے لمبی سانس لی اور عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”ہاں، وڈی اماں نے کئی دکھ بھی سہے پر یہ دوستی نبھائی رہیں۔ کافی احسان ہیں ان کے تم لوگوں پر۔“

چودھری طنزل کے آخری الفاظ نے دونوں بھائیوں کو چونکا یا پھر خلیل مہرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بے شک۔۔۔۔۔ بے شک وہ بڑی مہربان عورت تھیں۔ سب کے لیے مہربان تھیں۔“

چودھری اسی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”کچھ احسانوں کا

بادی نقش تھیں مگر اب یہ سب کچھ کسی اور کی ملکیت تھا۔ مہرا
نیل کی حیثیت یہاں ایک دو دن کے مہمان جیسی تھی۔ اس
نے اس کا ردف درست کیا۔ ڈاؤنٹن اچی طرح لیٹی اور باہر
آگئی۔ سامنے ہی پرانی کے ڈھیر لگے تھے اور کالی سیاہ
بھینٹیں کھڑی میں منہ مار رہی تھیں۔ تیا زاد عثمان گاڑی
کے پاس کھڑا بچپن کے کسی ہم جو لی سے گپ شپ کر رہا تھا۔
نور کو دیکھ کر وہ چوٹا کرا پاس آگیا۔ ”کیا بات ہے نور؟“
”عثمان بھائی! طبیعت ذرا بوجھل سی ہو رہی ہے۔
پلیز مجھے جلد چھوڑ آئیں۔“

”لیکن آج تو یہاں ڈھولک کا پروگرام تھا۔“
”نہیں بھائی۔ یہ نہ ہو پیار پڑ جاؤں۔ آرام کر لوں
گی تو کل تک خشک ہوجاؤں گی۔“

”کسی دوا وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟“ عثمان نے
اپنا ت سے پوچھا۔ نور نے لٹی میں جواب دیا۔
وہ عثمان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اور جلدی چل دی۔
دھوپ لگی ہوئی تھی مگر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شام کے
سامنے لے ہوتا شروع ہو گئے تھے۔ وہ میلے کی رونق کے
درمیان سے ہو کر گزرے۔ شامیانوں اور عارضی دکانوں
کے آس پاس لوگوں کا جھوم تھا۔ جگہ جگہ پنخانی میوزک بھی
بے ہو رہا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں ہلکا ہلکا کر رہی تھیں۔
ایک ایک وہ چوٹی۔ اسے ایک جانا پچانا چہرہ نظر آیا۔ ہاں، یہ
وہی تھا۔۔۔۔۔۔ یہ وہی تھا۔ اس کے سر شاید پٹی بندھی ہوئی
تھی۔ اس نے کالی گرم چادر کی بکھل مار رکھی تھی۔ وہ گاڑی کی
طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ شاید ایک سیکنڈ کے لیے ان دونوں کی
نگاہیں بھی ملی تھیں۔ پھر گاڑی آگے بڑھ گئی اور اس کی شکل
اوجھل ہوئی۔ شبے کی منگناش نہیں تھی۔ یہ ذوالقرنین ہی تھا۔
اس کی ایک جھلک کل شام بھی اس نے حاجی اکرام صاحب
کے گھر سے باہر دیکھی تھی۔ اس وقت وہ مین دروازے پر
کھڑا ابا جان اور تیا جان سے علیک ملیک کر رہا تھا۔ تب نور
کی طرف اس کی پشت تھی۔ نور کو بس خشک سا ہوا تھا کہ یہ
ذوالقرنین ہے لیکن آج تو اس نے اسے صاف دیکھا تھا۔
عثمان پوری توجہ سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے پتا
ہی نہیں چلا کہ نور کسی کو دیکھ کر بری طرح چوٹی ہے۔ نور کا دل
تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ کیا عام لوگوں
کی طرح صرف میلاد کیلئے آیا تھا؟ یا پھر عام لوگوں کی طرح
نہیں آیا تھا؟

حویلی کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ کر عثمان نے نور کو
ڈراپ کر دیا۔ وہ بولی۔ ”عثمان بھائی! تائی کی کویتا دینا کہ

میں یہاں آگئی ہوں۔“

”اوکے۔“ اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔

ایک کمرے سے دادی اماں کی ہائے ہائے سنائی
دے رہی تھی۔ وہ کسی وقت تکلف میں ہوتی تھیں اور کسی
وقت نہیں بھی ہوتی تھیں مگر عادتاً ہائے ہائے کرتی رہتی تھیں۔
اس وقت بھی پچھو جا رہا اور ایک ملا زمانہ کے پاس موجود
تھیں اور ان کی کچی چابی کر رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نور بستر پر گر گئی اور
ذوالقرنین کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیا وہ اکیلا تھا یا کوئی
اور بھی اس کے ساتھ تھا؟ یوں تو شرنیل اور عثمان کے کچھ
دوست بھی لاہور سے ملنا دیکھنے کے لیے آئے تھے اور
وہ بھی لاہور سے لوگ یہاں پہنچتے تھے مگر ذوالقرنین کا
یہاں نظر آنا نور کے لیے اہم اور پریشان کن تھا۔ اس کے
ماتھے پر کوئی چوٹ وغیرہ بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ
وہ پچھو یا شرنیل سے اس بارے میں کچھ پوچھے لیکن ہمت
نہیں پڑی۔ خیالوں میں الجھی ہوئی وہ سوئی۔

یوں تو لاہور میں اچھی سے اچھی چوڑیاں اور مہندی
وغیرہ مل جاتی تھی مگر یہ بھی میلے کا ”کریر“ تھا کہ دوسرے
دن شام کے وقت عورتیں میلے سے چوڑیاں، مہندی اور
خوشبو وغیرہ خریدتی تھیں۔ مہرین اور دو ماموں زاد بہنیں نور
کو بھی پہنچ کر اس شاپنگ کے لیے لے گئیں۔

نور نے ابھی تک مہرین کو بھی دل والے واقفے کے
بارے میں نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی مہرین نے کوئی ایسی بات کی
تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ یہاں ذوالقرنین کی موجودگی سے
آگاہ ہے۔ لڑکیاں ایک ریزمی والے کے پاس کھڑی گول
گپے کھا رہی تھیں جب اچانک مہرین نے اس کے بازو پر
چٹکی لی اور سرگوشی میں بولی۔ ”وہ دایں طرف دیکھو
..... کراکری کی دکان کے پاس۔“

نور نے اس رخ پر دیکھا اور اس کے جسم پر چوڑیاں
سی رنگ لگیں۔ وہاں لوگوں کے درمیان ذوالقرنین کی
جھلک نظر آئی۔ وہ حسب معمول شلوار قمیض میں تھا اور ایک
موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خدیجہ کا بھائی ہے نا یہ؟“ مہرین نے تیز سرگوشی کی۔
نور نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ ذات شریف یہاں کیسے؟“ مہرین بولی۔
ذوالقرنین کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس نے شاید
اپنی چوٹ چھپانے کے لیے اور گردوغبار سے بچنے کے لیے
سر پر ڈبی دار درمال لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جس موٹر سائیکل کو

شکست کی فتح

نکلس مار رہا تھا، وہ ایک عمر رسیدہ شخص کی تھی جو پاس ہی کھڑا
تھا۔ چند سیکنڈ بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی۔ عمر رسیدہ شخص
خوش ہو گیا..... اور ذوالقرنین کے لیے غالباً شکر ہے کے
الفاظ استعمال کیے۔

موٹر سائیکل آگے نکل گئی۔ ذوالقرنین کے دونوں
ہاتھ سیاہ ہو رہے تھے۔ شاید کچھ دیر پہلے وہ موٹر سائیکل کے
پلگ وغیرہ سے پچھیز چھا کر تار رہا تھا۔ ہاتھ دھونے کے لیے
اس نے ارد گرد دیکھا اور پھر گول گپے والی ریزمی کی طرف
بڑھا، جہاں بائیں میں پانی نظر آ رہا تھا اور یہی وقت تھا جب
اس کی نگاہ نور وغیرہ پر پڑی۔ درمیان فیصلہ نہیں بچیں قدم
کے قریب تھا۔ پھر بھی ذوالقرنین نے انہیں پہچان لیا۔ وہ
ریزمی کی طرف آتے آتے ذرا ٹھٹکا اور پھر رخ پھیر کر
ایک شامیانے کی طرف بڑھ گیا جہاں چائے خانے کے باہر
ٹانکا نظر آ رہا تھا۔ اس نے وہاں جا کر ہاتھ دھوئے۔ اس عمل
کے دوران میں اس نے ایک دوبار اپنی نظروں سے نور اور
مہرین کی طرف بھی دیکھا۔

مہرین نے کہا۔ ”یہ اصلاح معاشرہ یہاں بھی موجود ہے۔“
”ہاں۔ مجھے بھی کل خشک ہوا تھا حویلی جاتے
ہوئے۔“ نور نے پوری وضاحت نہیں کی۔
”بھئی! امنا لے کی کشش لوگوں کو دور سے کھینچ
لاتی ہے۔ پر تپنا نہیں یہ امنا لے کی کشش ہے بھی یا نہیں۔“
مہرین نے متنی خیر لکھ کر کہا۔

وہ اب ہاتھ دھو کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور قدرے
دراز قد ہونے کی وجہ سے جھوم میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔
شانے کشادہ اور سر اور ڈاؤن می ہاں ہمارے تھے۔ چائے
خانے والے لڑکے نے اسے ہاتھ پونچھنے کے لیے ایک تولیا
رومال دے دیا۔ وہ شکرے ادا کرنے کے بعد ہاتھ پونچھنے
لگا۔ نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں لیکن تاثرات سے صاف پتا
چلتا تھا کہ وہ نور اور مہرین کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس
کر رہا ہے۔

نور نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گول گپا داپس تقالی میں رکھ
دیا تھا۔ چہرے پر اس کا ردف درست کرتے ہوئے اس نے
مہرین سے سرگوشی کی۔ ”چلو چلیں۔“
”بھئی! یہ دو دین گول گپے مجھے بدعا عین دیں گے۔
انہیں تو نگل لو۔“ اس نے پورا گول گپا منہ میں ڈالنے سے
پہلے کہا۔

نور تھوڑا سا رخ پھیر کر کھڑی ہوئی۔ اسی دوران میں
کہیں پاس ہی موجود سرسک کا شیر اپنے بچہ بچے میں

دھاڑنے لگا۔ بہت سے لوگ اس کی دھاڑ دیکھنے اور سننے
کے لیے سرسک کے شامیانوں کی طرف بھاگے۔ نور نے
دیکھا کہ ایک نوجوان آیا اور ذوالقرنین کو بھی کھینچتا ہوا سرسک
کی طرف لے گیا۔ ذوالقرنین جیسے جانتا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس
نے جاتے ہوئے دو تین بار مڑ کر نور اور مہرین کی جانب
دیکھا، پھر اسے جھوم نے چھپایا۔

گول گپے کھانے کے بعد روپ کی چند لڑکیاں بھی
شیروں کو دیکھنے کے لیے سرسک کے شامیانوں کی طرف چلی
تھیں مگر نور دیگر لڑکیوں کے ساتھ میلے کے دوسرے حصے کی
طرف روانہ ہو گئی، وہ اپ سیٹ تھی۔

☆☆☆

رات کو مہرین اور نور اپنے اپنے پلنگ پر لیاف
اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ابھی دیکر رہی تھی۔
لائٹ کی ہوئی تھی مگر جزیر کا انتظام موجود تھا۔ کمر کیوں سے
باہر دسمبر کی رات بستہ دھند..... جامن، مالے اور بیری کے
ٹنڈ منڈ رشتوں کو ڈھانے ہوئے تھی۔

مہرین نے کہا۔ ”میں نے پچھو جا رہا سے تھوڑی سی
سن گن لی ہے۔ انہیں بھی پتا نہیں کہ خدیجہ کا بھائی یہاں آیا
ہوا ہے۔ ہاں یہ کہہ رہی تھیں کہ لاہور سے اردو بازار کے تین
چار دوکاندار بھی میلاد کیلئے آئے ہوئے ہیں۔“
”وہ کیوں کر رہا ہے ایسا؟“ نور نے کھوٹی کھوٹی سی
آواز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے کہ وہ خاص تمہارے لیے نہ آیا ہو۔“
”نہیں مہرین۔“ نور نے اپنی ہز جری کی آستینیں
اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو خود کو دھوکے میں رکھنے والی
بات ہے۔“

”کیا تم نے ٹھیک سے دیکھا تھا کہ پرسوں وہ ابا جان
اور چچا جان سے بات کر رہا تھا؟“
”ہاں بھئی۔ یہی تھا لیکن تب مجھے صرف خشک ہوا تھا۔
اگلے روز تصدیق ہوئی۔“

دونوں خاموش ہو گئیں۔ باہر تاریکی میں کہیں کوئی
رات کا برندہ چکارا نور کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ وہ
اسے کچھ نہیں دے سکتی تھی، پھر اس کی آنکھوں میں سوال
کیوں تھے؟ وہ کیوں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا؟
ہوسکتا ہے کہ وہ اتنا برا انسان نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اچھا
انسان ہو لیکن نور کے ذہن میں جیون ساھی کا جوتھوڑا تھا، وہ
اس سے بہت مختلف تھا۔

خاموشی کے وقفے کے بعد وہ دونوں پھر باتیں کرنے

لگیں۔ اس مرتبہ موضوع ابا جان کی ناراضگی تھی، جن کو لڑکیوں کا ڈھونڈنا اور حاجی اکرام صاحب کے گھر رہنا بالکل پسند نہیں آتا تھا۔ اتنے میں دادی جان کی لالچی کی نلک نلک سنا دی پھر انہوں نے لالچی سے ہی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”اوڑکیو! کیا چوں چوں لگا رہی ہے، آدھی رات ہونے والی ہے، سو جاؤ اب۔“

”اچھا وادی۔“ مہرین نے ناگواری سے کہا اور لحاف میں منہ گھسایا۔ ”دس بجے کو آدھی رات کہہ رہی ہیں۔“ وہ بڑبڑائی۔

دادی نے کمرے میں جھانکا۔ دروازے کے پاس ہی نور کے جوگر پڑے تھے۔ انہوں نے لالچی سے ہی انہیں ایک طرف ہٹایا۔ جیسے وہ جوگر نہ ہوں، کوئی پلید بدبودار شے ہو۔ نور پر ایک غلط انداز ڈالی اور بکڑ بکڑولیں۔ ”کہا بھی ہے کہ جلدی سو جایا کرو۔ بند کر دلائٹ۔“

”ابھی کر دیتی ہوں۔“ وائش روم میں جاتا ہے۔“ نور نے کہا۔

”بات مانی ساری زندگی نہیں آئے گی تجھے۔ بات ماننے والی ہوتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ ساری کی ساری ماں پر ہے۔“ ان کی آواز میں زخمی کرنے والی کاٹھی۔ وہ باہر نکل گئیں۔

نور کا دل چاہا کہ وہ چلا کر دادی سے کہے کہ اب تو وہ عرصے سے منوں مٹی کے بچے سوئی ہوئی ہیں۔ وہ اب تو انہیں معاف کر دے مگر اس نے خود پر ضبط کیا اور ایک نہایت طویل، نہایت سنجیدہ سا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بے طرح جلنا شروع ہو گئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ دکھ آمیز جھلاہٹ کے ساتھ انہی اور لائٹ آف کرنے کے بعد مہرین کی طرح لحاف میں منہ گھسایا۔

☆☆☆

اگلے روز موسم ابر آلود تھا۔ رات کو تھوڑے سے چھینٹے بھی پڑے تھے۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خواتین نے طوا پوری، پنوں اور دودھ پتی کا ناشتا کیا۔ نور چکنائی والی خوراک سے ذرا دور ہی رہتی تھی۔ اس نے دو تین سلائس، انڈے اور اورنج جوس سے کام چلایا۔

ابا جان، تایا جان اور ماموں مراد جیسے سویرے ہی گاڑی پر کہیں نکل گئے تھے۔ نور نے محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ پریشان بھی ہیں۔ چودھری طفیل کے گھرانے کی عورتیں بھی کہیں دکھائی نہیں دی تھیں۔ کل چوڑیوں کی خریداری کے موقع پر ابدال کی دو بیٹیاں نظر آئی تھیں مگر

انہوں نے آنکھ نہیں ملائی تھی۔ نور اور مہرین نے اندازہ لگا تھا کہ شاید طفیل گھرانے کے ساتھ کوئی سخت ترش بات ہوئی ہے۔ تائی امی، چھوٹی امی زلفت اور چچو کا جرحہ وغیرہ کا بھی یہی خیال تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد مہرین اس کے سر پر سوار ہو گئی۔ ”چلو بھئی چلیں۔ اس مرتبہ بڑا زبردست آسمانی جھولا آیا ہے۔ مزہ آجائے گا۔“ دور دراز علاقہ نظر آگیا۔ ”مہرین! آج نہیں۔“ طبیعت بالکل بھی نہیں چاہ رہی۔ ”یار چھوڑو۔ دادی جان کی باتوں کو دل سے نہ لگایا کرو۔“ تمہیں تو پتا ہے وہ جیسی ہیں۔“

وہ چپ رہی۔ وہ اسے کیا بتاتی، بات صرف دادی جان ہی کی نہیں تھی، یہاں کون تھا جو اسے اپنات کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ ہر وقت جیسے بے مہر انجینوں کے حصار میں رہتی تھی۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے وہ ان گنت سوالیہ نگاہوں کی چھن اپنے جسم پر محسوس کرتی تھی۔ دیکھو اس لڑکی کو۔۔۔۔۔۔ یہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی ہے۔ یہ بتول اور ہنسہ کی بہن ہے۔ یہ اپنے بڑوں کی نافرمان ہے۔ اسے باپ نے دھتکارا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا کام کرتی ہے جو عورتوں کے لیے باعث ننگ ہے۔

مہرین نے اپنی انگلی سے نور کے پہلو میں پکڑا دیا۔ ”کیا مایوس صورت بنائی ہوئی ہے۔ بھئی، ہم کسی چٹم میں نہیں، میلے پر آئے ہوئے ہیں۔ دو دن بعد اس میلے سے دور ہوں گے اور ہر طرح کے جھیلے سے قریب ہوں گے۔ چلو اٹھو، میں آج تمہیں گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔“ چھوٹی ای بھی آگئیں۔ وہ پہلی مرتبہ اس میلے میں آئی تھیں اور بہت انجوائے کر رہی تھیں۔ اس میلے کی انوکھی رسوں ریتوں نے بھی انہیں متاثر کیا تھا۔

چھوٹی امی اور مہرین کے زور دینے پر وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ براؤن شلوار قمیص کے اوپر اس نے گہری براؤن جرسی پہنی اور لمبی شال کے ساتھ اس کا کراف پہن کر تیار ہو گئی۔ میلے کی گہما گہمی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بارش کے اندیشے کے پیش نظر خیرہ زن لوگوں نے اپنے خیموں پر بڑے بڑے پلاسٹک منڈھ دیے تھے اور دیگر احتیاطی تدابیر کی تھیں۔ کسی قریبی میدان میں آج کشتیوں کے مقابلے بھی ہو رہے تھے تاہم وہ ایونٹ شام کا تھا۔ ابھی تو لوگ دیگر تفریحات سے لطف لے رہے تھے۔ آبی بتول ہنسہ اور مامیوں سمیت مہرا فیملی کی اکثر عورتیں برقعوں میں تھیں۔ جو نہیں تھیں، انہوں نے بھی چہرے حجاب یا نقاب

شکست کی فتح

نگاہ دور نیچے ایک منظر پر پڑی۔ اس نے چودھری طفیل کے چوڑے چٹکے بٹے ابدال کو دیکھا۔ وہ جھیلے شلوار کرتے اور واسٹک میں تھا۔ کندھوں پر چودھریوں کے انداز میں تہ شدہ گرم شال ڈال رکھی تھی۔ (یہ وہی تھا جس کے لیے پہلے آبی بتول اور پھر ہنسہ کا رشتہ مانا گیا تھا) ابدال کے پاس ہی ابا جان کا پرانا ملازم خدا بخش تھا۔ کافی فاصلہ تھا، پھر بھی پتا چل رہا تھا کہ ابدال بڑے سخت لہجے میں خدا بخش سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کسی طرح کی سخت کلائی تھی، پھر دو تین بندے آگے آئے اور انہوں نے صبح صفائی کا کردار ادا کیا۔

”کیا پکڑ ہے؟“ مہرین انہیں سے بولی۔ ”گلتا ہے کہ دو تین دن سے کچھ گڑبڑ ہے۔ کل ماموں مراد بھی بڑے غصے میں نظر آ رہے تھے۔“

”نہیں وہ پرانا معاملہ ہی تو پھر اٹھ کھڑا نہیں ہوا۔“ مہرین نے ذرا شویش سے کہا۔

”یہ تو بڑے ہی بتا سکتے ہیں۔ تم جا کر ابا یا تایا جان سے پوچھنا۔“ اس منظر نے مہرین کا مزہ کر کر دیا تھا۔ اس کا تفریحی موڈ ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گرم شال کو مضبوطی سے اپنے گداز شانوں پر لپیٹ کر بولی۔ ”پتا نہیں کب چلے گا جھولا؟“

”تمہیں تو بلندی اچھی لگ رہی تھی؟“ نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ (دیے وہ بھی پریشان تھی)۔

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر سردی بھی پڑی ہے۔“ ”بلندی اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اردگرد کے منظر اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ بلندی صرف اتنا کرتی ہے کہ ہمیں زیادہ کچھ دکھا دیتی ہے اور تفصیل سے۔“

”اچھا زیادہ فلسفہ نہ بھارو۔ دعا کرو کہ یہ آسمانی چرخا چل پڑے۔ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔“ مہرین نے اپنے مرمریں ہاتھ اور کوٹ کی جیبوں میں تھپتھپتے ہوئے کہا۔ اسی دوران میں جزیئر کی آواز بلند ہوئی اور جھولا حرکت میں آ گیا۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور مینڈ تو اتارے برسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ بھی چلی گئی۔ جزیئر کل سے کام نہیں کر رہا تھا۔ حویلی میں لائٹیں اور ٹیکسٹس روشن کر دیے گئے۔ حویلی سے تقریباً تین کلومیٹر دور موراں والی میں بھی یقیناً میلے کی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ حویلی سے باہر چاروں طرف وہی خاموشی اور یکسانیت تھی جو

میں چھپا رکھے تھے۔ اچانک نور نے محسوس کیا کہ نہ چاہنے کے باوجود اس کی نگاہیں ادھر ادھر پھینک رہی ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ وہ اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟ کیا وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر آئے۔۔۔۔۔۔ یا وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر نہ آئے؟ نہیں، وہ اسے دیکھنے کے لیے تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کیوں دیکھنا چاہے گی؟ وہ شاید لاشعوری طور پر چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے جا چکا ہو۔ اس کا اردگرد نظر نہ آتا ہی نور کے لیے اچھا تھا۔ ہاں اسی لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

سب لڑکیاں آسمانی جھولے پر بیٹھیں اور دو تین بار بیٹھیں، جب بلند و بالا جھولا اوپر جاتا تھا تو اردگرد کا علاقہ دور تک دکھائی دیتا تھا۔ پورا موراں والی گاؤں، اس کی گلیاں، اس کے بیچ و خم اور پھر آگے مویشی منڈی، خریداروں کا ہجوم، بائیں طرف ڈھائی تین کلومیٹر کے فاصلے پر بارش نالے کا خیال پانی اور اس پانی کے کنارے پرکھوں کی پرانی حویلی جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ حویلی کے باہر کھڑی ان کی دو گاڑیاں کھلونوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس نالے کے پار آگے تک درختوں، جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے سلسلے تھے اور اس کی دوسری جانب پولیس چوکی کی چھت خاکستری دھبے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس چھت پر شاید پولیس والوں کی وردیاں سوکھ رہی ہیں۔ دائیں کنارے پر ایک چمیل میدان تھا جہاں سیم تھور کی سفیدی تھی۔ اس میدان کی ایک جانب موراں والی گاؤں کے کھیت شروع ہو جاتے تھے، جن میں سے کچھ پر زئیئر چلائے گئے تھے اور کچھ پر کھاد، مٹی اور سروس کے کھیت اہلکار رہے تھے۔ ان کے درمیان پکڑنڈیاں اور گرگا رہیں تھیں۔ دور ایک ڈیرے پر نیوٹ ویل کے پانی کی موٹی دھار چاندنی کی طرح چمکتی تھی۔ اس کے اردگرد بچے دوڑتے تھے اور چند عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔

جھولا ابھی رکا ہوا تھا۔ اس کی ڈولی بلندی پر تھی۔ مہرین نے کہا۔ ”اوپر سے چیزوں کو دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔“ ”ہوں۔“ نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

”مہرین بولی۔“ آج تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ”اللہ کرے نہ ہی آئے۔“ ”کچھ کہہ رہی ہو؟“ وہ مسکرائی۔

”جب اس طرح بات کرتی ہو تو زہر لگتی ہو۔“ وہ چڑ کر بولی۔

وہ دونوں اس ڈولی میں اکیلی تھیں۔ اچانک نور کی

موتا ترستی بارش میں ماحول کا حصہ ہوتی ہے۔ سردیوں کی طویل رات سر پر بھی اور صبح بہت دھڑکی۔

نور، مہرین، بسمہ اور بتول ایک ہی کمرے میں بیٹھی انگلیٹھی پر ہاتھ تاپ رہی تھیں۔ رشتے میں ان کے ایک چچا تھے جو انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ملتان میں رہتے تھے۔ ملتان سے میلادیکھنے یہاں پہنچے تھے اور اچھی کوالٹی کا ملتان سوہن حلوا بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ سوہن حلوا سامنے پڑا تھا مگر لڑکیوں نے بس پکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ گیس لیپ کی روشنی نے ماحول کو غنودہ سا کر رکھا تھا۔ کچن میں ملازما ایک کھانا تیار کر رہی تھیں اور بلاؤ اور پالک گوشت کی خوشبو اونچی چھتوں والے کمروں میں چکرا رہی تھی۔

نور نے چھوٹے شیشوں والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ احاطے سے آگے حویلی کے چونی گیٹ کے پاس دو پہریدار حسب معمول ایک ٹینک کے نیچے کھڑی کے اسٹولوں پر بیٹھے موٹک پھلی کھا رہے تھے۔ ان کے ہتھیرا تو میلے کے آغاز میں ہی منج ہو چکے تھے، اب وہ بس لاشیوں سے تھے۔

نور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ابا جان اور تایا ابا ابھی تک نہیں آئے۔ اللہ خیر کرے۔“

”بارش کی وجہ سے رک گئے ہوں گے۔“ بسمہ خود کو تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

”انہوں نے کون سا پیدل آنا تھا۔“ بتول نے اپنی شیرخوار بچی کو چھاتی سے لگا کر اس پر اپنی گرم شال پھیلاتے ہوئے کہا۔

”تمنا! ای نے کچھ نہیں بتایا؟“ نور نے مہرین سے پوچھا۔

”انہیں بھی کچھ زیادہ پتا نہیں۔ بس یہی کہہ رہی تھیں، شاید کوئی لین دین کا جھگڑا ہے۔“

”مگر ماموں مراد تو بڑے غصے میں لگ رہے تھے اور وہ چھوٹی موٹی بات پر غصے میں نہیں آتے۔“

اسی دوران میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ ”شاید ابا جان آگئے ہیں۔“ بسمہ بولی اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

اندازہ درست ہی تھا۔ آنے والے ابا جان اور تایا ابا ہی تھے۔ دو ملازم چھتریوں میں تان کر ان کو برآمدے تک لے آئے۔ ان کی شیر وایتیوں پر بارش کے چھینٹے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ ان کے موڈ سخت خراب ہیں۔ لڑکیوں میں سے کسی کو بہت نہیں ہوئی کہ ان سے کوئی سوال کرتی۔ رات کا کھانا بھی بے ولی سے کھایا گیا۔ خلاف معمول نور کے ابا جان اور تایا ابا سمیت سب مردوں کا کھانا

مردانے میں ہی بھیج دیا گیا۔

نور کا تکیا تھکی ہوئی تھی۔ دادی اماں کی بات کی وجہ سے کل رات اسے بارہ ایک بجے تک نیند نہیں آئی تھی۔ صبح سویرے مہرین نے چکا کر بٹھا دیا تھا۔ اب وہ جلدی سونا چاہتی تھی۔ عشا کی نماز پڑھ کر وہ صوفے پر نیم دراز ہوئی اور وہیں آڑی ترچھی پڑی ہوئی۔

وہ کھانسی کی وجہ سے جاگی تھی، وہ خوش خوراک ضرور تھی لیکن پرہیزی کھانا کھاتی تھی۔ کل دوسری لڑکیوں کے ساتھ چند گول گپے کھا کر اس کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، مہرین اور بسمہ ایک ہی پٹنگ پر ڈیل خلاف کے پیچھے سوئی بڑی تھیں۔ گیس لیپ کی روشنی کچھ دم ہو گئی تھی اور انگلیٹھی تقریباً بج چکی تھی۔ پاپر بادل گر رہے تھے اور بارش کبھی آہستہ بھی تیز ہو جاتی تھی۔ اس نے الماری سے کھانسی کا سیرپ نکالا اور ڈیڑھ ڈھکن پیا۔ بکھرے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے اور ہیر پن اپنے ہونٹوں میں دبائے ہوئے اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ابھی صرف ساڑھے نو بجے تھے مگر لگتا تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ خلاف میں گھسنے سے پہلے وہ دروازے کو بولٹ کرنے کے لیے آگے بڑھی تو اسے دمدم آواز میں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے ابا جان، تایا خلیل اور ماموں مراد کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ وہ مردانے حصے میں تھے اس لیے آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس گونج سی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

نور میں تجسس تو پہلے سے ہی جاگا ہوا تھا۔ اس نے شال اوڑھی، رخ برسرہ چل پھری اور باہر نکل آئی۔ ساتھ والے کمرے میں، چھوٹی امی زلفت، آبی بتول کی بڑی بیٹی حنا کو اپنے ساتھ لگائے خلاف کے نیچے اونگھ رہی تھیں۔ باقی لوگ بھی سوچے تھے۔ فقط کامن روم میں سے دادی جان کے کھانسنے اور بڑبڑانے کی صدا آرہی تھی۔

نور دے پاؤں چلتی نیم روشن راہدار یوں سے گزری اور ایک بند دروازے کی چٹختی بہت آہستہ سے اتار کر مردانے حصے میں آگئی۔ آوازیں اب واضح سنائی دینے لگی تھیں مگر الفاظ اب بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بڑی بیٹھک کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور سننے لگی۔ ابا جان کی سخت آواز ابھری۔ ”میں پھر کہتا ہوں۔ مجھے ان کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ میرا تو مشورہ ہے کہ سویرا ہوتے ہی نکل جائیں۔“

”ایسی بھی لٹ نہیں پڑی ہوئی بھائی جان! ان کی

شکست کی فتنہ

ایٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں ہم۔ مگر اندر کی بات کا تو پتا چلے کہ اچانک یہ کیسا پلٹ ہوئی کیوں ہے؟ یہ چھوٹے چچا احسان کی آواز بھی جو ایک ماہ پہلے انگلینڈ سے پاکستان آئے تھے۔

”میں تمہیں بتاتا ہوں احسان۔“ تایا خلیل کی پاٹ دار آواز نور کے کانوں تک پہنچی۔ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ پتھر سے لہجے میں بولے۔ ”سارا معاملہ چودھری طفل کی ماں کے مرنے کے بعد خراب ہوا ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ دراصل چودھری طفل اور اس کا گھرانا اپنی ضد سے بھی بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ میں ان لوگوں کی تین نسلوں کو جانتا ہوں۔ ان کی طبیعت کتنے کی اس دم جیسی ہے جو سو سال سے کی نال میں رہ کر بھی میڑھی کی میڑھی رہتی ہے۔“

”تو پھر وہ صلہ صفائی کیاتھی۔ ان لوگوں نے تیسری پنچایت میں خود کہا تھا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔“

”نہیں احسان! معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ زہرا ان کے اندر پلٹا رہا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے بتول کا رشتہ مانگا۔ پنچایت کا فیصلہ ہمارے حق میں آیا اور ہم نے فوراً بتول کی شادی کر دی۔ اسی دوران میں ابدال کا چچا سکندر ایم بی اے بن گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی ضد کی باسی کڑی میں ابالا دیا۔ اسی کے کہنے پر ان لوگوں نے بتول کے بعد بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع کر دیا۔ تم سب کو یاد ہوگا اس مرتبہ پنچایت نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ ان دنوں حالات بڑے خراب ہو گئے تھے۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ شاید بسمہ کو زبردستی ہم سے چھین لیا جائے گا۔ بہر حال اللہ نے کرم کیا۔ ایک روز ماں جی (نور کی دادی) خاموشی کے ساتھ اپنی کینٹی وڈی اماں (طفل کی ماں) کے پاس گئیں۔ کسی زمانے میں یہ دونوں عورتیں دو پٹا بدل بیٹھیں تھیں۔ دو پٹا بدلی کی یہ رسم انماں والے کے مزار پر ہوئی تھی۔ ماں جی نے اس روز وہی تیس سال پرانا دو پٹا طفل کی ماں کے قدموں میں رکھ دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس دوپٹے کے صدرتے اس کی پوٹی بسمہ کو معاف کر دے۔ وڈی اماں بھی اپنے زمانے کی مانی ہوئی ہٹ دھرم تھی۔ پر کچھ دیر اسیے ہوتے ہیں جب بندہ نرم پڑ جاتا ہے۔ پتا نہیں اس دن دونوں عورتوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں اور کس طرح ہوئیں۔ آخر وڈی اماں نے وہ دو پٹا دوبارہ ہماری ماں کے سر پر رکھ دیا۔ اور اس سے کہا کہ وہ اپنے بیٹوں کو سبھانے کی پوری کوشش کرے

گی۔ ساتھ ہی اس نے ماں جی سے یہ بھی کہا کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو وہ اپنے بیٹوں اور پوتروں کو لے کر یہاں سے چلی جائے۔“

تایا ابا کے اگلے ایک دو جملے نور کی سمجھ میں نہیں آئے کیونکہ بادل زور سے گرجے تھے اور درو دیوار جیسے لرز گئے تھے۔

تب تایا ابا کی آواز دوبارہ نور کے کانوں تک پہنچی۔ ”خدا جانے اس عورت نے اپنے بیٹے طفل اور پوتروں ابدال وغیرہ کو کس طرح ان کے نحوس ارادوں سے باز رکھا اور وہ کس طرح باز آئے۔ بہر حال یہ کام ہو گیا۔“

اس موقع پر چھوٹے ماموں مراد نے کچھ کہا۔ چونکہ وہ درو بیٹھے تھے اس لیے الفاظ نور کی سمجھ میں نہیں آئے۔ یہی اندازہ ہوا کہ انہوں نے کھا پر یوں کی کینٹی کے بارے میں کوئی بات کی ہے۔

نور کو ہر کھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی اسے یہاں دروازے سے لگا دیکھ نہ لے۔ اندر ہونے والی گفتگو کے اثرات سے اس کا دل بے طرح دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔

اچانک احاطے کی طرف سے ایک بلند آواز نور کی ساعت تک پہنچی۔ پہلے تو وہ اسے چونکیدا کر آواز دے بھی لیکن پھر پتا چلا کہ یہ آواز حویلی کے باہر سے آئی ہے۔ بیٹھک کے اندر سے کسی نے کھڑکی کھولی۔ شاید آواز کا ماحذ جاننے کی کوشش کی تھی۔

نور کا پول کھل سکتا تھا۔ وہ اٹنے قدموں واپس مڑی اور اسی طرح بلی کی چال چلتی ہوئی واپس کوریڈور میں اور پھر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ رکھوالی کے کتے مسلسل شور مچا رہے تھے۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو اسے یوں لگا، جیسے حویلی کے پھاٹک سے باہر کسی افراد موجود ہیں اور بلند آواز میں بول رہے ہیں۔ اس نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ سرد ہوا سویٹیوں کی طرح چہرے سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی نور پر انکشاف ہوا کہ حویلی سے باہر کافی زیادہ لوگ جمع ہیں اور غالباً ان کی ٹارچوں اور لاشیوں وغیرہ کی روشنی بھی جو بلند چار دیواری کے پار دکھائی دے رہی تھی۔

ہوا کی کاٹ سے پیچنے کے لیے اس نے جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

یہ کون لوگ تھے؟

اس وقت اس خراب موسم میں یہاں کیوں آئے تھے؟

کہیں یہ؟..... کہیں یہ.....؟

وہ اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکی۔ اس نے بے تاب ہو کر دوبارہ کھڑکی کھولی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ دس بیس یا چالیس پچاس لوگ نہیں تھے۔ یہ بہت زیادہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں اور قہرناک آوازوں میں لگا کر رہے ہیں۔ چندھوں کے لیے گہرے بادلوں میں سے چاند تھے ایک جھلک دکھائی اور دوبارہ اُدھل ہو گیا۔ ہوا کے بیچ بست پھیڑوں نے کمرے کی رہی سہی حرارت بھی ختم کر دی۔ ہسمہ کسمہ کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے دراز ریشی بال بکھرے ہوئے تھے اور جسم پر ویلٹ کی گلابی قمیص بے ترتیب تھی۔ ”کیا ہوا نور؟“ اس نے ہراساں آواز میں کہا۔ ”کچھ نہیں۔ شاید کچھ لوگ ہیں باہر۔“ نور نے دوبارہ کھڑکی بند کر دی۔ اس کا منہ خشک ہونا شروع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دیگر خواتین بھی جاگ گئی تھیں اور بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ برآمدے میں ٹیس لپیس کی روشنیاں دکھائی دیں۔ نور نے دیکھا، بتایا ابا احاطہ پارک کے مین گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ملازم خدا بخش نے ان پر چھتری کا سایہ کر رکھا تھا۔ ماموں مراد، احسان اور دیگر افراد برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ نور نے ایک بار پھر کمرے کی کھڑکی تھوڑی سی کھول دی تاکہ باہر کی آوازیں سنی جاسکیں۔ چھوٹی امی، پچھو حاجرہ، تانی، راحت اور دیگر خواتین بھی اس ادھ کھلی کھڑکی کے پاس آ گئیں۔ لوہے اور کھڑکی کے اس مضبوط گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ نور کے تایا ابا نے شاید یہی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا یا مگر اسی دوران میں حویلی کا پرانا ملازم فدا حسین لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”نہیں مالک! وہ ہراساں آواز میں بولا۔ ”دروازہ نہ کھولیں۔ مجھے ان کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔“

”تو پھر؟“ تایا ابا کی آواز نور وغیرہ کے کانوں تک پہنچی۔ فدا حسین آگے بڑھا اور اس نے گیٹ میں ایک جانب موجود وہ چھوٹا سا روزن کھول دیا جس میں سے باہر جھانکا جاسکتا تھا۔

تایا ابا اس روزن کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے باہر کی سے مخاطب ہو کر کہا۔ جواب میں چودھری فخرل کی بلند آواز سنائی دی۔ ”دروازہ کھولو ٹھیل! ہم تم سے بات

کرنے آئے ہیں۔“

”بات کرنے کا یہ کون سا وقت اور طریقہ ہے۔“ تایا خلیل نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔ ”یہی طریقہ ہے۔۔۔۔۔ یہی طریقہ ہے۔“ ایک اور مگر جدار آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً فخرل کے بڑے بیٹے ابدال کی تھی۔

پھر نجانے کیا ہوا، کوئی چیز گیٹ سے ٹکرائی اور ملازم فدا حسین نے لپک کر روزن کو بند کر دیا۔ جونہی روزن بند ہوا گیٹ کو دھکیلا جانے لگا اور اس پر ہتھوڑے سے پرے سے لگے۔ چودھری فخرل کی لگا رسنائی دی۔ ”دروازہ کھولو ٹھیل! نہیں تو توڑ دیں گے ہم۔“

اب نور کے ابا جان، ماموں مراد اور تایا آزاد بھائی شرنیل اور عثمان وغیرہ بھی بارش کی پروا کیے بغیر احاطے میں نکل آئے تھے۔ رکھوالی کے کتوں نے جیسے شہید خطرے کی بونگھ لی تھی اور مسلسل شور مچا رہے تھے۔ حویلی کی چودھ فٹ بلند باؤنڈری وال کی دوسری جانب بیسیوں افراد کے لگا رہے سنائی دے رہے تھے۔

نور کے ابا جان نے ماموں مراد کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ ”مراد! ٹیلی فون کرو۔۔۔۔۔ پولیس چوکی میں فون کرو۔“

ان کی آواز یقیناً باہر بھی سنی گئی تھی۔ باہر سے چودھری فخرل کی دہاڑ سنائی دی۔

”مولوی مہرا! خیریت چاہتا ہے تو دروازہ کھلوا دے۔ ورنہ آج سارے اگلے بجھلے حساب برابر ہو جائیں گے۔ ابھی اسی وقت۔“

یہی وقت تھا جب نور نے دیکھا کہ ماموں مراد کا من روم کی طرف سے گھبرائے ہوئے نکلے۔ پچھو حاجرہ نے کھڑکی میں سے پوچھا۔ ”کیا ہوا مراد؟“

وہ دانت پیس کر بولے۔ ”حرامزادوں نے فون کے تار کاٹ دیے ہیں۔“

”ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟“ پچھو نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ماموں مراد جواب دے بغیر احاطے کی طرف چلے گئے۔ اسی دوران میں حویلی کی بالائی چھت پر سے چوکیدار گل محمد نکلا۔ ”مہرا صاحب! یہ لوگ سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

تب نور اور دیگر عورتوں نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔۔۔۔۔ گیٹ کے دونوں چوکیدار لائیاں سونت کر باؤنڈری وال کی طرف لپکے۔ باؤنڈری وال کے بالائی

شکست کی فتح

کمرے پر دو انسانی سر دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی افراد تھے جو اندر گھسنے کی کوشش میں تھے۔ چوکیدار نے بے دریغ ان پر لائیاں برسائیں۔۔۔۔۔ دونوں ہوبوے اوجھل ہو گئے۔ اب صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ کھلی لڑائی کی شکل بن گئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس صورت حال میں فائرنگ یا ہوائی فائرنگ بھی شروع۔۔۔۔۔ ہوائی فخرل کی فائرنگ کی گولیوں کے پاس نہیں تھا اور شاید باہر والوں کے پاس بھی نہیں تھا۔ ماموں مراد، شرنیل اور عثمان وغیرہ سر تپا پا آتش بن گئے تھے۔ ماموں مراد نے ملازموں کو بھی ساتھ لیا اور حویلی کی ”لورڈ“ پر چلے گئے۔ یہاں سے وہ کئی بھی ایسے شخص کو روک سکتے تھے جو سامنے سے بیرونی دیوار پر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا۔ باہر سے سنائی دینے والا شور غل بڑھتا جا رہا تھا اور پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں۔ حویلی میں مہرا خلی کے قریب پندرہ مرد اور بیس عورتیں تھیں۔ لاہور سے آنے والے سات آٹھ مہمان حویلی کے مہمان خانے میں بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ حویلی کے ملازم تھے جن میں ایک مالی، اس کے دو جوان بیٹے، خانا ماں اور چوکیدار وغیرہ شامل تھے۔

تین چار منٹ کے اندر اندر سب لوگوں کو صورت حال کی شدید جنگ بندی کا احساس ہو گیا۔ شرنیل کو جب پتا چلا کہ کچھ افراد دو بانیسی بیڑھیاں لے کر حویلی کی مقبلی دیوار کی طرف گئے ہیں تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اوپر والی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے ان لوگوں پر لائیاں وغیرہ برسائیں اور انہیں اوپر نہیں چڑھنے دیا۔

عورتوں کے رنگ فق ہو رہے تھی۔ دادی اماں بھی آگئی تھیں اور انہیں دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ دہ سرتا بارز نے لگتی تھیں۔ باہر بارش بھی ہو گئی تھی، ہم گاہ بگاہ بجلی چمکتی تھی اور احاطے کے مناظر روشن ہو جاتے تھے۔ مہرین، نور اور ہسمہ زینے پڑھ کر دوسری منزل پر آ گئیں۔ یہاں سے منظر زیادہ وضاحت سے دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نور کا دل بیٹھ گیا کہ اس تاریک سنسان رات میں ان کی حویلی سے باہر پچھوے ہوئے دیہاتیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور چٹیلے کوکوں والی لائیاں چک رہی تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں پرانی طرزی برچھیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اسلحہ خانے میں جمع ہو چکا تھا ورنہ یقیناً وہ بھی موجود ہوتا۔ ان لوگوں کی بھڑکوں اور لگاڑوں سے پتا چلتا تھا کہ ان میں سے کئی نئے

میں ہیں۔ شاید خشت باری سے ان کے کچھ ساتھی زخمی بھی ہو گئے تھے۔ وہ گندی گالیاں بک رہے تھے اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ نور حوصلہ مند لڑکی تھی، سکہ بند سوانیت سے اسے زیادہ تعلق نہیں تھا مگر اس موقع پر اس کا دل بھی خزاں رسیدہ اپنے کی طرح لرزنے لگا۔

دوسری منزل سے وہ گفتگو واضح سنائی دینے لگی جوتایا ابا اور چودھری فخرل وغیرہ کے درمیان ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو بڑی بلند آواز میں ہو رہی تھی، وجہ یہی تھی کہ چودھری فخرل گیٹ کی دوسری طرف تھا۔ چودھری فخرل دہاڑ رہا تھا۔

”اؤئے مہرا! دعا عین داس عورت کو جس کی وجہ سے اب تک بچے ہوئے تھے تم۔ اس کے پاؤں دھو دھو کر پیٹے تو بھی کم تھا۔“ (وہ اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا)

نور کے تایا ابا نے کہا۔ ”تو پھر اب کیا ہو گیا ہے چودھری؟ اب کیوں کر رہے ہو یہ سب کچھ؟ کیوں طوفان کھڑا کر رہے ہو؟“

”اب وہ نہیں رہی۔ وہ چلی گئی ہے۔ مرنی ہے، مہر کا گھونٹ پی کر اور اس کے ساتھ ہی وہ بات بھی ختم ہوئی ہے۔ اب ہمیں اپنی منگ چاہیے۔ تمہیں پتا ہے ہم کھا پری ہیں اور کھا پری اپنی بات دیا بنے کے لیے سو سال تک بھی انتظار کرتے ہیں۔“

”غلط بات نہ کرو چودھری! تم چنگی طرح جانتے ہو، کوئی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک اڑنی اڑنی بات تھی جس کو تم نے بنگلہ بنایا اور اب تو وہ بات بھی ختم ہو چکی تھی۔ سب کو پتا ہے کہ۔۔۔۔۔“

”نہیں ہوئی تھی بات ختم۔۔۔۔۔ نہیں ہوئی تھی۔“ فخرل غلیل مہرا کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ ”تم مولویوں کو کیا پتا کہ ہم نے کیا کیا باتیں سنی ہیں لوگوں کی۔ کہاں کہاں ہماری پیک گری ہے اس رشتے کی وجہ۔۔۔۔۔ زردلی، بے غیرتی کے طعنے سے ہیں ہم نے۔ بس اس ماں کی وجہ سے چپ تھے۔۔۔۔۔“

فخرل کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سابق ایم پی اے سکندر بولا۔ ”مولوی اشفاق! ابھی ہم تیری بیٹی کو اٹھانے کے لیے نہیں دیا ہے۔ اس کے لیے آئے ہیں۔ شرع کے مطابق اسے ڈولی میں بٹھا کر لے جائیں گے۔ اسے نوں (بہو) بنانا ہے ہم نے۔ اپنے ان غنڈوں کو باز کر جو انہیں چلا رہے ہیں۔ ورنہ پھر خدا دھوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جو ہم نہیں چاہتے۔“

زور سے بجلی چمکی اور چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار دور تک روشن ہو گئے۔ نور کی نگاہوں نے ایک حیران کن منظر کی جھلک دیکھی۔ ایک سفید گھوڑی پر ایک شخص سہل

سپینس ڈائجسٹ 274 دسمبر 2017ء

مافوں مراد بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔ وہ نور سمیت نینوں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”یہاں کیا کر رہی ہو تم؟ چلو نیچے چلو۔ جب تک ہم نہیں کوئی کمرے سے باہر نہ نکلے۔“

وہ انہیں لے کر نیچے آ گئے۔ نیچے بھی کھرام سام سچا ہوا تھا۔ آبی بتول بے ہوش ہو گئی تھیں۔ چھوٹی ای ان کی تسلیوں کی مالش کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ”آ تمہیں کھولو، بتول! ہوش کرو۔“

پھوپھو جا رہے تھے اب بے تاب ہو کر اسے جھنجھوڑا۔

چند منٹ بعد تاجا جان اور ابا جان سے ہوئے منہ سے جلی کے اندر دوئی جسے میں وہاں پہنچ گئے۔ ملازم خدا بخش کے ہاتھ میں ایک گول فٹری تھی۔ تاجا کے اس منقضی تری میں قریب ایک درجن دے پڑے تھے۔ مٹی کے ان بول میں سے کچھ اٹے تھے اور کچھ سیدھے۔ خدا بخش نے گرفتہ انداز میں یہ فٹری میز پر رکھی اور بیڑا سارا ایک فکڑا ہوگا۔ ”کہہ کہے تاجا اما؟“ بتول نے سر اسے

آئے ہیں۔ ہمیں کیا پتا کہ کتنے جلے اور کتنے بجھے اور آسے خودی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ بہت سے لوگ اس نیاں شیاں

تخلیل مہرا نے مراد کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ”تیرے جو نہیں ہوش کا وقت ہے۔ انہوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ رات کا وقت ہے، بارش ہو رہی ہے اس طرف کسی نے آتا ہے نہ جاتا ہے۔ ہم کو یہ لوگ باہر نکالیں۔ مگر ہمسرہ بھینٹے دل سے کچھ سوچتا ہوگا۔“

یہ بسمہ کے لیے شادی کا جوڑا بھیجا گیا تھا۔ نور کے ابا جان نے لافانہ سمجھا کر دیوار پر دے مارا تھا اور بے دم سے ہو کر بسمہ کے پاس قائلین پر بیٹھ گئے تھے اور پھر کچھ دیر بعد وہ منظر نور کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا جب اس نے چھوٹی ای زلفت کو سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ ابا جان کے پاس بیٹھے اور انہیں سمجھاتے دیکھا تھا۔ ابا جان جھلا کر بولے تھے۔ ”تو کیا کروں میں؟ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے..... ان ڈاکوؤں کے حوالے کر دوں۔ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے، اپنے کلیجے خنڈے کر لو۔“

”نہیں جی..... لیکن..... جو کچھ بھی ہو رہا ہے..... اور جو کچھ ہونے والا ہے..... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی۔“

”اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟“ اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔

”..... جو کچھ بھی ہے، وہ لوگ..... اپنی بسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں..... لیکن..... اگر خدا نخواستہ..... یہ لوگ اندر گھس آئے اور..... دو چار موتیں ہو گئیں..... تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہو جائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

اسی دوران میں دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زوردار دھماکا ہوا تھا۔ حویلی کی سبھی ہوئی عورتیں بے طرح چلا نچلی تھیں اور مرد سیزجوں کی طرف لپک گئے تھے۔ بعد ازاں پتا چلا تھا کہ شریٹل، عثمان اور غیاث وغیرہ نے ملازموں کے ساتھ مل کر حویلی کی خست برساتی کی ایک دیوار گرا دی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اگر دوبارہ مارا ماری کی نوبت آئے تو چھت سے خست باری کرنے کے لیے اینٹیں اور روڑے مہیا ہو سکیں۔

اگلے ایک گھنٹے میں چھوٹی ای زلفت اور پھپھو حاجرہ وغیرہ نے ابا جان اور تایا ابا کو نیم رضامند کر لیا تھا۔ کوئی دوسری راہ بھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ مراد شریٹل زخمی تھا اور حالات اتنے سنگین تھے کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ حکم حاکم مرگب مفاجات والی صورت حال بھی اور پھر نور نے وہ منظر بھی دیکھا جب اشک بار چھوٹی ای اور خالد عریفہ نے، باہر سے بلند ہونے والے مرغضب لکڑوں کی گونج میں سیلا دو پٹاروتی سسکتی بسمہ کے سر پر ڈالا اور اس کے لرزاں ہاتھوں پر مہندی لگا کر شروع کی۔

بسمہ، بتول اور ماموں کی لڑکیوں نے رونا شروع کر دیا۔ تائی راحت سجدے میں گر گئیں اور جان آبرو کی سلامتی کے لیے گونگڑاٹے لگیں۔ دادی اماں کا برا حال تھا اور ان کو سنبھالتے سنبھالتے پھپھو حاجرہ خود بھی نیم جان ہو رہی تھی۔

حویلی کے مردوں نے، جن میں باہمت ملازم بھی شامل تھے، جان پر پھیل کر اندر گھسنے والوں کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس کوشش میں چار پانچ افراد کو شدید زخم آئے لیکن جس کو شدید ترین چوٹ لگی وہ نور کے ماموں مراد تھے۔ باہر سے جوانی خست باری بھی ہوئی تھی۔ ایک اینٹ گلنے سے ان کے سر پر گہرا زخم آیا تھا..... اور بالائی ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھے۔

انہیں اندر لایا گیا۔ ان کی حالت دیکھ کر عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ بہر حال نور اور مہرین کی حد تک حوصلے میں رہیں۔ ایک فزپوٹر اسپتال کی حیثیت سے مہرین میڈیکل کی سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔ حویلی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ مہرین نے سب سے پہلے مراد کے سر سے پنبے والا خون بند کیا اور پھر عارضی بینڈج کر دی۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”فوری خطرے کی تو کوئی بات نہیں..... مگر ماموں کو اسپتال لے جانے کی ضرورت ہوگی۔“

حویلی کے سامنے ”لورڈ“ پر حویلی کے آٹھ دس افراد موجود تھے۔ اگر باؤنڈری وال کے شکستے حصے سے کوئی اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا تو اسے موٹ طریقے سے روکا جاسکتا تھا مگر یہ دفاع تنہی دیر تک چل سکے گا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

نور نے دیکھا، بسمہ سبکی سبکی ہوئی ایک سبھی چڑیا کی طرح کونے میں گھسی ہوئی تھی۔ گاچے لگا ہے، دہشت زدہ نظروں سے اپنے بڑوں کے چہرے دیکھتی تھی۔ اسی اثنا میں چھوٹی ای زلفت اور پھپھو حاجرہ نے اس کے ابا جان کو اپنے ساتھ لیا اور ساتھ والے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ کوئی خاص قسم کی نفست کو کر رہی تھیں۔

دس پندرہ منٹ بعد تینوں باہر آ گئے۔ ابا جان کا چہرہ بدستور کرب کی آماجگاہ تھا۔ یہی وقت تھا جب ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا تھا اور اس نے پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ ابا جان کی طرف بڑھایا تھا۔ اس لفافے میں سرخ رنگ کا کوئی کامدار کپڑا جھلک دکھایا تھا۔ خدا بخش نے نور کے ابا جان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔“

رہی۔ بارش کی بو پھاڑوں ہی کی طرح کبھی لہجے مدھم اور کبھی تند و تیز ہو جاتے تھے۔ شریٹل اندر آیا تو سب عورتیں اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ”کیا بات ہوئی شریٹل؟“ تائی راحت نے بیٹے سے پوچھا۔

”بیس ہو رہی ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ لہجے میں مایوسی تھی۔

”کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ..... شاید..... کوئی اچھا مشورہ ہی دے دیں۔“ نیکر زلفت نے استفہار کیا۔ خالد عریفہ نے بھی ساتھ دیا۔ سب کے رنگ زرد تھے۔

”وہ غبیث اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں.....“ شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر بسمہ کی طرف دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بے چاری پہلے ہی ہلدی ہو رہی تھی۔

خالد عریفہ بسمہ کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شریٹل نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ چودھری طفل اور اس کے بہنو بسمہ کے حوالے سے ایک اچھی پیچھے نہیں ہٹ رہے۔ وہ اسی وقت نکاح اور رخصتی چاہ رہے ہیں۔ ابا جان، چچا جان اور دیگر اس کوشش میں ہیں کہ کم از کم آج رات کے لیے اس معاملے کو ٹال دیا جائے اور کل پچائیت میں اس کا حل نکالا جائے لیکن یہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

باہر سے ایک دم شور بلند ہوا اور مار دھاڑ کی آوازیں آئیں۔ لڑکیاں چلا آئیں۔ شریٹل بھی احاطے کی طرف دوڑا۔ وہاں باقاعدہ لڑائی کا منظر تھا، باہر کے لوگوں نے جس جگہ سے باؤنڈری وال کی نوکدار گرل اکھاڑی تھی، اب وہاں سے کچھ افراد اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حویلی کے مرد انھیوں اور کھڑائیوں سے ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ بجلی چمکی اور چند ساعتوں کے لیے قرب و جوار روز روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ نور نے دیوار کا منظر دیکھا۔ یہ ایک جتنی منظر جیسا تھا، کم از کم چار پانچ افراد تھے جنہوں نے چوٹ سے بچنے کے لیے سروں پر بھاری گڑیاں کس رہی تھیں اور دیوار پھانڈنے کی کوشش میں تھے۔ ان پر چھت پر سے اینٹیں برس رہی تھیں اور احاطے میں موجود افراد بلی لائٹوں سے انہیں نیچے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ بات چیت ناکام ہو گئی ہے اور اب وہ لوگ ہر صورت اندر گھسنا چاہتے ہیں۔

ان کے لکڑاے خوفناک تھے۔ وہ گندی گالیاں دے رہے تھے اور اندر موجود عورتوں کے لیے غلیظ الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

مراد نے ایک بار پھر طیش بھری نظروں سے تانے کی طعنتی اور اس میں سیدھے اور اوندھے پڑے مٹی کے دیوں کو دیکھا اور بولا۔ ”لیکن میں ان بے کار رسوں کو نہیں مانتا۔ یہ لوگ بس اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ان رسوں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ رسم نہ ہوئی تو کوئی اور ہوئی..... کوئی اور فال ہوئی۔ ان لوگوں نے ہم پر چڑھائی کرنا ہی تھی۔“

عمر رسیدہ ملازم خدا بخش نے کہا۔ ”بیٹا! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ان رسوں کے بہت سے نقصان ہیں پر کچھ فائدے بھی تو ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ اگر اسلحہ جمع کرانے کا رواج نہ ہوتا اور لوگ اس پر پورا یقین نہ رکھتے تو..... اب تک شاید یہاں بہت نقصان ہو گیا ہوتا.....“

”نقصان کیا، دونوں طرف سے کئی لاکھیں گر گئی ہوتیں۔“ خلیل مہرا صاحب نے تائید کی۔

یہی وقت تھا جب احاطے کی طرف سے کچھ ٹوٹے اور مرنے کی آواز آئی۔ رکھوالی کے کتوں نے شور مچایا اور مختلف آوازیں سنائی دیں۔ چند سیکنڈ بعد یوژھاملازم فدا حسین بانہا ہوا اندر آیا۔ خلیل مہرا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”مالک! انہوں نے رسے ڈال کر ایک طرف سے دیوار کا جینکا گرا دیا ہے..... لگتا ہے کہ وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کریں گے۔“

خلیل مہرا، اشفاق مہرا، مراد اور دیگر افراد احاطے کی طرف لپکے۔ نور، مہرین اور دیگر لڑکیوں نے کھڑکی سے جھانکا، صاف طور پر تو دکھائی نہیں دیا مگر اندازہ ہوا کہ بلند باؤنڈری وال کے بالائی حصے پر کئی نوکدار سلاخوں والی باڑ کا کچھ حصہ دکھائی نہیں دے رہا۔ وہاں سے باڑ اکھاڑ دی گئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ نمونے آہنی تار کی مدد سے اس باڑ پر کندھ ڈالی گئی تھی اور اس کندھ کو جھکے دے دے کر قریباً پندرہ فٹ چوڑائی کا ایک گلا اینچے گرا دیا گیا تھا۔ اب اس حصے سے باؤنڈری وال پر چڑھنا آسان ہو گیا تھا۔ بہر حال ابھی یہاں سے چڑھنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی تھی۔ شاید یہ کارروائی صرف باؤنڈری وال کے لیے کی گئی تھی کہ اگر ان کی بات نہیں مانی گئی تو وہ ہر حد تک جانیں گے۔

گیٹ کے مختصر روزن میں سے ایک بار پھر دو طرفہ گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ مستقبل روزن چوڑائی میں دو فٹ کے قریب اور اونچائی میں صرف سات آٹھ انچ تھا۔ تانے کی طعنتی بھی اسی خلا سے اندر بھیجی گئی تھی۔

گیٹ پر ہونے والی گفتگو قریباً دس منٹ جاری

سپینس ڈائجسٹ

مولوی اشفاق میرا اور غلیل میرا نے مشورہ کیا۔ انہیں اب بالائی منزل، چکی منزل سے زیادہ محفوظ لگ رہی تھی۔ لڑکوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مولوی اشفاق عورتوں کو لے کر دوسری منزل پر آگئے۔ ان کی ہدایت پر نور کی دادی اماں کو ایک کرسی پر بٹھایا گیا اور شرنیل، پٹمان، غیاث وغیرہ کرسی اٹھا کر دوسری منزل پر لے گئے۔ سیزھیاں چڑھتے وقت دادی اماں کو رونے کی آوازیں آئیں۔ انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو مولوی اشفاق نے انہیں گول مول سا جواب دیا۔

یہ آوازیں دراصل فدا حسین اور اس کی بیوی کی تھیں۔ اپنے بچے کی دردناک موت نے انہیں نوحہ کنساں کر رکھا تھا۔

اشفاق صاحب بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ وہ دکھ اور تشویش کی انتہا پر تھے۔ ایک طرف بے گناہ بیٹی اور اس پر ہونے والے ظلم و ستم کا تصور تھا، دوسری طرف اپنے پورے خاندان کے کی جان اور آبرو بھی۔ وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ ہمسہ کو اس کی پھوپھو جاجہ اور چھوٹی امی نے سرخ جوڑا تک پہنچا دیا تھا مگر حتیٰ فیصلے کی ہمت ابھی تک کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

اشفاق صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ لرزتی کانپتی ہمسہ ان کی بائیں جانب اور بتول دائیں جانب تھی۔ مہرین اور ماموں زاد سیلہ ان کے قدموں میں قالین پر بیٹھی تھیں۔ اشفاق صاحب نے ہمسہ اور بتول کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ ”ارے نور کہاں ہے؟“ پھوپھو جاجہ نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ ”نور۔ نور!“ انہوں نے آوازیں دیں۔

اشفاق صاحب کی بیگم زلفت بھی اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”کہاں گئی وہ؟“ بتول نے بھی بے قراری سے کہا۔ اشفاق صاحب کچھ بڑبڑائے اور اٹھ کر برآمدے میں آگئے۔ بارش کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ بادل پھٹے تھے اور پوری رات کا چاند جھانکنے لگا تھا۔ اشفاق صاحب نور کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھے، مہرین بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر مہمان خانے کا سنگل اسٹوری پورشن دکھائی دے رہا تھا۔ چمت پر لگا ہوئی وی انیٹیا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اچانک ایک منظر نے اشفاق صاحب کو جکڑ لیا۔ ان کی ساری حیات جیسے سٹ کر ان کی آنکھوں میں

آگئیں۔ انہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر ان کی اپنی ہی نگاہوں کو بھر دسنا نہیں ہوا۔ کیا وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟ وہ مہمان خانے کی چھت سے نیچے پرانی کے ایک ڈھیر پر جھٹک لگا رہی تھی۔ ہاں، یہ وہی تھی۔ یہ وہی نا فرمان مٹی، وہی سرکش مٹی۔

مہرین نے بھی بے پناہ حیرت سے دیکھا۔ اگر یہ کوئی فلم ہوتی اور یہ منظر سلوموشن میں دیکھا جاتا تو بے حس و ہوش ہوتا۔ دیکھنے والوں کے رونے کھنکھانے کر دیتا۔ وہ جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی پرانی کے ڈھیر پر گر گئی۔ وہاں سے اٹھی۔ سنبھلی۔ اور بھاگی۔ ہاں۔ وہ بھاگی، اس کے سامنے تصور زدہ طویل میدان تھا۔ وہ اس کے آس پاس موجود تھے۔ انہوں نے لنگارے بلند کیے اور اس کے پیچھے لپکے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ فدا حسین کے لڑکے رشید کے پیچھے بھاگے تھے اور اسے پکڑ لیا تھا۔ لیکن۔ یہ رشید نہیں تھا۔ یہ نور تھی۔ یہ پاکستان کی مانی ہوئی اسپرٹنز میں سے ایک تھی اور وہ بھاگ رہی تھی۔ اپنی پوری رفتار کے ساتھ۔ وہ جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ اس نے دو پٹاس کرکسے باندھ رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جو گرز تھے۔ آج اس کا اسکارف پھسل گیا تھا اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

”پکڑو۔۔۔ جانے نہ پائے۔“ ایک لنگار بلند ہوا۔ لاشعیاں اور کلباڑیاں چچکیں۔ تعاقب کرنے والوں کے قدم برق رفتار ہوئے، وہ اسے دوپٹے کے لیے پوری طاقت سے بڑھے مگر ان کے آگے نور تھی۔ اور نور کی رفتار۔ بہت ہوتی ہے۔

مولوی اشفاق منڈیر کے آخر تک آئے اور سینے کی پوری قوت سے چلائے۔ ”بھاگو مین انور۔۔۔ بھاگو۔۔۔ ان کے ہاتھ نہیں آتا مین انور۔۔۔ بھاگو۔“ ان کی آواز گونجتی اور پھیلتی چلی گئی۔

کسی نے مین انور کا جواب نہیں سنا۔ مگر مولوی اشفاق نے سنا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا۔ میں آپ کی بیٹی ہوں ابا جان! آپ کی ناکارہ ترین بیٹی۔ آپ کو بہت دکھ دینے والی، مایوس کرنے والی لیکن آج میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔ ہاں، میں نہیں کروں گی کیونکہ یہ میرا میدان ہے، یہ میرا راستہ ہے۔ ”بھاگو مین انور۔۔۔ بھاگو۔“ مولوی اشفاق پھر پوری طاقت سے پکارے اور یہ وہی مولوی اشفاق تھے، جنہوں نے ہمیشہ کہا تھا۔۔۔ مت بھاگو مین انور۔

”رن فاسٹ۔۔۔ نور! رن فاسٹ۔“ مہرین بھی چلائی۔

اور وہ بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک ناقابل فراموش منظر تھا۔ چھریں سے بدن کی ایک لڑکی اور۔۔۔ اس کے عقب میں موت کے ہر کارے، درمیانی فاصلہ پندرہ بیس قدم کے قریب۔ تعاقب کرنے والوں میں بڑی عمر کے لوگ بھی تھے، کزمل جوان بھی اور بالکل نوجوان چودھری زادے بھی۔ انہیں یقین تھا، وہ حصار توڑنے والی اس لڑکی کو بارش نالے تک نہیں پہنچے دیں گے کیونکہ بارش نالے کے پار جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھنا سلسلہ تھا اور پھر اس سے آگے وہ راستہ تھا جو سیدھا پولیس چوکی تک پہنچتا تھا اور وہ شاید اسی رخ پر جاری تھی۔ وہ اس لڑکی سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کرنے میں ناکام ہوئے تو بھاگتے بھاگتے اس کی طرف چھوٹے دستے کی کلباڑیاں اور لاشعیاں وغیرہ پھینکنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے۔ ان کی جھلاہٹ دیدنی تھی۔ ایک لڑکی، ایک کمزور لڑکی۔ ان کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔

ہاں، قدرت ایسے ہی ہار کو جیت میں بدلا کرتی ہے۔ ایسے ہی جاں مسل مشتقوں کا صلہ دیا کرتی ہے۔ ایک طرح سے نہ سبھی دوسری طرح سے۔ دوسری طرح سے نہ سبھی، تیسری طرح سے۔ بے شک تختیں رانگاں نہیں جاتیں۔ جاں سوزیاں ضائع نہیں ہوتیں۔ آخر صلے مل کر رہتے ہیں۔ مولوی اشفاق اپنی بیٹی کی جیت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ منڈیر کے آخری سرے تک پہنچ چکے تھے۔ ”بھاگ جاؤ نور۔۔۔ پولیس تک پہنچ جاؤ۔“ وہ بار بار کہتے تھے۔ انہوں نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں، ان کی آواز بیڑہ رہی تھی۔

اب ہمسہ، بتول، سیلہ، چھوٹی امی، پھوپھو جاجہ اور بہت سے دیگر لوگ اس جگہ جمع ہو چکے تھے اور روشن چاندنی میں، سکتہ زدہ کرنے والی یہ انوکھی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک ٹوپوٹا گاڑی بھی نور کے پیچھے چلی۔ یہ پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی جس پر ہمسہ کو لے جایا جاتا تھا۔ زندہ یا مردہ۔۔۔ (چودھری طغرنے نے یہی کہا تھا) گاڑی برق رفتاری سے نور کے تعاقب میں پہنچی تو وہ دائیں جانب کے ان تصور زدہ کھیتوں میں گھس گئی جن میں چکی منڈیریں بنا کر، انہیں آباد کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر گاڑی بری طرح پھدکنے اور ڈمکانے لگی۔ نور اور تعاقب کرنے والوں کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے قدم برق کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ بال لہرا رہے تھے۔ وہ ایک ایتھلیٹ کی

بھاگنے کا اور کھا پر یوں کے ہاتھ نہ آنے کا کہا تھا..... وہی تو تھے جو اسے عین النور کے نام سے پکارتے تھے۔ بے شک یہ وہی تھے۔ اس آواز نے نور کے حوصلوں کو پہاڑ کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ آج اسے کوئی نہیں چھو سکے گا اور کوئی نہیں چھو سکتا تھا۔

اب بھی وہ پوری ہمت کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اس کے کپڑے سخت سردی میں ٹالے کے پانی سے بھیک کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے مگر شدید جسمانی مشقت کے سبب اس کے زیریں جسم کو بالکل سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ فقط شانوں اور چہرے کو ہوا کے پتھڑے لگ رہے تھے۔ اسے ڈر صرف ایک ہی بات کا تھا، کہیں عقب سے پھرے ہوئے کھاپری اس پر کوئی فائر نہ کر دیں۔ ابھی تک تو خیریت گزری تھی اور اسے لگتا تھا کہ خیریت ہی رہے گی۔ یہ امان لے کے میلے کے دن تھے۔ علاقے کے بدترین افراد بھی نسلوں سے چلے آنے والے رواج کے مطابق فائر ہونے والے ہتھیاروں کو چھونا گناہ سمجھتے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ وہ سیدی پولیس چوکی کی طرف جاری ہے۔ کل وہ پھر اس نے آسمانی جھولے کی بلندی سے جو فضائی منظر دیکھا تھا، وہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ پھر بھاگتے بھاگتے ایک دم ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ ڈر کر کے میلے کے دنوں میں علاقے میں آتشیں ہتھیار منوع ہو جاتے تھے۔ کیا پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہوتے تھے؟ اس بارے میں اسے شک سے کچھ پتا نہیں تھا لیکن اگر پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں تھے تو پھر..... وہ پھرے ہوئے جہوم کو اور جنونی کھاپریوں کو کیسے روک سکتے تھے؟

اس نے اپنی شلوار کے پانچوں کوجراہوں میں ہساکر ٹراؤزر کی شکل دے رکھی تھی۔ جو گرز کے لیے بھی کس کر باندھ رکھے تھے۔ پھر بھی ایک جگہ اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ گرتے گرتے پئی۔ چاندنی پھر ایک دم اوجھل ہو گئی تھی اور اسے تیز بھاگنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پروفیشنل اسپینا کی مالک ہونے کے باوجود ہانپ رہی تھی مگر اسے پتا تھا کہ اب چوکی زیادہ دور نہیں ہے۔ شاید ایک دو منٹ کا فاصلہ تھا..... یہی وقت تھا جب اسے عقب سے ایک فائر سنا دیا۔

☆☆☆

ذوالقرنین کا دل شام سے ہی کچھ اکھڑا ہوا تھا۔ ایک بے نام سی اداسی اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ رات

گہری ہونے کے ساتھ ساتھ گرج چنگ اور بارش کا سلسلہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ذوالقرنین کو کسی گروٹ جھین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا، ابھی، اسی وقت۔ نور کی مسلسل سرد مہری نے ذوالقرنین کو جیسے اس کی اپنی نظروں سے ہی گمراہ کیا تھا۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا تھا کہ وہ گمراہ پڑے لڑکوں کی طرح وہ کام کر رہا ہے جسے عرف عام میں ”جھونڈی“ کہا جاتا ہے۔ وہ اصلاح معاشرہ کا ٹھیکیدار بنتا تھا اور اپنے دل کے ہاتھوں اتنا مجبور تھا کہ کسی موہوم امید کے سہارے نور کے پیچھے یہاں موراں والی تک چلا آیا تھا۔ بے شک میلا دیکھنے کی دعوت اسے پچھلے سال اشفاق مہرا صاحب نے بھی دی تھی اور یہ ایک معقول بہانہ تھا مگر جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ تو ذوالقرنین اچھی طرح جانتا تھا۔

اردو بازار کے تین اور دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ سب ایک مقامی گھر کرائے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میلے کے دنوں میں اپنے گھر کرائے پر دینے کا رواج موراں والی میں بھی پایا جاتا تھا۔ رات گیارہ بارہ بجے تک ذوالقرنین کی طبیعت اتنی بیزار ہوئی کہ اسے اپنا دم ٹھٹھا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی موراں والی سے نکل جائے گا..... (دوستوں کو بتائے بغیر) وہ لوگ علیحدہ گاڑی پر آئے تھے اور جب چاہے جا بھی سکتے تھے۔

بارہ بجے کے لگ بھگ وہ خاموشی سے اٹھا۔ وضو کر کے نماز حاجات ادا کی۔ سفر کے نفل پڑھے۔ صرف ایک دوست ریمز کو اٹھا یا جس سے وہ اپنی کیفیت شیئر کر سکتا تھا۔

اسے اپنی روائی کا بتا کر اور قائل کر کے وہ چپ چاپ اپنی قیام گاہ سے نکل آیا۔ بارش ہلکی ہو چکی تھی اور کسی وقت بند بھی ہو جاتی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنی ادنیٰ کوہانی چادر اچھی طرح بالائی جسم پر لپیٹ لی۔ نیلی ایف ایکس گاڑی کھلے میں کھڑی تھی اور برف ہو رہی تھی۔ فوری طور پر تو گاڑی کا بیئر بھی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور موراں والی سے اور موراں والی کے میلے سے نکل آیا۔ پتا نہیں کیوں وہاں سے نکلے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی سی آگئی۔ اس کی نگاہوں میں بار بار وہ منظر آ جاتا تھا جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ٹھیلے والے کے پاس کھڑی تھی اور پھر اسے دیکھ کر بالکل منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کتنی بے اعتنائی، بیگیا کی اور بیزار سی ہلکتی تھی اس کے انداز سے۔

اس نے گاڑی کو دوسرے گیزر میں ڈالا اور کچے کچے راستے پر بچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پختہ سڑک تک پہنچنے کے لیے اسے قریباً دو کلومیٹر تک اسی نیم پختہ راستے پر جانا تھا اور پھر برساتی ٹالے کا ٹنگ بھی ملے گا۔

اس کے دایمیں بائیں جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے۔ چاند نے تھوڑی دیر کے لیے گہرے بادلوں کی اوٹ سے جھلک دکھائی تھی اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ اچانک ذوالقرنین بری طرح ٹھنک گیا۔ اسے بائیں جانب سے کچھ فاصلے پر فائر کی آواز سنا دی..... ابھی وہ اسی پر غور کر رہا تھا کہ بائیں جانب کے سرکنڈوں میں عجیب سی حرکت ہوئی اور کوئی تیزی سے بھاگ کر سامنے سے گزرا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ایف ایکس کی ہیڈ لائٹس کے سامنے آیا تھا۔ ذوالقرنین کتے میں رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر پھر دسانیں ہوا۔ بھیکے لباس اور بھیکے بالوں والی وہ دراز قد لڑکی جو لڑکھائی ہوئی کسی بھاگ رہی تھی..... نور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی.....

حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے گاڑی کے بریک دباے اور گھڑی کھول کر اپنے پیچھے پڑوں کی پوری طاقت سے پکارا۔ ”نور..... نور.....“

وہ رک گئی۔ درمیانی فاصلہ دس پندرہ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ ”یہ میں ہوں نور“ وہ پھر چلا آیا۔

جب تک شاید وہ بھی ذوالقرنین کی نیلی ایف ایکس پہچان چکی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت رہنے کے بعد گاڑی کی طرف بچھنی اور دروازہ کھول کر اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ ”جلدی کرو..... پولیس چوکی چلو۔“ انہوں نے حوصلی کو گھیر لیا ہے۔ وہ..... میرے پیچھے بھی آرہے ہیں۔“ اس کی آواز دہشت کے سبب ناقابل شناخت ہو رہی تھی۔

ذوالقرنین بھی حیرت اور سنسنی کے شدید گھیرے میں آ گیا لیکن کوئی سوال پوچھنے کے بجائے اس نے گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھانا مناسب سمجھا۔ گاڑی غیر ہموار راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی..... اور پھر اس نے ایک جگہ سے ٹالے کا پل پار کر لیا۔

”آپ زخمی تو نہیں ہیں؟“ ذوالقرنین نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور پہچانی لہجہ میں پوچھا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ مضطرب آواز میں بولی۔ ایک آدھ منٹ کے اندر ہی وہ پولیس چوکی کے سامنے تھے۔ پولیس چوکی کے مختصر محن میں تاریکی تھی۔ ایک دو کمروں کے روشن دانوں میں لائین وغیرہ کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہلکی بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ نور اور ذوالقرنین ایک ساتھ گاڑی

شکست کی فتح

سے نکلے اور چوکی کا بیرونی دروازہ پھٹا شروع کر دیا۔ بیرونی دیوار کی اونچائی دس فٹ کے قریب تھی۔ ”دروازہ کھولیں، جلدی کریں۔“ نور چلانے والے انداز میں بولی۔

اس سے ملتا جلتا فقرہ ذوالقرنین نے بھی دہرایا۔ ساتھ ساتھ وہ دونوں دروازہ بھی پیٹ رہے تھے۔ پھر ذوالقرنین کے ذہن میں آیا اور اس نے گاڑی کی کھلی کھڑکی میں سے اپنا ہاتھ گزرا کر بارن پر رکھ دیا۔

اس کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ ”پتا نہیں بھنگ لپی کر سو گئے ہیں سارے۔“ ذوالقرنین جھلا کر بولا۔ نور سخت پریشانی میں مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور سینے کا زبردیروم واضح تھا۔

اچانک ذوالقرنین کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ وہ اسے چلا کر دیوار کے بالکل قریب لے آیا۔ پھر اس کی جھت پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھا اور اندر کودا۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس نے بیرونی دروازہ اندر سے کھول دیا۔ نور اسی لمحے کی منتظر تھی۔ وہ جلدی سے اندر گھس گئی۔ ”کنڈی چڑھا دیں۔“ ذوالقرنین نے کہا اور محن پار کر کے اندر دوی کروں کی طرف لپکا۔

اس نے نایک کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ دیا۔ اس مرتبہ یہ کوشش رانگال نہیں گئی۔ دروازہ کھلا اور سادہ کپڑوں میں ایک بھاری بھر کم شخص نظر آیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ چوکی انچارج سب انسپٹر جان محمد تھا اور خاصا دنگ شخص تصور کیا جاتا تھا۔

ذوالقرنین نے جھلا کر کہا۔ ”آپ لوگ کس طرح کی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ باہر غدر مچا ہوا ہے اور آپ نے دروازے بند کر رکھے ہیں۔“

سب انسپٹر نے اپنی سرخ آنکھوں سے ذوالقرنین کو گھورا، ہو سکتا تھا کہ وہ جواب میں کوئی سخت بات کہتا لیکن اس کی نگاہ خستہ حال نور پر پڑ گئی۔ ”کیا ہوا ہے؟“ اس نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

نور اپنا سر ڈھانپتی ہوئی آگے آئی اور بولی۔ ”آپ یہ پوچھیں کہ کیا نہیں ہوا۔ کھاپریوں نے ہمارے گھر کو گھیر لیا ہے۔ ایک بندے کو سخت زخمی اور دوسرے کو قتل کر دیا ہے۔ وہ..... میرے پیچھے..... بھی لگے ہوئے ہیں۔“ اس کا گلارندہ کیا۔

دو تین اور کمروں کے دروازے اب کھل گئے تھے۔ کچھ باوردی اور کچھ سادہ لباس والے الہکار باہر نکل آئے

ایک دم کھرام سا گھبراہٹ مچا تھا۔ کوئی جتنی انداز میں چلا رہا تھا۔ ”ماردوں گا۔ کاٹ ڈالوں گا۔“ نوٹے کر دوں گا۔“
نور کوئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور ابا جان نے اسے اپنی اوٹ میں لے لیا تھا۔ نور کے رونکنے کھڑے ہو گئے۔
نار چوں کی روشنی تصادم والی جگہ پر پہنچی تو نور نے دیکھا کہ چوڑا چمکا ابدال کسی سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ جس سے لپٹا ہوا تھا، وہ ذوالقرنین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ابدال کے ہاتھ میں چھوٹے دستے والی چمک دار کلبھاڑی تھی اور اس کے چہرے پر غنغ و غضب کے شعلے تھے۔ صاف طور پر بتا چلتا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے۔ اور کسی بھیڑے سے بڑھ کر خون آشام ہو رہا ہے۔ اس کی کلبھاڑی پر ذوالقرنین نے بھی گرفت بنائی تھی اور دونوں تقریباً ختم کھاتے تھے۔ پھر وہ دونوں گر گئے لیکن ذوالقرنین نے کلبھاڑی کے دستے پر اپنی گرفت ختم نہیں ہونے دی۔ اس کی مزاحمت زبردست تھی۔

پھر پولیس والے اور دیگر افراد بھی ابدال پر چھپے اور اس خون آشام کو دیوچ لیا گیا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں دھاڑ رہا تھا اور پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ بس ایک فقرہ ہی نور کی سمجھ میں آیا۔ ”اپنی دوہٹی لے کر جاؤں گا۔ چھوڑ دوں گا نہیں اسے۔“

نور یہ سوچ کر لرز گئی کہ یہی وہ شخص تھا کہ آج رات بسمہ کو جس کے حوالے کیا جاتا تھا۔ پولیس والوں نے وہیں گیٹ کے قریب اسے بے دروغ پٹا اور نیم بے ہوش کر ڈالا۔ لرزتی کانپتی نور کو اس کے ابا جان نے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ نور نے ذوالقرنین کی طرف دیکھا۔ اس کا گریبان جاک ہو گیا تھا۔ ہونٹوں سے خون رس رہا تھا لیکن ویسے وہ بالکل ٹھیک تھا۔

چوکیدار گل محمد کے چہرے پر کلبھاڑی کا سخت وار لگا تھا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے اور ایک طرف کا گال قریباً کان تک چر کر رہ گیا تھا۔ ایک دوسری گاڑی میں اسے بھی فوراً اسپتال روانہ کر دیا گیا۔

صورت حال سے صاف پتا چل رہا تھا کہ پولیس پارٹی کی آمد پر باقی لوگ تو یہاں سے تیزتر ہو گئے تھے مگر یہ خرابی ابدال نہیں آس پاس چھپ گیا تھا اور کسی موقع کا منتظر تھا۔ گیٹ کھلنے کے بعد یہ موقع اسے نور پر حملے کی صورت میں ملا جو چوکیدار گل محمد اور ذوالقرنین نے ناکام بنا دیا۔

سب کے سامنے ہی بری طرح مدہوش ابدال کو اپنی ہتھکڑی لگا کر پولیس کی گاڑی میں چمپک دیا گیا۔ وہ ہولناکی

خواری سے بچا ہوا ہے۔“ انہوں نے اسے ہاتھوں میں پھینچ لیا اور اس کا سر اور ہاتھ چومتے چلے گئے۔
وہ سسک رہے تھے اور وہ بھی رو رہی تھی۔ وہ جب روتی تھی تو بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلا کرتے تھے لیکن آج اس کے آنسو بھی نکل رہے تھے۔
اس کے ابا جان انشک بار آواز میں بولے۔ ”میری بہادر بیٹی۔۔۔۔۔ میری دلیر بیٹی۔۔۔۔۔ شیر بیٹی۔۔۔۔۔“
سب انشکثر جان محمد اور اس کے ماتحت تعجب سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ساری بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نور کے ابا جان نے خود کو نور سے علیحدہ کرتے ہوئے فخریہ لہجہ میں کہا۔ ”یہ میری بیٹی ہے۔۔۔۔۔ یہ بہت بڑی رز ہے۔۔۔۔۔ بڑے میڈل جیت چکی ہے۔ اسی نے آج ان بدبخت کھاپریوں کا ٹھیرا توڑا ہے اور آپ تک پہنچی ہے۔ اللہ سوچنے نے اسے ہم سب کی جان آبرو کی حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے۔“

انہوں نے ایک بار پھر نور کو اپنے ساتھ لگایا۔ نور بولی ”ماموں مراد کہاں ہیں۔ انہیں اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔“

”تمہارے تایا اور عثمان وغیرہ اسے لے کر جا رہے ہیں۔ وہ دیکھو گاڑی آ رہی ہے۔“ انہوں نے ہیڈ لائٹس کی طرف اشارہ کیا۔ تاریکی کو چیرتی ہوئی ہیڈ لائٹس گیٹ تک آ گئیں۔

گاڑی قریب پہنچی تو تایا ابا نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر نور کی گردن کی پشت پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف جھکا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ انشک بار آنکھوں کے ساتھ لیے جانے والے اس بوسے میں انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ نور نے پچھلی نشست پر دراز ماموں مراد کو دیکھا۔ ان کے سر کی بینڈج خون سے تر تھی۔ آنکھیں بند تھیں، عثمان نے کہا۔ ”گھبرا نے ان کی بات نہیں سنی۔“
ٹوکولائزر کے اثر میں ہیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ یہی وقت تھا جب ایک چٹکھڑی نور کے کانوں میں پڑی۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ گیٹ کے بالکل پاس گل عباسی کے پودوں کے پیچھے سے ایک پرچہ عین سی چھپتی ہوئی نظر آئی۔ تاریکی میں نور کو بس یہی نظر آیا کہ چوکیدار گل محمد کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری ہے۔ پھر ایک دوسرا شخص پرچہ اٹھانے سے لپٹ گیا۔ ورنہ یہی لگ رہا تھا کہ وہ پرچہ اٹھانے میں مددگار کی طرف آئے گی۔

یوں لگا کہ وہ مثال لینے سے انکار کر دے گی مگر پھر خاموش رہی۔ ”اس کو اچھی طرح لپیٹ لیں۔“ ذوالقرنین نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔
کچے کچے راستے پر گاڑی اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پولیس موبائل کی عقبی سرخ بتیاں ذوالقرنین کی راہنمائی کر رہی تھیں۔ ان کے عقب میں خانہ بدوشوں کے ریزے اور گدھار بڑھیاں تھیں۔ غالباً ان کے دو چار کتے بھی شور مچاتے ساتھ آ رہے تھے۔

غور زدہ طویل میدان میں پہنچتے ہی چوہلی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاید چوہلی کے کسی کوئے میں آگ بھی سسک رہی تھی۔ سب انشکثر نے ٹھنڈی کا مظاہرہ کیا اور ایک جگہ گاڑی روک کر آٹو ٹیک رائٹلوں سے کئی برست چلائے۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی اور بلوائیوں کے لیے پیغام تھا کہ پولیس آگئی ہے، وہ مگر نہ لیں۔

۔۔۔۔۔ کچھ دیر بعد جب وہ لوگ چوہلی کے سامنے پہنچے تو گھبراؤ کرنے والے بکھر چکے تھے۔ ذوالقرنین اور نور نے کچھ ٹوٹیوں کو دریا کی جانب بھاگتے دیکھا۔ کچھ نارچوں اور لالشیوں کی دور دوری ہوئی روشتیاں سرکنڈوں کی جانب نظر آ رہی تھیں۔

نور نے دیکھا مشتعل کھاپریوں نے چوہلی کے قدیم چوہی دروازے کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش یقیناً نور کے فرار ہونے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ مگر لکڑی اور لوہے سے تیار ہونے والے اس دروازے کا کچھ خاص نہیں بگڑ سکا تھا۔ اب خانہ بدوش بھی پہنچ گئے تھے اور پولیس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ زبردست ہوائی فائرنگ اور پولیس گاڑی کا مسلسل ہونسن کر چوہلی والوں کو یقین ہو گیا کہ پانسلٹ چکا ہے۔ چوہلی کا جہازی ساز دروازہ کھول دیا گیا۔ نور کی نگاہ سب سے پہلے شرنیل، چچا احسان اور اپنے ابا جان پر پڑی وہ لپک کر ان کی طرف گئی۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر گری گئی۔ ٹھٹک گئی، جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر وہ ایسے ہی منتشر ہو گیا جیسا کہ تھی لیکن اس باصورت حال مختلف رہی۔ ابا جان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے عجیب کیفیت میں اپنے دونوں بازو نور کے لیے کھول دیے۔ وہ لپک کر گئی اور ان کی ہاتھوں میں سامنی۔

”میری بیٹی۔۔۔۔۔ میری عین اللور۔“ وہ دھکارتے چلے گئے۔ ”آج تم نے وہ کیا جو کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔ آج تم میرا بیٹا بنی ہو۔ آج تم نے ہم سب کو ایک بہت بڑی مصیبت اور

تھے۔ نور مسلسل بولتی چلی گئی اور ایک منٹ کے اندر اندر اس نے تقریباً ساری صورت حال پولیس والوں کے گوش گزار کر دی۔ یہ انکشاف ذوالقرنین کے لیے بھی تھمک خیز تھا کہ چوہلی کے ارد گرد بہت سے لوگ جمع ہیں اور نور کی بہن بسمہ کو ایک طرح سے اغوا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔
ایک ہیڈ کانسٹیبل نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی پہلے مجھے بھی شک ہوا تھا کہ تالے کی طرف کوئی فائر کیا گیا ہے بلکہ شاید یہ دو فائر تھے۔ فائر اور وہ بھی میلے کے دنوں میں۔ گزرتا تو ضرور ہو رہی ہے جی۔“

دو تین منٹ کے اندر اندر پولیس اہلکار چوہلی سے باہر نکل آئے۔ ان کی تعداد پندرہ کے لگ بھگ تھی۔ کچھ وردی میں اور کچھ سادہ لباس میں تھے۔ دو چار کچھوز کر سب کے پاس اسلحہ موجود تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ سب انشکثر جان محمد خود بھی کھاپری برادری سے زیادہ خوش نہیں ہے۔ اس نے فوراً بذریعہ فون قریبی قلعے تک بھی اطلاع پہنچا دی تھی۔ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے پار چوہلی کی جانب روشنی سی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید کہیں تھوڑی بہت آگ بھی لگی ہوئی تھی۔

سب انشکثر جان محمد اپنی نفری کے ساتھ پولیس موبائل میں بیٹھ گیا۔ کچھ اہلکار موٹر سائیکلوں پر تھے، تین چار ذوالقرنین کی ایف ایف میں لگے۔ تھوڑا آگے جا کر سب انشکثر نے گاڑی روک لی۔ یہاں بہیمت بڑی ایک جموہیزا ابستی تھی۔ بارش کی وجہ سے ان میں سے کئی لوگ جاگ رہے تھے۔ سب انشکثر نے بلند آواز میں انہیں پکارا۔ پکی رنگٹوں والے پانچ چھ افراد لپک کر اس کی طرف آئے۔ اس نے ان سے کچھ ہمسپری کی۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی اس جموہیزا ابستی میں پہل نظر آئی اور درجنوں افراد کلبھاڑیوں اور لاشیوں سے مسلح ہو کر نکل آئے۔ ان میں سے کچھ گھوڑا ریزہ میوں پر اور کچھ گدھا گاڑیوں پر سوار ہو گئے۔ اس سارے قافلے نے ہل پار کیا اور تیزی سے وقوع کی طرف بڑھا۔

نور، ذوالقرنین کے ساتھ ایف ایف میں اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کا لباس تمنا تھا اور اب وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ پولیس اہلکاروں کو چوہلی کی تشویشناک صورت حال سے بھی آگاہ کر رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ وہ کس طرح بچ کر یہاں پہنچ پائی ہے۔

ذوالقرنین نے اسے کانپتے دیکھا تو اپنی گرم کپڑائی مثال اتار کر نور کے کندھوں پر ڈال دی۔ وہ پہلے تو بھینکی اور

تھا اور ایک ٹوٹا ہوا چمکیا ہا بار بھی اس کے گلے سے لٹک رہا تھا۔ سب انسپٹر جان محمد کی ہدایت پر پولیس اہلکاروں نے حویلی کے ارد گرد سرچ آپریشن شروع کر دیا کہ کوئی اور کھاپری بھی کہیں گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ حویلی کا گیٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

ماموں اور چچا وغیرہ اب ذوالقرنین سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ پھر سب انسپٹر جان محمد نے ماموں اور چچا کو اپنے پاس بلایا اور ان کو ضروری ہدایات دینے لگا۔ اسی دوران میں نور نے دیکھا کہ ذوالقرنین آگے آیا۔ نور کے ابا جی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”انکل! زنجیوں کو اس طرح اکیلے نہیں بیٹھنا چاہیے، کوئی ساتھ ہو۔ یہ لوگ یہاں سے تو بھاگ گئے ہیں لیکن ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔“

ذوالقرنین کی بات کا وزن سب نے محسوس کیا۔ افراتفری میں اس طرف دھیان ہی نہیں کیا تھا۔

ذوالقرنین نے اپنی گاڑی کے دروازے کھول دیے۔ تین سب پولیس اہلکار اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور گاڑی زنجی چوکیدار والی گاڑی کے پیچھے روانہ ہوئی۔ حویلی میں اب حالات مکمل کنٹرول میں تھے۔ معلوم ہوا کہ جب نور چھت سے چھلانگ لگ کر بھاگ گیا اور کھاپریوں کی زد سے نکل کر سرکنڈوں میں اوجھل ہو گئی تو مایوس ہو کر اور جھنجھلا کر کھاپریوں نے حویلی کے گیٹ کو آگ لگانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دیوار کے اوپر سے مگن میں کچھ بیڑول بم بھی پھینکے۔ جواب میں ان پر چھت سے سخت خشت باری کی گئی۔ بیڑول بموں سے دو تین افراد کو معمولی زخم آئے۔ کسی بڑے نقصان سے بچت ہو گئی۔

..... خطرہ ٹل چکا تھا پھر بھی سب انسپٹر جان محمد نے چند اہلکار گیٹ پر متعین کر دیے اور باقیوں کو ساتھ لے کر لائن کے معائنے کے لیے چلا گیا۔ نور کے ابا جان، چچا جان اور دیگر مرد بھی ساتھ گئے۔ نور، پچھو جا رہا اور تانی راحت کے ساتھ خواتین والے حصے میں آگئی۔ آپی بتول، بمسہ، مہرین، سلمہ سب اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی تک لڑاں تھیں۔ وہ ان سب بھی تھی لیکن سب جیسی نہیں تھیں تھی۔ وہ مختلف تھی اور آج ایک بڑے واسطے نے یہ ثابت بھی کر دیا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ستائش تھی اور محبت آسیرنی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں والی بمسہ نے اسے ایک بار پھر اپنی ہاتھوں میں سمیٹ لیا اور سسکے لگی۔ جب وہ دونوں جدا ہوئیں تو سب ارد گرد بیٹھ گئیں اور نور پر سوالات

کی بوچھاڑ کر دی۔ حویلی سے باہر اب پولیس کی مزید گاڑیوں کے ہونٹ سنا دیے گئے تھے۔

☆☆☆

..... اور یہ منظر تھا لاہور میں مولوی اشفاق مہرا کی رہائش گاہ کا۔ نور اب اپنے گھر میں تھی۔ کچھ لمبے عجیب کا یا پلٹ ہوتے ہیں۔ مشکیں آسان کر دیتے ہیں۔ بلند و بالا دیواریں جن کے گرنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا، ریت بن کر سمرا ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب ابا جان نے اسے حویلی کے دروازے پر سینے سے لگا دیا تھا اور اس کا ہاتھ چوما تھا اور اسے بہادر بنی کہہ کر اس کی پیٹھ پیٹتی تھی۔ انہی لمحوں میں..... ہاں، انہی لمحوں میں نور نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے ابا جان جو بھی کہیں گے وہ تسلیم کر دے گی۔ اب وہ ساری زندگی ان کی کسی بات کو رد نہیں کرے گی۔ شاید اس کے ابا جان کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی ایک چھکی کی قیمت کتنی زیادہ ہے۔ وہ اس ایک چھکی پر اپنی زندگی بٹا کر رکھتی تھی۔

اپنے والد کی مرضی و منشا کے لیے جو یہ خدا داد آدمی اس کے اندر پیدا ہوئی تھی، وہ اسے اب ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جلد از جلد اسے استعمال میں لے آنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سے اٹھ کر وہ ایک دن تاپا ابا کے گھر میں جا رہی تھی۔ دل فکار اور پارہ پارہ۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جنوری کی شفق رنگ شام لاہور کے آسمان کو چھو رہی تھی۔ رنگ برنگی چٹائیاں اپنے ٹھکانوں کی طرف سمت رہی تھیں۔ ایسی مختصر اور سرد و شامیں اسے اکثر اداں کر دیتی تھیں۔ اس نے براؤن رنگ کی وہ گرم کومالی چادر دھیمی جسے ملاقات ہو تو وہ اس کے بھائی کی چادر اسے واپس کر دے۔ اس نے بے خیالی میں چادر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ منظر اس کی نگاہوں میں بھر گیا جب اس تہلکہ خیز رات میں حویلی کی طرف جاتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی چادر کمرہوں سے اتار کر نور کے شانوں پر پھیلا دی تھی۔ ان لمحوں میں وہی تڑپ، وہی مگن اور لازوال انتظار دکھائی دیتا تھا جس کا مشاہدہ اس نے ایک دوبار پہلے بھی کیا تھا اور جس نے اسے سرتاپا لڑا دیا تھا۔ وہ شروع میں اسے بہت برا شخص سمجھتی تھی پھر وہ اسے صرف برا سمجھنے لگی لیکن اب وہ اس کے لیے ایک اچھا شخص بن چکا تھا۔ سچا، کھرا اور شاید انسانیت سے محبت کرنے والا بھی لیکن

وہ کیا کرتی؟ وہ اچھا ہونے کے باوجود بلکہ بہت اچھا ہونے کے باوجود اس کے لیے پسندیدہ نہیں تھا۔ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ مجبوری ہو جاتی تھی۔ کیوں مجبور ہو جاتی تھی؟ شاید..... کوئی آئینہ میل اس کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ کلین شیڈو، ماڈرن لباس، چمپلا۔ یا پھر کوئی انجانا خوف تھا جو اس کا راستہ روکتا تھا۔ یہ کیا کیفیت تھی؟ وہ خود بھی سمجھ نہ پاتی تھی۔

مہرین بھی کبھی زیادہ بے تکلف ہو جاتی تھی۔ اس نے ایک دوبار اس تہلکہ خیز رات کے حوالے سے اسے چھیڑا بھی تھا۔

ایک دن کہنے لگی تھی۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم چوکی کی طرف جا رہی تھیں، خدیجہ کا بھائی اتفاقاً ہی تمہیں آ ملا تھا؟“

”کیا مطلب؟“

”نہیں کوئی رابطہ وغیرہ تو نہیں ہوا تھا پہلے سے؟“

”تمہاری عقل گھاس چرے نہی ہوئی ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ گھاس مار کر تمہارا سر توڑ دوں۔“

”مگر اس سے مجھے جواب تو نہیں مل جائے گا۔ اچھا چلو چھوڑو اس بات کو..... جب تم دونوں اٹھنے گاڑی میں حویلی جا رہے تھے کیا محسوس ہوا انہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی بات تو کی ہوگی اس نے یا نہی کے لیے تمہارا ہاتھ شاتھ تھا ہوا ہوگا.....“

”اس وقت تین پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے گاڑی میں..... اور یکجا منہ کو آ رہا تھا۔“ نور نے بیزار لہجہ میں کہا تھا اور اٹھ کر بچن کی طرف چلی گئی تھی۔

حویلی والے واقعات کو اب قریباً دس روز ہو چکے تھے۔ دو تین اخبارات میں حویلی والے واقعات کی تفصیلی خبر بھی چھپ چکی تھی..... اس میں جانی پہچانی ایتھلیٹ نور کی کارکردگی کو بھی سراہا گیا اور بتایا گیا کہ اس نے کس طرح ایک نہایت سنگین صورت حال میں اپنی ٹیکی کی مدد کی اور بھاگ کر ایک قریبی پولیس اسٹیشن تک پہنچی۔ جو بھی نور سے ملتا تھا، پہلے اس حیرت انگیز واقعے کے بارے میں ہی پوچھتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ ابا جان گھر میں ہی تھے۔ آپی بتول، آپی کے شوہر غیاث اور مسہ ماموں مراد کی خبر گیری کے لیے اسپتال گئے ہوئے تھے۔ ان کے سر کا قاعدہ آپریشن ہوا تھا اور اب وہ رو بہ صحت تھے۔ چوکیدار گل محمد کے چار وائٹ ٹوٹ گئے تھے اور جبرے کی ہڈی بھی فریکچر ہوئی تھی۔ وہ زیر علاج تھا۔ مہرا ٹیکی اس کی پوری نگہداشت

شکست کی فتنج کر رہی تھی۔

نور، ابا جان کے سر کے بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ ان کے عقب میں تھی۔ اپنی بات کہنے کے لیے یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ ابا جان نور کو حویلی کے حالات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کے مطابق فدا حسین کے بیٹے رشید کے گل کا مقدمہ چودھری فخرل اور اس کے بڑے بیٹے ابدال کے خلاف ہی درج ہوا تھا۔ آٹھ دس اور افراد بھی نامزد تھے مگر بڑے مجرم یہی دونوں تھے۔

ابا جان نے کہا۔ ”یہ بھی پتا چلا ہے کہ پرسوں فخرل کو پولیس اسٹیشن میں دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے جہلم کے اسپتال میں داخل کرا گیا ہے۔ اس کی حالت ڈانواں ڈول ہے۔ دراصل سب انسپٹر جان محمد نے دونوں باپ بیٹے پر بڑی ٹائٹ ایف آئی آر کاٹی ہے۔ دو تین اور کیس بھی مکمل کئے ہیں ان کے خلاف۔ بھانسی سے بچ بھی گئے تو آٹھ دس سال تو باہر نہیں آئیں گے انشاء اللہ۔“

”ابو! اس فائر کی سمجھ نہیں آئی جو نالے کے پار کیا گیا۔ پتا نہیں کہ مجھے نشانہ بنا گیا تھا یا پھر وہاں کی فائر تھی؟“

”اس کا بھی پتا چل گیا ہے۔“ ابا جان نے اپنے ہاتھ میں موجود نیکی سیج کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے نکل جانے کے بعد یہ لوگ ناچ کر رہ گئے تھے۔ مایوسی میں ہی انہوں نے گیٹ پر پٹرول ڈال کر آگ لگانے کی کوشش کی اور اسی مایوسی اور بدحواسی میں ایک کھاپری نے یہ دو فائر بھی کیے۔ یہ فائر نالے کے پار کے ایک ڈیرے سے کیے گئے۔ وہاں ایک چری ٹریکٹر ڈرائیور نے بھوسے کے ڈھیر میں ایک پستول چھپا رکھا تھا۔ اس نے ہوا میں دو گولیاں چلائیں اور سمجھا کہ شاید تم اس طرح ڈر جاؤ گی مگر تب تک تم چوکی کے سامنے پہنچ چکی تھیں.....“

تھوڑی دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر چند لمبے کے توقف کے بعد وہ بولے۔ ”ابو! ایک بات کہوں؟“

”ہاں ہاں، بولیں نور۔“

”میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ آپ مجھے دل کی گہرائی سے معاف کر دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں، ابھی آپ کی کسی بات پر اعتراض نہیں کروں گی۔ آئندہ زندگی کے بارے میں آپ میرے متعلق جو فیصلہ بھی کریں گے، مجھے قبول ہوگا۔“

انہوں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے تھے۔ اسے بازو سے پکڑ کر انہوں نے اپنے سامنے کرسی پر بٹھالیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ کہہ

رہی تھی وہ اس کا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔
”میری پتی! انہوں نے بڑے جذبے سے کہا اور اسے سمجھ کر
اپنے ساتھ لگایا۔ ”تم.... مجھے معاف کرو۔ میں نے بھی
تجربوں میں غلط سمجھا ہے۔ تجہیں دکھا دیا ہے۔“

نور کا سر ان کے سینے پر تھا۔ وہ اپنے سر کو کافی
ہلانے لگی۔ آنکھوں کے کنارے جل ہی نہیں رہے تھے،
بھیک بھی رہے تھے۔

وہ گھبر کر لہجے میں بولے۔ ”دیکھو، قدرت بھی کیا کیا
منظر دکھاتی ہے۔ میں نے تمہارے شوق کو ہمیشہ برا کہا.....
اس وجہ سے ہمیشہ تم سے خفا رہا مگر..... تمہارے اسی شوق کی
وجہ سے اس رات ہم سب نے نئی زندگی پائی۔ جو کام کوئی
اور نہ کر سکا، وہ تم نے کیا۔ میں ان لمحوں کو بھی بھول نہیں سکتا
نور۔ اگر تم ان کے ہاتھ آجاتی تویں تو.....“ وہ اس سے
آگے کچھ بول نہ سکے اور چند لمحے کے لیے رقت آمیز کیفیت
میں رہے۔

تب سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔
”انسان خود کو عقل کل سمجھتا ہے اور قدرت اسے بتاتی ہے کہ
اس کی فہم و دانش کی کیا حقیقت ہے..... پتا نہیں کیوں آج
مجھے لگتا ہے کہ تم اس رویے کی حقدار نہیں تھیں جو میں نے
اب تک تم سے اپنائے رکھا.....“

”ابوئی! اب چھوڑ دے ان باتوں کو۔ یہ سب ماضی کا
حصہ ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ بس آپ کی بیٹی
ہوں۔“ اس نے اپنے گرم آنسو اپنے ابو کے سینے کو سونپ
دے۔ وہ حیران تھی کہ یہ آنسوئی برسوں تک کیوں اس کی
آنکھوں میں آزادانہ نہ نہیں پاسکے..... کیا پہلے..... وہ اپنی
شناخت چاہتی تھی، اپنی ذات کو منوانا چاہتی تھی، اس کے بعد
ان آنسوؤں کو راستہ ملتا تھا؟

☆☆☆

یہ دو ماہ بعد کی بات ہے۔ مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ یہ بہار
کے آغاز کی ایک سہانی رات تھی۔ سارے مہینے میں جوتے اور
گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔
برسوں نور کی سگائی تھی۔ ابا جان کی دیرینہ آرزو کے مطابق
اس کی منگنی مولانا حبیب اللہ مرحوم کے فرزند ذوالقرنین سے
ہی ہونے والی تھی۔ اپنے عزم کے مطابق اس نے ابا جان اور
تایا جان کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ تائی راجت نے
اپنے دلنشین انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”نور.....
عورت کے لیے بہت بہتر ہوتا ہے کہ وہ اس سے شادی کرے
جو اسے چاہتا ہے۔ نہ کہ اس سے جسے وہ چاہتی ہے۔“

سپینس ڈائجسٹ 286

دسمبر 2017ء

اور وہ بھی جانتی تھی کہ ذوالقرنین دل کی گہرائیوں
سے نور پر فدا ہے۔ اس کے کی جوت تھے جن میں سے ایک
یہ بھی تھا کہ وہ امتحان والے کے میلے میں بھی موجود تھا اور
اس موقع پر بھی موجود تھا جب طوفانی شب میں نور اس
دوران پولیس چوکی کے دروازے پر دتھیں دے رہی
تھی..... اور اس وقت بھی جب چوکیدار گل محمد جلد وراہدال
کو روکنے کی کوشش میں گر چکا تھا..... وہ خاموش محبت اپنے
سینے میں لیے برسوں سے اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔

اور نور بھی یہی سوچ رہی تھی۔ انسان کو وہ سب کچھ تو
نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے اور ایک دن شادی نہیں نہ
کہیں تو کرنا ہی تھی..... تو پھر کیوں نا اس میں بڑوں کی
خوشنودی شامل ہو جاتی۔

اگلے روز نور کو ایک اور امتحان سے دو چار ہوئی۔ یہ بھی
کڑا امتحان تھا۔ وہ تاپا ز اور مہین سے مل کر واپس اپنے گھر
آئے تو ملازمہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ شاید
آپ کا بچہ چھوٹی لی بی۔“

نور نے لفافہ دیکھا اور اس کے پورے جسم میں سنسنی
پھیل گئی۔ یہ ٹھکانی لیٹر تھا۔ اسی مہیاں نامہریاں ادارے کی
طرف سے جس نے جاہ فراہم کی تھی اور جس کی نمائندگی وہ
قومی کھیلوں میں کر چکی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ہونے والے
ٹرائل کی بنیاد پر نہ صرف اس کی ملازمت بحال کر دی گئی تھی
بلکہ پیرا اور بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ دوسری ایٹھلیٹس کے
ساتھ پینٹل اسپورٹس میں چمکنے کی نمائندگی بھی کرے گی۔

یہ ایک بڑی خوشخبری تھی لیکن ایک ایسے موقع پر آئی
تھی جب اس کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو
زندگی کے ایک مشکل ترین دورا پر محسوس کیا۔ خط اس
کے ہاتھ میں لڑنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شادی
اور اسپورٹس دونوں کام ایک ساتھ بھی نہیں چل سکتے۔ وہ
اپنے ہونے والے سسرالیوں کے خیالات اچھی طرح جانتی
تھی اور اپنے ابا جان کے مزاج کو بھی۔ وہ ان دونوں
راستوں میں سے بس ایک ہی راستہ چن سکتی تھی۔ ایک جاں
مسل کشش کے بعد اس نے وہی راستہ چنا جو اسے چنا

چاہیے تھا۔ اس نے نہ صرف وہ خط چھڑا دیا بلکہ گھر کے عقی
گھر سے میں پھٹی۔ یہاں وہ سارے ایوارڈز اور ٹرافیوں
وغیرہ موجود تھیں جو تاپا کے گھر سے واپس اس کے گھر میں
آئی تھیں۔ چھوٹی ہی زلفت نے یہ ٹرافیوں اس کے گھر میں
سجادی تھیں۔ اس نے ان ساری ٹرافیوں اور ایوارڈز کو ایک
ڈبل بیڈ شیٹ میں گھڑی کی طرح باندھا اور تہ خانے میں

شکست کی فتح

جا کر اس پر اپنی جستی پٹی میں پھینک دیا جو شاید ای کام کے
لیے خالی پڑی تھی۔ اس پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، سینے
میں جیسے دھواں سا پھیلنا ہوا تھا۔ وہ اپنے شوق سے یوں
پھنجر رہی تھی جیسے کوئی دیرینہ محبوب ساتھی سے پھنجر رہا ہے۔

ملازمہ سودا سلف لینے قریبی مارکیٹ جا چکی تھی۔ اس
وقت نور گھر میں اکیلی تھی۔ وہ ایک الماری تک پہنچی۔ وہاں
وہ اپورٹڈ ایٹھلیٹس فوڈز رکھے تھے جو کچھ عرصہ پہلے تاپا ابا
نے اسے یو ایس اے سے منگوا کر دیے تھے۔ یہ اس کے
سب سے محبوب شوز تھے۔ وہ انہیں لے کر کھیت پر چلی گئی۔
ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ دکھادی۔ وہ جل گئے تو ان
کی راکھ ایک شاپر میں ڈال کر ڈسٹ بن میں پھینک دی۔
اس کے بعد کمرے میں بند ہو کر اس نے دیر تک آنسو
بھائے اور ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اسے نیند آ گئی۔ وہ تب جاگی
جب شام گہری ہو گئی اور ڈرائنگ روم میں پھر سے ڈھولک
بجنا شروع ہو گئی..... اس کی منگنی میں اب بس چوتیس گھنٹے
باقی رہ گئے تھے اور شادی میں بھی زیادہ دن نہیں تھے۔

☆☆☆

کبھی کبھی وقت پر لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ شاید ان
دنوں بھی ایسا ہی تھا۔ دن مختصر تھے اور شادی کی تیاری میں
صبح سے شام اور پھر رات ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔
شاپنگ ہو رہی تھی۔ دو تین بار خدیجہ بھی نور کے ساتھ گئی
تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے بھائی کی دلی مراد پوری
ہو رہی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ جیسے ہواؤں
میں اڑتی پھر رہی تھی۔

ایک دن وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”شادی سے پہلے
اپنے ہونے والے میاں سے نہیں ملو گی؟“

”وہ کیوں؟“

”مجھے، تمہاری چچکا بہت اور خوف میں کمی واقع
ہو جائے گی۔“

”کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ کے بھائی
خوفناک ہیں؟“

”اگر خوفناک نہیں تو پھر تم نے سگائی کے بعد ایک بار
بھی میل ملاقات کی خواہش کیوں ظاہر نہیں کی؟“

”اب ایک ہی بار مل لیں گے..... اور بھگت بھی لیں
گے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”بہت برا لفظ استعمال کیا ہے تم نے..... بھگت لیں
گے۔“ خدیجہ نے اس کے سر پر ہولے سے چپٹ لگائی پھر
سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”نور! تم سے کہا تھا کہ وہ سخت

سپینس ڈائجسٹ 287

دسمبر 2017ء

ضرور ہے، کئی معاملوں میں دو ٹوک رائے رکھتا ہے لیکن یہ
سختی دیکھ ہی ہے جیسے..... اخروٹ کی ہوتی ہے۔ اندر سے
کتنا نرم اور مزیدار ہوتا ہے۔“

نور بولی۔ ”لیکن اخروٹ کی ”نری“ تک پہنچنے کے
لیے کافی مشکل پیش آ پارتی ہے جناب..... کچھ کی ”نری“
تو اپنے سخت خول سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔“

”وہ ایسا نہیں ہے نور! تم بے فکر ہو۔ بس تھوڑا
سا..... ٹائم دینا ہے۔“

اور یہ نور کی شادی کی رات تھی۔ اپریل کی درمیانی
تاریخیں تھیں۔ بہار کا شائبہ تھا..... اور شائبہ پر بہار تھی۔
پوری راتوں کا چاند دمک رہا تھا۔ بہار اور چاندنی کا ملاپ
دلوں میں جادو جگادیا کرتا ہے۔ وہ اپنے جملہ عروسی میں
پھولوں کی لڑیوں کے درمیان گاؤں کے لیے لگائے بیٹھی
تھی۔ اسے میک اپ اور بھاری کپڑے وغیرہ بھی پسند نہیں رہے
تھے مگر کچھ معاملات وقت کی مجبوری ہوتے ہیں۔ اسے اپنا یہ
روپ بالکل بھلا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ اسے دل و جان سے نبھانا
چاہتی تھی اور پھر وہ گھڑیاں آئیں جب اس کا شریک حیات،
اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ نور کے دل کی دھڑکن بڑھ
گئی۔ سانسوں کی آمد و رفت تیز ہو گئی۔ گلاب، گیندے اور
زکس کے پھولوں کی مہک اس کے حواس کو ڈھانپ رہی تھی۔
سرخ جوڑے کے اندر اس کا سینا بدن تھا اور اس بدن کے
اندر اس کا دل تھا اور اس دل میں امید کی کرنیں روشن تھیں۔
کچھ خوشگوار سی دھڑکنیں ان نیلی سفید کپڑوں کو دکھانے لگی
تھیں۔ کرنیں متحرک تھیں اور جھللا رہی تھیں۔

اس نے گھونٹ اٹھایا۔ چند ری قہرے ادا کیے اور
پھر اس کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ پاؤں پر مہندی تھی
اور نفرتی پازیبوں کی جھللا تھی۔ اس نے نور سے تمام تر
توجہ ہٹا کر اس کے پاؤں پر نگاہ جمائی، پھر عجیب انداز سے
ان پر ہاتھ پھیرا۔

ایک نور کے ذہن میں ایک سیاہ جھکڑ چلا اور اس
کے پورے بدن میں پھیل گیا۔

اسے لگا..... اسے لگا اس کے ہر مسام سے پسینا بہہ
نکلا ہے۔ وہی مناظر اس کے ذہن پر چھپے جو ایک مرتبہ
غٹو کی عالم میں اس کے پردہ تصور پر ابھرے تھے۔
اس نے کہا تھا، میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ اتنی
کہ تمہیں پانے کے بعد کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لہذا
مجھے ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ تمہاری جدائی کے درد وازے ہمیشہ
کے لیے بند ہو جائیں..... اور پھر.....

...خون کی پگھلائی اور نور کی اپنی ہی آہ و کھاس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اس کے پاؤں گھٹنے کے اوپر سے رکات ڈالے گئے تھے۔ نہ زمین گھٹنے پاؤں، نہ بھائے گی تو..... نہ بھائے گی تو۔

تو کیا آج وہی تصور حقیقت کا روپ دھارنے والا تھا..... یا اس تصور جیسا کوئی اور بے رحم منظر سامنے آنے والا تھا؟ پھولوں کی لڑیوں کے درمیان سے نور کو ذوالقرنین کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اس کی کریم گلر شیر دانی، اس کی ہموار ڈاڑھی کی ایک سائڈ اور اس کا ایک ہاتھ جس میں ایک چابی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ان کے تاثرات۔ اس نے جانی سے الماری کھولی اور اس میں سے کچھ نکال لیا۔ وہ دیکھ نہیں سکی۔ اس کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ بزدلی نہیں تھی لیکن ان لمحوں میں اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے کیا نکالا تھا؟ کیا ایک تیز دھار چابر..... یا اس جیسی کوئی اور چیز؟ نہیں، وہ چابر نہیں تھا۔ وہ ایک ڈبّا تھا جو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ویسا ہی گہرا سرخ خون جو اس کے عروسی لباس کا تھا..... مگر نہیں، وہ سرخ خون نہیں تھا۔ وہ نور سرخ رنگ کا ڈبّا تھا جس کے نیچے کی طرف سفید دھاریاں تھیں۔ وہ ڈبّا لے کر اس کے قریب آیا۔ اسے کھولا..... اس میں اسٹیلک کھینک شوز تھے۔ اپوزنڈ، سفید رنگ کے یو ایس اے کے بنے ہوئے، اسپرٹلز کے لیے مخصوص۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی، نہیں، یہ حقیقت تھی۔ ذوالقرنین نے شوز نکالے۔ عجیب نظروں سے نور کی طرف دیکھا۔ محبت سے مسکرایا اور بولا۔ ”پاؤں آگے کرو نور۔“ وہ ششدر تھی۔ کانوں میں ایک آواز گونج رہی تھی۔ کون کہتا ہے محبت لوگوں کو نہیں بدلتی؟

محبت لوگوں کو بدلتی ہے۔
ان کی سوچوں کو بدلتی ہے۔
ان کے خیالات کی سب سے گہری پرتوں میں بھی اتر جاتی ہے اور وہاں سے معیار ایجاد کرتی ہے۔ یہی محبت کا معجزہ ہے۔

☆☆☆

شادی کے بعد چند روز کے اندر ہی وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب آ گئے تھے کہ نور سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ شریک حیات کے لیے جو ایک موہوم سا آئیڈیل یا نور کے دل و دماغ میں ابھرا کرتا تھا، نچانے کہاں کھو گیا تھا۔ اس آئیڈیل کی جگہ حقیقت نے لے لی تھی اور حقیقت خوبصورت تھی۔ اس شخص سے کہیں زیادہ

خوبصورت اور دلواؤں تھی جو کبھی ایک میگزین کے اسپورٹس انچارج کے طور پر اس کے سامنے آیا تھا۔ اب وہ اس کا نام بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔

”انشاء اللہ۔“ ذوالقرنین نے اس کے عقب میں آ کر کہا اور وہ اپنے خیالوں سے بری طرح چونک گئی۔ ڈریسنگ میز کے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کھانے کی ایک دعوت پر جا رہے تھے۔ نور نے ہمیشہ کی طرح بہت ہلکا میک اپ کیا تھا۔ چوڑیاں اور جھمکے پہننا اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ یہ بھی نہ پہنتی۔ اس معمولی تیار کی کے ساتھ بھی وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ ذوالقرنین نے کندھوں سے تمام کر اسے اور اس کے سنگھار کو گھونٹا پھر ایک فرحت بخش سانس لے کر بولا۔ ”اللہ آپ کو نظر بد سے بچائے۔ میں اپنی قسمت پر ناز کر سکتا ہوں۔“

”کیا اب مجھے شکر یہ ادا کرنا ہوگا؟“ وہ مسکرائی۔
”نہیں۔ صرف، میری شیر دانی کا اوپر والا مٹن بند کرنا ہوگا۔“ وہ ہلکے ہلکے پھٹکے انداز میں بولا۔

نور نے اس کی خوبصورت تراش کی براؤن شیر دانی پر نگاہ دوڑائی۔ وہ سچ رہا تھا۔ نور نے شیر دانی کا بالائی مٹن ذرا زور لگا کر بند کر لیا۔ کارٹھوڑا سا ٹائٹ تھا۔ وہ مصنوعی انداز میں کراہنے لگا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اتنے تنگ گلے والی شیر دانی میرے سرریلوں نے سازش کے تحت سلوائی ہے..... جب مجھ سے پیچھا چمڑانے کو دل چاہے گا، آپ مجھے یہ شیر دانی پہننے کے لیے دے دیں گی۔“

”آپ زیادہ ڈراما نہ کریں۔ ہاں، یہ ہے کہ دو ماہ پہلے کے حساب سے تھوڑا سا وزن بڑھ گیا ہے آپ کا۔“
”آپ اتنا اچھا لگتی ہیں تو پھر میری کچھ ہوگا۔“ اس نے ا سے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”جلیں، اب دیر ہو رہی ہے۔ خدیجہ اور خالد نیچے انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ چیخے مٹے ہوئے بولی اور آئینے کے سامنے دوبارہ لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

وہ بولا۔ ”ارے ہاں یاد آیا۔ صبح آپ نے ایف اے ایس، بھی جاتا ہے، کتنے بچے اٹھنا ہوگا؟“
”چھ بچے سے پہلے۔“ وہ مسکرائی۔ ”کل رنگ سیشن بھی ہوتا ہے۔“

”یا خدا..... یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟“ ذوالقرنین نے کہا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ کتنا Cool لگ رہا تھا۔
وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے بار بار

تایا ابا کی بات یاد آتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا۔ ”مور میں دھوکا دیتی ہیں نور۔ جب تک کسی بندے کے ساتھ رہنا جائے اسے پرکھنا جائے، کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔“ بے شک وہ درست کہا کرتے تھے۔

”چھ بچے تو اندھا ہوتا ہے زوجہ محترمہ۔“ وہ بولا۔
”امید ہے کہ جلد ہی آپ کی شکایات دور ہو جائیں گی۔ جب میں ٹیم چھوڑ دوں گی، پھر ٹائٹنگ کی یہ سختیاں نہیں رہیں گی۔“
”لیکن ٹیم سے آپ نے مکمل ٹائٹا تو نہیں توڑنا۔ جب آپ کو جنگ وغیرہ کی طرف آئیں گی تب بھی وقت تو دینا ہی پڑے گا۔ صبح بچے نہ سکی، سات بجے سکی۔ سات بجے نہ سکی، آٹھ بجے سکی..... نو بجے سکی۔“

”نو بجے سے جناب کو کیا پریشانی ہوگی؟“ وہ بولی۔
”پریشانی تو مجھے دس اور کیا رہے گی سے بھی ہو سکتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ، آہستہ آہستہ کچھ کرم فرمادے۔ دل کی بے قرار یوں کو ذرا قرار آ جائے۔“ وہ کسی پچھل لڑکے کی طرح بولا۔

ذوالقرنین کے مزاج کا یہ رخ نور کے لیے بڑا دل آویز تھا۔ وہ سوچنے لگی کئی کم ہیمیاں کتنی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اگر کچھ عرصہ پہلے ہی اسی او کے ہاتھ سے ذوالقرنین کو ایک سخت فون کرتے کرتے وہ رک نہ جاتی اور ارادہ بدل نہ دیتی تو توجانے ان کے درمیان کتنی بڑی فلیج حائل ہو جاتی۔ قدرت کے کام قدرت ہی جاتی ہے۔ نور اور ذوالقرنین کے درمیان اس کال والا معاملہ بھی صاف ہو چکا تھا۔ ایک دن رومانی موڈ میں ذوالقرنین نے اس سے پوچھا تھا کہ پہلے پر جانے سے پہلے ایک دن سہ پہر کو نور نے اسے کال کی تھی؟ نور مان گئی تھی مگر یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ کال اس نے اٹھتے نہیں برے موڈ میں کی تھی۔ بس اتنا کہا کہ آپ کو سمجھنا تھا جانتی تھی۔ اس کے بعد ذوالقرنین نے بھی اسے بتا دیا تھا کہ پہلے کے دوران میں اس کے سر پر مٹی کیوں نظر آئی تھی۔ فون بیل سن کر سیر میوں سے اس کا لڑکھانا ایک دلچسپ واقعہ تھا۔ نور اور ذوالقرنین دونوں ہنستے ہوئے سرخ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

..... اور پھر آخروہ دن آن پہنچا جس کا انتظار مدت سے تھا۔ آج نور ایک بار پھر سو میٹر دوڑ کے میدان میں تھی۔ یہ میگا ایونٹ تھا۔ قومی ٹیم تھی اور اس کے سامنے وہی ٹریک تھا جس پر وہ کئی بار باری بھی اور ایک بار ہی طرح گری بھی تھی لیکن

شکست کی فتنہ

آج وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم وکٹری اسٹیڈیو کو تو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی تربیت تھی اور اس تربیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پرانی حریف ٹشو جکی بھی پوری تیاری کے ساتھ ایونٹ میں حصہ لے رہی تھی۔ اس کے بارے میں اڑنی اڑنی خبر یہ بھی کہ اس نے کسی ٹینس پر اہم کا شکار ہو کر اپنا قریب ایک چوتھائی سینکڑہ دیا ہے۔

بظاہر سنجیدہ لیکن اندر سے متشہم ذوالقرنین حوصلہ افزا انداز میں نور کے ارگرد دو جوتا تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی نور کے لیے بے حد اہم تھی۔ نور کی رفتار منس اب تک بہت بہتر تھی۔ اس نے جاں کسل کوشش کے ساتھ اپنی پرانی فارم تقریباً تقریباً حاصل کر لی تھی۔ ابتدائی ٹینس میں ایک مرتبہ اس کی ٹائٹنگ 12.05 بھی رہی تھی۔

اسٹیڈیم کچھا بچہ بھرا ہوا تھا۔ کمرے حرکت کر رہے تھے۔ اس کی محترم کو چڑ بنیلہ وجدان اور میڈم فرحانہ بھی موجود تھیں۔ اپنے مختلف لباس اور اسکارف کی وجہ سے نور ہمیشہ علیحدہ سے نظر آتی تھی۔ کچھ لوگ اس صلیب کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور کچھ ہونٹک بھی کرتے تھے۔ ٹشو جکی اس کے پاس سے گزری اور حسب معمول ایک فقرہ اچھا لگئی۔ ”سوئے سپرہاگے یار! ایک تو پیٹنڈو، اوپر سے شادی شدہ۔“

نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا نظریہ ہمیشہ سے یہی تھا کہ اصل جواب میدان میں ہوتا ہے۔

فائل ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اس کے پیارے تایا ابا اس کے پاس آئے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے اپنے ساتھ لگایا اور بولے۔ ”بیٹا! ہار جیت مکمل کا حصہ ہوتی ہے۔ کوئی ہارتا ہے تو ہی کوئی جیتتا ہے۔ اصل چیز تو مستقل مزاجی ہے اور اپنی کوشش سے جڑے رہنا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ غیر مستقل مزاجی سے ایک ایسا ہارنے والا نہیں بہتر ہے جو مستقل مزاجی سے کوشش جاری رکھتا ہے اور نتیجے کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے..... تم جیت سکتی ہو اور ہار بھی سکتی ہو۔ دونوں صورتوں میں تم ہماری جان ہو..... کیونکہ تم..... مورال والی میں وہ جیت اپنے نام کر چکی ہو جو کبھی ہار میں نہیں بدل سکتی.....“

نور کو تایا ابا کا جملہ بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر ایک سایہ سا اس کے چہرے پر لہرایا۔ وہ بولی۔ ”ابا جان نہیں آئے؟“
”نہیں..... لیکن انہوں نے تمہاری کامیابی کی دعا کی ہے۔ ان کی ساری کڈ و شتر تمہارے ساتھ ہیں۔“

تھا۔ جس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہی تھی۔ جس کو وہ سمجھ بن کر دکھانا چاہتی تھی، جس کی نگاہوں میں وہ اپنی سائنس دیکھنے کے لیے ہمیشہ تری تھی۔ بھی بچپن میں بے تکلیف شراعتیں کی تھیں، بھی ہند کی طرح اچلی کودی تھی۔ بھی نیک پروین بن گئی تھی، بھی جھکڑے کے تھے اور بے ڈھنگے لباس پہنے تھے، بھی کوئی انوکھا ہنر سکھانا شروع کر دیا تھا۔..... ایسا بھی آپ کی بیٹی ہوں، ایویری طرف بھی..... ہوں میں تیری ہوں لیکن آپ کی ہوں..... اس نے لڑائی کے مختلف مرحلوں میں جو کچھ بھی کیا تھا، ان کی نگاہوں میں آنے کے لیے ہی تو کیا تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ اس کے دور سے دور ہوئی چلی گئی تھی اور پھر میلے والا واقعہ ہوا تھا جس نے اس کی برسوں پرانی آرزو میں پوری کر دی تھی۔..... اس نے بولے اس کا ماتھا چڑھا تھا۔ آج اسے ایک اور موقع ملا تھا۔ اپنے ابوی کی نگاہوں میں اپنا مقام مستحکم کرنے کا۔ اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آج کچھ گزر رہے گی..... آج سب کچھ وہی تھا جو پہلے ایونٹس میں ہوا کرتا تھا لیکن آج ایک شخص یہاں موجود تھا اور آج ایک کھلی اسے مل رہی تھی۔ پھر وہ بھاگی..... اس کا دل کہہ رہا تھا، کوئی انہونی نہ ہو جائے ورنہ آج اسے کوئی ہر انہیں سکے گا۔ اس نے اپنی سخت ترین حریف نشوونما کو دیکھا۔ وہ اس سے دو قدم پیچھے تھی۔ بڑی تیزی سے پاس آ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ نصف فاصلے کے بعد اپنا مونٹرم بڑھاتی تھی اور مارننگ Cover کر لیتی تھی۔ آج وہ پھر وہی کر رہی تھی۔ اسپرٹز کے لیے بھاگنے کے دوران میں بولنا آسان نہیں ہوتا لیکن نور نے نشوونما کن نگاہوں سے دیکھا اور گرجی۔ میں پیٹھوں ہوں..... شادی شدہ بھی ہوں لیکن آج ہراؤ مجھے۔ ماں کا دودھ پیاتے تو ہراؤ مجھے۔ وہ ایک جنوبی کیفیت میں جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی..... اور پھر فٹ لائن کا فیتا نور کے سینے سے ٹکرایا تھا.....

یہ وہی ساتیں تھیں جن میں صدیوں پرانے سننے پورے ہوتے ہیں، پھر وہی لمبے تھے جن میں گشتوں کا تسلسل ٹوٹتا ہے اور فتح مسلسل مزاجوں کے قدم چوتی ہے اور یہ وہی وقت تھا جب سرے ساختہ سجدہ شکر کے لیے جھک جاتے ہیں۔ نور نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ وہ جیت چکی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنے سپورٹرز کے وہ پرجوش نعرے گونج رہے تھے جن کے لیے آج تک اس کی سماعت تری تھی۔ سفید بادلوں کے پیچھے سے بہار کا مہربان سورج نکلا اور لاہور کے آسمان پر مگرانے لگا۔

ختم شد

”پر انہوں نے وعدہ کیا تھا۔“
”اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے..... مگر نور! وہ تم سے خوش ہے۔ تمہیں کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔“
اناؤٹسٹ گھمکی کہ فائل ریس میں حصہ لینے والی اسپرٹز ٹریک پر آ جاگیں۔
دیگر لڑکیوں کی طرح نور بھی پہنچ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ ایو جان یہاں آئیں۔ انہوں نے اسے ٹیک دعاؤں سے رخصت کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے جلدی واپس آگئے تو اسٹیڈیم پہنچیں گے۔
نور نے ان کی دی ہوئی دعاؤں کو یاد کیا اور ان کی کوشش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دعا اور بدعا میں بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ایو جان کی دعا تھیں اس کے ساتھ نہیں تھیں..... نہ صرف وہ دعاؤں سے محروم تھی بلکہ بقول پچھوہا جڑہ ایک بدعا بھی اس کے ساتھ تھی۔ آج صورت حال بالکل مختلف تھی۔

اسپرٹز ٹریک پر پہنچ چکی تھیں۔ اب کسی بھی وقت پوزیشن ہونے کا اعلان ہو سکتا تھا۔ اچانک نور نے دیکھا کہ اس کے تایا انتظامیہ کے ایک شخص سے آڑگوٹ کر رہے ہیں۔ وہ شاید نور سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ آخر وہ کامیاب ہوئے اور اپنی پی کیپ درست کرتے ہوئے سیدھا نور کی طرف آئے۔

”کیا ہوا تایا ابا؟“ وہ جیسے اندر سے کانپ گئی۔
انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی انگلی سے تماشا بیوں کے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہی آئی ٹی کی تیسری یا چوتھی رو میں اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ اس کے ابا جان کا چہرہ تھا۔ وہ آگئے تھے..... وہ پہنچ گئے تھے، وہ مسکرا رہے تھے..... نور کے اندر ایک ترنگ پیدا ہوئی۔ یہ ترنگ توانائی کی ایک شعاع بن کر اس کے پاؤں کے ناخنوں سے اُٹھی اور سر کے بالوں تک چلی گئی۔

لاہور کی اس چمکیلے سہ پہر میں آسمان پر سفید بادلوں کے کھلنے سے..... پوزیشن لینے کا اعلان ہوا۔ اسپرٹز نے اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے، آگے کوچھیں، اسٹارٹنگ لائن کوچھوا۔ سیکنڈ پوزیشن کی اور ان کی ساتیں فائر کی آواز سننے کے لیے تیار ہوئیں۔ یہ سب کچھ وہی تھا۔ وہی پوزیشن، وہی ٹریک، وہی تماشا ٹی، وہی دور سے نظر آتی ہوئی فٹس لائن کی جھلک لیکن آج ایک چیز نور کے لیے مختلف تھی۔ آج ایک شخص یہاں موجود تھا..... اور آج ایک کھلی یہاں موجود تھی۔ اور یہ اس محترم شخص کی کھلی تھی جس نے اسے جنم دیا